"معارف"

کے تنقیدی مطالعات

مرتب

غلام مصطفیٰ دائم

”معارف“ کے تقدیسی مطالعات

مرتب

غلام مصطفیٰ دائم

نعت ریسرچ سینٹر

ہمارا نصب العین! نعتیہ ادب کا فروغ

کتاب : "معارف" کے تقدیسی مطالعات

مرتب : غُلام مصطفیٰ دائم

کتابت : راشد حسین

مطبع : مہر گرافکس اینڈ پبلشرز

اشاعت : 2025ء

تعداد : 200

صفحات : 570

قیمت : 2500

شائع کردہ

B-306، بلاک 14، گلستانِ جوہر، کراچی۔

انتساب

نعت کے سبھی حوالوں کا اعتبار پا جانے والے جناب

سیّد صبیح الدین رحمانی

کے نام، جو مطالعاتِ حمد و نعت

سے میرے تعلق کا پہلا وسیلہ ہیں۔

پشت بر کوہ ست طاقت تکیہ تا بر رحمتست

کار دشوار ست و ما بر خویش آساں کردہ ایم

فہرست

عرضِ مرتب

برصغیر میں مذہبی صحافت کا معتبر علمی و تحقیقی جریدہ "معارف" اسلامی فلسفہ و فکر میں کلیدی نوعیت کا اثر انداز ثابت ہوا۔ اس کے ادبی و فنی، نیز علومِ دینیہ سے متعلق مقالات و مضامین نے ایک عہد کی تحقیقی ضرورتوں کی تکمیل کی ہے۔ بیسویں صدی کے تمام عمائدِ ادب اور زعمائے دین نے اس میں اپنی خامہ کاریوں کے ساتھ ایک متواتر تحریک کی بنیاد گزاری کی ہے۔ جن میں مولانا حالیؔ، عبد السلام ندوی، پروفیسر نواب علی، شیخ عبد القادر، مولانا دریا آبادی، اقبال احمد سہیل، علامہ اقبال اور نیاز فتح پوری وغیرہ شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل ہی "معارف" نے شعر و ادب کے کلاسیکی نعتیہ متون کی سنجیدہ پڑھت کی ایک علمی بنیاد ڈال دی تھی جس کا مقصود تقدیسی ادب کے ان زوایا پر ادبی و فنی، نیز علمی و فکری حوالوں سے تنقیدی تجزیہ تھا جو بہ حیثیت ادبی فن پارے کے، اس متنی لوازمے کی تعیینِ قدر کے لیے ضروری درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن "معارف" کے سو سالہ دورانیے میں ان مطالعات کا تناسب

بہت ہی کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ فہرست میں ”معارف“ کے دستیاب تیرہ سو شماروں میں سے صرف تینتالیس اندراجات ہیں۔ اس سے بخوبی تخمینہ لگایا جاسکتا ہے کہ ”معارف“ جیسا علمی و فکری سیاق رکھنے والا جریدہ تقدیسی ادب کے مطالعاتی پہلو سے کس قدر تہی دامن ہے۔ لیکن بایں ہمہ، اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ اکیسویں صدی تقدیسی ادب کے مطالعات سے اپنے تنقیدی سفر کا آغاز کر چکی ہے جسے ماقبل جرائد، بالخصوص ”معارف“ کی فکری و تحقیقی کاوشوں نے کمک فراہم کی ہے۔ اسی لیے نعت کے تخلیقی و تنقیدی ارتقا کے سلسلے میں ”معارف“ کے ان مضامین کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ موجودہ عہد میں ان کی افادیت کا تحقیقی زاویہ مزید ابھر کر سامنے آیا ہے۔ مثلاً قدسؔی کی نعتوں کے انتساب کا مسئلہ جس تحقیقی انضباط سے پہلی مرتبہ ”معارف“ میں اٹھایا گیا، اس سے قبل نہ بعد میں اس کی مثال ملتی ہے۔ ”معارف“ کے مطالعاتِ حمد و نعت میں سب سے پہلا مضمون محسنؔ کاکوروی پر ہے جو ۱۹۴۱ء میں تحریر کیا گیا۔

”معارف“ سے پہلی مرتبہ الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ کی لائبریری میں میرا واسطہ ۲۰۱۸ء میں پڑا۔ چونکہ دین کی علمی و مذہبی روایت سے میرا دیرینہ تعلق ہونے کی وجہ سے پہلے ہی مرحلے میں ”معارف“ کا سحر مجھ پر طاری ہو گیا۔ لیکن تب زیادہ مطالعہ نہ کر سکا کیوں کہ دورانِ رمضان باقی معمولات کی وجہ سے یہ ممکن بھی نہ تھا۔ تاہم دوسری مرتبہ الندوہ کی لائبریری میں تب جانا ہوا جب سید صبیح الدین رحمانی صاحب سے نعت کے حوالے سے ایک ربط ضبط قائم ہو چکا تھا۔ سو اِس مرتبہ ”معارف“ کی ورق گردانی کا مقصد نعتیہ مطالعات کی تلاش و جستجو تھا۔ کم وقت میں زیادہ اوراق سے بالاستیعاب گزر جانا ناممکن تھا، سو میں نے وہاں موجود شماروں میں سے متعلقہ مواد کے عکوس اتار لیے۔ اس کے بعد دیگر چند مطالعہ گاہوں سے بھی کچھ نہ کچھ ملتا رہا۔ اور یوں بالآخر ”معارف“ کے تیرہ سو دستیاب شماروں سے تمام حمدیہ و نعتیہ، نیز منقبتی مطالعات کا اہم مواد عکس بند کر لیا۔ اور اب صبیحؔ صاحب کی ترغیب و ہدایت پر ان عکوس کی صفائی (Scanning) کرکے حتی الامکان متن کو

واضح کیا گیا ہے تا کہ مختلف دھبے اور کرم خوردگی کے باعث بننے والے نشانات عکسی اشاعت میں نظر نہ آئیں۔ اور یوں ساڑھے پانچ سو صفحات کا یہ مواد ایک دستاویز کی صورت میں تاریخی ترتیب کے ساتھ حاضرِ خدمت ہے۔ میں اس مواد کو ہرگز پیش نہ کر سکتا اگر صبیحؔ رحمانی صاحب ترغیب اور حکم نہ دیتے۔ سو یہ ادنیٰ سی کاوش اُنھی کی نذر کرتا ہوں۔

غلام مصطفیٰ دائمؔ

غالبؔ لائبریری، ناظم آباد، کراچی

۱۲مارچ۲۰۲۵

محسن کاکوروی اور انکی خصوصیات

از

جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی بدایونی ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

قدیم اردو شعر و شاعری پر حالی سے لیکر ابتک اس قدر خامہ فرسائی ہو چکی ہے، کہ اعتراضات کی طویل فہرست مین کسی اضافہ کی گنجایش معلوم نہین ہوتی، یہ اعتراضات صرف شاعری پر صادق نہین آتے، شاعری کے علاوہ ادب کی اور اصناف اور ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبون پر نظر ڈالین، تو پچھلے آٹھ سو سال کی ہندوستان کی تاریخ مین بعض عیوب ان سب میں مشترک نظر آئین گے، ان کو اگر ہم کسی ایک لفظ سے ادا کرنا چاہین، تو وہ "تقلید" ہے، ہمارا ادب اور ادب کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ "تقلیدی" ہین، اور تقلیدی ہونے ہی کی وجہ سے ان سے معرکے صادر نہین ہوئے،

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومین
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ایک مغربی مفکر نے فنون لطیفہ کے ارتقاء کے سلسلہ مین لکھا ہے کہ فنون کی زندگی مین بالعموم دو منزلین پیش آتی ہین، ایک حیات و حرکت عمل کی دوسری جمود و تعطل وسکون کی، پہلی منزل کی پیداوار تخلیقی (Creative) اور دوسری کی تقلیدی (IMITATIVE OR TRADITIONAL) ہوتی ہے،

جب کوئی قوم بساطِ عالم پر اپنے مہرے جماتی ہے، تو سب سے پہلے تنازع للبقا سے سابقہ پڑتا ہے، جد و جہد عزم و استقلال عمل و کردار کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے قوم مین تمام قوتین اپنی

معراج پر ہوتی ہین، اس وقت ایک خاص قوت سرگرم عمل ہوتی ہے، جسے (Creative - Faculty) یعنی صلاحیت تخلیق کہہ سکتے ہین، اس صلاحیت کی پیداوار تخلیقی ہوتی ہے، اس مین زندگی کی وہ روح ہوتی ہے، جو خود قوم مین موجود ہوتی ہے، جس کی یہ ترجمانی کرتے ہین، قومون کے کارنامون کی طرح ان کے آرٹ اور فن مین بھی معجزہ ہوتا ہے،

لیکن جس طرح قوم کی اور صلاحیتین تکمیل کی ایک خاص منزل پر پہنچکر رک جاتی ہین، اور پھر زوال کا دور شروع ہوتا ہے، اُسی طرح (Creative Faculty) یعنی قوت تخلیق بھی مردہ ہوجاتی ہے، اور جیسے جیسے عمل، عزم، استقلال کی جگہ تن آسانی اور تساہل لے لیتے ہین، اسکے ساتھ ہی ساتھ قوت تخلیق کی جگہ صلاحیت تقلید (Imitative Faculty) ترقی کرتی رہتی ہے، آرٹسٹ اب آرٹ کی تخلیق سے قاصر ہوتا ہے، اس وقت پوری قوم آبا و اجداد کے فراہم کئے ہوئے سرمایہ پر گذر بسر کرتی ہے، چنانچہ آرٹسٹ بھی اپنے پیشروؤن کے کمالات کو بیچ کر کھاتا رہتا ہے، اور انہی کی تقلید کو کمال فن اور معراج تکمیل سمجھتا ہے، جس قدر تقلید یا نقل مکمل اور مطابق اصل ہو، اسی قدر آرٹ مکمل سمجھا جاتا ہے، یہ عالم آرٹ کے سکرات کا عالم ہوتا ہے، اگر ایسے موقع پر قوم کی ناؤ کو کھینے والا میسر نہ ہو، تو قوم کی کشتی زوال کے گرداب مین ہی غرق ہوجاتی ہے، اسی طرح اگر آرٹ کو تباہی سے بچانے والا تخلیقی آرٹ کا علمبردار پیدا نہ ہو، تو آرٹ فنا ہوجاتا ہے،

اس مغربی مصنف نے تخلیقی اور تقلیدی آرٹ کی بحث یورپ کے فنون کے سلسلہ مین کی ہے، لیکن یہ بیان ہماری شاعری کے عین مطابق ہے، ہندی مسلمانون کی شاعری کا سرچشمہ عرب ہے، عربی شاعری کی بنیادین جذبات پر قائم ہین، اور حقیقت کی ترجمانی اس کا مقصد ہے، عرب شعرا نے اپنے معرکۃ الآرا قصیدون مین انہی لوگون کی تعریف کی ہے، جو تعریف کے مستحق ہین، بہادرون کی تعریف کی گئی ہے، کہ میدان جنگ مین اپنی ذاتی تعریف سنکر ان کے حوصلے بڑھین، اور وہ قوم

کی خاطر فتح حاصل کرین، امیرون اور سردارون کی تعریف کی گئی ہے، کہ ان کے قابل تقلید نمونے دوسرون کے لئے شمع ہدایت کا کام دین، شاعرون کی تعریف کی گئی ہو کہ وہ تخلیقی آرٹ کے قابل تقلید نمونون کے موجد قوم یا قبیلہ کی عزت اور فطرت کے ترجمان تھے، ان قصیدون مین رزم اور بزم کے وہ مناظر ہین، کہ ہر جگہ زندگی کی لہرین کروٹ بدلتی نظر آتی ہین یہ تخلیقی آرٹ کے نمونے ہین،

غزل کی طرف نظر ڈالئے تو صرف ان شاعرون کو غزل گو پائین گے، جو واقعی عشق و عاشقی کی وادی مین نام پا چکے تھے، ان کی شاعری خود ان کے جذبات کا آئینہ ہے، اس مین رسم و تقلید نہین، عرب مین شعر و ادب کے سرچشمے کے یہ سوتے پاک و صاف تھے، لیکن ایران پہنچکر ان کی نوعیت بدل گئی،

ایران کی فتح کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ عربون نے اگرچہ سیاسی اعتبار سے ایران کو فتح کر لیا، لیکن ذہنی اعتبار سے ایران نے ہی مسلمانون پر فتح پائی، ان کے فلسفہ جد و جہد کی جگہ نفی خودی اور بے عملی کی تلقین کیجانے لگی، اور جب قوم کی زندگی پر سکون کا افسون طاری ہوا تو شعر و ادب کی نزع کا وقت بھی قریب آگیا، اور بہت جلد تخلیقی آرٹ کی جگہ صرف تقلیدی آرٹ رہ گیا، یہ کیا تھا؟ رسمی شاعری جو باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو ورثہ مین ملتی رہی' بندھے ٹکے جذبات، اور ان کے ادا کے مخصوص انداز اور اسالیب' پیش پا افتادہ مضامین، پرانی تشبیہات اور پامال استعارات کے الٹ پھیر کا نام شاعری رہ گیا،

اردو نے اسی رسمی فارسی شاعری کی گود مین آنکھ کھولی، ابتدائی دور مین ہندوستان کے فارسی گو شعراء جو خود رسمی فارسی شاعری کے علمبردار تھے، محض تفنن طبع کے لئے "بزبان ریختہ گاہے گاہے فکر می نمودند" ظاہر ہے کہ ان شعراء سے اردو مین بھی وہی مضامین ادا ہوتے ہونگے جو فارسی شاعری میں عام تھے، دوسرے دور مین دکھنی ادب کو فروغ ہوا، اور کہین کہین

فارسی شاعری کی ابتدا، کر ساتھ ہندی شاعری کے اثرات بھی مل گئے، لیکن شاعری کے عام مذاق مین کوئی تبدیلی نہین ہوئی، اس کا ایک عام اثر یہی ہے، کہ ابتدائی دکھنی ادب مین مثنویون کی تعداد بہت ہے، اور سوا سے چند مثنویون کے باقی تمام قصے فارسی کی مشہور مثنویون کے تراجم یا ان کا خلاصہ ہین، تشبیہات اور استعارات مین بھی دکن والون نے کہین کہین ملکی شاعری سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن دکنی ادب کا کوئی شاہکار جو تخلیقی آرٹ کا نمونہ کہا جا سکے، اب تک ہماری نظر سے نہیں گذرا،

تیسرے دور مین شمالی ہند مین دلی کی بزم شاعری گرم ہے لیکن یہان کے شعرا بھی فارسی کی تقلید بیجا مین گرفتار ہین، اور حالی نے اپنے مرثیہ مقدمہ شعر و شاعری مین انہی کا ماتم کیا ہے، چوتھے دور مین لکھنؤ کے شاعر اپنی محفل جماتے ہین، اور ایک اعتبار سے یہ دلی والون سے بہتر ہین، ان مین تھوڑا بہت تخلیقی جذبہ کارفرما ہے، کیونکہ سلطنت اودھ کی ابتدا ہے، اور علوم قدیمہ کے احیار کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی دوسرا رنگ دینا مقصود ہے، لیکن اودھ کے ماحول اور معاشرت نے ان شاعرون کو نقصان پہنچایا، اور یہ راہ بھٹک کر ریختی، ہرزہ گوئی، اور ضلع جگت کی گلیون مین جا نکلے، لیکن ان مین سے بعض نے واقعی تخلیقی آرٹ کے نمونے پیش کئے، جو نادر اور عدیم المثال ہین، ایسے جواہر انیس اور محسن کے کلام مین بالعموم پائے جاتے ہین،

محسن کاکوروی کا کلام دبستان لکھنؤ کی پیداوار ہونے کے باوجود لکھنؤ کے عام رنگ سے جدا ہے، ان کا موضوع نعت ہے، جس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہین ہے، موضوع کا احترام کلام کی بے کیفی و بے رونقی کی پردہ پوشی کرتا ہے، نقاد کو نعت گو سے باز پرس کرنے مین تامل ہوتا ہے، دوسری طرف نعت گو کو اپنی فنی کمزوری چھپانے کیلئے نعت کا پردہ بھی بہت آسانی سے مل جاتا ہے، شاعر ہر مرحلہ پر اپنے معتقدات کی آڑ پکڑتا ہے، اور نقاد جہان کا تہان رہجاتا ہے لیکن نعت گوئی کی فضا جتنی وسیع ہے، اتنی ہی اس مین پرواز مشکل ہے، ہر پرواز سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا

کہ فضا ساز گار بھی ملے گی یا نہین، اگر ہمت پرواز مشکل مقام پر پہنچا دے تو بھی اڑنے والے کا یہ کمال ہونا چاہئے، کہ وہ عافیت اور کامیابی کے ساتھ وہان سے گذر جائے، ان امور کو مدنظر رکھکر جب ہم محسن کا مطالعہ کرتے ہین، تو معلوم ہوتا ہے، کہ نعت کی وسیع فضاین انھون نے خوب خوب پرواز کی ہے، اور بڑے مشکل مقامات بھی انھون نے انتہائی خوبی و خوبصورتی کے ساتھ طے کئے ہین، مضمون مین موضوع کے اعتبار سے جدت، اسلامی تصوف اور ہندی روحانیت کا امتزاج، حدیث اور عقائد کی صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذاق شاعرانہ کے ساتھ نکتہ آفرینی خلوص و محبت کے اظہار مین تہذیب و متانت کا پاس ان کے کلام کی عام خوبیان ہین، اس کے پورا کلام ہموار اور شگفتہ، مضمون بلند، زبان تسنیم و کوثر کی دھلی ہوئی، بندش چست، مثنویون مین قصیدون کی سی شان و شوکت، تشبیب و گریز کے کمالات ایسی خصوصیات ہین، جو شاید ہی معاصرانہ شاعری مین مل سکین، ان سب کے علاوہ ایک امتیاز جو تنہا محسن کو شاعرون کی صف اوّل مین بٹھا سکتا ہے، ان کی تشبیہات کا ہے، ان کے کلام کا مجموعہ مختصر ہے لیکن اس مین انھون نے تشبیہ و استعارہ کی وہ داد دی ہے، جو توصیف و تعریف سے مستغنی ہے،

محسن کی نعت مین تخلیقی شان پائی جاتی ہے، یہ اسلئے کہ نعت گوئی اگرچہ ہمیشہ سے موجود تھی، لیکن اسے فن کی حیثیت سے کسی اور شاعر نے محسن سے پہلے اختیار نہین کیا اور جن لوگون نے عقیدت کی بنا پر صرف نعت گوئی کو اپنا شعار بنایا، انھون نے کوئی شاعرانہ کمال پیدا نہیں کیا، شعراء کے اردو و فارسی کے جتنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکرے اور تاریخین راقم السطور کی نظر سے گذرین، ان مین ایسے شعراء کا حال دستیاب نہیں ہوا، جن کا مسلک شعری نعت گوئی رہا ہو، اسی ایک بات کو ملحوظ رکھین تو بھی محسن کا درجہ اس سے کہین بلند ہو جاتا ہے، جو اب تک انھیں دیا جاتا رہا ہے،

محسن سے پہلے عربی اور فارسی شاعری کے سرمایہ مین نعت گوئی مفقود نہیں ہے، البتہ مقدار وخوبی کے اعتبار سے اُسے ادب مین کوئی ممتاز درجہ حاصل نہین ہے، غزل گویون نے بالعموم اپنے دواوین اور کلیات کی ابتدا حمد سے کی ہے، اور حمد کے بعد عموماً نعت اور اکثر اوقات منقبت کو جگہ دی ہی، لیکن یہ چیز کلیۃً رسمی تھی، چنانچہ ہندوستان کے ہندو شعرا جو فارسی اور اردو مین طبع آزمائی کیا کرتے تھے، ان کے کلام مین بھی حمد و نعت اور منقبت کے نمونے موجود ہین،

نعت گو شعرا کی دوسری قسم ان لوگون کی ہے، جو شاعر نہیں تھے، اور نہ کبھی شاعرانہ کمال کے مدعی ہوئے، ایسے شعرا بالعموم مسلمان تھے، جن کو رسول کریمؐ کے ساتھ والہانہ الفت تھی، فارسی شعرا سے قطع نظر اردو مین ایسے لوگون کی کافی تعداد موجود ہے، شہیدی اور اکبر کا نعتیہ کلام عام طور پر میلاد کی مجلسون مین پڑھا جاتا ہے، اور سننے والون کے جذبات موقع کی مناسبت سے تھوڑی دیر کے لئے سامعین کے قلوب میں اتر جاتے ہین، ان کے علاوہ اسی قبیل کے بعض اور نعت گو شاعر ہوئے ہین جن کی طرف عام طور پر توجہ نہین کی گئی ہے، خود راقم الحروف کے وطن مین دلدار علی صاحب مذاق ایک صوفی بزرگ گزرے ہین، آپ کا مزار اب تک مرجع خلائق ہے، اور ہر سال مجلس عرس کا انعقاد ہوتا ہے، آپ کا مکمل دیوان موجود ہے، عوام آپ کو مذاق میان کہتے ہین، اور آپ کا نعتیہ کلام بڑے ذوق و شوق سے سنتے اور سُناتے ہین، دوسرے نامور کرنہ کا نعتیہ کلام بھی مشہور ہے، ایک اور بزرگ کے کلام کا قدیم مطبوعہ نسخہ راقم السطور کو دستیاب ہوا ہے، ان کا نام مولوی محمد حسین اور تخلص نقیر تھا، ان کے کلام کا مجموعہ "تحفۂ نقیر" کے نام سے باہتمام منشی شادی لال مطبع ذریب کاشی مین چھپا تھا، سنہ طباعت و سنہ تصنیف ۱۸۹۵ء ہے، یہ مختصر مجموعہ جو ۴۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، غزلون، مسدس اور تضمینون پر مشتمل ہے، اسی زمانہ مین ایک اور گمنام شاعر گذرے ہین، جن کا مجموعۂ کلام "نعت رضوان نعت" کے نام سے راقم السطور نے اپنے اوائل عمر مین دیکھا تھا،

ان کا نام حکیم سید فضل حق اور تخلص فضل تھا، یہ منشی کرپا لال ساقی کے شاگرد اور قصبہ انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، یہ مجموعہ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور ۱۲۹۵ھ ہجری کے قریب زمانہ کی تصنیف ہے،

محسن سے پہلے نعت گوئی کو مستقل فن یا مسلک کی حیثیت سے کسی اردو شاعر نے اختیار نہیں کیا، اور نہ نعت گو شعراء کی طرف کسی نے توجہ کی، محسن نے جب ہوش سنبھالا اور شاعری شروع کی، تو ادب کا تقلیدی دور تھا، یہ ان کا کمال کہئے کہ وہ ان دشواریوں سے گذر کر نعت گوئی کی معراج کمال پر پہونچے،

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ شعر و شاعری میں محسن لکھنؤ کے دبستان ادب سے تعلق رکھتے ہیں، لکھنوی شعراء نے بعض اصناف سخن میں ایسی ترقی کی کہ اسے بھی تخلیقی کا رنگ دیدیا، انیس سے پہلے مرثیہ گوئی کی وہ شہرت اور عظمت نہیں تھی، جو انیس و دبیر کے کارناموں کی بدولت حاصل ہوئی، بلاشبہ ان دونوں کی شاعری میں بعض نوادر ملتے ہیں، اور یہ صحیح ہے کہ انیس و دبیر سے پہلے کسی مرثیہ گو شاعر کو یہ پایہ نصیب نہیں ہوا تھا، لیکن مرثیہ گوئی بحیثیت فن عرصہ سے رائج تھی، یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ ان لوگوں سے پہلے مرثیہ کا مقصد محض رونا یا رلانا تھا، سودا نے اس کی تردید کی ہے، اور بحیثیت فن اسے بہت مشکل بتایا ہے، سودا سے بہت پہلے دکن میں بھی اس کا رواج تھا، میر انیس کا کمال مرثیہ نگاری مسلّم لیکن اس فن میں خود ان کے والد میر خلیق بہت اونچے پایہ پر ہیں، بلکہ بعض اہل نظر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بعض مرثیوں میں یہ دھوکا ہوتا ہے، کہ کس کا کہا ہوا ہے،

مرثیہ گوئی کی فنی ترقی دراصل ایران میں ہی شروع ہو گئی تھی، شاہان صفویہ میں شاہ طہماسپ کو ائمہ اور اہل بیت کرام سے بڑی الفت تھی، اور اسی کے اشارہ پر درباری شعراء نے سلاطین کی مدح و ثنا کو چھوڑ کر اہل بیت کرام کی تعریف اور مصائب کربلا کے بیان کو

اپنا فن قرار دیا، اس سلسلہ مین سب سے زیادہ شہرت محتشم کاشی کو حاصل ہوئی جس کا ہفت بند اپنی خوبیون مین بے نظیر ہے، محتشم کی پیروی اور تقلید دوسرے شعرا نے کی اور مرثیہ کو مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی، اور مرثیہ کے بہت سے اصناف پیدا ہوگئے،

ہندوستان مین مرثیہ گوئی اردو کے ابتدائی دور مین ہی شروع ہوگئی، چنانچہ دکن مین بیجا پور اور گولکنڈہ کے شیعہ سلاطین کی بدولت دکن کے شعرا نے مرثیہ گوئی پر خاص توجہ کی، دکنی شعرا کے مراثی عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے، لیکن ان مراثی کی جو بیاضین یورپ کے کتب خانون مین محفوظ ہین، انکے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صنف کو دکن مین بڑا رواج ہوا، دکھنی مخطوطات کے مؤلف کا بھی یہی خیال ہے، کہ جس طرح دکن کے شعرا نے کم از کم ایک دو مثنویان ضرور تصنیف یا ترجمہ کی ہین، اسی طرح کبھی نہ کبھی مرثیہ بھی ضرور کہا ہے[۱] اور یہ شاید اس وجہ سے کہ ان کے مربی اور محسن سلاطین اثنا عشری تھے، ظاہر ہے، اس دور مین مرثیہ کا بڑا سرمایہ بہم پہونچا ہوگا لیکن دست برد زمانہ سے نہ بچ سکا،

اس کے بعد شمالی ہند کے شعرا مین سودا سے پہلے کم از کم میان مسکین اور سکندر مشہور مرثیہ گو گذرے ہین، سودا نے اپنے "شہر آشوب" مین میان مسکین کے کمال کی طرف اشارہ کیا ہے،

اقساط حمل ہو تو کہین مرثیہ ایسا،
پھر کوئی نہ پوچھے میان مسکین کہان ہے،

سودا نے خود فن مرثیہ گوئی کی ترقی مین پہلا قدم اٹھایا، اور مرثیہ کو مسدس کے طرز مین لکھکر وسعت پیدا کی، میر تقی میر نے بھی مرثیہ مین طبع آزمائی کی، میر ضاحک اور میر حسن کے مراثی

---

[۱] یورپ مین دکھنی مخطوطات نصیر الدین ہاشمی،

عام طور پر دستیاب نہین ہوتے، لیکن انیس کا یہ مصرعہ

پانچوین پشت ہے شبیر کی مداحی مین،

صاف بول رہا ہے کہ میر حسن صاحب مثنوی نے بھی ضرور مرثیہ کہا ہوگا،

ایک اہم نکتہ اس موقع پر قابل غور ہے، مرثیہ کے متعلق سودا نے صاف لکھا ہے کہ اس کا مقصد محض گریہ و بکا نہین، بلکہ یہ ایک مشکل فن ہے" پس لازم ہے کہ مرثیہ در نظر رکھکر مرثیہ لکھوے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئین ماخوذ کرے" اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا، کہ انیس سے پہلے مرثیہ گوئی بحیثیت فن مروج تھی، انیس سے پہلے بھی خلیق، ضمیر، دلگیر اور دبیر نے اس فن کو اپنی اصلاح و اضافہ سے ترقی بخشی، انیس نے اپنی خداداد صلاحیتون کو بروئے کار لاکر اسے معراج پر پہنچا دیا، لیکن اس فن مین انھین تخلیقی فن کار کا درجہ دینا بہت مشکل ہے، البتہ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ مرثیہ تخلیقی فن کے نمونے کی حیثیت سے لکھنوی دبستان ادب مین موجود نہین، اور اسی لئے محسن کا نعتیہ کلام بے نظیر ہے،

لکھنوی شاعری کے فریم مین محسن کی تصویر

لکھنو کے دبستان ادب کے ساتھ بعض خصوصی امتیازات وابستہ ہین، ان مین سب سے اہم شاعری مین خارجی پہلو کا بیان ہے، متقدمین شعرائے دکن اور دلی کے ہان شعر کی بنیاد بالعموم جذبات پر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار مین روحانیت کے جذبات بھی موجود ہین، اسی نے میر اور درد کے کلام کو غیر فانی بنا دیا ہے، شام وسحر کی لاکھون کروٹین بدلین اور بدلتی رہین گی، لیکن انسان کے جذبات عشق و محبت، سوز اور درد، کسک اور تڑپ نہ کبھی بدلے ہین، اور نہ بدل سکتے ہین، ظاہر ہے کہ ایسے اشعار جن مین یہ مضامین نظم ہون گے ہمیشہ زندہ رہین گے، لیکن شاعری کو جذبات سے علٰحدہ کرکے الفاظ کا کھلونا بنا لیا جائے، جس سے شاعر دل بہلائین، اور صنعت گری کے نمونے پیش کرین، تو ایسی شاعری کو ثبات نہین، شاع

جذبات کے اظہار مین صنعت گری کو دخل دینے پر مجبور ضرور ہے لیکن نری صنعت گری کو شاعری قرار دینا روا نہین، اور نہ اس نوع کی شاعری کو ہمیشگی نصیب ہو سکتی ہے، لکھنو کی قدیم شاعری بالعموم صنعت گری کے سہارے قائم رہی، اور یہی سبب ہے کہ وہان کے شعرار کی دماغی کاوشون کو لوگ اس نظر سے نہیں دیکھتے جس نظر سے دبستانِ لکھنؤ کے پیرو اس کا دیکھا جانا پسند کرتے ہین،

برخلاف اس کے محسن کا کلام جذبات کی غیر فانی بنیادون پر استوار ہے، خلوص اور محبت شیفتگی اور عقیدت جو محسن کی زندگی کے عناصر تھے، انہی سے ان کی شاعری نے ترکیب پائی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اب بھی اس مین معنوی دلکشی پائی جاتی ہے، اس اعتبار سے لکھنوی شعرار مین محسن اپنی آپ مثال ہین،

لکھنویت کا دوسرا اہم عنصر نسائیت ہے، جو لکھنوی معاشرت کے ہر پہلو سے جھلکتا ہے، بیشتر فرمانروایانِ اودھ کو مہ جبینون سے بڑا لگاؤ تھا، پھر امرا، اور دیگر آسودہ حال طبقون پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا، ظاہر ہے، یہ اثر رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہو گیا، مردون نے عورتون کی بولی مین ان کے جذبات ادا کئے جس مین انھون نے اپنے دور کی عکاسی کی، اس کی بدولت بعض ایسی مستقل اصنافِ سخن پیدا ہوئین، جو شاعری کے روشن چہرہ پر کسی طرح زیب نہین دیتین، اس قسم کی باتین نعت مین دخل نہین پا سکتی تھین، لیکن تعجب یہ ہے کہ نعت خود کس طرح یہان کی شعروشاعری مین دخل پا سکی، وہ بھی ایسی نعت اور ایسا نعت گو، جو ہر اعتبار سے ممتاز و منفرد ہے،

لکھنویت کا تیسرا اہم عنصر ابتذال ہے، جو مذکورالصدر دونون عناصر سے ترکیب پا کر ظہور مین آیا، یہ پہلو بعض اوقات اس درجہ نمایان ہو گیا ہے کہ اسے بالعموم لکھنویت کا مترادف سمجھا

جاتا ہے، یہ خامیاں بعض لکھنوی شعراء کے ہاں کم اور بعض کے ہاں نسبتاً زیادہ ہیں لیکن ایسی مثال شاذ ہی ملے گی، جو اس سے محفوظ ہو، اور یہ چیز مضمون اور بیان دونوں میں موجود ہے، محسن کا موضوع خاص نعت تھا، جس کے مقدس و بہتم بالشان ہونے میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا، زبان ہمیشہ موضوع کی مناسبت سے ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محسن کی زبان بھی دلکش اور پاکیزہ ہے،

لکھنویت کا ایک اور اہم عنصر صنعت گری ہے، جس کے شوق میں لکھنو والوں نے رعایت لفظی اور ضلع جگت میں کمال پیدا کیا، لکھنو کے بعض اچھے اچھے شاعروں کو اسی شوق نے بدنام کر دیا، امانت جن کی قادر الکلامی میں کوئی شبہہ نہیں، اور آتش جن کے کمالات مسلّم ہیں، اسی بھنور میں پھنس گئے، بعض نے اسمیں اعتدال کو ملحوظ رکھکر تنگی پیدا نہ ہونے دی، اگرچہ ان کے ہاں بھی آورد نے کلام کو پھیکا اور بے مزہ کر دیا ہے، لیکن ایسے لوگ نسبتاً قابلِ معافی ہیں، انیس کم اور دبیر زیادہ اس قسم میں شامل ہیں، ان کے ہاں صنائع و بدائع کلام کی خوبی کو دو بالا کرنے کیلئے اکثر موجود ہیں لیکن نہ ایسے کہ اکتا دینے والے ہوں،

محسن کا کلام بھی بلاشبہہ شاعرانہ صناعی کا نادر نمونہ ہے، تشبیہات، استعارات، کنایے مضمون اور معنی آفرینی سب صنعت گری میں داخل ہیں، اور اس اعتبار سے انھیں آورد اور تصنع سمجھنا چاہئے، لیکن یہ محسن کا کمالِ شاعرانہ ہے، کہ ان کی آورد بھی کلام میں زور لاکر آمد کا لطف پیدا کر دیتی ہے، تشبیہات، استعارات، اور کنایے آسانی سے فہم کے قابو میں آجاتے ہیں، مضمون آفرینی میں تخیل پرواز کرکے آسمانوں میں غائب نہیں ہوجاتا، صنعت گری کی نمایش اور بھرمار کا شوق پڑھنے والے کے لئے وبالِ جان نہیں بن جاتے، اور مضمون سے علحدہ ہو کر محض صنعت برائے صنعت کا عیب بھی نہیں ملتا، یہ چیز بھی محسن کو ان کے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے،

با این ہمہ لکھنو نے اصلاحِ زبان کی جو کوشش کی ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی

ہو گی، زبان کا تعلق انسانوں سے ہے، اور انسان کی زندگی کی طرح زبان بھی ارتقا پذیر ہے، آج اردوے قدیم کو جس کا نام دکنی ہے، صحت کیساتھ پڑھنا اور سمجھنا دشوار ہے، ولی نے اسی دکنی کو اردوے معلیٰ شاہجہان آباد کے موافق اور مطابق کرکے اس کی اصلاح کی، میر وسودا نے اسی محنت کرکے وہ زبان تیار کی جو لکھنؤ مین شعروادب کی محفل کے قیام تک ٹکسالی اور مستند سمجھی جاتی رہی، تاہم اس مین بعض الفاظ اور محاورے ثقیل تھے،

لکھنؤ والون نے جو بالطبع نفاست پسند تھے، زبان کو لطیف اور لچکدار بنا دیا، اس سلسلہ مین ناسخ نے سب سے زیادہ زبان کی خدمت کی جس کا اثر دہلی والون پر بھی ہوا، اور متقدمین کی کی جو باتین لکھنؤ والون نے ترک کی تھین، اساتذۂ دہلی نے بھی عموماً ترک کر دین،

یہی وجہ ہے کہ لکھنوی شاعری ظاہری حسن وزیور کے اعتبار سے عام طور پر متقدمین کی شاعری سے بہتر ہے، زبان کی صفائی، بندش کی چستی، محاورہ اور طرزِ ادا کا زور، لکھنؤ کے شعرا کے ہان عام طور پر موجود ہے، محسن بھی اس مین برابر کے شریک ہین،

اب تک ان امتیازات سے بحث تھی، جن مین لکھنؤ کے بیشتر اساتذہ شریک ہین، لیکن جیسا کہ مذکور ہوا محسن کی انفرادی شان اور ان کا اپنا خاص رنگ بھی ہر جگہ نمایان رہتا ہے، ان مین سب سے اہم خلوص ومحبت ہے، نعت گوئی ایک طرح کی قصیدہ گوئی ہے، قصیدہ کے باکمالون نے اس صنف مین خوب خوب دادِ کمال دی ہے، تخیل کی پرواز، الفاظ کی شان وشوکت، تشبیہات واستعارات کی بلندی، تشبیب وگریز کی جدت سے ان باکمالون نے قصیدے کو ایک دقیق فن بنا دیا تھا، لیکن قصیدے کی بنیاد بیشتر صلۂ دنیوی پر ہے، شاعرون کو قصیدہ لکھتے وقت بالعموم صلہ کا خیال رہتا تھا جس نے ان کے دل سے خلوص اور صداقت کو محو کر دیا، مدح کے مقررہ مضامین، اس مین مبالغہ کی کثرت، طرح طرح سے اظہارِ مطلب اور کوشش کرکے ممدوح کو

صلہ عطا کرنے پر آمادہ کرنا ان شاعرون کا کام رہ گیا تھا، ان مین اکثر ایسے بھی تھے، جو صلہ نہ پاکر ہجو تیار رکھتے تھے جس کو فی البدیہہ سُنا دینے مین ذرا تامل نہین کرتے تھے، اسی لئے ان قصیدون مین اصلیت اور جوش کا فقدان ہے،

محسن کا کلام اس حیثیت سے قابلِ قدر ہے، کہ اسکی بنیاد خلوص و محبت پر رکھی گئی ہے، محسن نے اپنی شاعری کو اپنی شہرت، عزت یا صلہ کا ذریعہ نہین بنایا، اپنی تمناؤن کا اظہار خود کس خوبی سے چراغِ کعبہ کے آخر مین کرتے ہین، رسولِ کریمؐ سے خطاب کرنے کے بعد لکھتے ہین :-

جس طرح ملا نوا پنے رب سے ‍ ‍ ‍ ‍ انداز سے شوق سے ادب سے

یون ہی ترے عاصیانِ مہجور، ‍ ‍ ‍ ‍ اک دن ہون تری لقا سے مسرور

صدقے مین ترے یہ آرزو ہے، ‍ ‍ ‍ ‍ دم مین کرین راہِ آخرت طے،

ہو حشر کا دن خوشی کی تمہید ‍ ‍ ‍ ‍ جس طرح سے صبحِ صادقِ عید

گزرے مری نعت کے سخن مین ‍ ‍ ‍ ‍ رکھی ہو یہ مثنوی کفن مین

پھولے پھلے گلشنِ تمنا، ‍ ‍ ‍ ‍ عقبیٰ مری پھل ہو پھول دنیا

یان شوق و خلوص و التجا ہو، ‍ ‍ ‍ ‍ وان مین ہون آپ ہون خدا ہو

مدیح خیر المرسلین کے آخر مین مناجات کا عنوان ہے،

محسن اب کیجئے گلزارِ مناجات کی سیر ‍ ‍ ‍ ‍ کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل،

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل ‍ ‍ ‍ ‍ میرے ایمانِ مفصل کا یہی ہے مجمل،

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی ‍ ‍ ‍ ‍ نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل،

دین و دنیا مین کسی کا نہ سہارا ہو مجھے ‍ ‍ ‍ ‍ صرف تیرا ہو بھروسہ تری قوت مرا بل،

ہو مرا ریشۂ امید وہ نخلِ سرسبز ‍ ‍ ‍ ‍ جسکی ہر شاخ مین ہو پھول ہر اک پھول مین پھل

آرزو ہی کہ رہے دھیان ترا تا دم مرگ شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح ہاتھ میں ہو لئے مستانہ قصیدہ یہ غزل

کہیں جبریل اشارہ سے کہ ہان بسم اللہ سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

ایک رباعی مین فرماتے ہین :-

بندہ کو نگاہ لطف مولا بس ہی حضرت کا مرے لئے وسیلہ بس ہی

مین مشت غبار ہون سہارا مجھکو داماں رسول مصطفےٰ کا بس ہی

یہ خلوص نعت کے علاوہ ان کی غزلون اور دیگر اصناف سخن مین بھی موجود ہے :-

لیکن صرف خلوص و محبت اور اصلیت و صداقت نے محسن کا پایہ بلند نہیں کیا، اس موقع پر یہ امر بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے، کہ ہر موقع پر شاعرانہ انداز بیان کو بڑی خوبی سے نباہا ہے اور ان دونون کے امتزاج نے ہی ان کے کلام کو پرکیف اور بااثر بنا دیا ہے، یہ امتیاز ان کے ابتدائی عمر کے کلام مین بھی موجود ہے، پہلا قصیدہ گلدستہ رحمت ہی، جو ۱۲۵۸ھ مین تصنیف ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف ۱۰ سال کی تھی، اس کا مطلع ہے :

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن غنچہ ہی نام خدا نافۂ آہوے ختن

اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہون :-

جملہ انبتہ اللہ نباتاً حسناً ان دنون فصل بہاری مین ہی طغرائے چمن

رشک شمشاد اگا کرتے ہین نخل قامت سرو گلزار زمین پر جو ہوا سایہ فگن

خط گلزار ہوا جس نے لکھا خط غبار ہوگیا کاغذ مکتوب زمین گلشن

دوسرا مطلع ہے،

ہان مین مفتون ہون اسی رشک چمن کا کہ چمن جسکی صورت سے سدا خار ندامت در تن

اسکو بیجا ہے گلستان کا مشبہ کہنا کہئے کیسے کہ وہ ہے لالہ رخ و نسرین تن

پورے قصیدہ مین وہ تمام خوبیان جو اچھے قصیدہ گو شعرا کے کلام کا زیور ہین، اس مین جھلکتی ملین گی، کمال شاعرانہ کی تفصیل آگے آئیگی۔

محسن کے نعتیہ کلام مین سب سے زیادہ شہرت ان کے مشہور قصیدہ مدیح خیر المرسلین کو نصیب ہوئی، جو ۱۲۹۳ھ مین تصنیف ہوا، اسی ایک قصیدہ کو سامنے رکھکر محسن کے کلام کا جائزہ لیا جائے، تو بھی ان کی شاعرانہ خوبیان نمایان ہوجاتی ہین، قصیدہ نعت مین ہے، لیکن اس کا مطلع ہے،

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

اس کے بعد تشبیب مین متھرا، گوکل، کنھیا اور گوپیون کا ذکر کیا ہے، بعض حضرات نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ نعت رسول اکرمؐ کے سلسلہ مین ان چیزون کا بیان بے موقع اور بے محل معلوم ہوتا ہے، اس اعتراض کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے، کہ یہ نظم قصیدے کی صنف سے تعلق رکھتی ہے، اور قصیدے مین تشبیب کے مضمون کی قید نہین، کہین ذکر شباب ہے لیکن تو کہین مضامین عشقیہ کا بیان، کہین شکایت زمانہ ہے اور کہین اپنے حال کا رونا، کسی نے خاص مضمون کی غزل لکھدی ہے، اور کسی نے متفرق مضامین کی غزل، اور بعض ایسے قصیدے بھی موجود ہین، جن میں تشبیب موجود ہی نہین ہے، عربی شاعری مین اس قسم کی بکثرت مثالین موجود ہین،

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تشبیب کے پڑھنے کے بعد گریز کا مضمون دیکھکر کسی اعتراض کی گنجایش باقی نہین رہتی، محسن نے خود اسی جواب کو تفصیل کے ساتھ نظم کرتے ہوے لکھا ہے :-

پڑھنے تشبیب مسلمان مع تمہید و گریز رجعت کفر با یمان کا کرے مسئلہ حل

کفر کا خاتمہ با لخیر ہوا ایمان پر، شب کا خورشید کے اشراق سو تفصیل

چشم انصاف سو دیکھو تو قصیدہ کی تشبیب نیم رُخ تھی اسی رنگت سو ہوئی مستقبل

ظلمت اور اس کے مکار ہیں جو طولِ سخن گر ایمان کی کہئے تو اسی کا تھا محل

غلبہ و سطوتِ ظلمت کے بیان مین مضمر شوکت اس نور کی ہو جس نے کیا مستاصل

کفر و ظلمت کو کہا کس نے کہ ہو دینِ خدا مے و نغمہ کو کہا کس نے کہ ہو حسنِ عمل

مدعا یہ ہو کہ اندوہ کی سیہ بختی سے، ظلمتِ کفر کا جب دہر مین چھایا بادل

ق

ہوا مبعوث نفقا اس کو مٹانے کیلئے سیفِ مسلولِ خدا نورِ نبی مرسل

مہرِ توحید کی ضو اوجِ شرف کا مہِ نو شمعِ ایجاد کی لَو بزمِ رسالت کا کنول

اسے دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بجائے عیب کے اس مین ایک خوبی مضمر ہے،

پڑھنے والے کو اسلامی تصوف اور ہندی تخیل کا سنگم نظر آتا ہے، جو لوگ سری کرشن کی داستان

عشق اور اس رومانی فضا سے آشنا ہین، جو ان کے وجود سے برج کے علاقہ مین موجود تھی،

وہ اس کی تاثیر کو خوب محسوس کرتے ہون گے، ہمارے ناقدین نے ہماری عام شاعری پر یہ

اعتراض کیا ہے، کہ ہندوستان مین رہ کر بھی ہمارے شاعرون کا تخیل عرب کے بے برگ و گیاہ

صحراؤن اور ایران کے نغمہ زار و سبزہ زار و جوئبار زمین بھٹکتا پھرتا ہے، وہی تشبیہات استعارات

اور تلمیحات جو متقدمین شعرائے فارس کے یہان عام ہین، وہی ان کا ورثہ ہین، لیکن چونکہ

ان کا تعلق براہِ راست ایران کی سرزمین تاریخ یا خاص ایرانی تہذیب و معاشرت سے ہے،

اس لئے ہندوستانی شاعری مین جس کے مطالب ہندوستانی ہین، ان کا شمول لطف کو دوبالا

کرنے کے بجائے شاعری کو بے مزہ بنا دیتا ہے، سری کرشن کی داستانِ حیات رومان و محبت

کی کہانی ہے لیکن اس مین ابتذال، رکاکت اور سوقیانہ حالات و واقعات کا شائبہ نہین، بلکہ ہر جگہ خلوص و عقیدت، مذہبیت اور احترام کی جھلک زیادہ ہے، چونکہ ہندوستانی عام طور پر اس قصہ سے واقف ہین، اور بعض رسمین اور تہوار ابھی تک ان پرانے واقعات کی یاد تازہ رکھنے کے لئے منائے جاتے ہین، اس لئے تشبیب مین ان کے ذکر سے رومانی فضا پیدا ہوگئی ہے، جو اثر سے لبریز ہے، کسی اور مضمون سے یہ کیفیت یا تشبیب مین یہ زور پیدا کرنا مشکل تھا،

مضمون کے اعتبار سے اس قصیدے اور محسن کی شاعری کے دوسرے کارنامون کو پرکھئے، تو ان مین سب سے ممتاز صنعت جدت کی نظر آئے گی، جیسا کہ مذکور ہوا، ہماری شاعری بالعموم تقلیدی ہے، اور ہمارے شاعر تقلیدی آرٹسٹ، غزل مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غرض ہر صنف کے مخصوص مضامین پیدا ہوگئے تھے، بقول حالی یہی ہزار بار کی چچوڑی ہوئی ہڈیان تھیں، جو ہمارے شاعرون کے لئے سرمایۂ افتخار بنی ہوئی تھین، محسن کے معاصرین بھی اس رسمی اور تقلیدی شاعری کے چکر سے آزاد نہ ہو سکے، اسی لئے ان کے یہان ہجر و وصال کی داستانین، شکوے شکایتین، خاص خاص حکایتین، گل و بلبل کے مضامین، مے و مینا کی گردش سے پرانے زمانہ کی یادگارون کا ایک عجائب خانہ نظر آتا ہے، جو رفتہ رفتہ اصلیت سے دور اور ابتذال و رکاکت سے قریب تر آگیا، لیکن محسن نے اپنے دامن کو انہی پھولون سے بھرا، ہی ایک قصیدے کی تشبیب کے مضامین ملاحظہ ہون،

کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہ نو کی کشتی	بحر اخضر مین تلاطم سے پڑی ہے ہلچل
شاہد کفر ہے کھڑے سر اٹھائے گھونگھٹ	چشم کافر مین لگائے ہوئے کافر کاجل
جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبوت	یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیان	لوگ کہتے ہین کہ کرتے ہین فرنگی کونسل

صاف آمادۂ پرواز ہو شاماکی طرح پرلگائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل
خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل رنگ مین آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل
شاہد گل کالئے ساتھ ہے ڈولا بادل برق کہتی ہے مبارک تجھے سہرا بادل
جبتلک برج مین جمنا ہے یہ کھلنے کا نہین ہے قسم کھائے اٹھائے ہوئے گنگا بادل
راجہ اندر ہے پریخانۂ مئے کا پانی نغمہ نئے کا سری کرشن کنھیا بادل

ایسی نرالی تشبیب آپ کو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہان تلاش سے بھی نہیں ملی گی، ذوقؔ و سوداؔ قصیدے کے بادشاہ ہین لیکن ان کی کسی تشبیب مین ایسی جدت اور زور نہین، یہ مضامین تشبیہات، استعارات اور خیالات جو خالص ہندوستانی فضا کی پیداوار ہین محسنؔ ہی کا حصہ ہین، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ محسنؔ کی پاکیزہ طبیعت عوام کی پامال شاہراہ سے بچکر اپنا راستہ الگ بنانا چاہتی تھی، یہی وجہ ہے کہ انھون نے سرزمین نعت مین اپنی جدت پسندی سے رنگ رنگ کے پھولون کا ایک گلزار کھلا دیا ہی،

جدت پسند طبیعت سے ہی مضمون آفرینی کا سلسلہ ملتا ہے، ایرانی شعرا نے اپنی تخیل سے مضمون آفرینی کے نوادر پیش کئے ہین لیکن اکثر مضمون آفرینی کے شوق مین کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق بھٹک کر بہت دور نکل گئے ہین، ہندوستان کے فارسی گو شعرا مین بیدلؔ اور ان کی تقلید مین اردو شعرا مین غالبؔ نے اس طرف بطور خاص توجہ کی، ابتداے عمر مین غالبؔ کا کلام اسی شوق کی بدولت مہملات سے جاملا تھا، جب عمر اور مشق نے اصلاح کا ہاتھ رکھا تو سلاست کے راستہ پر آگئے، غالبؔ کے علاوہ بعض اور جدت پسند شاعر اس طرف متوجہ ہوئے، جن مین مومنؔ نے بڑا نام پیدا کیا، لکھنؤ کی شاعری مین واردات قلب کو اساسی حیثیت نہیں دی گئی، بلکہ پورا زور صنعت گری پر صرف کیا گیا، اور اس شوق نے یہان تک ترقی کی، کہ

یہان کے بیشتر شعرا معمہ اور چیستان گوئی کی بھول بھلیان مین بھٹکنے لگے خیال آرائی اور مضمون آفرینی کا اکثر نتیجہ یہی دیکھا گیا ہے کہ شاعر چیستان اور معمے کہنے لگتا ہے، آخر عمر مین محسن کو بھی معمہ گوئی کا شوق پیدا ہوگیا تھا، لیکن ان کی عام شاعری اس عیب سے پاک ہے، اس مین مضمون آفرینی ہے، لیکن اعتدال کا دامن کہین ہاتھ سے نہین چھوٹا ہے، چند مثالون سے اوکی وضاحت ہوجائیگی،

جگنو پھرتے ہین جو گلبن مین تو آتی ہو نظر — مصحف گل کے حواشی پہ طلائی جدول

سبزۂ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا، — شہسوار عربی کے لئے کالا بادل

قبلۂ اہل نظر کعبۂ ابروے حضور، — موئے سر قبلہ کو گھیرے ہوے کالا بادل

مثنوی چراغ کعبہ مین اس قسم کی بے شمار مثالین ہین،

کاغذ مین سطور کا تسلسل — ہے کھیت مین چاندنی کے سنبل

شبدیز قلم کی شان اعلی — جنگل مین براق کے غزالا

تحریک انامل سخنگو — جبریل امین کا زور بازو

از رفعت من چہ پرسی — ہر حرف کی عرش پر ہی کرسی

شب معراج کا ذکر کرتے ہوئے کس خوبی سے نئے مضمون پیدا کئے ہین:-

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ مین وضو سے

اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام — شبنم کی ردا بقصد احرام

گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

کیا سعی صفا سے رنگ فق ہو، — سر سے پا تک عرق عرق ہے،

بے محرمون سے چھپائے چہرہ — پروین کو بنائے منہ کا سہرا،

خوشبو وہ کہ ہار یاسمن کے | لپٹے ہوئے بالوں میں دلھن کے
یا تازہ بسی ہوئی ختن کی | کلیاں یوسف کے پیرہن کی

براق کی صفت :-

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل | کھیت اس کا بہشت خلد جنگل
مہ پارہ فلک سے آنے والا | اطلس کو کتان بنانے والا
یوں چرخ سے نکلے وہ سبکرو | فانوس سے جس طرح کہ پرتو
شیشے سے پری چمن سے شبنم | سیپی سے گہر حباب سے دم

سراپائے رسول اکرمؐ کے سلسلہ مین بھی چند شعر دیکھئے :-

ابرو پہ جبین مہ شمائل | رکھی ہوئی رحل پر حمائل
واللیل کا ترجمہ ہے گیسو | تفسیر اذا سجیٰ ہے گیسو
جوہر کا بھرا ہوا خزینہ | آئینہ بے مثال سینہ
رعنائی قامت مناسب | روزہ مین اذان وقت مغرب

(باقی)

گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اُردو شعرار کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعرار کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہی، جس میں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لے کر حالی اور اکبر تک کے حالات، قیمت: للعہ ۴۸۵ صفحے،

"منیجر"

محسن کاکوروی

اور

ان کی خصوصیات

جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی بدایونی ایم اے لکچرار اردو یونیورسٹی علیگڈھ

(۲)

جدت پسند اور مضمون آفرین شاعروں کو اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے مبالغہ سے کام لینا پڑتا ہے، اکثر عام شاعر بھی اپنی دوکان سجاتے وقت اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، مبالغہ کو شاعری میں اس درجہ دخل ہے، کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مترادف سمجھا جانے لگا ہے، شاعر تخیل کی بلند پروازی میں اکثر دنیا کی حقیقتوں سے بہت دور نکل جاتا ہے لیکن محسن ایسا نہیں کرسکتے تھے، جہاں تک تعریف و توصیف کا تعلق ہے، ان کے ممدوح یعنی رسول اللہ صلعم کی ذاتِ پاک اتنے اوصافِ حمیدہ کی جامع ہے، کہ ان کے بیان میں مبالغہ کی ضرورت ہی نہیں، دوسرے انھوں نے حدیث اور قرآن کی روشنی کو ہمیشہ اپنے لئے شمعِ ہدایت بنایا ہے، بعض نعت گو شاعر محبت کے جوش میں اکثر ایسی باتیں کہہ گئے ہیں، جو مذہبی نقطۂ نظر سے ناروا ہیں، ان کا عذر یہ ہے کہ جوشِ محبت اور والہانہ شیفتگی کے عالم میں یہ سب کچھ کہا ہے، اس لئے وہ لائقِ معافی ہیں، لیکن محسن کو اس عذر اور معافی کی ضرورت نہیں پڑتی، ہمارے یہاں میلاد النبی صلعم کے سلسلہ میں جو مجالس منعقد ہوتی ہیں، ان میں نعت گو شعرا

کا کلام ہمیشہ پڑھا جاتا ہے اور ایسے ایسے اشعار پر لوگ وجد کرنے لگتے ہیں :۔

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے   لینا ہے ہمیں جو کچھ لے لیں گے محمدؐ سے

اس قسم کے اشعار میں شعراء نے حفظِ مراتب کو نظر انداز کر دیا ہے، اور بعض طبائع ایسی زیادتیوں کو کسی عنوان گوارا نہ کریں گی محسن کے یہاں والہانہ عشق اور محبت کے باوجود ایسی لغزشیں تلاش کرنے پر بھی نہیں ملیں گی، اپنے کلام میں انھوں نے جابجا قرآن اور حدیث کے ان مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے، جہاں سے ان کا مضمون ماخوذ ہے ایک مثال سے یہ واضح ہو جائے گا،

مثنوی چراغِ کعبہ میں معراج کے سلسلہ سے حضرت جبرئیلؑ کی آمد کا ذکر کیا ہے، چونکہ کسی حدیث میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت جبرئیلؑ نے حاضر ہو کر کیا عرض کیا تھا، اسلئے فرماتے ہیں :

آنا ہے طلب کا استعارہ   بروں کا ہے آمدن اشارہ

اور حاشیہ میں اسکی صراحت کر دی گئی ہے،

براق کی صفت میں ایک مصرعہ ہے ؎

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل

حدیث شریف میں بھی مذکور ہے کہ براق چھوٹے فرس کے برابر تھا افلاکِ اول کی سیر کے سلسلہ میں ایک شعر ہے،

وہ روزِ ازل کا سعدِ اکبر   وہ اول ما خلق کا مظہر

اسمیں اشارہ ہے حدیث شریف کی طرف "اَوّلُ مَاخلق اللہ نوری"،

فلکِ ششم کی سیر میں ایک شعر ہے،

تھا داغِ فراق لَنْ تَرَانِیْ مسرورِ وصال مَنْ رَاٰنی

اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف مَنْ رَاٰنی فَقَدْ رَای الحق"

فلک ہفتم کے سلسلہ مین حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایک شعر ہے،

کرتا تھا جو ہر رت میہمانی خوانِ یغماے من عصانی

اس مین اشارہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی دعا وَمَنْ عَصَانی فانک غفورٌ رحیم کی طرف،

مقام اعلیٰ کے بیان مین ایک شعر ہے،

آنکھون کی تلاش جلوۂ رب کانون مین صداے نحن اقرب

اس مین کلام مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے نحنُ اقربُ مِنْ حَبْلِ الوَرِیْد مثنوی کا

شفاعت و نجات مین بکثرت آیات کی طرف اشارے ہین،

ان چیزون سے محسن کی مذہبیت کا پتہ چلتا ہے، قرآن اور حدیث پر ان کی نظر تھی،

اس لئے حالات و واقعات کے بیان مین ان کا مضمون کبھی ان کے حدود سے باہر نہین نکلتا تھا،

لیکن اسی کے ساتھ فن شاعری کے ایسے کمالات کا اظہار کرتے تھے، کہ ان پابندیون کے باوجود کلام

مین زور اور تاثیر پیدا کر لیتے تھے، شاعری اور وعظ مین یہی فرق ہے، وعظ کی خشکی سے

سامعین گھبرا اٹھتے ہین، لیکن جب شعر کا ساز بجنے لگے، اور اس کے پردون سے وہی راگ

نکلے، جو پہلے واعظ کی زبان سے ادا ہو رہا تھا، تو سننے والے مسحور ہو جاتے ہین، انھون نے

اپنے کلام مین شاعری اور مذہب کے امتزاج کا ایسا مرقع پیش کیا ہے، کہ اس مادیت اور

الحاد کے دور مین بھی جس کی جاذبیت اور کشش باقی ہے،

مضمون کے اعتبار سے محسن کے کلام کی ایک خاص خوبی کا ذکر کرنا باقی رہ گیا، یہ انکی

تہذیب اور متانت ہے، لکھنو کی مخصوص انداز کی شاعری کی بدولت وہان کا پورا دبستان شعر

آج تک مطعون ہے، یہی وجہ ہے کہ لکھنو اپنے نامور سخنوروں کی فہرست مین پہلے ان شعرا کا نام رکھتا ہے، جن کا کلام اس دبستان کے دوسرے شعرار کے مقابلہ مین کہین زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے، لیکن معلوم نہیں اس موقع پر محسن کا نام کیون نظرانداز کردیا جاتا ہے حالانکہ تہذیب و متانت کے اعتبار سے محسن کی شاعری اپنی آپ نظیر ہے، اور مضمون زبان، تشبیہات اور استعارات ہر اعتبار سے اسکی ثقاہت اور تطہیر مسلم ہے،

انیس اور دبیر نے مرثیہ گوئی کے فن مین مجدد کا درجہ حاصل کیا، اور مرثیہ گوئی کو بڑا فروغ بخشا، فصاحت اور بلاغت کے بڑے بڑے معرکے سر کئے، لیکن فن کاری کے اعتبار سے یہ بات دل مین کھٹکتی ہے کہ مرثیون مین جہان کہین عرب کے مردون عورتون اور ان کے حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، وہان خالص لکھنوی تہذیب و معاشرت کا چربہ اتارا ہے، بہت سی وہ رسمین جو بیشتر ہندوستانی بلکہ بعض خالص ہندوانی ہین عربون کے کردار میں شامل کردی گئی ہین، جس سے کردار نگاری میں جگہ جگہ بھونڈاپن پیدا ہوگیا ہے، اور تاثیر کی فضا، کم ہوگئی ہے، لیکن محسن خالص ہندوستانی فضا کے شاعر ہین، اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہین، ان کے خیالات ان کی زبان، ان کی تشبیہات اور استعارات اسی ملک کی پیداوار ہین، اسی لئے ان مین اثر بھی زیادہ ہے،

مضمون کی بلندی اور فکر کی پرواز کے اعتبار سے بھی محسن کا کلام نادر ہے، قصیدہ مدیح خیرالمرسلین، مثنوی تجلی کعبہ اور چراغ کعبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ مضمون کی بلندی الفاظ کے شکوہ سے ہم پہلو و ہم آہنگ ہے، الفاظ کا حسنِ انتخاب قادرالکلامی کی دلیل ہے، مضمون کی مناسبت سے الفاظ کا صحیح استعمال اچھے شعر کے لئے ضروری شرط ہے، مثنوی چراغِ کعبہ مین واقعۂ معراج کو نظم کیا ہے، یہ واقعہ چونکہ شب مین پیش آیا،

اس نئی تمہید میں مضمون اور الفاظ کی ہم آہنگی سے رات کے مناسب ماحول اور فضا کا پورا لحاظ رکھا ہے،

ہے نام خدا سوادِ تحریر — واللیل اذا سجیٰ کی تفسیر

آغاز روایت میں لکھتے ہیں :-

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٔ گل اندام — شبنم کی ردا بقصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی ہی اب — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال
کیا سعیِ صفا سے رنگ فق ہو — سر سے پا تک عرق عرق ہو
نامحرموں سے چھپائے چہرہ — پروین کو بنائے منہ کا سہرا
آنا کھلتا ہوا نہ جانا — اندازِ خرامِ صوفیانہ
سناٹے کا دم انیس و ہمدم — انفاسِ ہوا رفیق و محرم
خوشبو وہ کہ ہار یاسمن کے — لپٹے ہوئے بالوں میں دلہن کے
یا تازہ بسی ہوئی ختن کی — کلیاں یوسف کے پیرہن کی
ناخن کی جگہ ہلال کی حد — دفترِ سے طلوع کے ندارد
گرتے ہوئے ٹوٹ کر ستارے — ہیں رمیِ جمار کے اشارے

چونکہ یہ مثنوی ہے اسلئے زبان نہایت سادہ سلیس اور بامحاورہ استعمال کی ہی جس میں روزمرہ کا لطف آجاتا ہے،

محسن کے کلام میں فنی حیثیت | انیسویں صدی میں "صنعت" کو فطرت پر ترجیح دینے کا عام رواج تھا، یہی زمانہ محسن کاکوروی کو ملا، اس عہد کے لکھنؤ میں زندگی کے ہر شعبہ میں کمال صنعت

کی داد دی جارہی تھی، نثر اور نظم دونوں کو تکلفات سے آراستہ کیا جارہا تھا، یہی سبب ہے کہ لکھنؤ کی شاعری لفظی صناعی اور صنعت گری کا نمونہ بن گئی، اس سے تاثیر جو شعر کا مقصد اصلی ہے، کم ہوگئی، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اس کا ظاہری لباس ایسا دیدہ زیب ہوگیا جو اس سے پہلے شاعری کو نصیب نہیں ہوا تھا،

محسن نے اپنی شاعری میں اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے لفظی صناعی پر بھی توجہ کی ہے، اور اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان کے کلام کی ظاہری خوبی اسی کوشش کی مرہون منت ہے، لیکن اس موقع پر بھی محسن نے اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اور ان کا قدم اعتدال کے راستہ سے نہیں ہٹا ہے،

اسی صنعت گری کے شوق میں شعرائے لکھنؤ نے رعایت لفظی کی طرف توجہ کی، اس فن کے امام آغا حسن امانت ہوئے، اس دبستان کے دوسرے شعراء نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ بالعموم اسی کو شعر کا مقصد بنالیا، جس سے ان کا کلام بے مزہ ہوگیا، لیکن محسن نے صنعت گری میں بھی شاعرانہ لطافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، چنانچہ ان کی رعایات بے ساختہ، ان کی تشبیہات اور استعارات جاندار اور ان کا عام انداز شاعرانہ ہے، پورا کلام پڑھ جائیے ان تکلفات کی وجہ سے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی، قصہ طلب تلمیحات بھی ہیں، اور بکثرت ہیں، لیکن بندش کی چستی اور نظم کی روانی ایسی ہے کہ طبیعت اس پر رک کر نہیں رہ جاتی، اس اعتبار سے ان کا کلام اگر ایک طرف تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے جاذبیت رکھتا ہے، تو دوسری طرف عوام الناس بھی اس کی خوبیوں پر سر دھنتے ہیں،

ان کے فن میں سب سے زیادہ نمایاں عنصر تلمیحات کا ہے، تلمیح یہ ہے کہ شعر میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے نہایت مختصر الفاظ میں کسی مشہور و معروف واقعہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے

چند مثالون سے اسکی وضاحت ہوجائیگی، سراپاے رسول اکرمؐ کا ایک شعر ہے،

شعلۂ طور کا کاغذ پہ کھینچا ہے نقشہ   خاکہ انگارہ کف دست ید بیضا ہے

اسمین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب فرعون نے آپ کے بچپن مین آپ کے سامنے اشرفیان اور آگ رکھدی حضرت موسیٰؑ نے انگارہ ہاتھ مین لے لیا، اور آپ کا ہاتھ جل گیا جو بعد مین ید بیضا ہوگیا،

اسی کا ایک اور شعر ہے،

خواب مین بھی جو وہ زہرہ جبین پیش آئے   مشتری طالع کنعان کی زحل ہوجائے

مثنوی صبح تجلی مین سے چند شعر یہ ہین:

آنکھین نظارے کی طلب گار   نظارہ کا بخت خفتہ بیدار

منظور ہے حسن کا تماشہ،   ہر دیدہ ہے دیدۂ زلیخا

ہے شرق سے غرب تک پریشان   نورعینین پیر کنعان،

وہ سورۂ یوسف تجلی   یہ مطلع مصر کی عزیزی،

اس مین حضرت یوسفؑ زلیخا اور حضرت یعقوبؑ کے واقعات کی طرف اشارہ ہے مثنوی چراغ کعبہ مین بکثرت تلمیحات ہین،

یونس سر حوت تک پہنچکر   سکتہ نہ بٹھائین ہر دم پر

مین ایک تلمیح اور ایک رعایت ہے، یونس علیہ السلام کو ایک مچھلی نگل گئی تھی اور حوت فلک کے بارہوین برج کا نام ہے، جس کی صورت مچھلی کی سی ہے، ایک اور شعر ہے،

آیا جو کرم پہ عشق بے باک   سینہ کیا شق، جگر کیا چاک

اسمین واقعۂ شق صدر کی طرف اشارہ ہے،

دو شعر اور ہیں،

ازراہِ کمالِ مہربانی ... اس گھر سے ہوئی یہ میہمانی

دکھکر مے و شیر کو مقابل ... اس صاحبِ ذوق کا لیا دل

اس مین اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، کہ حضرت جبریلؑ نے آنحضرت صلعم کے سامنے دو پیالے پیش کئے، ایک مین دودھ اور دوسرے مین شراب تھی، آپنے دودھ کے پیالے کو لے لیا اور شراب سے انکار کر دیا،

فلکِ چہارم پر حضرت ادریسؑ سے ملاقات ہوئی کہا جاتا ہو کہ سب سے اول حضرت ادریسؑ نے قلم سے لکھنا ایجاد کیا تھا، اس کا اظہار فلکِ چہارم کی سیر کی تمہید مین اس طرح کیا ہے،

پھر وہ خط عفو داہلِ عصیان ... فرزانہ شفیع پیش یزدان

فلک ہفتم کی سیر میں ایک شعر ہے،

کعبے کا سواد صفحۂ عین ... شنگرفی نسخۂ ذبیحین،

اس مین اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف "انا ابن الذبیحین" یعنی مین بیٹا دو ذبیحون کا ہون، ایک ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد حضرت عبد اللہ، مثنوی شفاعت و نجات مین بھی ایسی بکثرت مثالین موجود ہین،

تلمیحات کے علاوہ ایک اور عنصر جو محسن کی خصوصیت مین شمار ہونے کے لائق ہے، انکی تشبیہات ہین، تشبیہ شعر کی جان ہے، جس طرح جسم بغیر روح کے مردہ ہے، اسی طرح شعر بغیر تشبیہ کے مکمل نہین، اس اعتبار سے محسن کی صرف ایک مثنوی صبحِ تجلی ان کو زندہ جاوید کرنے

کے لئے کافی ہے، اتنی لطیف اور رنگین تشبیہات کہین اور مشکل سے ہی ملتی ہین،

سبزہ ہے کنار آب جو پر	یا خضر ہے مسند وضو پر
نوبت ہو صدائے قمریان کی	تیاری ہو باغ مین اذان کی
محو تکبیر فاختہ ہے	قد قامت سرو دلربا ہے
اک شاخ رکوع مین کی ہو	اور دوسری سجدہ مین جھکی ہو
سوسن کی زبان پر مناجات	جاری لب جو سے التحیات

تشبیہات کی یہ ندرت اور تسلسل محسن کا خاص حصہ ہے، چند مثالین اور ہدیۂ ناظرین ہین،

غنچے مین ہو خامشی کا عالم — یا صوم سکوت مین ہے مریم

غنچۂ ناشگفتہ کو مریم کہنا اور اوسکی خاموشی سے مریم کے صوم سکوت کا خیال پیدا کرنا تشبیہ کو بالکل مکمل کردیتا ہے، جس سے پاکیزگی اور تقدس کی وہ فضا اور بڑھ جاتی ہے، جو صبح تجلی یعنی صبح ولادت رسول اللہ صلعم کے مناسب حال ہے، پھر اس سلسلہ کو یون جاری رکھا ہے،

کیاری ہر ایک اعتکاف مین ہو	اور آب رواں طواف مین ہے
. . . .	. . . .
سالک ہے چمن مین نہر موزون	مجذوب ہے شاخ بید مجنون
ہے صوفی صاف دل صنوبر	تحریک نسیم حالت آور
. . . .	. . . .
ہے استغراق نیلوفر کو	پاس انفاس ہے سحر کو۔
. . . .	. . . .

خلوت گہ حسن ہے زمانہ اور جلوہ صبح شاہدانہ

ڈوبی ہوئی رنگ مین چمن کے نکھری ہوئی روپ مین دلھن کے

ہے چاندنی ایک ماہ پیکر سورج کھی آفتاب انور،

ہمارے خیال مین کسی دوسرے شاعر کی کسی ایک نظم مین اس قدر کثرت سے اور اتنی درخشان تشبیہات مشکل سے نکل سکین گی، قصیدہ مدیح خیر المرسلین مین بھی یہی شان جلوہ گر ہی؛

جوگیا بھیس کئے چرخ لگا کر ہی بھبوت یا کہ بیراگی ہی پربت پہ بچھائے کمل

لہرین لیتا ہی جو بجلی کے مقابل سبزہ چرخ پر بادلا پھیلا ہی زمین پر مخمل

جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہین کلیان لوگ کہتے ہین کہ کرتے ہین فرنگی کونسل

چرخ پر بجلی کی چل پھر سے نظر آتا ہی سبزہ چمکائے ہلاتا ہوا برچھا بادل

یہ تشبیہین شاعر کے اسلوبِ فکر، جدتِ اظہار اور مذاقِ شاعرانہ پر دلیل ہین، کیونکہ فطری اور سریع الفہم ہین، اور ان مین جدت و تازگی کی وہ شان ہے جو محسن کی خصوصیت ہی، اسے بھی محسن کا مخصوص امتیاز سمجھنا چاہئے، کہ ان کی مثنویون مین بھی قصیدے کا لطف آجاتا ہی؛ مثنوی صبح تجلی، چراغِ کعبہ وغیرہ اس کی اچھی مثالین ہین، چراغِ کعبہ کی تمہید مین بالکل تشبیب کی شان پیدا ہے،

ہے نامِ خدا سوادِ تحریر واللیل اذا سجیٰ کی تفسیر،

دریا ہے روان ہے درِ نظم آج یہ بحر خفیف بحرِ مواج ؛

جاتا ہے کلیم آسمان تک معراجِ سخن ہی لامکان تک

خلوت گہہ دل ارم سرشتہ پروازِ طبیعت ایک فرشتہ

ہر گوہر قلزمِ تکلم سیارۂ آسمانِ ہفتم

بلند آہنگی کا یہ سلسلہ پوری نظم مین جاری وساری ہے، یہ صحیح ہے کہ فارسی مثنویون مین مثنوی کے مضمون کی قید نہین، لیکن اس کا انداز بیان اور زبان مخصوص ہے، اردو مین مثنوی گو شعراء نے بالعموم عشقیہ اور بعض نے اخلاقی مثنویون پر بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن محسن نے اسے اپنے فن سے نئی اور لازوال دولت بخشی، مضمون اور زبان دونون کے اعتبار سے محسن کی مثنویان ہماری شاعری مین بیش بہا اضافے ہین،

قصیدے مین بھی محسن کسی باکمال سے پیچھے نہین رہے، قصیدہ گوئی کا کمال تشبیب، گریز اور خاتمے سے پرکھا جاتا ہے، ان ہی تین چیزون کے بل پر سودا نے قصیدہ گوئی کے فن مین امامت کا درجہ حاصل کیا، اس مین محسن کے کمال کے اظہار کے لئے چند مثالین کافی ہین، قصیدہ مدیح خیر المرسلین کی تشبیب،

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل ‏ ‏ ‏ برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

محسن کی قادر الکلامی کی بین دلیل ہے،

گریز کے لئے بیساختہ ہونا ضروری ہے، دیکھئے محسن کس استادانہ کمال کے ساتھ مدح پر آئے ہین،

ہان یہ سچ ہو کہ طبیعت نے اڑایا جو غبار ‏ ‏ ‏ ہوئی آئینہ مضمون کی دو چندان صیقل

روی معنی ہے بھٹکنے مین بھی اعلیٰ کی طرف ‏ ‏ ‏ تاکتا ہو تو ثریا کی سنہری بوتل

اک ذرا دیکھئے کیفیتِ معراجِ سخن ‏ ‏ ‏ ہاتھ مین جام زحل شیشۂ مے زیر بغل

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہان رکھا پاؤن ‏ ‏ ‏ کہ تصور بھی وہان جا نہ سکے سر کے بہل

یعنی اس نور کے میدان مین پہنچا کہ جہان ‏ ‏ ‏ خرمنِ برق تجلی کا لقب ہے بادل

تار باران مسلسل ہے ملائک کا درود ‏ ‏ ‏ پئے تسبیح خداوند جہان عز و جل

کہین طوبیٰ کہیں کوثر کہین فردوس برین — کہین بہتی ہوئی نہرین نہرلبن و نہرعسل

بار ہا تنزیہہ مین سرسبز نہال تشبیہ — انبیا جسکی ہین شاخین عرفا کونپل

گل خوش رنگ رسول مدنی عربی — زیب دامان ابد طرۂ دستار ازل

خاتمہ میں کہتے ہین:

محسن اب کیجئے گلزار مناجات کی سیر — کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہو سب سے افضل — میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل

اسکے بعد مناجات کے نہایت پر تاثیر اشعار ہین،

محسن کا بقیہ کلام | نعتیہ کلام کے علاوہ محسن کے سرمایہ مین چند غزلین، ایک ناتمام عشقیہ مثنوی نگارستان الفت، ایک مثنوی فغان محسن ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی تعریف مین چہرشہنشاہی کے نام سے اور چند قطعات تاریخ اور ہین لیکن شاعری کے لحاظ سے ان کا درجہ کچھ بہت اونچا نہین، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا تخیل صرف نعت کی مقدس فضا مین بلند پروازی دکھاتا ہے، چنانچہ ان کی غزلین لکھنؤ کی عام شاعری کا نمونہ ہین، ان مین شاعر کی جدت، ذہانت اور طباعی کا کوئی غیرمعمولی کمال نظر نہین آتا، اور بالعموم رعایت لفظی اور صنائع و بدائع کو دخل دیا گیا ہے، ایسا شاید اس وجہ سے ہو کہ یہ ابتدائی عمر کا کلام ہے، اور اس زمانہ مین چونکہ یہی روش عام تھی، اس لئے محسن نے بھی پہلا قدم اسی کی طرف اٹھایا، لیکن آخر مین تائید الٰہی اور طبیعت کی رسائی و تازگی سے اپنی راہ الگ نکال لی، غزلون کا اندازہ ذیل کے انتخاب سے ہو سکتا ہے، پہلی غزل ہے،

ہے عیان جلوہ بتون مین بھی خدا کے نور کا — زاہد آنکھون مین لگائے سرمہ سنگ طور کا

سر جھکا کے ہم ہین وہ تلوار کو کھینچے ہوئے — یہ نیاز عاجزا اور وہ ناز ہے مغرور کا

مغبچون کی کتنی خاطر کی خدا نے حشر مین
جرم ٹھہرا ٹوٹ جانا شیشۂ انگور کا

جب اٹھائین اسقدر دور فلک کی سختیان
ہو صاف پتھر ہو محسن دل سے چکنا چور کا

بعض اور اشعار ملاحظہ ہون،

آنکھ پر ٹھہری نظر مائل ابرو ہو کر
ہم پھرے کعبہ سوائے قبلہ تو منہ ہو کر

شب کا یہ جذبۂ محبت کا تماشا دیکھا
شمع پروانے کے ساتھ اڑ گئی جگنو ہو کر

مبارک ہو کشو کس دھوم سے شورش ہے پالی کی
خدا حافظ ہے توبہ کا صراحی بے طرح چھلکی

خدا نے تل کیا پیدا لب رنگین جانان پر
تو گویا تیل چھڑکا آتش لعل بدخشان پر

صاحب غیر دن سے جی خفا ہے
اور کیا مجھے آپ سے گلہ ہے،

فرہاد نہ پوچھ سختی ہجر
دن آج پہاڑ سا کٹا ہے

دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو
رونے کا کچھ آج ہی مزہ ہے

ان کو کبھی خیال ہو میرا یہ وہم ہے
جاگین مرے نصیب یہ باتین ہین خواب کی

ہونے نہ پائی خشک بھی تر دامنی مری
محشر مین دھوپ ڈھلنے لگی آفتاب کی

رباعیات البتہ زوردار ہین، بعض پر انیس کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

مولا کی نوازش نہان کھلتی ہے
عزت مری پیش قدسیان کھلتی ہے

کہدو کہ ملائک گوش برآواز رہین
مداح پیمبر کی زبان کھلتی ہے،

اک شان خدا ہے سید عالی جاہ
ملک قدم وحدوث کا شاہنشاہ

جس دل پہ کھلی اس کی حقیقت محسن
بیساختہ بول اٹھا کہ اللہ اللہ

رہ جاؤگے ہاتھ زندگی سے دھوکر
پچھتاؤگے اقربا تھارے روکر

محسن کیا پوچھتے ہو چھوڑو گھر بار
جنت کو چلے چلو مدینے ہو کر

مثنوی نگارستانِ الفت میں خالص لکھنوی مثنویوں کی تمام خصوصیات موجود ہیں،

زردی چھائی ہوئی رخساروں پر سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر

مردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو، اپنی جاتی ہوئی دنیا دیکھو

کامدانی کا پہننا چھوڑا لٹ گیا تیرا شہانا جوڑا

بند آنکھیں کئے روتے دیکھا، رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا

سو کہیں ایک نہ مانی آخر مٹ گئی تیری جوانی آخر

چاندنی پچھلے پہر کی کب تک روشنی شمعِ سحر کی کب تک

دلِ ناشاد کو رکھ قابو میں نہ سہی یار نہ ہو پہلو میں،

مثنوی فغانِ محسن میں (جو ایک دوست کے قید ہو جانے پر لکھی گئی ہے) البتہ خلوص کے ساتھ جذبات نگاری کے مرقعے ملتے ہیں،

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا، تڑپنے لگا دل اچھلنے لگا،

مری چشمِ تر کا یہ کیا حال ہے کہ دامن سے تا آستیں لال ہے

مرا رنگ فق ہوتا جاتا ہے کیوں بدن خود بخود سنسناتا ہے کیوں

مرے منہ پہ زردی سی کیوں چھا گئی چمن میں مرے کیوں خزاں آگئی

نہ کیا کیا ہوس زندگانی کی تھی مگر موت آنی جوانی کی تھی،

کوئی دم میں دم ہی نکلتا ہے آج کلیجا مرا کوئی ملتا ہے آج

چلی آتی ہیں ہچکیاں دمبدم مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم

اندھیرا مری آنکھوں میں چھا گیا جبیں پر وہ دیکھو عرق آگیا

محسن کے تمام کلام کی نسبت صرف ایک بات کہنا اور باقی رہ گئی، یہ کلام کی شگفتگی ہے،

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے، انقلاب اور خونریزی کی ظلمت میں سلاطین کی گداگری، شریفوں کی پریشان حالی، شاعروں اور ادیبوں کی ناقدری امیروں کی بے سروسامانی اور غریبوں کی فاقہ کشی کے بھیانک خواب نظر آتے ہیں، اسی وجہ سے اس دور کے شاعروں کے کلام اور ادیبوں کی تصانیف پر قنوطیت کا گہرا رنگ چڑھ گیا ہے، جسے پڑھکر طبیعت افسردہ اور مضمحل ہو جاتی ہے، امید کا دامن چھوٹ جاتا ہے، آرزو کی آخری کرن ڈوب جاتی ہے، لیکن محسن کے یہاں افسردگی کی جگہ شگفتگی، ناامیدی کی جگہ یقین، تزلزل کی جگہ استحکام نظر آتا ہے، اور اس حیثیت سے وہ یقیناً اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں،

الغرض محسن کا کلام اختراعی فن کاری کا ایک نادر نمونہ ہے، اور لکھنوی ہونیکے باوجود لکھنو کے عام رنگ سے جدا ہے جس میں شاعر کی شخصیت نے کمال خلوص و محبت کے خاکہ کو تصوف اور ہندیت کے رنگ سے آراستہ کر کے شاعرانہ صناعی سے مکمل کیا ہے، جس کی جدت جاذب اور جس کی مضمون آفرینی دلکش ہے، جہاں حدیث و قرآن کی صحت کے لحاظ کے ساتھ مذاق شاعرانہ اور مذہبیت کا معتدل امتزاج نظر آتا ہے، جہاں رکاکت اور ابتذال کی بجائے متانت تہذیب اور شایستگی کا جلوہ ہے، جہاں فنی حیثیت سے تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کا کمال بے نظیر ہے جہاں مثنویوں میں قصیدوں کا لطف ہے، جہاں تشبیب اور گریز کے مضامین نو شاعر کی قادر الکلامی پر دلیل ہیں، لکھنو کے دبستان شعر کا نادر ترین مرقع ہے،

جلد ۵۲ ماہ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۳ء عدد ۲

استفسار و جواب

آنحضرت صلعم کے شعراے کرام رضہ

مولوی الیاس حسین صاحب
(مدرسہ اسلامیہ خیرآباد ضلع سیتاپور)

"امور مندرجۂ ذیل کا تفصیلی جواب تحریر فرما کر ممنون فرمائین :۔

(۱) حضور انور صلعم کے دربار مبارک کے شاعر کتنے تھے، ان مین عورتین بھی تھین یا فقط مرد، حضرت حسان بن ثابت رضہ اور کعب رضہ بن زہیر کا ذکر تو اکثر تاریخون اور سیر کی کتابون مین موجود ہے، مجھے تفصیل کی ضرورت ہے۔

(۲) ان حضرات کے حالات مین اردو زبان میں کوئی کتاب کہین سے شائع ہوئی ہے یا نہین، اگر شائع ہوئی ہے تو اس کا پتہ کیا ہے اور قیمت کیا؟"

معارف (۱) آنحضرت صلعم کے شعرائے کرام رضہ کو "آپ کے دربار مبارک کے شاعر" سے ملقب کرنا کچھ موزون سا نہین معلوم ہوتا، "درباری شعراء" سے ذہن ایسے شاعرون کی طرف جاتا ہے جو سلاطین کے دربارون مین ان کی جھوٹی سچی مدحون مین قصیدے پڑھا کرتے تھے، اس لئے سیرت نگارون نے آپ کے شعراء کا تذکرہ ان لفظون مین کیا ہے :

واما شعراؤہ علیہ الصلوٰۃ والسلام الذین یذبون (یذبون)	اور آپ کے شعراء جو کہ اسلام کی مدافعت کرتے تھے، اور اس کی حمایت کرتے تھے،

عن الاسلام ویحمونه لا الذین — نہ کہ وہ جنھون نے صحابہ وصحابیات میں سے
مدحوه بالشعر من رجال الصحابة — آپ کی مدح مین اشعار کہے،
ونسائهم، (زرقانی ج ۳ ص ۲۲۶)

جب غزوات کی ابتدا ہوئی، تو عرب شعرائے جاہلی کی تیغ زبان بھی اسلام کے مقابلہ کے لئے بے نیام ہوگئی، اس لئے آنحضرت صلعم نے ان صحابہ کو جنھین فن شاعری مین کمال حاصل تھا، ان جاہلی شعرا کی نظمون کے جوابات دینے پر مامور فرمایا، اور مختلف موقعون پر مختلف شعرا نے اپنی فصاحت کے جوہر آبدار سے اسلام کی مدافعت کی، غزوۂ بدر کے موقع پر بھی کفار نے قصیدے کہے، اور صحابہ نے ان کے جوابات دیئے اس سلسلہ مین حضرت حمزہ بن عبد المطلب، حضرت علی مرتضی، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت ضرار بن خطاب رضوان اللہ علیہم کے کلام سیرۃ کی مختلف کتابون مین منقول ہین، (عیون الاثر ج ۱ ص ۲۸۸ وغیرہ)

کبھی ایسا بھی ہوا کہ بعض عرب قبائل اپنے قبیلہ کے خطیب وشاعر کو لیکر آپ کی خدمت مین آئے، اور مبارزت طلبی کی، آپ نے یہ فرما کر کہ مین شعر کے ساتھ مبعوث نہین ہوا ہون باینہمہ آپ نے ان کی مبارزت کے جواب مین کسی صحابی شاعر کو جواب دینے کا حکم عطا فرمایا، اور صحابی شاعر کا کلام سن کر حق کی تائید سے غیر مومن قبیلہ کے آنے والے شاعر نے اپنے عجز کا اعتراف کیا، اور قبیلہ کا قبیلہ مسلمان ہوگیا، ایسے ہی شعرا "شعرائے نبوی" کے لقب سے ملقب ہین،

ان مشاہیر شعرا مین حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہ خزرجی اور حضرت عامر بن اکوعؓ وغیرہ کے اسمائے گرامی ہین، حضرت حسان بن ثابتؓ کے حالات تو آپ ملاحظہ کر چکے ہین، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ آیت کریمہ الشعراء یتبعهم الغاوون الم تر انهم فی کل واد یهیمون وانهم یقولون ما لا یفعلون کے بعد الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات، (الآیہ) کے وہ مصداق ہین، نیز ا وہین ایک موقع پر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سید الشعراء کے لقب سے بھی ملقب فرمایا تھا، (شرح زرقانی ج ۳ ص ۲۶۲، ۲۷۰، ۲۸۴،

تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۸۴)

ان کے علاوہ صحابۂ کرام میں سے بہت سے ایسے شعراء ہیں، جنھوں نے آنحضرت صلعم کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، حضرت کعب بن زہیر رض کا اسم گرامی انہی شعراء کے سلسلہ میں آتا ہے، یعمری نے ان شعراء کے اسماء و کلام کو ایک رسالہ میں جمع کیا ہے، جن کی تعداد تقریبًا دو سو ہے، اور جیسا کہ زرقانی کے بیان میں اوپر گذرا، ان میں صحابہ وصحابیات دونوں تھے،

یعمری کے اس رسالہ کا تذکرہ زرقانی نے کیا ہے، (ج ۳ ص ۲۶۲) اس کے علاوہ اس رسالہ کے متعلق سردست ہمیں اور کوئی علم حاصل نہیں،

آپ اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کیلئے طبقات شعرائے عرب پڑھ سکتے ہیں، ان میں مختلف شعرائے جاہلی مخضرمین کے حالات ملاحظہ کریں، ان میں آپ کو ایسے شعراء کے جستہ جستہ حالات و کلام مل جائیں گے، اسی طرح سیرۃ ابن ہشام میں اور بھی قصائد ملیں گے جنمیں سے بعض مردوں کی طرف اور بعض عورتوں کی طرف منسوب ہیں،

۲- ہمیں کسی ایسی اردو کتاب کا علم نہیں، جو خاص اس موضوع پر لکھی گئی ہو، البتہ سلسلہ سیر الصحابہ میں کہیں کہیں آپ کو ان کے احوال بھی مل جائیں گے، ورنہ اردو میں ان کے حالات کے لئے اور کوئی دوسرا مستند ماخذ ہمارے علم میں موجود نہیں،

حضرت کعب بن زہیر رض

جناب شبلی یزدانی صاحب
بی نمبر ۴ خیرت آباد (حیدرآباد دکن)

محترم حضرۃ مولانا زاد اللہ مجدکم و تم فیوضکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

ایک مدت کے بعد معارف کی زیارت نصیب ہوئی، جدید اضافے بہت پسند ہوئے، ہندوستان میں اس نوعیت کا رسالہ صرف معارف ہی ہے، خدا کرے کہ یہ سرچشمۂ علم ہمیشہ جاری رہے،!

جلد ۵۶ ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء عدد ۵

عزیز لکھنوی کے قصائد

از

جناب غلام مصطفےٰ خان صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ لکچرار ایڈورڈ کالج امراوتی برار

مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ عزیز لکھنوی کی شاعری پر لکھنے سے پہلے ان کی زندگی کے کچھ حالات بھی بیان کر دیے جائیں، ان کا نام محمد ہادی، اور تخلص عزیز آبا و اجداد کا مسکن کشمیر تھا، لیکن اب کئی پشتوں سے لکھنؤ میں متوطن تھے، ۱۲۹۰ھ میں عزیز پیدا ہوئے، اور بچپن ہی سے عربی و فارسی علوم رسمیہ کا اکتساب کرنے لگے، خصوصاً مولوی شیخ فدا حسین اور آغا حاذق سے زیادہ استفادہ کیا شاعری کا ذوق پیدا ہوا تو مختلف باکمال اساتذۂ لکھنؤ سے مستفیض ہوئے، یہاں تک کہ ۱۹، ۲۰ برس کی عمر سے اپنی فکرِ صائب، ذوقِ سلیم، جدت طرازی اور ذہانت کی وجہ سے بڑے خوش گو شاعر سمجھے جانے لگے، مولانا ابو الکلام آزاد، شرر، اور محسن عبد اللہ دریابادی وغیرہ ان کی داخلی شاعری کے مداح ہیں اور اکبر الہ آبادی نے کہا ہے :-

سخن میں اور تو اہل تمیز ہی ہیں فقط
شہید جلوۂ معنی عزیز ہی ہیں فقط

ان کی غزلیں جو دہلوی رنگ اور لکھنوی زبان میں ہیں، ایک زمانہ ہوا، گلکدہ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں، اور ان کی مدحیات یعنی صحیفۂ ولا کی اشاعت غالباً ۱۹۳۱ء میں ہوئی، اس کے چار سال بعد یعنی ۱۹۳۵ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے، ہم کو یہاں محض ان کی مدحیات پر کچھ کہنا ہے :-

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے یہاں اب قصیدہ گوئی کا رواج بہت کم ہو گیا ہے، کچھ تو اس وجہ سے کہ اب وہ دربار یا ویسے لوگ نہیں رہے، جہاں اس کی قدر کی جاتی، اور کچھ اس بناء پر کہ قصیدوں کی طوالت، اظہار قابلیت، تصنع اور تکلف کا زمانہ بھی نہیں رہا، خود شعراء ہی اب

---

[1] منتخب کلام برائے جماعت بی اے، (علی گڑھ) کے ص ۵۳ - ۵۵ سے یہاں تک اخذ کیا گیا،

بہت کم ایسے ملین گے جو اعلیٰ قابلیت سے بہرہ ور ہون آج مغربی رو کی بنا پر ہماری ہر چیز کو مغربی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے
لیکن خود مغربی استادون مین ایک بھی ایسا نہ ملے گا، جو اس قسم کی شاعری کو سمجھ سکے، وہ قصیدہ کو خوشامد اور دروغ سمجھتے
ہین وہ کیا جانیں کہ کس ماحول کی وجہ سے یہ باتین اس صنف مین داخل ہوئین، اسی لئے براؤن جیسے فاضل نے جو مولانا شبلی کے
صحیح ادبی ذوق کے اعتراف کے ساتھ اپنے ذوق کی کمی کا ہمیشہ معترف رہا، نظامی اور جامی کا موازنہ خود نہین لکھا بلکہ ایک ایرانی
ادیب شیخ اللہ بہروز سے لکھوایا، بات دراصل یہ ہے کہ ہماری فارسی یا اردو شاعری کا مطالعہ بغیر تاریخی اور سیاسی حالات کے
معلوم ہوئے مشکل ہے، علامہ شبلی نے اپنی اعلیٰ تاریخ دانی کی وجہ سے شعر العجم مین بڑی سچے کی باتین کہی ہین،
جو قصیدہ گوئی کے لئے خصوصاً بہت صحیح ہین، اُن کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ سلاطین کی ناہموار طرز
حکومت کی وجہ سے شعرا مجبور تھے کہ بادشاہ اگر دن کو رات کہے، تو تم کہو کہ واقعی تارے نظر آرہے ہین،
مثلاً بنو امیہ کی ظالمانہ حکومت نے آزادی وحریت کے جذبہ کو بالکل پامال کر دیا تھا، اور مذہبی لوگون کو
رشوتین ملین، تو انھون نے قضا و قدر کا مسئلہ پھیلایا، گو کہ معتزلہ نے اس کی مخالفت کی، لیکن بعد مین شاعرُ
کی وجہ سے بادشاہ کی عزت، خدا کی عزت سمجھی گئی، اور اُس کی توہین کو خدا کی توہین، کہا گیا، اس کا نتیجہ
یہ ہوا، کہ اخلاقی شاعری تک مین احسان، تواضع حلم، عفو، سخاوت، توبہ وغیرہ کے متعلق سیکڑون اشعار
نظر آنے لگے، لیکن دلیری اور آزادی کے مضامین خال خال رہے، بلکہ ناپید ہی ہوگئے، سلاطین کی اس
ناہموار حکومت کے بعد پھر خود اُن کی ناپائداری کا دور آیا، آج ایک بادشاہ تخت پر ہے اور کل تختہ پر نظر آرہا ہے
ایک شخص سر پر لکڑی کا بوجھ لئے پھرتا ہے، اور کل مالک تخت و تاج ہو جاتا ہے، چنانچہ دنیا کی اسی بے وفائی اور
بے ثباتی نے متصوفین کی جماعت کو بڑھایا، اور قناعت اور توکل کے مضامین کو مدارج ارتقا تک پہنچایا،

غرض کہ ایسے تاریخی ماحول پر نظر رکھتے ہوئے، ہمارے شعرا، کا کلام دیکھا جائے گا، تو قصیدہ نگارون
کی دروغگوئی خوشامد و تذلیل نفس کی باتین بڑی حد تک حق بجانب سمجھی جائین گی، خود اس زمانہ کے حالات
پر نظر غائر ڈالئے کہ ہمارے یہاں کا بڑے سے بڑا شاعر آج کل ناچ گانے اور سنیما کو اپنے ذوق کے پست
ہو جانے کے اندیشہ کے باوجود، ہم خرما و ہم ثواب سمجھے ہوئے ہے،

اس طویل مقدمہ کی ضرورت اس لئے ہوئی، کہ آپ کو معلوم ہو سکے،
کہ قصیدے مین بے جا طوالت، تکلف اور تصنع کا ادخال کیونکر ہوا، اور یہ اجزائے ترکیبی کس طرح اس کے لئے
ضروری سمجھے جانے لگے، اور جب اس صنف شاعری نے ایک مستقل صورت اپنے لئے پیدا کر لی، تو بعد کے

شعرانے اگرچہ دنیوی ممدوحون کو چھوڑ کر نعت اور منقبت بھی لکھی، تو اُسی طریقہ پر لکھی، چنانچہ آپ سودا، لطف، شہیدی محسن، غالب وغیرہ کے یہان جو قصائد دینی ممدوحون کے متعلق پائین گے، ان مین کوئی تلوار، گھوڑے ہاتھی اور بازو غیرہ کی تعریف لکھ رہا ہے، کوئی بہار، شباب، شراب کے علاوہ علمی مصطلحات و تصنعات، اور متھرا، بندرابن، سری کرشن اور گوپیون وغیرہ کا بھی ذکر کر رہا ہے، جو بظاہر عجیب و غریب ہے، لیکن قصیدہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

بہرحال ایسی قصیدہ نگاری کے لئے شاعر کو کسی دنیوی صلے کی توکیا، کسی واہ واکی پروا بھی نہین ہوتی، وہ رسماً بھی لکھتا ہے تو عقیدت کا اظہار ہی اس کی داد کے لئے کافی ہے، چنانچہ عزیز کے قصائد سامعین و قارئین کی داد کے لئے نہین، بلکہ لکھنؤ کے کوئی مجتہد ناصر حسین صاحب کی ہمت افزائی پر لکھے گئے ہون گے، وہ اس کے متعلق اشارہ بھی کرتے ہین، جگہ جگہ اُن کے لئے دعائین بھی کرتے ہین، مثلاً:-

دکھادون اب تمھین وہ قطرۂ دریا نما شیعو ۔۔۔ یہ ہین ناصر حسین آئینہ دار علم ربانی
بسعی ناخن تحقیق کھولے جس نے سب عقدے ۔۔۔ امور شرع مین مشکل کشائی کی بآسانی
ہو دُس کی نہ کیونکر رشک خون شہیدان ہو ۔۔۔ نظر آتے ہین جس مین جلوۂ اسرار ربانی
دل کعبہ ہوا جس طرح وجہ اللہ سے روشن ۔۔۔ کیا ہے قلب ایمان آپ نے اس طرح نورانی
مجھے جرأت ملی ہو آپ ہی کی داد سے ورنہ ۔۔۔ کہان اک چاکر قنبر کہان شہ کی ثناخوانی

اور آخر مین اس طرح دعا دی ہے،

صلے مین اس قصیدہ کے بجز اس کے نہین خواہش ۔۔۔ ہمارے حجۃ الاسلام کی ہو عمر طولانی

اسی طرح صحیفۂ ولا کے صفحات ۲۰، ۱۰۸، ۱۴۶، ۱۹۰ پر بھی اُن کی مدح ہے، یا اُن کے لئے دعا ہے، اور یہ قصیدے انھون نے جیسا کہ صفحات ۲۳۱-۲۰۳ سے معلوم ہوتا ہے، قریب ۱۳۱۵ھ کے پہلے ہی شروع کردیئے ہون گے، اور کم از کم ۱۳۴۵ھ تک ضرور کہے ہون گے، اس کی مدت انھون نے مقدمہ مین بتائی بھی ہے، کہ

ازل سے ہے مجھے شوق غلامی ۔۔۔ مری گردن مین ہے طوق غلامی
تعلق میرا اصحاب کسا سے ۔۔۔ تمسک دامن آل عبا سے
دل افسردہ گو بیت الحزن ہو ۔۔۔ رگون مین دور صبا سے تن ہو

ٹپک رہے کب سے دل کے آبلے ہین | کٹے پینتیس سال اس مشغلے مین

اب ہم ان کی قصیدہ گوئی کی طرف آتے ہین، اور پہلے اُن کی خارجی خصوصیات کو لیتے ہین،

(۱) ان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے قصائد کے لئے مختلف شعراء کی زمینین اختیار کرتے ہین، اُس خصوصیت کے وہ شروع ہی سے پابند نظر آتے ہین، اُن کا گلکدہ اٹھا کر دیکھئے، اکثر مقامات پر میر[1] یا وہ غالب کی زمینین نظر آئین گی، مثلاً غالب کہتے ہین :-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا | کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

عزیز اپنی غزل اس طرح شروع کرتے ہین،

سچ کہو دل پر اثر کیا ہوگا ایسے تیر کا | توڑ دیتی ہے نگہ جب آئینہ تصویر کا

غالب نے کہا تھا :-

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا | اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہ زمین داغ اور امیر وغیرہ نے بھی اختیار کی تھی، اور عزیز لکھتے ہین،

غمِ عشق اگر ملا تھا تو کبھی قرار ہوتا | کوئی زور دل پہ ہوتا کوئی اختیار ہوتا

غالب کی غزل تھی،

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا | جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

عزیز نے کہا ہے :-

---

[1] میر کی غزل شروع ہوتی ہے :-

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا | اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

عزیز اس طرح شروع کرتے ہین :-

دل میں جو ہین سکون ہوا جسم سرد تھا | وہ مدتِ حیات تھی جب تک کہ درد تھا

آتش کہتے ہین :-

وحشت انگیز ہے فسانہ میری رسوائی کا | عاشقِ زار ہون اک آہوے صحرائی کا

عزیز کی غزل ہے :-

رنگ ہر پھول میں ہے حسنِ خود آرائی کا | چمنِ دہر ہے محضر تری یکتائی کا

وہ شوقِ قتل و ولولۂ دل نہیں رہا | اب ان کے امتحان کے قابل نہیں رہا

غالب کی ایک غزل تھی :-

درد منت کشِ دوا نہ ہوا | مین نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

عزیز کی غزل ہے :-

عہد مین تیرے ظلم کیا نہ ہوا | خیر گذری کہ تو خدا نہ ہوا

غالب کا مطلع تھا :-

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی | میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

عزیز کا مطلع ہے :-

اب نہ میری دوا کرے کوئی | ہو سکے تو دعا کرے کوئی

اسی طرح متعدد غزلین غالب کی تقلید مین نظر آئین گی، یہان تک کہ غالب کی غزلون کی زمینین عزیز نے اپنے قصائد کے لیے بھی اختیار کی ہین، مثلاً غالب کی مشہور غزل ہے :-

سب کہان کچھ لالہ و گل مین نمایان ہو گئین | خاک مین کیا صورتین ہون گی کہ پنہان ہو گئین

عزیز کی غزل بھی ہے :-

وہ نگاہین کیا کہون کیونکر رگ جان ہو گئین | دل مین نشتر بن کے ڈوبین اور پنہان ہو گئین

ان کا قصیدہ بھی اس طرح شروع ہوتا ہے،

جب ہوائین نشہ افزائے گلستان ہو گئین | چشم خواب آلود سب نرگس کی کلیان ہو گئین

غالب کی ایک غزل ہے :-

مدت ہوئی ہے یار کو مہمان کئے ہوئے | جوشِ قدح سے بزم چراغان کئے ہوئے

عزیز کا یہ قصیدہ اسی زمین مین ہے :-

جاتا ہون عزم کوچۂ جانان کئے ہوئے | دل مین ہزار طرح کے سامان کئے ہوئے

غالب کی ایک اور مشہور غزل ہے :-

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیون | روئین گے ہم ہزار بار کوئی ہمین ستائے کیون

عزیز کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

جلوۂ حسن خود نما چھپ کے کوئی دکھائے کیون | چھپ نہ سکے تو پھر کوئی پڑ ی مین منھ چھپائے کیون

عزیز نے غالب کے علاوہ فارسی شعراء کی زمینین بھی اختیار کی ہین، مثلاً انوری نے کہا تھا :۔

اے چو عقلِ اول از آلایشِ نقصان بری | چون بہا بہرت بر جہان از بد و نظرت برتری

یا:۔ اے مسلمانان فغان از دورِ چرخِ چنبری | وز نفاقِ تیر و قصد ماہ و کید مشتری

عزیز کا قصیدہ ہے :۔

منتظر کب تک رہین گے شاکیٔ بد اختری | اے حجاب آرا کہان تک یہ حجابُ لبری

عرفی کا ایک قصیدہ ہے :۔

مرحبا اے شاہدِ ایام را عہدِ شباب | وہ بہین نو بادۂ باغ دعاے مستجاب

عزیز نے لکھا ہے :۔

ہوشیار و باخبر اے سرخوشِ عہدِ شباب | تا کجا نظارۂ نیرنگیٔ دارا لخراب

عرفی کا ایک اور قصیدہ ہے :۔

جہان بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار | نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

عزیز کا قصیدہ ہے :۔

ہے تا بعرش گلستان کا گوشہ وشاہ | کہ سرزمینِ عراقِ عرب سے آئی بہار

قاآنی کا ایک قصیدہ شروع ہوتا ہے :۔

بود این نکتہ در حکمت سرائے غیب برہانی | کہ در جانان رسی آنگہ کہ جان از غیب ہانی

اور عزیز نے اس طرح شروع کیا ہے :۔

نصابِ مکتبِ پیرِ مغان ہو درسِ عرفانی | رہے کتابہ کے سرست حکمتہاے یونانی

یا ایک قصیدہ اس طرح ہے :۔

وہ دل مشہور تھا اک وقت مین عرشِ حمانی | بتانِ ہیکل الروم اب ہان کرتے ہین سلطانی

اس کے علاوہ کہین عربی شاعر فرزدق کی تقلید ہے کہین دوسرے فارسی شعراء مثلاً نظیری؛ وہ حافظ کا بھی اتباع کیا ہے اور کہین اردو کے شعراء مین میر اور حالی وغیرہ کو بھی اپنا رہنما بنا لیا ہے، ایک جگہ انھون نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت کے سلسلے مین ان شعراء کو اس طرح یاد کیا ہے :۔

فرزدق، جریری، حسان، واعشی و عبل و سحبان | ہر اک موصوف بصف بیٹھے ہوئے تلمیذ رحمانی

کہین دور مئے شیراز سے بیٹھے ہوئے سرخوش | جمال الدین عرفی اور حبیب اللہ قاآنی

نمک پروردگان ذوق معنی کا کہین جلسہ | کہین پر میر و غالب مست آہنگ ثناخوانی

غرض کہ انھون نے اپنے قصائد کے لئے ایسے بڑے بڑے شعرار کو رہبر بنایا تھا،

(۲) دوسری خارجی خصوصیت ان کے یہان یہ ہے کہ انھون نے اپنے لئے نئے نئے موضوعات تلاش کئے ہین، گو یہ بات کہین مرثیون مین بھی موجود تھی لیکن میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے خصوصیت کے ساتھ قصیدے مین عزیز ہی نے یہ نئے نئے موضوعات فراہم کئے، مثلاً حالات بعثت، عروسی حضرت فاطمہؑ، ولادت حضرت علیؑ، تہنیت ولادت امام ثانی، طمانیت مظلوم کربلا، عقد امام حسن عسکری، فلسفی امی،

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انھون نے محسن کاکوروی کی طرح اپنے قصیدون کے نئے نئے نام رکھے ہین، ایک تو "چراغ کعبہ" ہی ہے، دراصل نئے نئے دلکش نام رکھنے مین عزیز کے ہم عصر علامہ اقبال سب پر فوقیت رکھتے ہین لیکن عزیز نے بھی بہت اچھے نام رکھے ہین، مثلاً:۔ عطر عروس، شمع حرم، الماس ریزہ، سلک گہر، گل نرجس، نہال طوبیٰ، نرگس شہلا، رحیق ریحانی، سبحۂ مرجان، بادۂ گلرنگ، عقیق مذاب، عقد پروین، یاقوت احمر، لعل بدخشان، در ثمین، موجۂ کوثری، موجۂ تسنیم، آتش پارہ، لالہ زار وغیرہ، اور ان استعارات سے بڑے لطیف مطالب نکلتے ہین، جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہین،

یہ خصوصیات تو اُن کے قصائد مین خارجی تھین، اب داخلی خصوصیات دیکھئے، کیونکہ انھی پر ان کی اصل قصیدہ گوئی کا دار و مدار ہے،

(۱) اس لحاظ سے ان کی پہلی خصوصیت (قصائد مین) تغزل ہے، چونکہ غالب کے خیالات، انداز بیان و زبان اور بحور کی تقلید انھون نے غزل مین کی ہے، اور قصائد مین بھی ان کی زمینین اختیار کی ہین، اس لئے ان کا تغزل بھی اُن کے یہان اکثر مقامات پر نمایان ہے، دیکھئے ایک قصیدہ کے یہ اشعار کیونکر غزل سے الگ سمجھے جا سکتے ہیں،

شوخیان ایسی ہین ناز اس کے کرشمے اس کے ہیں | جس ستمگر کی ادائین دشمن جان ہوگئین

بڑھکے دل کی حسرتین سب باعث وحشت ہوئین | بستیان آباد ہو ہو کے بیابان ہوگئین

اس کی شام غم پہ صدقے ہو مری صبح حیات | جس کے ماتم مین تری زلفین پریشان ہوگئین

ف جوانی مین کسی بدمست کی انگڑائیان | باعث خمیازۂ چاک گریبان ہوگئین

لئے اک ساتگیں اور اک صراحی ہاتھ میں اپنے — ہم ایسے لاابالی رند بھی بیٹھے ہوئے اک سو

کہ لائے چند شاعر اک نگار ایشیائی کو — کہ جس کی چشم وحشت خیز سے رم خوردہ ہو آہو

مگر ہنستے ہوئے کچھ مغربی شاعر بھی آئے ہیں — کہ دیکھیں حسن سے ہوتا ہے دل کس طرح بے قابو

یکایک اُس ستم پیشہ نے چہرہ سے نقاب اُلٹی — ہوئی وہ بزم عشرت رشک بزم گلشن مینو

نگاہیں ہیں کہ اک پیمانۂ زہر ہلاہل ہیں — ہیں افعی کا کلیں اور عقرب جرّارہ ہیں ابرو

یہ سلسلہ چلا جاتا ہے، "ستم پیشہ" کے خارجی اوصاف بڑی خوبی سے بتائے جاتے ہیں لیکن پھر کہتے ہیں کہ

ارے بدمست باز آ ایسے تخئیلات فاسد سے — نہ پھر دیوانہ وار اس وادی الفت میں ہر سو

ارے مجنون یہ دریا ہے نہ ہے یاں گوہر مقصد — چمک کر تجھ کو دھوکا دے رہی ہے نجد کی بالو

پریشاں دل کے ذرے کر شب گیسوئے دلبر میں — نظر آئیں گے تجھ کو پھر چمکتے ہر طرف جگنو

مٹا دے جھائیاں شیشے کی انفاس حقیقت سے — اسی کو دل میں دیکھے گا کہ جس کو ڈھونڈتا ہے تو

ذرا شمع ولایت لے کے گھوم اس کعبۂ دل میں — تو پھر اے بے خبر معلوم ہوگی وسعت مشکو

اگر قوس ہلال عید عرفاں دیکھنا چاہے — تو دل پر نقش کر لے اس عفیفہ کا خط ابرو

تشبیب بڑی اچھی ہے اور ع

یکایک اُس ستم پیشہ نے چہرہ سے نقاب الٹی

بالکل یکایک ذکر آ گیا ہے جو بظاہر بے تکی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ یکایک ہی میں اس کا لطف پوشیدہ ہے، ایسے باکمال شاعر کم ہوتے ہیں، اور ایسی ندرت کم پیدا کرتے ہیں، ایسے شاندار قصیدے میں گریز پھر بھی اتنا اچھا نہیں ہے، جیسا کہ چاہئے اس کے متعلق یہاں بحث کرنے کی گنجایش نہیں ہے لیکن اگر آپ چاہیں تو شمس الدین محمد بن قیس الرازی کی المعجم فی معائیر اشعار العجم میں اس کی بحث ملاحظہ فرمائیں،

عزیز کی تشبیب اکثر جگہ بڑی پُر لطف ہے، بہار، شباب، ساقی، شراب کا ذکر اکثر جگہ ہے لیکن چونکہ یہ چیزیں محض رسماً کہی گئی ہیں، اس لئے ان میں اتنی لطافت پیدا نہیں ہو سکی، جو کہ عرفی یا قاآنی جیسے بہار آفریں شاعر پیدا کر سکتے تھے، تاہم اس میں شک نہیں کہ ایرانی بہار کا ذکر جس حسن و خوبی سے عزیز نے کیا ہو اردو میں بہ مشکل کسی اور شاعر کے یہاں نظر آئے گا، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ بلا کے ذہین تھے، اور کچھ

اس بنا پر کہ انھون نے متعدد اکابر شعراے فارسی کے قصائد کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا، اس پر مزید یہ کہ انھون نے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا تخمیناً پینتیس سال قصیدہ نگاری کی تھی، ایسے کہنہ مشق اور ذہین شاعر سے ایسی ہی تمہیدون اور تشبیہون کی توقع کی جا سکتی تھی، جو ان قصائد سے متعلق ہین :-

بہار آتے ہی ان کو ہو گیا ناز خود آرائی
لہو کچھ بڑھ گیا جب فصد دیوانون نے کھلوائی

کہان تک کی ہے اس طول شب فرقت نے خونریزی
جواب کاکل شبگون بنی ہے رات اندھیاری

بہار برشگال آئی کدھر ہے ساقی مہرو
جگا دے آج کی شب تو ذرا چلتا ہوا جادو

عروس شب نے جھلے مین بہ انداز حیا پردہ
نکالی معجر گلدوز بہر زینت ہیکل

کسی قصیدے کی تمہید مین آثار قیامت (ص ۹۶) بیان کئے گئے ہین، کہین بے ثباتی دنیا ہے، اور کسی جگہ موسم گرما کی تمازت (ص ۱۰۹) بیان کرتے ہوئے گریز پر آئے ہین، ایسے مضامین کے ساتھ گریز آسان کام نہین ہے، اور ہمین یہ کہنے مین تامل نہین ہے کہ انھون نے بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے، گریز کی لطافت کا رواج اس ملک مین بہت کم تو کیا اب ہے بھی نہین، جب کہ قصیدے ہی نہین رہے، تو اس کے لوازمات کیونکر رہین گے؟ تاہم عزیز نے تقلیدی اور رسمی قصیدہ گوئی مین بے شک کامیابی حاصل کی ہے لیکن اگر وہ محسن کاکوروی کو پیش نظر رکھتے، تو شاید زیادہ کامیاب ہوتے، کیونکہ محسن کی کامیابی کچھ اس وجہ سے نہین ہے، کہ انھون نے فارسی شعراء کی تقلید کی، بلکہ زیادہ تر ہندوستان کے مناظر قدرت کو تشبیب مین استعمال کیا تھا، جس کی تشبیب و گریز ہمیشہ ایک جدت لئے ہوئے تھا، اور پھر مناسب الفاظ کی رعایت، معنی آفرینی اور واقعات کی صداقت نے اُن کے کلام کو چار چاند لگا دئیے تھے،

(۳) تیسری خصوصیت اُن کا حسن تخیل ہے جس کی تشبیہات و استعارات کی ندرت کسی حالت مین بھی نظر انداز نہین کیجا سکتی، ان کا ایک شعر جو اخبار مدینہ کے سرورق پر ہوتا ہے، ضرور قابل ذکر ہے یعنی

معجزۂ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیان
مہ نے شق ہو کر لیا ہو دین کو آغوش مین

دیکھئے تخیل مین کتنی زبردست لطافت ہے؟

قمر کے شق ہونے کو دوسری جگہ کہتے ہین :-

قمر جو شق ہوا تھا جنبش انگشت حضرت سے
اُسی کے ڈر سے ہی کا ہیدگی کی اس کو بیماری

اب فوارے کے ابلنے کو دیکھئے :-

ہوئی باطل دے وہمن کی وہ تقویم پارینہ خزان کے نام سے آتی ہے فوارے کو ابکائی

سبزہ کے اُگنے، بیلون کے پھیلنے اور پھولون کے کھلنے کو کہتے ہین،

نگاہِ سبزہ نے مدِ زمین پر کروٹین بدلین اُدھر آغوش مین گلشن کے لی بیلون نے انگڑائی

جماہی آئی پھولون کو اُدھر ذکرِ صراحی کر اِدھر غنچون نے شاخون پر ہراک پوروں چٹکائی

ایک جگہ غنچے کے چٹکنے کو کہتے ہین :-

دلِ بلبل سے بھی آئی صدا الحمد للہ کی قریب آ بجو جس دم کسی غنچہ کو چھینک آئی

جگنو کے چمکنے کو کہتے ہین :-

حسینون کو دمِ گلگشت ہے یہ شغل دلچسپی قبائے سبز کے دامن مین باندھو جاتے ہین جگنو

ہلالِ عید کے نکلنے کو بیان کرتے ہین :-

کمان ہین جنبشِ ابروے ساقی کے تماشائی ہلالِ عید وہ لیتا ہوا نکلا ہے انگڑائی

اور کمان کی انگڑائی کو بھی دیکھئے :-

ہوئے ہین ڈر سے تیری تیغ کے سُست اسقدر حربے کمانین آج تک لیتی ہین قتِ جنگ انگڑائی

اسی حسنِ تخئیل سے اور بھی حُسنِ تعلیل دیکھئے،

جب اُن کے جسم کا سایہ امیر المومنین خود تھے زمین پر کس طرح پھر سایہ پڑتا جسم والا سے

ایک دوسری جگہ کہتے ہین :-

نہ ہوتا انفکاکِ سایہ گر جسمِ منور سے کہان یہ جا درِ مہتاب مین ہوتی ضیا باری

غرض کہ محُسن کاکوروی کی طرح اُن کے حُسنِ تخئیل کی بھی بے شمار مثالین جگہ جگہ نظر آتی ہین، اور جس طرح انھون نے لفظ مدینہ سے معجزۂ شق القمر کا حُسنِ تعلیل پیدا کیا ہے، اُسی طرح مصطفےٰ اور مرتضےٰ کے بیّنات تک اُنہی کی نظر پہنچ سکتی تھی، کہتے ہین :-

اتحادِ باطنی کی ہے یہی بیّن دلیل متحد ہین مصطفےٰ او مرتضےٰ کے بیّنات

بیّنات اُس کو کہتے ہین کہ حرُوف کا جو لفظ ہو اس مین پہلا حرف چھوڑ کر بقیہ حروف کے اعداد ابجد کے لحاظ سے نکالے جائین، چنانچہ الف جب ادا کرین گے، تو پہلا حرف نکال کر محض ل اور ف کے اعداد جوڑ لین گے یعنی اس طرح الف کے ایک سو دس ہوئے، با، تا، ثا، را، زا، وغیرہ کے پہلے حرف کو نکال دینے سے ان حروف کا

عدد ایک ہی ہے، اور سین، شین، عین، غین، کے عدد ساٹھ ہوئے، اسی طرح لفظ مصطفےٰ یا مرتضےٰ کے حروف
کے تلفظ میں سے اگر پہلا حرف نکال دیا جائے، تو جو حروف باقی بچیں گے، ان کا مجموعہ ۵۰ ہی بچے گا یعنی
دونوں لفظوں میں سے یہی اعداد باقی رہیں گے،

(۴) اب ہم عزیز کی چوتھی خصوصیت یعنی تلمیحات و مصطلحات کا مختصر تذکرہ بھی کرینگے، کیونکہ انھوں
نے اپنے قصائد کو شاندار بنانے کے لئے ان چیزوں سے بھی کافی کام لیا ہے، کہتے ہیں،

فَأتُوا بِسُورَۃٍ کا جب اشتہار نکلا عاجز ہوئے ادب کے دریا بہانے والے
آخر لبید نے بھی کی ترک بُت پرستی حیران تھے شاعری کے جھنڈے اڑانے والے

پہلے شعر میں سورۃ البقرہ کی تیئسویں آیت کی طرف اشارہ ہے، جس میں تمام دنیا کو ہمیشہ کیلئے
خدا کی طرف سے چیلنج ہے، کہ اگر تم کو اُس (قرآن) پر شک ہے، جو ہم نے اپنے بندہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل
کیا، تو بنالاؤ اس جیسی کوئی سورۃ،...... الخ

دوسرے شعر میں عرب کے مشہور شاعر لبید کی طرف اشارہ ہے جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے،
یہ وہی شاعر ہیں جن کے اس مصرع کی تعریف جیسا کہ بخاری شریف میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَّا خَلَا اللّٰہِ بَاطِل

حق تعالیٰ کے سوا جو کچھ کہ ہے باطل ہے

ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے متعلق مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی کا اشارہ کیا ہے،

لگا کے کحل مازاغ البصر چشم بصیرت میں اگر ہو دیکھنا خلوت سرائے عشق کا منظر

اسی طرح ان اشعار میں بھی اس قسم کی تلمیحات ہیں :-

چلی ہی آتی ہے پیہم صدائے اُدْعُونِی عزیز ہاتھ اٹھا پیش خالق ذوالمن
صبغۃ اللہ کی بنیاد نہ قائم رہتی گر یزید ستم آرا سے یہ کرتے بیعت
مَنْ لَّہٗ جَدٌّ کَجَدِّی فِی الْوَرٰی کس نے کہا کون ازل سے تھا رجز خوان حسبِ اجداد کا

غرض کہ اس طرح کی تلمیحات بہت جگہ ہیں، اور دیگر شاندار الفاظ و مصطلحات بھی صفحات ۷-
۲۶-۵۵-۵۶-۹۰-۱۰۱،۱۰۲،۱۰۷-۱۶۱-۱۶۳-۱۹۹-۲۰۰-۳۲۰- وغیرہ پر ملتے ہیں، جن کو طوالت
کے خوف سے چھوڑا جاتا ہے،

(۵) پانچوین بات جو ان کے بیان ہے، وہ اُن کے عقائد کی تشریح ہے، ایک جگہ ذرا صاف کہہ گئے ہین،

کسی کو برتری نہین ہو شوہر بتول رضؓ سے
تفوق آپ دیتے ہین بھلا کین اصول کو

علیؑ کا نسبتہً شرف صحابہ رسولؐ سے
حواس کو مناسبت ہو جس طرح عقول کو

حواس بھی ہمیشہ جو معطل اپنے کار مین

ایک شاعر کو اس قسم کی چوٹ کرنے کی ضرورت نہین تھی، کیونکہ اُس کا کلام کسی ایک فرقے کے لئے نہین ہوتا، اور خصوصاً اس زمانے مین اس قسم کے طنز سے اور زیادہ احتراز کرنا چاہئے جب کہ غیر قومین جن مین اتحاد کا سبق ہی مفقود تھا، متحد ہو رہی ہین، اور پھر بھی ہم کو شرم نہین آتی، لیکن ایسے ایک دو موقعون (۸۰۔ ۱۴۴) کے علاوہ جہان کہین بھی عزیز نے اپنے مخصوص عقائد کا اظہار کیا ہے، وہ شاعرانہ انداز کی وجہ سے ایسا چھپا ہوا ہے، کہ جن لوگون کو اُن کے عقائد سے تعلق نہین ہے، وہ بھی متاثر ہوتے ہین، مثلاً دیکھئے "خلق" کے پردہ مین کس خوبی سے کہا ہے :-

خلیق ایسے کہ سب اصحاب کو اپنا سمجھتے تھے
ٹپکتی ہے محبت نقرۂ سلمانؓ منّا سے

ایک جگہ "آفرینش" کی ازلی یا نسلی نسبت کے متعلق کہتے ہین، :-

حدیثِ آفرینش میری کچھ معلوم ہو تجھ کو
ہم اک نور سے پیدا ہوا مین اور مرا بھائی

ان کے مختلف عقائد کی طرف اشارہ صفحات ۱۵۔ ۳۰۔ ۸۰۔ ۸۹۔ ۹۵۔ ۱۶۶۔ وغیرہ مین بھی ملتا ہے لیکن اکثر جگہ شاعرانہ لطافت کی وجہ سے بڑی خوبی سے کہہ کر گذر جاتے ہین، اور یہ اُن کی ذہانت کی دلیل ہے،

یہان تک ان کی خصوصیات شعری ختم ہوئین، اب ہم مختصر الفاظ مین تصویر کا دوسرا رُخ بھی دکھانا چاہتے ہین لیکن اس وجہ سے نہین کہ

ع ہنر اس دور مین ہے عیب بینی (مقدمہ)

بلکہ اس وجہ سے کہ

ع گردشین باقی نہ رکھین پھر زمانہ کے لئے

عزیز نے ایک جگہ کہا ہے :-

ع گروہِ انبیار ہو یا ملائکہ کا اژدہام

اس مین آخر لفظ زائے فارسی اور ہائے ہوز کے ساتھ ہے، لیکن یہ غلط ہے اصل لفظ عربی ہے اور ازدحام ہی صحیح ہے،

ہمارے یہان بعض الفاظ ایسے بھی ہین، جو اصل مین جمع ہین لیکن واحد ہی مستعمل ہین، مثلاً احوال جو فارسی مین توخیر، اردو مین بھی وَلی کے زمانہ سے اب تک اکثر واحد ہی مستعمل ہے، اسی طرح اولاد بھی ہے، یعنی واحد مونث، جیساکہ عزیز نے اُسے اُردو جمع مین استعمال کیا ہے :-

ع عبا مین لے کے اپنی پاک اولادون کو یک دن

لیکن اعمال جو ہمیشہ جمع ہے، اس کی جمع الجمع اردو مین بنانے کی ضرورت نہین تھی، عزیز کہتے ہین :-

ع سیاہا پنے اعمالون کا بھی تونے کبھی دیکھا

ایک جگہ "تم بھی ہے اور فرمایئے" بھی ہے، یہ بات نسیم کے عہد تک ضرور تھی، لیکن اب لکھنو مین نہین ہے اور نہ ہونا چاہئے، عزیز کہتے ہین :-

مین نے کہا یہ وصل تو ثابت ہو مری جان کیا بھول گئے تم شب معراج کے حالات
فرمایا کہ ابرو تھے دہان بھی تو کشیدہ تھے دونون کمانون مین جدائی کے اشارات
مین نے کہا فرمایئے خلوت مین ہوا کیا فرمایا یہ ہین راز نہ کر ایسے سوالات

اور اسی مین یہ بھی ہے کہ

ع یہ تو مجھے بتلایئے اے قبلۂ حاجات

عموماً بھائی کو قوتِ بازو کہا جاتا ہے، لیکن عزیز نے بیٹے کے لئے استعمال کیا ہے :-

یہ اللہ سا ہے شوہر اور محمد سا پدر جس کا ملے ہین شبر و شبیر سے دو قوت بازو

لیکن آگے چل کر صحیح فرمایا ہے کہ

ع یہی وہ صابرہ ہے جس کا زخمی کردیا پہلو

اسی طرح ہندی لفظ سوارت جو بروزن فعلن ہے، عزیز نے فعولن کے وزن مین استعمال کیا ہے

ع بہت جلد اب سوارت میری محنت ہونے والی ہے

اور یہ اجتناب واقعی ضروری ہے، اور اردو مین یونہی چاہئے، کیونکہ ہندی کا مرکب ہمارے یہان ابتدا ہی سے نہین

آتا، البتہ "ی" سے مل کر ضرور آتا ہے، جیسے کیا" "دھیان" "جیونی" وغیرہ، اور فارسی کا بھی آجاتا ہے، مثلاً خواہش، "خواجہ" وغیرہ،

حضرت عزیز نے عام مروجہ استعمال کے خلاف ذرا سے ذری دو جگہ ص ۱۹۵ پر استعمال کیا ہے جو صحیح ضرور ہے لیکن اب اس کا متروک ہی ہونا بہتر ہے، اور کہین کہین انھون نے امیر مینائی کی طرح دہلوی زبان بھی استعمال کی ہے، مثلاً

دکھانی تھی مجھے قوت عزیز مدح گستر کی

اسی سلسلے مین ایک بات اور کہنا چاہتا ہون جو مجھے بھی کھٹکتی ہے، پہلے عرض کیا جاچکا ہے، کہ عزیز نے نئے نئے موضوعات بھی تلاش کئے ہین، جن مین سے ایک "عروسی فاطمہ" بھی ہے، اس مین کچھ اشعار ایسے بھی ہین، :-

مراد معنوی نور علیٰ نور آئی دنیا مین | کہ ہون گے آج کی شب نور کے دونون ہم بستر
صدا آئی عزیز بادہ کش کیون اتنا حیران ہے | مری آغوش مین ہے تیرا ساقی دیکھ لے آکر

اس قسم کی شاعری کے لئے جامی (یوسف وزلیخا) وغیرہ سے جواز کا فتویٰ نکالنا کم از کم میری نظر مین بیجا ہے، اور جب عقیدہ ہمارا یہ ہو کہ ایسی پاک ہستیون پر ہماری مان بہنین بھی قربان ہون، تو اس وقت ایسے اشعار کا لکھنا تو بالکل نازیبا ہے، بہرحال عزیز کی اعلیٰ شعریت کے بیان کے ساتھ ان باتون کا تذکرہ تنقیص و تعریض کے لئے نہین ہے، بلکہ اس لئے کہ

ع نظمِ رنگینِ عزیز نکتہ پرور دیکھئے

عزیز لکھنوی کا ایک شعر

(۱) کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

مخدومی السّلام علیکم

آپ کا بڑا کرم ہے کہ آپ نے میرا مضمون اسی ماہ کے شمارہ میں شائع فرما دیا، اس کے صفحہ ۳۰۱ پر عزیز کا مشہور شعر نقل ہوا ہے :-

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں　　مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

میرا خیال تھا کہ یہ خیال عزیز کو سب سے پہلے پیدا ہوا ہوگا، لیکن مخدومی قبلہ نواب صدر یار جنگ علامہ محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی مدظلہٗ کا گرامی نامہ کل ملا، جس میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ مضمون خالص کے یہاں پہلے تھا، وہ گرامی نامہ ملفوف کرتا ہوں، آپ مناسب سمجھیں تو دسمبر ہی کے معارف میں اسے شائع فرما دیں تاکہ دوسرے حضرات کو بھی معلوم ہو سکے، کہ وہ مشہور شعر عزیز کا نتیجہ تخیل نہیں ہے بلکہ وہ پہلے سے موجود تھا، کرم ہوگا،

والسّلام　　ناچیز غلام مصطفےٰ خان،

(۲) حبیب گنج علی گڈہ　۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء

گرامی قدر سلمہ، - ابھی تمھارا مقالہ عزیز لکھنوی پر پڑھکر معارف ہاتھ سے رکھا ہے، حسب معمول خوش گفتنی و درسفتنی،

ایک عجیب اتفاق ہے عزیز کا ایک بہترین شعر فارسی شعر کا بجنسہٖ گویا ترجمہ ہے،

عزیز، معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں　　مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

خالص، در لفظ مدینہ دیدم از معجزات عیاں　　مہ شق شدہ گرفتہ دین را بہ میاں

زندہ باش　　حبیب الرحمٰن ؏

اقبال سہیل میری نظر میں

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی وکیل

بیاورید گر ایں جا بود سخندانے — غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اقبال سہیل میرے ہموطن اور عزیز خاص تھے، اس لیے فطری طور پر مجھکو ان کی دائمی مفارقت کا رنج و افسوس ہے، لیکن آج مجھکو ایک خاص ملال ہے، اور یہ ملال مجھکو اکثر ان کی زندگی میں بھی رہا ہے، قدرت نے ان کو ایک غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا جس سے اگر وہ صحیح طور پر کام لیتے، تو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ علامہ شبلی کا صحیح معنوں میں کوئی جانشین نہیں ہے، لیکن ان کے مزاج کی ناوابستگی کو کیا کہا جائے کہ ایک مدت تک وہ اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ انھوں نے علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین کی علم پرور صحبتوں سے جو متاع گراں ارزاں حاصل کی ہے، اس کو کس طرح صرف کیا جائے، لیکن جب طبیعت میں کچھ استقلال پیدا ہوا، اور فیصلہ کا وقت آیا تو انھوں نے جو فیصلہ کیا وہ علمی و ادبی دنیا کے لیے ایک عبرتناک حادثہ ہے، مجھکو یقین ہے کہ وہ جب احاطۂ عدالت میں جہاں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنا بہت بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، قدم رکھنے کا ارادہ کر رہے تھے، تو کارکنانِ قضا و قدر نے ضرور صدا دی ہوگی کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے" لیکن افسوس ہے کہ ان پر کچھ ایسی غفلت طاری رہی کہ ان کا ضمیر اس صدائے غیبی سے متاثر نہ ہو سکا، اور وکالت کا عذاب نازل ہو کر رہا جس کی بدولت ان کی حیرت انگیز استعداد و قابلیت کی حقیقی

شان دنیا کے سامنے جلوہ گر نہ ہو سکی اور علم و فن کو اپنی بد نصیبی کا ماتم کرنا پڑا، حالانکہ خدا نے ان کے دماغ کو جو گوناگوں صلاحیتیں عطا کی تھیں، ناممکن تھا کہ کوئی علمی و ادبی ادارہ ان کے خیر مقدم کے لیے تیار نہ ہوتا۔

علاوہ عربی و فارسی کے مرحوم انگریزی کے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن ناظرین کو شاید معلوم نہ ہو کہ انگریزی کی طرف ان کی مستقل توجہ اس وقت ہوئی تھی، جب وہ عربی و فارسی کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، یہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن اپنی غیر معمولی فطری ذہانت کی بدولت ان کو کسی راہ میں ناکامی کا سامنا کرنا نہیں پڑا جس میدان میں قدم رکھا جس محفل میں پہنچے پرچم اقبال ہمیشہ ان کے سر پر لہراتا رہا، غرض ان کی بلند نظری اور عالی دماغی نے ان پر حریف مقابل کا رعب کبھی طاری ہونے نہیں دیا، ان کا انداز ہمیشہ فاتحانہ ہی رہا، ان کے مخاطب کو محسوس کرنا پڑتا تھا کہ ان کو خاموش کرنے کے لیے معمولی اور سطحی دلائل کچھ کام نہیں دے سکتے۔

مرحوم مجھ سے عمر میں بارہ تیرہ سال بڑے تھے لیکن جہاں تک انگریزی تعلیم کا تعلق تھا، وہ میرے ہم سبق تھے، ۱۹۱۴ء میں ایف، اے پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے، جہاں چار سال تک میرا ان کا ساتھ رہا، یہاں ان کی حیثیت ایک گوشہ نشین طالب علم کی نہیں تھی، بلکہ ہر موقع پر ان کی فطری ذہانت کے جلوے لوگوں کو نظر آتے رہے، غرض جب تک علی گڑھ میں ان کا قیام تھا، کالج کا ہر شعبۂ حیات ان کی شخصیت سے نمایاں طور پر متاثر ہوتا رہا، سیاسی، علمی، ادبی کوئی مجلس ایسی نہیں تھی، جہاں اس جوہر قابل کی تابانیوں سے نگاہیں خیرہ نہ ہوئی ہوں۔

۱۹۱۸ء میں مرحوم قانون پاس کر کے وطن واپس آئے اور نہایت مستعدی کے ساتھ وکالت شروع کی جس کا سلسلہ وفات سے تقریباً دو سال قبل تک برابر قائم رہا، ذہانت اور قوت تقریر کی بدولت ان کو اپنی کامیابی کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا چنانچہ بہت جلد ان پر زر و سیم کا

کی بارش ہونے لگی، لیکن اس حال میں بھی ان کی بلند نظری اور عالی حوصلگی قائم رہی، یعنی ان کا دل حبِ دولت کی معصیت سے ہمیشہ پاک رہا، چنانچہ جب بیمار ہوکر وکالت کے کام سے معذور ہوئے تو ان کی حیثیت ایک مفلس قانع کی تھی، مجھکو ان کی اس تہی دستی اور بے نوائی کا غم نہیں، کیونکہ مال و زر جمع کرنیوالوں کو قرآن مجید نے جس عذاب الیم کی بشارت دی ہے، اس سے وہ یقیناً محفوظ ہوں گے، البتہ حمنستان شعر وادب کے اس بلبل رنگین نوا کو عدالتوں میں دیہاتی جہلا کے ساتھ جرح میں الجھتے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے گردشِ روزگار کا عجیب عبرتناک منظر نظر آتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہو کہ خدا کی طرف سے کوئی ناانصافی نہیں ہوتی، بلکہ انسان خود اپنی صلاحیتوں پر ظلم کرتا ہے، ممکن ہے کہ مرحوم اپنی وکالت کی کامیابی سے خوش رہے ہوں، لیکن ایک ایسا دماغ جس کی نکتہ سنجیوں سے علم و فن کے بہت کچھ حقایق بے نقاب ہو سکتے تھے، اس کے لیے عدالتی مقدمات کی ترتیب کوئی ایسا کمال نہیں تھا، جس پر فخر کیا جا سکے، ان کا اصلی سرمایۂ فخر و ناز ان کی وہ گوناگوں دماغی خصوصیات تھیں، جن کی کوئی مستقل یادگار دنیا کو نصیب نہ ہو سکی، پھر بھی باوجود اپنی فطری تساہلی اور بے اصولی کے وہ کچھ اپنے نتائج افکار چھوڑ گئے ہیں، جو اپنے اندر ارباب فن کے لیے علمی اور ادبی حیثیت سے ذوق و لذت کا بہت کچھ سامان رکھتے ہیں، اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے غلط روی اختیار نہ کی ہوتی، تو وہ علم و ادب کے افق پر سہیل نہیں بلکہ آفتاب بن کر چمکتے۔

اگرچہ مرحوم نے کوئی مستقل علمی تصنیف نہیں کی، لیکن وہ تمام قابلیتیں جو ایک کامل الفن مصنف کے لیے ضروری ہیں، ان میں موجود تھیں، وہ فطرۃً فلسفی تھے، ان کا دماغ خالص فلسفیانہ تھا، فلسفہ غالباً پڑھا بھی تھا، جس کا اندازہ ان کے طرز استدلال سے کافی طور پر ہوتا تھا، وہ کسی علمی مسئلہ پر اپنے نقطۂ خیال کی تائید میں جو دلائل پیش کرتے تھے وہ سطحی اور عامیانہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان میں ایک خاص قوت اور گہرائی ہوتی تھی، طبیعت میں جدت و اجتہاد کا مادہ بھی تھا، شاہراہ عام سے

الگ ہو کر ہمیشہ دقیق نکتے پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، نظر بھی تنقیدی اور محققانہ پائی تھی، جو اصل حقیقت تک بہت جلد پہنچ جاتی تھی، زود فہمی اور انتقال ذہنی کا یہ عالم تھا کہ اِدھر اُدھر سے کچھ ورق گردانی کرکے کتاب کے اصل موضوع پر کامل عبور حاصل کر لیا کرتے تھے، نکتہ چینی میں معیار کی بلندی ہمیشہ پیش نظر رہتی تھی، خیالات کا دامن ابتذال و پستی سے کبھی آلودہ ہونے نہیں پاتا تھا، ذہانت کے علاوہ مرحوم کا حافظہ بھی عجیب و غریب تھا، جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، تعلیم کا زمانہ ختم کرنے کے بعد غالباً مطالعۂ کتب کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی لیکن جو کچھ پڑھا تھا، وہ سب اخیر وقت تک دماغ میں محفوظ تھا، چنانچہ کسی مسئلہ پر بحث و استدلال کے لیے ان کو کتاب کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، صرف اپنی قوت حافظہ سے کام لے کر سامع کو حیرت میں ڈال دیتے تھے، ہر موضوع پر خواہ اس کا تعلق مذہب سے ہو، سیاست سے ہو، یا علم و ادب سے، ان کی ہمہ گیر طبیعت یکساں حاوی تھی، عام معلومات کا ذخیرہ بھی کم نہ تھا، ان گوناگوں اوصاف کے ساتھ ایک سحر طراز اور ریز رقلم بھی ہاتھ آیا تھا، جس کی ادیبانہ طرز نگارش دیکھ کر شعر العجم کے مصنف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، غرض کسی چیز کی کمی نہیں تھی، کاش طبیعت میں کسی قدر استقلال ہوتا، تو وہ ایک نکتہ سنج اور دقیق النظر مصنف کی حیثیت نہایت آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے تھے،

مرحوم نے اگرچہ نثر نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، طبیعت کا رجحان زیادہ تر شاعری ہی کی طرف رہا، تاہم ان کے انشاء پردازانہ کمال سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا، کبھی قلم اٹھاتے تھے تو اس کی رعنائی اور برجستگی پر حیرت ہوتی تھی، ہر فقرے سے ایک بلند پایہ اور کہنہ مشق ادیب کی شان نظر آتی تھی، اس موقع پر مرحوم کا وہ فاضلانہ تبصرہ یاد آ گیا جو انھوں نے اصغرؔ کے مجموعۂ کلام نشاطِ روح پر لکھا تھا، جس کو میں نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا تھا، یہ تبصرہ کتاب کے ۵۰ مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے، جس کو پڑھنے کے بعد مرحوم کی دقتِ نظر اور ادیبانہ قابلیت کے لیے کسی مزید ثبوت کی

ضرورت محسوس نہیں ہوتی، شاعری کی حقیقت اکثر زیر بحث رہی ہے، اس کے ارکان و عناصر پر اساتذۂ فن نے مختلف انداز سے اظہار خیال کیا ہے، لیکن اس پامال موضوع پر بھی تبصرہ کے ابتدائی صفحات میں مرحوم نے اپنا جو زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے، اس کی شان کچھ مجتہدانہ نظر آتی ہے، شاعر کے لطیف اور نازک محاسنِ کلام پر جس بلیغ اور محققانہ اندازِ بیان کے ساتھ تنقید کی ہے، اس سے ان کی غیر معمولی قوتِ نقد کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے۔

ادبی دنیا میں وہ عام طور پر ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ان کی سخن سنجی کی صلاحیت تھی، ان کی ناقدانہ نظر جس تیزی کے ساتھ دقیق سے دقیق شعر کے اصل مفہوم اور اس کے محاسن و معائب کی تہ تک پہنچتی تھی، اس کی مثال ان کے ہمعصر اہلِ فن میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ میں ذاتی واقفیت کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ وہ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار تھے، غالب کے دقیق فلسفیانہ اشعار کی تشریح میں نے اکثر ان کی زبان سے سنی ہے، ان لطیف نکتوں تک جن پر وہ روشنی ڈالتے تھے، دیگر شارحین کی نگاہ غالباً مشکل سے پہنچ سکتی ہے۔

دماغ کی فلسفیانہ ساخت نے مرحوم کی فکر و نظر کو نہایت دقت پسند بنا دیا تھا، مذاق عام کی راہوں سے ہمیشہ بچ کر ان کا قدم اٹھتا تھا، شعر میں جب تک عام فہم سے ماورا کوئی لطیف بات نہ کہی گئی ہو ان سے خراجِ تحسین وصول کرنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن تھا، ان کی نگاہیں جو ہمیشہ اسرارِ حقیقت کے مخفی جلووں کی متلاشی رہتی تھیں، محض تماشائے لبِ بام سے کیف اندوز نہیں ہو سکتی تھیں، ان کا قول تھا کہ وہ شعر شعر نہیں جس کا مفہوم کچھ دماغی غور و فکر کا طالب نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا میں وہ سب سے زیادہ غالب کے مداح اور گرویدہ تھے، اور یہ ان کے ذوقِ بلند کی بہت بڑی دلیل تھی، ان کا جدت آفریں مذاق ہمیشہ یہی صدا دیتا رہا "نمی رویم براہے کہ کاروان رفت است" انکی چشمِ بصیرت میں ہمیشہ اسی ادعا کا سرور تھا

"ہر جلوۂ مرا نہ تواند فریب داد پروانۂ چراغ سرِ طور بودہ ایم"

ناظرین شاید جاننا چاہیں گے کہ وہ "چراغ سرِ طور" کہاں تھا جس سے سہیل نے اکتساب نور کر کے بزم سخن کو ایک نئے انداز سے جگمگا دیا، اس کا جواب خود ان ہی کی زبان سے سننا چاہیے، چنانچہ ایک فارسی قصیدہ کے ابتدائی اشعار میں بظاہر کچھ اپنی مدح سرائی کر کے اصل مرکز فیض کی طرف یوں رجوع کرتے ہیں:

گمان خویش ستائی بمن مبر کہ بود مدیح من ہمہ راجع بہ ذات نعمانی

گرت شگرفی نقشے در آورد بہ شگفت رسد بہ خامۂ نقاش آفرین خوانی

زمین جبۂ فیضان شبلی است کہ من بہ قطرۂ بنو سیم براتِ عمانی

زفیض تربیتش این سہا سہیل شد آہ وگرنہ نامرہ نقدم بہ ہیچ نستانی

ان اشعار نے اب قلم کی رو مرحوم کی شاعرانہ حیثیت کی طرف پھیر دی ہے جس کا حق ادا کرنے کے لیے ایک مبسوط تبصرہ درکار ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجایش نہیں، تاہم کچھ اظہار خیال کیے ہوئے بغیر قلم آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے،

سہیل کے ہمہ گیر دماغ کو غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی، جب اور جو کچھ لکھنا چاہتے تھے، ان کے قلم کی روانی اور برجستگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا. غیر معمولی قوت نظم کے علاوہ عربی اور فارسی تعلیم کی بدولت ان کے دماغ میں ہر قسم کے فصیح و بلیغ الفاظ اور لطیف و نازک ترکیبوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا، اس لیے شاعری کے کسی میدان میں ان کے طائر خیال کو عجز و درماندگی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا اصلی تماشا گاہ قصیدہ ہی کا میدان تھا، جہاں کسی اور کو ان کے سامنے حریف مقابل بن کر کھڑے ہونے کی مشکل سے جرأت ہو سکتی تھی، یہ محض عزیزانہ محبت کا جوش نہیں ہے، بلکہ ایک روشن حقیقت ہے جس سے کوئی صاحب نظر قصائد میں ان کی قوتِ تخئیل کی سحر کاریوں اور انداز بیان کی رعنائیوں کا ہوش ربا منظر دیکھ کر انکار

نہیں کرسکتا، ایران کا مغرور عرفی زندہ ہوتا تو ہم اپنے اس خاکسار ہندی نژاد عرفی کو اس کے سامنے نہایت فخر کے ساتھ پیش کرسکتے تھے، پھر اس کو غالباً تسلیم کرنا پڑتا کہ اس نے اپنے اس شعر میں

اقبال سکندر بہ جہانگیری نظمم	برداشت بہ یک دست علم را و قلم را

جس فخر کا اظہار کیا ہے، وہ اس کا تنہا مستحق نہیں تھا،

غزل گو شعرا کی طرح سہیل کی شاعری کسی ایک خاص موضوع تک محدود نہ تھی، وہ فطرۃً شاعر پیدا ہوئے تھے، اس لیے جب کوئی موثر واقعہ یا منظر پیش آتا تھا، تو بے اختیار ان کے سحر طراز قلم میں جنبش پیدا ہو جاتی تھی، اور پھر وہ جنبش ایک موج گہربار بن کر نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تھی، یوں تو انکی ہر قومی، ملّی، اور سیاسی نظم جس سے ان کے شاعرانہ احساس کی تپش اور وسعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، ایک کامل الفن شاعر کا نتیجۂ فکر ہے، ممکن ہے کہ قومی یا سیاسی شاعری کے میدان میں سہیل کا کوئی حریف نکل آئے، لیکن نعت کی بزم تجلی میں افراط و تفریط سے محفوظ رہ کر جس احتیاط اور جذبۂ احترام کے ساتھ انھوں نے اپنے اخلاص و عقیدت کی نذر پیش کی ہے، اس کی مثال سے اردو شاعری اب تک خالی ہے، اس کی تصدیق کچھ ان کے کلام ہی سے ہوسکتی ہے، چنانچہ ایک نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار ہم نقل کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ وہ ذاتِ اقدس کن کمالات کی جامع تھی، جس کی روحانی جلالت و عظمت کے سامنے کفر و باطل کے قصر ہائے فلک بوس پست ہو کر رہ گئے تھے، ملاحظہ ہو:

محمدؐ وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی	محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی
محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستین کلکِ فطرت کا	محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی
وہ فاتحؐ جس کا پرچم اطلسِ زنگاری گردوں	وہ امیؐ جسکے آگے عقل کل طفلِ دبستانی
وہ رابطؐ عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے	وہ فارقؐ زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی
وہ ناطقؐ جسکے آگے مہر برلب بلبل سدرہ	وہ صادقؐ جسکی خوشگوئی کا شاہد نطق ربانی

وہ عادلؑ جسکی میزان عدالت میں برابر تھے — غبارِ مسکنت ہو یا وقارِ تاجِ سلطانی

وہ جامعؑ جس نے یکجا کر دیئے بکھرے ہوئے دانے — مٹا دی جس نے آکر باہمی تفریقِ انسانی

وہ گنجورِ معارف جسکے اک اک حرف میں پنہاں — نکاتِ فلسفی، اسرارِ نفسی، رازِ عمرانی

وہ کشافِ سرائرؑ جس نے کھولا چند اشاروں میں — علومِ اولین و آخرین کا گنجِ پنہانی

یہ نہایت سیر حاصل قصیدہ ہے، جس کا پورا لطف شروع سے آخر تک پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے محض چند اشعار پر اکتفا کرنا پڑتا ہے لیکن اسی قصیدہ میں اصل نعت کے بعد سہیل کے خامۂ رنگیں نگار نے معراج کے پُر اسرار منظر کی جو تصویر پیش کی ہے، دل گوارا نہیں کرتا کہ ناظرین کو اس سے بالکل محروم کر کے آگے بڑھ جاؤں پہلے ہی شعر میں روحانی و جسمانی بحث کا خاتمہ کر دیا ہے۔

وہ جسمِ پاک خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی — تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

آگے چل کر اس مشکل کو اور زیادہ آسان کر دیتے ہیں

براقِ برق پیکر لے چلا یوں ذاتِ انورؐ کو — فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضورؐ اس طرح گذرے ہوں گے گنبد مینائے گردوں سے — نظر جس طرح شیشے سے گذر جائے بآسانی

یہ لطیف و نازک تشبیہ کتنی مسکن دلیل ہے کہ اس کے بعد دل کو عقلِ موشگاف کی کاوش بے جا سے نجات مل جاتی ہے، اور یقین و ایمان کے غبار آلود نقوش چمک اٹھتے ہیں۔

عام نعت گویوں نے اتنا ضرور بتایا کہ براق و جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر رک گئے، اس سے آگے قدم رکھنے کی مجال نہ تھی، لیکن یہ نہ بتا سکے کہ پھر اس کے بعد بارگاہِ قدس تک پہنچانے کا نازک فرض کس کے سپرد ہوا، اس کا ادراک صرف سہیل ہی ایسے عالی نظر شاعر کی قوتِ متخیلہ کر سکتی تھی۔ ملاحظہ ہو:

براق و جبرئیل آخر رکے سدرہ کی منزل پر — کہ تھی یہ انتہائے سرحدِ تسلیمِ امکانی

یہاں سے لے چلیں پھر آپؐ کو موجیں تجلی کی — وہ رفرف ہو کہ انوارِ ازل کا جوشِ فیضانی

سواد لامکاں تک رک گیا رفرف کہ اسکو بھی — کہاں اس خلوتِ وحدت میں اذنِ گرم جولانی

کسی نے لے لیا خود بڑھ کے آغوشِ محبت میں — ہوا ملک قدم خلوت سرائے حسن امکانی

علاوہ جوشِ عقیدت کے جس سے سہیل کی تمام نعتیہ نظمیں لبریز ہیں، ناظرین ان کی صحیح المذاقی، قادر الکلامی اور علمی تبحر کا کچھ اور سماں دیکھنا چاہیں تو ان کی وہ آخری نظم ملاحظہ کریں جس کا نام ان کی بلاغت شناس طبیعت نے "موج کوثر" رکھا تھا، یہ کوئی نمائشی نام نہ تھا، پوری نظم پڑھنے کے بعد مذاق سلیم کو اس اعتراف میں تامل نہیں ہو سکتا کہ وہ دراصل حقائق و معانی کا ایک سرچشمہ تھا، جو وجد و حال کے کسی عالم خاص میں شاعر کے قلب و روح کی گہرائیوں سے نکل کر نامحدود تابانیوں کے ساتھ شگاف قلم سے ابل پڑا تھا،

شروع سے آخر تک اس نظم کے جمالِ معنوی اور شوکتِ الفاظ کا جو عالم ہے، اس کا اندازہ ناظرین ذیل کے چند اشعار سے کر سکتے ہیں:

احمد مرسل فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم — مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

جسم مزکی، روح مصور، قلب مجلی، نور معطر — حسن سراپا خیر مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

طینت جس کی سب سے مطہر، بعثت جس کی سب سے موخر — خلقت جس کی سب پہ مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

فرد و جماعت، امر و اطاعت، کسب و قناعت، عفو و شجاعت — حل کیے جو اسرار تھے مبہم صلی اللہ علیہ وسلم

ربط و تصادم، طوع و تحکم، فقر و تنعم، عدل و ترحم — سب کے حدود و بتائے باہم صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا میں جس نے ساتھ انی کی جنگ میں جس نے جہانبانی کی — زہد و سیاست کر دیئے توام صلی اللہ علیہ وسلم

وہ مصداق دنیٰ فتدلیٰ، جس کی منزل عرش معلی — نکتۂ "ما ادنیٰ" کا محرم صلی اللہ علیہ وسلم

جتنے فضائل، جتنے محاسن ممکن میں ہو سکتے تھے ممکن — حق نے کیے سب اس میں فراہم صلی اللہ علیہ وسلم

علم لدنی، شان کریمی، خلق خلیلی، نطق کلیمی — زہد مسیحا، عفت مریم صلی اللہ علیہ وسلم

بندۂ او خدا سے واصل، خاکی اور انوار کا حامل — امی اور اسرار کا محرم صلی اللہ علیہ وسلم

صد امم سلطان مدینہ وہ جسکے کفِ پا کا پسینہ گل کدۂ فردوس کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

اتنی مشکل ردیف اور بحر میں ایک طویل نظم لکھنا، اور کہیں سے الفاظ کی نشست، فقروں کے دروبست اور بندش کی چستی میں فرق نہ آنا، کیا شاعرانہ کمال کی دلیل نہیں ہے؟

اسی سلسلہ میں ناظرین سہیل کے اس مخمس قصیدہ کے بھی چند بصیرت افروز اشعار سن لیں جو انھوں نے ولادت نبویؐ پر لکھا تھا۔

بہارستانِ ہستی کے لیے دورِ شباب آیا رگِ فطرت میں ریعانِ نمو کا اضطراب آیا
نظامِ آفرینش کو پیامِ انقلاب آیا فضائے کن فکاں میں پرچمِ ختمی مآب آیا
شہنشاہِ دو عالم، مہبطِ ام الکتاب آیا

وہ موجِ بے قرار اٹھی جو عمانِ تجلی سے زمانہ جگمگا اٹھا ہر فیضانِ تجلی سے
شبستانِ جہاں روشن ہوئی شانِ تجلی سے ہوئی ظلمت گریزاں جوشِ طوفانِ تجلی سے
رسالت کے افق پر نورِ حق کا آفتاب آیا

شوارعِ سرمدی جسکی جبینِ پاک پر رقصاں جمالِ ایزدی جسکے فروغِ حسن سے رخشاں
فضائے قدس کا ہر جلوہ جس کے نور پر قرباں بسیطِ خاک کا ہر ذرہ جس کا تابعِ فرماں
وہ سلطان الامم آیا وہ مختارِ رقاب آیا

وہ آئینہ دکھایا جس نے عکسِ روئے جاناں کو نمایاں کر دیا جس نے فروغِ حسنِ پنہاں کو
عطا کی دولتِ نظارہ جس نے دیدۂ جاں کو چراغاں کر دیا جس نے تجلی گاہِ امکاں کو
وہ جلوہ اب جمالِ احمدی میں بے نقاب آیا

معارف کا خیاباں تازہ جسکی رشحہ باری کر مکارم کو چمن شاداب جسکی آبیاری سے
تمنا سا جس نے عالم کو کیا توحید باری کر دلوں کی کھیتیاں سرسبز جسکے فیض جاری سے
وہ دریائے کرم آیا وہ رحمت کا سحاب آیا

اس مبارک موضوع پر اور بھی نظمیں ناظرین کی نظر سے گذری ہوں گی لیکن یہ پرشکوہ، بلیغ اور پرکیف انداز بیان اور کہیں غالباً نظر نہ آیا ہوگا، میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ ان روح پرور نغموں پر عالم قدس کی فضا بھی جھوم اٹھی ہوگی،

مذکورۂ بالا اشعار سے ارباب بصیرت نے سہیل کی نعتیہ شاعری کی ایک خاص خصوصیت کا اندازہ کیا ہوگا یعنی باوجود انتہائی جوش عقیدت کے یہ نازک حقیقت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے کہ جس کی مدح سرائی میں ان کا قلم اٹھا ہے، وہ خدا نہیں ہے، خدا کا بندہ ہے جس کو نبوت کا اعلیٰ ترین درجہ عطا کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ نعت گو شعرا کو عام طور پر اس نزاکت کا احساس نہیں ہوتا، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ عبدیت و نبوت کی شان کے منافی قلم سے ایک لفظ بھی نکل جانا ناقابلِ عفو معصیت ہے،

نعت دراصل نہایت نازک مرحلہ ہے، جہاں ہوش و بصیرت سے کام نہ لیا جائے تو ہر قدم پہ لغزش کا امکان ہے، اس لیے ہر راہ رو اس مقدس راہ سے کامیاب نہیں گذر سکتا، یہ کوئی دنیا کا عرصۂ بزم نہیں ہے کہ قدم پس و پیش کو نظر انداز کر کے بلا کسی غور و احتیاط کے گرد و غبار اڑاتا بڑھتا چلا جائے، بلکہ جیسا کہ کسی صاحب نظر شاعر نے کہا ہے:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر   نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یہ مقام ہی کچھ ایسے جلال و عظمت کا حامل ہے کہ بڑے بڑے رہروان تیز گام سرنگوں چلنے پر مجبور ہوتے ہیں، مغرور عرفی جو اپنے زور طبع اور جولانی قلم کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اس کو بھی دفعتہً چونک کر کہنا پڑتا ہے

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست   آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

سہیل بھی باوجود کمال سخنوری کے عجز و درماندگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

خرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کج مج، بیاں قاصر   زمین نعت میں کیا دیجئے داد سخندانی

فقرہ بے اختیار یاد آگیا جس کی شان بلاغت پر سیکڑوں نظمیں نثار کی جا سکتی ہیں، فرماتے ہیں:

"عمر فاروقؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن

چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے"

یہ انشا پردازی کی معراج ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے جائیں، تب بھی سطوت فاروقی کا یہ سماں جو اس ایک مختصر فقرے سے ادا ہو گیا ہے نظر نہیں آسکتا، وسیع سے وسیع تخیل کے لیے بھی اس سے بلیغ تر انداز بیان کی جستجو بے کار ثابت ہوگی،

محترم استاد کی مدح سرائی کا یہ موقعہ نہیں ہے کہ ابھی لایق شاگرد کے متعلق کچھ اور کہنا ہے سہیل کے زخمۂ اخلاص و عقیدت نے نعت و منقبت کے ساز لاہوتی کو جس انداز سے چھیڑا ہے، اس کی ندرت اور جوش و لطافت کا اندازہ ارباب ذوق نے مذکورہ بالا اشعار سے کر لیا ہوگا، اور جو آسمانی نغمے اس سے نکلے ہیں، ان کو سن کر نہ صرف سامعہ تسنیم و کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا ہوگا، بلکہ قلب و روح کے لطیف ترین احساسات بھی بیدار اور شگفتہ ہو گئے ہوں گے۔ سہیل کا یہ دعویٰ

سہیل رندوں سے کہہ دو آئیں قلوب کی تشنگی بجھائیں رحیق مختوم منقبت کی گلابیاں ہم لنڈھا رہے ہیں

حق و انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ دعویٰ ہرگز ناموزوں نہیں ہے،

سہیل کے مذہبی جوش و خروش کے تماشا گاہ سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ یکایک [illegible] اور خاص قصیدہ پر نظر پڑ گئی، جو انھوں نے حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں سپرد قلم کیا تھا، ظلم ہوگا اگر تشنگان ذوق کو اس جام طہور کے چند بادۂ جاں نواز سے محروم کر کے قلم کا رخ کسی اور طرف پھیر جائے، تمہید کے چند اشعار نقل کرتا ہوں، فکر و نظر کی بلندی ملاحظہ ہو:

اے کہ فضائے ذات حق تیرے طلسم راز کا زخم جگر دریچہ ہے تیری نگاہ ناز کا

جو بے اختیار جبین قلم سے صفحۂ کاغذ پر ٹپک پڑے تھے، اعمال ظاہری پر فخر کرنے والوں کے نزدیک ممکن ہے کہ ان منظوم سجدوں کی کوئی قیمت نہ ہو، لیکن ہم کو یقین ہے کہ جس وقت ہم اس پیکر کمال کو سپرد خاک کرنے کے لیے لے جارہے تھے، فرشتگانِ رحمت نے یہ صدا ضرور دی ہوگی،

قدم دریغ مدار از جنازۂ اقبالؔ کہ گرچہ غرق گناہ است می رود بہ بہشت

قلم کی روانی اس دلچسپ موضوع کو کچھ اور پھیلانا چاہتی تھی کہ دفعتہً سہیل کی وہ نظمیں بھی یاد آگئیں جو انھوں نے بارگاہ رسالتؐ کے محرمان خاصؓ کی مدح و ستایش میں لکھ کر سعادتِ دارین حاصل کی تھی، اور اپنے حق مغفرت کو کچھ اور مستحکم کر دیا تھا، منقبت بھی ایک خاص مقام ہے، جہاں شاعر کے لیے قدم اٹھانے کی سب سے پہلی شرط فرق مراتب کا احساس ہے، یعنی بارگاہ نبوت سے جو درجہ جس نفس پاک کو عطا ہوا ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مدح و ستایش کا قلم اٹھایا جائے ورنہ داغِ معصیت سے کلام کے داغدار ہونے کا خطرہ ہے، کسی صاحب بصیرت کا مشہور قول ہے" گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی"

سہیلؔ اگرچہ یہاں بھی جوش عقیدت سے بے تاب ہیں لیکن فرق مراتب کے احساس سے ان کا دل ناآشنا نہیں ہے، یہ ان کی منقبت نگاری کی خاص معنوی خوبی ہے، رہا انداز بیان تو ان کے ابر قلم کی گہر افشانیوں نے اس زمین کو بھی لالہ زار طور بنا دیا ہے جس کی رنگینیاں دیکھکر حریم قلب کا ہر گوشہ نور ایمان سے جگمگا اٹھتا ہے، ایک نظم کے کچھ گہر ہائے آبدار ملاحظہ کرلیں، حضور سرور کائناتؐ کی بارگاہ قدس میں حاضری دیکر صحابۂ کرامؓ کی طرف یوں رجوع کرتے ہیں:

گلزار دین پاک کا پہلا وہ آبیار جانِ بہار، جانِ چمن، جانِ کائنات

وہ صادق و مصدق و صدیق مصطفےٰ برگزیدہ وہ گزیدۂ اعیانِ کائنات

ارکانِ شرع جسکی خلافت سے استوار مرصوص جسکے فیض سے بنیانِ کائنات

وہ جس کا سینہ مہرِ رسالت کا آئینہ — وہ جس کا چہرہ شمعِ فروزانِ کائنات

کافر نہیں کہ اس کی امامت میں شک کریں — خود جس کے مقتدی ہوئے سلطانِ کائنات

پھر ان کے بعد ملکِ خلافت کا تاجدار — وہ بوریا نشین شہنشاہانِ کائنات

وہ شمعِ حرارتِ ایماں وہ نورِ حق — فاروقؓ یعنی مہرِ درخشانِ کائنات

جس کا جلال فتحِ مہمات کی کلید — جس کی نگاہ جنبشِ مژگانِ کائنات

وہ جس کے مشوروں پہ رسالت کو اعتماد — وہ چارہ سازِ خلق وہ درمانِ کائنات

وہ جس کا عدل مشعلِ اربابِ سلطنت — وہ جس کا عہد وجہِ چراغانِ کائنات

ان دو کے بعد تاجِ خلافت کا مستحق — وہ شمعِ مصطفیٰ تہِ دامانِ کائنات

ختنِ نبی وہ صاحبِ نورین وہ غنیؓ — سیراب جس کے فیض سے پاکانِ کائنات

جس کی چمک سے تاجِ خلافت کو افتخار — وہ آبدار گوہرِ عمانِ کائنات

طاقت کے ساتھ صبر و تحمل کا یہ کمال — کرتے ہیں اس پہ رشک شہیدانِ کائنات

ان سب کے بعد اوجِ امامت کا آفتاب — وہ بوترابؓ چارمِ ارکانِ کائنات

وہ قاسمِ فیوض درِ علمِ مصطفیٰ — معمور جس کے نغموں سے ایوانِ کائنات

وہ جس کی شمع خانۂ جگر گوشۂ رسول — وہ جس کے لال سنبل و ریحانِ کائنات

ناظرین غور کریں، فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے اصحابِ رسول کے فضائل و مناقب کی کتنی صحیح تصویر ہے!

"سنبل و ریحان" کی لطافتِ تشبیہ پر بھی ذوقِ سلیم کو وجد آجائے تو کچھ تعجب نہیں۔

سہیل نے منقبت میں جی کھول کر متعدد نظمیں لکھی ہیں، افسوس ہے کہ طوالت کے خیال سے ہر نظم کے اشعار پیش کرنا مشکل ہے، پھر بھی اربابِ ذوق کی مزید ضیافتِ روح کے لیے خاص طور پر ایک اور نظم کے چند اشعار پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اس کا پیکرِ جمال کبھی غبار آلود نہیں ہو سکتا، وہ بہار سرمدی کا گہوارہ ہے جس کو بادِ خزاں کے جھونکے کبھی ہاتھ نہیں لگا سکتے، سہیل اپنے اس مقدس سرمایۂ سخن کے متعلق بجا طور پر کہہ سکتے تھے۔

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ خواہد بود ۔۔۔ زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گرداں زدہ ام

سہیل کے مذہبی احساس کی حرارت نے شاعری کے میدان میں وادیٔ ایمن کی شرر باریوں کا جو منظر پیش کیا تھا، اس کو ناظرین نے دیکھ لیا لیکن یہ نہ سمجھیں کہ وہ جس دنیا کے انسان تھے اس کے واقعات و مناظر کی ان کو خبر نہ تھی، وہ فرشتہ نہ تھے کہ ہر وقت عالم بالا ہی سے رسم و راہ رکھتے اور ان غیر معمولی قومی اور سیاسی حالات سے بے خبر رہتے، جو خود ان کی نگاہوں کے سامنے ظہور میں آتے رہے، وہ کوئی قومی اور سیاسی لیڈر نہ تھے، اور نہ ان میں اس کی فطرۃً صلاحیت تھی لیکن ان کا دل ان تمام جذبات کا آتشکدہ تھا جس کی شرر فشانیاں ان کی تمام قومی، ملی اور سیاسی نظموں میں نمایاں نظر آتی ہیں، ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ غلامی کو سب سے بڑی لعنت اور آزادی کو سب سے بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ فطرت انسانی کا یہی وہ شریفانہ جذبہ تھا، جو اکثر ان کے شاعرانہ احساس میں ایک بے پناہ ہیجان و اشتعال پیدا کر دیتا تھا، اور اس وقت ان کے قلم کی پر جلال صدائے حق سے ایوان باطل کے بام و در لرز اٹھتے تھے، غرض جذبات کا ایک قیامت خیز طوفان ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر صفحۂ کاغذ پر چھا جاتا تھا۔

اگرچہ ملک کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں انھوں نے کوئی عملی حصہ نہیں لیا، اور نہ ان کے بس کی یہ چیز تھی، لیکن ان کی شریفانہ طبیعت کا سیاسی میلان ہمیشہ کانگریس کی طرف رہا، صرف اس لیے کہ ان کا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی کا حصول تھا، چنانچہ جب ملک کو غلامی کی لعنت سے نجات ملی تو انھوں نے متعدد نظموں کے ذریعہ سے اپنے جوشِ مسرت کا اظہار کیا، ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

محض انکسار نہیں ہے بلکہ ایک ناقابل انکار حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ذات گرامی جس پر خدا اور اس کے ملائکہ درود وسلام بھیجتے تھے، جو سرتاپا جمال سرمدی کی نامحدود تابانیوں کی نظارہ گاہ تھی، جس کے ظہور کا جلوۂ جاں نواز کفر و باطل کی تمام تاریکیوں کے لیے پیام شکست تھا، اکی مدح وثنا کا حق عاجز و بے نوا انسان کی زبان کیا ادا کر سکتی ہے؟

لیکن پھر بھی ہم دبی زبان سے اتنا کہنے کی جرأت کرینگے کہ سہیل کے نامۂ رنگیں نگار سے جو کچھ نکل گیا ہے، اس سے زیادہ ایک انسان کی زبان اور کچھ نہیں کہہ سکتی، معلوم نہیں سپرد خاک ہونے کے بعد ان کے اعمال کی پرسش کیا ہوئی ہوگی لیکن اس کا یقین ہے کہ آستانۂ رسالت پر انھوں نے اخلاص وعقیدت کی جو نذر بے بہا پیش کی تھی وہ رائگاں نہ گئی ہوگی، نسیم مغفرت کے جھونکوں نے ان کی خوابگاہ ابدی کو ضرور سرسبز و شاداب کیا ہوگا، میرا یقین کیا، سہیل نے بجا طور پر اس توقع کا اظہار خود اس شعر میں کر دیا تھا۔

پھر سہیلِ زار کیوں ہو مغفرت سے ناامید خود سیہ نامہ سہی لیکن انہی کا ہے غلام

ارباب ظاہر کو شاید حیرت ہو کہ ایک شخص جو اپنے کو سیاہ کار کہہ رہا ہے، اس کو مغفرت کی امید کیونکر ہو سکتی ہے؟ لیکن اگر اس چیز پر نظر رکھیں جس کی تقویت پر وہ مغفرت کا امیدوار ہے تو ان کی ساری حیرت جاتی رہے گی، اور ان کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ تنہا قیام وسجود ہی نجات کا وسیلہ نہیں ہے، بلکہ اور بھی اعمال ہیں، جن کی بدولت مرنے والے کی روح کو سحاب رحمت کی تردستیاں نصیب ہو سکتی ہیں، خواجہ حافظ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا۔

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو که مستحق کرامت گناہگارانند

کیا ناظرین کا یہ خیال ہے کہ سہیل نے چند نعتیہ قصائد لکھ کر محض شاعری کا ایک رسمی فرض ادا کر دیا تھا، وہ گل وبلبل کی شاعری نہ تھی، بلکہ در اصل ان کے قلب زخم کے کیف سے تجدے نکلے

کیا ہے وفا بس اک فسوں انکی نگاہ ناز کا — کیا ہے بقا بس اک فریب نرگس نیم باز کا

ایک نوائے کن فقط رقص کناں ہے چار سو — دہر نہیں یہ سحر ہے مطرب سحر نواز کا

المدد اے جنون شوق دے مجھے درس بیخودی — صفحۂ دل سے محو ہو نقش تو امتیاز کا

میں بھی حریف بن سکوں دُردکشان بزم کا — میں بھی شریک ہو سکوں خلوتیان راز کا

تو ہی اب لے کمند شوق رہبر بام دوست بن — حوصلہ پست ہو چکا عقل سپہر تاز کا

دورِ سپہر ایک گام چشمۂ مہر عکس جام — بادیہ گرد شوق کا بادہ کش نیاز کا

خواہش ناتمام ہے جس کا رکوع نام ہے — بیخودی دوام ہے سجدہ مری نماز کا

خود ہی تو زخمۂ نہاں چھیڑ رہا ہے تار جاں — مجھ سے یہ کیوں ہے امتحان نغمۂ دل گداز کا

جذب نظر کی کیا خطا دست جنوں کا جرم کیا — آپ ہی بے قرار تھا پردۂ حریم ناز کا

سوختگی ہے پیش کش بارگہ جلال کی — طور ادا شناس تھا برق نظر گداز کا

کیا ان اشعار کو پڑھکر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایک رند باخبر عالم سرور میں خلوتیان راز سے ہمکلام ہے۔

اصل موضوع کے متعلق بھی دو چار شعر سننے کے قابل ہیں، کہتے ہیں

یوم ولادت آج ہے سید پاکباز کا — غیب سے باغ دہر کو حکم ہے اہتزاز کا

نوک سناں پہ جس نے دی دعوت دین سرمدی — آج قدوم ہے اسی سید سرفراز کا

جس کی ادائے دلربا مظہر شان کبریا — وہ گل ارغواں قبا گل کدۂ حجاز کا

تشنۂ دشت کربلا کشتۂ خنجر رضا — بندۂ بندگی ادا ایزد بے نیاز کا

اب وہ شہید ذکر حق لالۂ طور کے ورق — دل وہ خزینہ نور کا سینہ سفینہ راز کا

حسین کی حسن سے زیادہ لطیف تشبیہ مشکل سے ذہن میں آسکتی ہے، آخر میں کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں

تجکو سہیل مرحبا عز قبول مل گیا — حشر میں اوج دیکھنا پیشکش نیاز کا

سہیل کے اس پیشکش نیاز سے ناظرین ابھی گھبرائے نہ ہوں گے، مجھے سیہ کار کو خود ان روحانی نغموں کے سنانے میں جو لذت محسوس ہو رہی ہے، وہ قلم کو آگے بڑھنے سے مانع ہے، مانع کیوں نہ ہو، کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ بیٹے کی تعریف تو ناظرین کو سنادی اور باپ کی شان میں سہیل نے محاسن شعری کے ساتھ جو ثنا خوانی کی ہے، اس کو نظر انداز کر کے کوئی اور داستان چھیڑ دوں، چند اشعار اس قصیدہ کے بھی سن کر ناظرین اپنے ایمان کو تازہ کرلیں، کہتے ہیں:

غرۂ ماہ رجب کا آج ہے یوم الکمال — وہ مکمل شان استخلاف کا پیدا ہوا
سرخیٔ خون شہادت جسکے عارض پر نثار — جو ازل سے لالۂ رنگیں قبا پیدا ہوا
چاندنی چھٹکی زمانے میں اجالا ہو گیا — دین کامل کا مہ برج علا پیدا ہوا
ظلمتِ کفر وضلالت کیوں نہ لے انگڑائیاں — آفتابِ آسمانِ مصطفیٰ پیدا ہوا
چاندنی لاتی ہے کس کے خیر مقدم کی خبر — مرحبا کا غل زمیں سے تا سما پیدا ہوا
شادیانے گا رہے ہیں طائرانِ نغمہ سنج — عید میلاد علیؑ کا غلغلہ پیدا ہوا
شبنمستان جہاں میں غنچہ گر چٹکا کوئی — برگ گل سے نغمۂ صلِّ علیٰ پیدا ہوا
خازن علم لدنی حامل اسرار وحی — کنز عرفاں مشعل راہ ہدیٰ پیدا ہوا

یہ نہایت طویل قصیدہ ہے، جو شروع سے آخر تک جوشِ معانی سے لبریز ہے، جیسا کہ سہیل نے خود مقطع میں کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے،

کوثر معنی لبوں سے خود ابل اٹھا سہیل — جب دلِ مداح میں جوشِ ثنا پیدا ہوا

یہ شاعرانہ تعلی نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقت ہے، جس سے کوئی صاحب ذوق انکار نہیں کر سکتا، ممکن ہے کہ زمانہ کسی وقت سہیل کے اور ترانہائے سخن کو بھلا دے، لیکن یہ چمنستانِ شاعری جس کے کچھ گل ہائے رنگین ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں، ابدی اور لازوال تابانیوں کا حامل ہے،

یہ جتنے اصحاب مصطفےٰؐ تھے سب اہل ایماں کے مقتدا تھے
یہی وہ سرچشمۂ ہدیٰ تھے کہ جن سے سب فیض پا رہے ہیں

خصوصیت سے جو سابقین تھے حضور انورؐ کے جانشین تھے
یہ چار ارکان قصر دین تھے مراتب انکے سوا رہے ہیں

پھر ان میں صدیقؓ سب پہ فائق فروغ حق مرآۃ الحقائق
نبی کے بعد افضل الخلائق میان ارض و سما رہے ہیں

طلا رضا کا پیام ان کو خدا نے بھیجا سلام انکو
خود انبیاؑ کے امام ان کو امام اپنا بنا رہے ہیں

قبول ایماں میں اولیت وہ خلوت ثور کی معیت
عیاں ہے قرآں سے افضلیت خدا صاحبکا پا رہے ہیں

دفعۃً مدینہ یاد آجاتا ہے تو کس والہانہ جوش سے خطاب کرتے ہیں:

مبارک اے طیبۂ مطہر تری زمیں مہر و مہ سے برتر
کہ محفل کن فکاں کے سرور وہاں زیر الثریٰ رہے ہیں

پھر فاروق اعظمؓ کے کوکبۂ جلال و عظمت کی طرف نگاہ عقیدت اٹھتی ہے تو یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں،

تحیۃ و شکر کے ترانے ملائکہ آج گا رہے ہیں
در رسالت پہ سر جھکانے جناب فاروقؓ آ رہے ہیں

وہ دین حق کی اساس محکم، وہ قصر ایماں کا رکن اعظم
وہ جس کو خود مقصد دو عالم بصد تمنا بلا رہے ہیں

فضا میں فضان حق کا پرچم بتوں میں برپا ہے بزم ماتم
ہوا وہ باران نور پیہم کہ بام و در جگمگا رہے ہیں

عمرؓ کی آمد کا غلغلہ ہے تو قصر کسریٰ میں زلزلہ ہے
عجم کے والی لرز رہے ہیں حرم کے بت لڑکھڑا رہے ہیں

یہ عدل فاروقؓ کا ہے منظر کہ سطح انساں ہوئی برابر
شہ یمن کے ہیں آج ہمسر ابھی جو کل تک گدا رہے ہیں

یہ شمع بزم حرا کی ضو ہے، یہ برق روحانیت کی رَو ہے
عجم تک آواز جا رہی ہے عرب میں خطبہ سنا رہے ہیں

بیت المقدس کے سفر کا سماں جس طرح پیش کیا ہے، غالباً اس سے بہتر کوئی پیرایۂ بیان مشکل سے مل سکتا ہے، ملاحظہ ہو:

نہ تیر و نیزہ نہ تیغ و خنجر نہ ساز و سامان نہ لاؤ لشکر
خدا کی رحمت ہے سایہ گستر ملائکہ پر بچھا رہے ہیں

فضا میں گونجی ہے مرحبا کی چلے ہیں فاروقؓ اس ادا سے
جو ذرے اڑتے ہیں گرد پا سے نجوم پر مسکرا رہے ہیں

افسوس ہے کہ انداز بیان کی یہ رعنائی اب دیکھنے میں نہ آئے گی!

اس موقع پر حضرت عمرؓ کے سفر شام کے متعلق سہیل کے محترم استاد علامہ شبلی کا وہ عدیم المثال

گلزارِ وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج سرشار ہے خوشبو سے ہر اک تختۂ چمن آج
غنچوں کو صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا دورِ زندانِ محن آج

پھر موج نے ڈوبی ہوئی کشتی کو اچھالا بگڑی ہوئی تقدیر کو ہمت نے سنوارا
کھوئی ہوئی عظمت دو دلی ہم کو دوبارا روشن ہوا پھر آزادیِ مشرق کا ستارا
یہ خوش خبری لائی ہے سورج کی کرن آج

رخصت ہے شبِ تارِ غلامی کا اندھیرا وہ سامنے ہے صبحِ سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیسی کا اکھڑنے لگا ڈیرا لہرائے نہ کیوں عظمتِ قومی کا پھریرا
آزاد ہوا قید غلامی سے وطن آج

آگے چل کر ملک کے ان جانبازوں کی خدمت میں اپنی نذر عقیدت پیش کی ہے، جن کی شاندار قربانیوں نے اس جہادِ عظیم کو کامیاب بنایا تھا، افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے یہ تمام اشعار قلم انداز کرنے پڑتے ہیں لیکن ایک بند ضرور سنانا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے اس فتح عظیم کی بشارت ان خفتگانِ راہِ عدم کو بھی دی ہے جن کی ہمت و غیرت نے اس مقدس جنگ کا آغاز کیا تھا، ملاحظہ ہو، کس جوش سے کہتے ہیں :

اے بادِ صبا خواب سے ٹیپو کو جگا دے مرحوم ظفر شاہ کے شانے کو ہلا دے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکا دے پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنا دے
آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

اس جوش و خروش کے عالم میں سہیل کی نگاہ نظر اس حقیقت پر بھی ہے کہ تعمیر تخریب سے زیادہ مشکل اور زحمت طلب ہوتی ہے، چنانچہ آخر میں اربابِ وطن کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

اے یاورِ وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل / ہاں جشن منا لو کہ ہے موقع ابھی قابل
ہونا نہ مگر جوشِ طرب میں کہیں غافل / تخریب تو آسان تھی تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یہاں ایک / اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے، اور سود و زیاں ایک / ہم سب کا خدا ایک ہے، ہم سب کا نشاں ایک
پھر دل میں ہو کیوں خارِ عداوت کی چبھن آج

وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہبِ اسلام / ہر دین تو دیتا ہے محبت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لیے مت کیجئے بدنام / کل شیر و شکر ہوں یونہی کل ہند کی اقوام
سنگم پہ ہیں جس طرح ملے گنگ و جمن آج

افسوس ہے کہ اس خیر خواہ وطن کی یہ صلاح نیک، اب تک صدا بہ صحرا کی حیثیت رکھتی ہے، عمل تو درکنار، یارانِ وطن کو اس کا سننا بھی گوارا نہیں، ابھی تو دل میں صدیوں کا ابھرا ہوا جوش انتقام ان کو ملک کی فلاح و ترقی سے غافل کیے ہوئے ہے، معلوم نہیں ان کی یہ سرگرانیاں کب تک رہیں گی، اور ان کا افق حیات جس پر تنگ نظری کا سیاہ بادل چھایا ہوا ہے، خلوص محبت کی روشنی سے کب منور ہوگا؛ ملک میں چراغاں کر دینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن افسوس ہے کہ سہیل کا یہ مطالبہ "روشن کرو الفت کا دیا دل کے بھی اندر" اب تک پورا نہ ہو سکا، حالانکہ بغیر اس چراغ کو جلائے ہوئے وہ حقیقی امن و سکون جس پر ملک کی ہر ترقی کا انحصار ہے، کبھی نصیب نہیں ہو سکتا،

مذکورۂ بالا اشعار اور نیز دیگر نظموں سے جو سہیل نے اس موضوع پر لکھی ہیں، ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کا سیاسی زاویۂ نگاہ کس قدر وسیع اور بلند تھا، وہ کس حد تک باہمی اتحاد و یگانگت کے حامی تھے، اور ان کا مذہبی احساس کتنا فیاض اور کشادہ تھا، یہ واقعہ ہے کہ وہ کسی فرقہ وارانہ

جماعت میں کبھی شریک نہیں ہوئے، ان کی نگاہ عقیدت اسی علم بغاوت کی طرف اٹھتی رہی جو سرفروشان وطن نے جبر و استبداد کے خلاف بلند کر رکھا تھا، ایک بلند نظر اور حقیقت شناس انسان ہونے کی حیثیت سے ان کو انسانیت کی تمام بلندی نظر آتی تھی، اس کے سامنے بلا لحاظ قوم و مذہب ان کی جبین نیاز جھک جاتی تھی، چنانچہ مہاتما گاندھی، جواہر لال، تلک، آزاد، بھگت، محمد علی، موتی لال وغیرہ تمام جانبازاد اور جو عامہ مند ہستیوں کو والہانہ خلوص کے لہجہ میں انھوں نے یاد کیا ہے، جو ان کی فراخدلی اور حب وطن کا بہت بڑا ثبوت ہے، وہ ایسے مذہب کے پیرو تھے جس کی بیاض کا سر آغاز ایثار و قربانی ہے۔ اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس جلوۂ روحانی کو قدر و عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتے، خواہ اس کا مظہر کوئی پیکر انسانی ہو، وہ جس زندگی کی دعوت دیتے ہیں، اس کی شان کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے ہو سکتا ہے، کہتے ہیں:

اس طرف آئیں کہاں ہیں طالبانِ زندگی	ہے دمِ شمشیرِ خنجر آستانِ زندگی
تو نفس کی آمد و شد کو سمجھتا ہو حیات	میں یہ کہتا ہوں وداعِ جان ہو جانِ زندگی
راحتِ کنجِ قفس سے زندگی کو کام کیا	بجلیوں سے کھیلتا ہے آشیانِ زندگی
کر تلاشِ کنجِ وزندانے تلبگار سکوں	شورشِ پیہم کا طالب ہے جہانِ زندگی
ایک ٹھوکر مار دیتا ہو جہاں پائے طلب	خود ابلتا ہو وہاں سیلِ روانِ زندگی
رو پڑے راہ طلب میں جس جگہ دو آبلے	لہلہا اٹھتا ہیں اک گلستانِ زندگی
سرفروشِ عشق کا جس خاک پر ٹپکے لہو	اس کے ہر ذرے سے پیدا ہو جہانِ زندگی

کچھ آگے چل کر ان کی اسلامی غیرت کا پرجوش جذبہ پیروان دین حنیف سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

فدیۂ جاں پیش کرائے پیرو دینِ حنیف	ذوقِ قربانی ہے پہلا امتحانِ زندگی
استقامت کا سبق لے اسوۂ صدیق سے	پھر زمانے کو سنا دے داستانِ زندگی

ہاں جنونِ شوق اٹھ پھر لے کے فانوسِ عمل | پھر دکھا دے دیدۂ عالم کو شانِ زندگی
خرمنِ باطل کو خاکستر بنا کر چھوڑ دے | ہر نفس تیرا ہو اک برقِ تپانِ زندگی

مبارک ہے وہ دل جو ان پاکیزہ جذبات کا حامل ہو، آفریں ہے اس زبان پر جو اسوۂ صدیقؓ و فاروقؓ کی پیروی کی دعوت دے کہ بغیر اس پر عمل کیے ہوئے تہذیب مغربی کے پرفریب مناظر کا تسلط ہماری نگاہوں سے زائل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہم کو وہ اخلاقی و روحانی قوت نصیب ہو سکتی ہے جس کے بل پر کبھی کچھ بے سروسامان صحرا نشینوں نے اٹھ کر قیصر و کسریٰ کے شاہانہ غرور و تمکنت کو خاک میں ملا دیا تھا، مسلمان اگر اب بھی اسلام کے جادۂ حق پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو پھر ان کے قلب و جگر کو ذلت و رسوائی کی ٹھوکروں سے ملول نہ ہونا چاہیے، وہ قطعی طور پر یہ سمجھ لیں کہ ان کا ظلمت کدۂ حیات صرف اسی آفتابِ ہدایت کے فیضانِ تجلی سے منور ہو سکتا ہے، جو تمام درخشانیوں کے ساتھ حجاز کے صحراء سے طلوع ہو کر جلوہ آرائے کائنات ہوا تھا، طلب صادق ہو تو آج بھی اس کی ضوفشانیاں آمادۂ کرم ہیں۔ خوف ماسوا دلوں سے دور ہو، تو آج بھی ہمارا نعرۂ توحید قصر باطل کے کنگروں کو ہلا سکتا ہے، اور پھر کسی فتنۂ روزگار کو ہم سے الجھنے کی ہمت نہیں ہو سکتی، سہیلؔ کے ایک قدیم قصیدہ کے ایک شعر کا صرف ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے، جس کو مسلمان سن لیں اور غور کریں کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا تھی، اور اس کو بھلا کر وہ کس قدر پست اور مبتذل ہو رہے ہیں، وہ مصرعہ یہ ہے:

کسی سے جز خدا ڈرنا خلافِ آدمیت ہے

اہل نظر غور کریں، تو یہ مصرعہ نہیں ہے، بلکہ ایک موجِ برق ہے، جس سے ایمان و غیرت کی آگیں دفعۃً مشتعل ہو جاتی ہیں، اور دماغ کچھ یوں بلند ہو جاتا ہے، کہ دنیا کی تمام بلندیوں کو اس کے سامنے مجبوراً جھک جانا پڑتا ہے، اور بڑے بڑے کج کلاہوں کے قدم قریب آنے سے لرز اٹھتے ہیں، خیالات کا تموج بھی عجیب چیز ہے، قلم کو کہاں سے کہاں لے جا رہا ہے، وعظ و پند کا یہ موقع نہیں،

مقصود تو یہ کہنا ہے کہ سہیل اگرچہ محب وطن تھے کہ حب وطن بھی انسانیت کا ایک شریفانہ جذبہ ہے، لیکن وہ ان مسلمانوں میں نہیں تھے، جو کسی مصلحت سے اپنے کو صرف ہندستانی کہہ کر رہ جاتے ہیں، اور مسلمان کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، سہیل نے جی کھول کر اپنے جذبۂ اسلامی کا علانیہ اظہار کیا ہے، خصوصاً ترکوں کی شاندار فتح سمرنا کے مبارک موقعہ پر انھوں نے اپنے جذبات کے رباب آتشیں کو جس جوش وخروش کے ساتھ چھیڑا ہے، اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس مشت پر میں آخر تڑپنے کی طاقت کہاں تک تھی، ممکن ہے کہ اور بھی دل اس حرارت ایمانی سے محروم نہ ہوں، لیکن قلم کا یہ کمال نظر آئے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سوختہ جاں نے صفحۂ کاغذ پر بجائے الفاظ کے دہکتے ہوئے انگارے بچھا دیے ہیں ۔

ایک مرد جانباز نے دولت عثمانی کے غارت گروں کو عزم و استقلال اور ایثار و غیرت کا جو حیرت انگیز منظر دکھایا تھا، وہ اسی قسم کے بلند اور شریفانہ جذبات کو ابھار سکتا تھا جن کا اظہار سہیل نے اپنی نظم موسوم بہ "فتح سمرنا" میں کیا تھا۔ اب اس نغمۂ آتشیں کو ان ہی کی زبان سے سننے میں لطف ہے، آغاز کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کس جوش سے کہتے ہیں :

دم شمشیر پہلا زینہ ہے معراج ایماں کا ۔۔۔ یہ ایما مسلموں کو ہے ہلال عید قرباں کا

اس مطلع کے بعد جس میں بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے، کچھ اور کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن جو طوفان دل سے اٹھ چکا ہے، اس کو اب کون روک سکتا ہے۔ اس کی رفتار کا یہ عالم ہے :

گئے وہ دن کہ تھی مقبول اک دنبے کی قربانی ۔۔۔ متاع جاں اب دنیٰ ہدیہ ہے سرکار جاناں کا
سدا اہل وفا کی آزمائش ہوتی آئی ہے ۔۔۔ اچھوتا کچھ نہیں منظر یہ بازی گاہ دوراں کا
وجود قوم اب تک مبتلائے صرع غفلت تھا ۔۔۔ سنگھانا تھا اسے اک لخلخہ خون شہیداں کا
مصائب نے اب آنکھیں کھول دیں اپنی تو یہ سمجھے ۔۔۔ کہ زنداں تھا دبستان سیاست ماہ کنعاں کا

بقائے جاوداں ملتی ہے جانبازانِ ملت کو ہمیں اب یاد آیا یہ سبق تعلیم قرآں کا

حیاتِ سرمدی چاہے تو اس ہستی کو باطل کر

کہ دانا بارور ہوتا ہے پہلے خاک میں مل کر

دوسرے بند میں جوشِ غیرت سے بے تاب ہو کر یوں خطاب کرتے ہیں،

مصیبت پر مسلماں شکوہ سنجِ آسماں کیوں ہو نہ ہو یہ آنچ تو کھوٹے کھرے کا امتحاں کیوں ہو

چٹانیں کفر و باطل کی اگر اس موجہ سے ٹکرائیں تو طوفاں خیز یوں اسلام کا سیلِ رواں کیوں ہو

ازل [illegible] قاتل منت اہلِ دل کی ہو حوادث کا گلہ کیوں ہو مصیبت پر فغاں کیوں ہو

[illegible] جو نہ دیکھتا ہو لذت کو وہ بزدل آرزو مندِ حیاتِ جاوداں کیوں ہو

ہمارا داغِ سجدہ نورِ سیمائے ملائک ہے ہمارا سجدہ گہ غیروں کا سنگِ آستاں کیوں ہو

شعاعِ برقِ ایمن ہے یہاں ہر خس نشیمن کا جلا دے جس کو بجلی وہ ہمارا آشیاں کیوں ہو

خدائے دو جہاں کی مہربانی ہم کو کافی ہے کوئی پروردۂ تثلیث ہم پر مہرباں کیوں ہو

کوئی جا کر یہ کہہ دے ناصحِ فرخندہ آئیں سے

جنونِ آرزو بہتر ہے عقلِ مصلحت بیں سے

[illegible] اکبر! [illegible] ایسا رند بے خبر کتنا باخبر نظر آ رہا ہے!! جبہ و دستار کا پتہ نہیں، شیخ و زاہد کی صحبت سے بھی محروم، لیکن جب زبان کھلتی ہے تو اسرار و حکم کے انمول موتی جھڑنے لگتے ہیں، ا ا

بے اختیار خواجہ حافظ کا شعر یاد آجاتا ہے،

سرِ خدا کہ عارفِ سالک بکس نگفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

اب وہ جنونِ آرزو جس کے بغیر زندگی کی پرخطر راہوں میں پا بجا رہنا ناممکن ہے سہیل کے دل میں جس طرح ہنگامہ آرا ہو گیا ہے، اس کا منظر بھی دیکھنے کے قابل ہے، یہ تڑپتی ہوئی بجلیاں ملاحظہ ہوں:

اگر دنیا میں رہتے ہیں تو دنیا کو دکھا دیں گے
کہ یا خود مٹیں گے یا حریفوں کو مٹا دیں گے

رگِ جاں مدتوں سے تشنۂ شوقِ شہادت ہے
ہم اس کی پیاس آبِ تیغِ عریاں سے بجھا دیں گے

کفن سادہ پہننا ننگ ہے رنگیں مزاجوں کو
ہم اس پر داغہائے خون سے گل بوٹے بنا دیں گے

رہے گی تا کجے افسردگی گلزارِ ملت پر
ہمارے خون کے چھینٹے اسے نشو و نما دیں گے

جہاں میں دینِ بیضا شمع ہے نورِ الٰہی کی
یہ جھونکے بادِ مغرب کے اسے کیوں کر بجھا دیں گے

الٹ دیں گے مرقع پھر بساطِ کفر و باطل کا
فروغِ ملتِ بیضا سے محفل جگمگا دیں گے

مٹے ہر چند ہم پھر بھی سلف کی شان باقی ہے
رگوں میں اب بھی خونِ طغرل و عثمان باقی ہے

اب اس خون کی حرارت ان کو سلف کی یاد دلاتی ہے،

وہی ہیں ہم کہ جب اٹھے علم توحید کا لیکر
یکایک زلزلہ سا آ گیا ایوانِ کسریٰ میں

ابھی بھولے نہیں ہم خالد و طارق کے افسانے
فتوحاتِ صلاح الدین ابھی روشن ہیں دنیا میں

کیوں نہ روشن ہوں کہ پھر ایک مدت کے بعد افقِ سمرنا پر اسی برقِ باطل سوز کا جلوہ نظر آ رہا ہے جسکو دیکھ کر سہیل اپنے جوشِ مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

زمانے نے ورق الٹا ہے پھر تاریخِ ماضی کا
وہ پہنچا پرچمِ اسلام پھر ارضِ سمرنا میں

ادھر ترکانِ غازی فاتحانہ بڑھتے جاتے ہیں
ادھر اک کھلبلی سی مچ رہی ہے فوجِ اعدا میں

نویدِ فتحِ اسلامی نشاط انگیز ہے کتنی
نہ کیفیت یہ نغمے میں نہ مستی ایسی صہبا میں

دلوں میں اس طرح بیتاب ہے جوشِ شادمانی
کہ جیسے موجِ صہبا ہے کفِ ساغر و مینا میں

آخری شعر کی شعریت ملاحظہ ہو،

صبا نے وہ تگ و دو کی ہے اعلانِ مسرت میں
کہ ٹپکا ہے پسینہ جابجا شبنم کی صورت میں

جس مجاہدِ اعظم کی عزیمتِ ذو الفقار سے جبر و استبداد کا ابر محیط پھٹ کر ترکان عثمانی کا آفتابِ اقبال ایک دفعہ پھر افقِ عالم پر جلوہ گر ہو گیا تھا اور جس کے نعرۂ حق سے لشکرِ باطل کی تمام صفیں ٹوٹ کر رہ گئی تھیں، اسکے قدموں پر سہیل نے اخلاص و محبت کے جو پھول نثار کیے تھے، ان کے رنگ و بو سے بھی ناظرین اپنے مشامِ روح کو تازہ کریں، یہ ایک طویل ترکیب بند ہے، جس کے چند آخری اشعار پیش کرتا ہوں،

باطل فتنہ ساز کو حق سے شکست ہو گئی — خیر سے آج سر ہوا معرکہ کارزار کا
رافعِ پرچمِ ہلال غازیٔ مصطفےٰ کمال — یعنی وہ اک مجسمہ ہمتِ استوار کا
صلِّ علیٰ و حبذا لمعۂ تیغِ مصطفےٰ — پھیر دیا ہے جس نے منہ فتنۂ روزگار کا
جس نے بلند کر دیا جذبۂ حریت کا نام — جس نے نشاں مٹا دیا غیر کے اقتدار کا
سبزۂ پائمال کو جس نے نہال کر دیا — جس نے سماں دکھا دیا گذری ہوئی بہار کا
بسملِ جاں بلب کو پھر جس نے حیاتِ تازہ دی — حوصلہ پھر بڑھا دیا ملتِ دل فگار کا

پہلے بند کا آخری شعر فارسی میں لکھ دیا ہے، پڑھکر وجد کرنے کو جی چاہتا ہے، ملاحظہ ہو:

مژدۂ نصرتِ کمال باز بگوش جاں رسید — طرۂ پرچمِ ہلال باز بہ آسماں رسید

ناظرین غور کریں، فتح و نصرت کا یہ مژدۂ جاں بخش جس کی بظاہر کوئی امید نہ تھی کس کی بدولت سننے میں آیا تھا، یہ وہی جنون آرزو ہے جسکو سہیل نے صحیح طور پر عقل مصلحت اندیش سے بلند تر قرار دیا ہے، اور جس سے آج مسلمان محروم ہو کر اسقدر پست اور کم حوصلہ ہو گیا ہے کہ اب گردِ راہ بھی اس کے دامنِ حیات سے شوخیاں کرتی ہوئی پھرتی ہے، حالانکہ یہ وہی بندۂ توحید ہے جس کے جلالِ نظر سے برقِ حوادث کو ہمیشہ شرمندہ ہونا پڑتا تھا،

یہ شعر جو میں نے ابھی اوپر نقل کیا ہے، قلم کے رخ کو سہیل کی فارسی شاعری کی طرف پھیرنا چاہتا تھا، لیکن کیا کروں ابھی ناظرین کو سہیل کے چمنستانِ غزل کی سیر کرانا باقی ہے،

(باقی)

جلد ۷۸ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۶ء جلد ۵

سہیلؔ مرحوم اور نعت نبویؐ

شاہ معین الدین احمد ندوی

یہ مضمون شبلی کالج کے یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا تھا، ماہ مبارک ربیع الاول کی تقریب میں اس کو شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا۔

قدرت نے مولوی اقبال احمد خاں سہیل مرحوم کو ایسی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں، جو ہزاروں لاکھوں انسانوں میں کہیں دو چار خوش قسمتوں کے حصہ میں آتی ہیں، وہ صحیح معنوں میں عبقری یا جینیس تھے، ان میں ذہانت و ذکاوت، علمی قابلیت اور قوتِ حافظہ وہ تمام استعدادیں بدرجۂ کمال موجود تھیں، جو کسی انسان کو بڑا بنانے کے لیے کافی ہیں، اگر وہ ان سے صحیح کام لیتے تو ہندوستان کے نامور فضلاء میں ان کا شمار ہوتا لیکن یہ علم و ادب کی بدنصیبی ہے کہ یہ صلاحیتیں غلط مصرف میں صرف ہوئیں، اور جو لعل شب چراغ پوری علمی دنیا کو منور کر سکتا تھا وہ شاعری کی شمع محفل بن کر رہ گیا، اور شاعری کو بھی انھوں نے مستقل مشغلہ نہیں بنایا بلکہ اس کی حیثیت محض وقتی دلچسپی کی تھی، اسکے باوجود انھوں نے اس کی جو یادگاریں چھوڑی ہیں وہ اردو زبان میں زر و جواہر کی حیثیت رکھتی ہیں،

سہیلؔ مرحوم کی فطرت شاعرانہ تھی، ان کی نثر بلکہ روزانہ کی گفتگو بھی شاعرانہ نکتہ سنجیوں سے خالی نہ ہوتی تھی، ان کی ذہانت اور علمی قابلیت نے اس شراب کو اور دوآتشہ کر دیا تھا، ان کو اردو فارسی، عربی تینوں زبانوں میں پورا عبور حاصل تھا، اور وہ ان کے ادا شناس تھے، فن کے نکتوں پر بھی ان کی نگاہ بڑی گہری تھی، اسلیے جملہ اصناف سخن پر ان کی حکمرانی یکساں تھی، مگر قصیدہ نگاری

سے خاص مناسبت تھی، اور اس میں ان کا کوئی حریف نہ تھا، اور ان کے کمال کا اصلی تماشا گاہ یہی ہیں، اس مضمون میں اس کی ایک صنف یعنی نعت گوئی پر مختصر تبصرہ مقصود ہے، نعت کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی، محض شاعری کی زبان میں ذات پاک نبوی کی عامیانہ توصیف کر دینا بہت آسان ہے، لیکن اس کے پورے لوازم اور شرائط سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے، نعت درا صل محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شاعرانہ توصیف کا نام نہیں، بلکہ نبوت کے حقیقی کمالات کی ایسی مصوری کا نام ہے، جس سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہو، اس کے لیے دل کی مستی اور دماغ کی ہوشیاری دونوں ضروری ہیں، یعنی حُب رسول کے ساتھ نبوت کے اصلی کمالات اور کارناموں، اسلام کی صحیح روح، عہد رسالت کے واقعات اور آیات و احادیث سے واقفیت ضروری ہے جو کم شعراء کو ہوتی ہے، اس کے بغیر صحیح نعت گوئی ممکن نہیں ہے۔

نعت کا راستہ بڑا نازک ہے، اس میں ادنیٰ لغزش سے نیکی برباد گناہ لازم آجاتا ہے، اسلیے اس پل صراط کو عبور کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، یہ وہ بارگاہ قدس ہے جہاں قدم رکھتے بڑے بڑے قدسیوں کے پاؤں لرز جاتے ہیں۔ ع

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اور عرفی جیسے شاعر کو یہ کہنا پڑا

عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحرا ست	آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن	نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

اس راہ میں سب سے بڑی لغزش الوہیت اور نبوت کے حدود کو سمجھنے میں ہوتی ہے، اکثر شعرا [نبو]ت کے ڈانڈے الوہیت سے ملا دیتے ہیں، مثلاً یہ

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر	اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

نعت کا بڑا مشہور و مقبول شعر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ شعر نہ صرف توحید کے سراسر منافی بلکہ نبوت کی حقیقت کے بھی خلاف ہے، ایک طرف یہ افراط و غلو ہے اور دوسری طرف یہ تفریط اور سوء ادب ہے کہ بعض شعراء ذات پاک نبویؐ کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار میں وہی پیرایہ اختیار کرتے ہیں جو دنیاوی بلکہ بازاری معشوقوں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، اور اس عیب سے اردو کی کم نعتیں خالی ہیں،

درحقیقت ذات پاک محمدیؐ عبدیت و نبوت کا ایسا برزخ کبریٰ ہے جس پر دونوں کے کمالات ختم ہو گئے، اس لیے جو تصور بھی ان دونوں کے منافی ہوگا، اس کا انتساب آپ کی جانب سخت گمراہی ہے، اس قسم کی لغزشیں زیادہ تر صحیح اسلامی تصورات سے ناواقفیت اور غلو کا نتیجہ ہوتی ہیں، نبوت اور عبدیت کا کمال اس میں نہیں ہے کہ بندے اور نبی کو خدا بنا دیا جائے، بلکہ ان کا اصلی کمال یہ ہے کہ نبی جامۂ بشریت میں رہتے ہوئے عبدیت اور نبوت کا ایسا کامل اور اکمل نمونہ ہو کہ اس کے بعد کمال کا کوئی درجہ تصور میں نہ آسکے، اور یہ صرف نبوت پر موقوف نہیں ہے، بلکہ دنیا کی ہر چیز کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ اپنی جنس کا کامل ترین نمونہ ہو،

پھر نبوت کا درجہ خود اتنا بلند ہے اور وہ انسانیت کی اتنی بڑی معراج ہے کہ انسان اسی کی توصیف سے قاصر ہے، اور انبیاء علیہم السلام میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے اور آپ کے کارنامے ایسے عظیم الشان ہیں کہ اگر بڑے سے بڑا شاعر ان ہی کو دکھانا چاہے تو اس کو آخر میں اپنے عجز و درماندگی کا اقرار کرنا پڑے گا کہ

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہم چناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

اس لیے آپ کی جانب غیر حقیقی کمال کے انتساب کی ضرورت ہی نہیں، حضرت سعدی علیہ الرحمہ نے کیسی مختصر اور جامع نعت کہدی ہے جس پر بڑی بڑی نظمیں قربان کیجا سکتی ہیں،

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ و آلہ

سہیل مرحوم نبوت کے عظمت شناس تھے۔ ان کی نظر ان تمام پہلوؤں پر تھی، اس لیے انکے قلم سے اس قسم کی کوئی لغزش نہیں ہونے پائی ہے۔ اور اردو میں ان کی نعتیں نعت نبوی کا صحیح نمونہ ہیں، ان میں الوہیت کی تجرید و تنزیہ، نبوت کی عظمت و جلالت، خصائص و کمالات محمدی ہر چیز اپنے اپنے درجہ پر رہتی ہے، اور وہ اسلامی روح سے اس قدر معمور ہوتی ہیں کہ ان سے مذہب کا درس لیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی حیثیت محض واقعہ نگاری کی نہیں ہوتی، بلکہ وہ فکر و تخیل کی جدت و ابداع، الفاظ کے حسن و نفاست، ترکیبوں کی مرصع کاری و خوشنمائی اور زبان و بیان کی دلکشی و رعنائی کے اعتبار سے شعر و ادب کا نگارخانہ ہیں۔

نعت ان کی شاعری کا خصوصی موضوع نہیں ہے، بلکہ انھوں نے دوسرے اصناف سخن کی طرح چند نعتیں بھی کہی ہیں، ان میں اصل نعتیں دو ہی ہیں، باقی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں، لیکن یہ انکا کمال ہے کہ نعت کا پورا عطر اور جوہر ان دو نعتوں میں کھینچ دیا ہے، جس کی خوشبو سے مشام جان معطر ہو جاتا ہے، وہ کونسا نغمہ لاہوتی ہے، جو اس ساز میں نہیں جسے سنکر ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی نعتوں کے جلوے اتنے رنگا رنگ ہیں کہ اس مختصر مضمون میں ان سب کا دکھانا مشکل ہے، اس لیے صرف ان کی ایک ایک جھلک دکھلانے کی کوشش کیجائیگی۔

نعت کا موضوع محدود و متعین ہے، اس لیے اس کے مضامین بھی مشترک ہوتے ہیں، مگر سہیل ان میں ایسی جدت و ندرت پیدا کر دیتے ہیں کہ پرانا خیال بھی نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ نور محمدیؐ کی تخلیق کی مصلحت میں شعرا نے بڑی بڑی بلند پروازیاں دکھائی ہیں، سہیل کی کچھ نکتہ سنجیاں ملاحظہ ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بزم شہود ازل سے قائم تھی، جمال سرمدی بھی جلوہ آرا تھا، مگر اس کے تماشہ کیلیے جب چشم بصیرت کی ضرورت تھی، اس سے عالم انسانیت محروم تھا۔ کائنات کی حقیقت ایک معمہ تھی۔

انسان خود اپنی حقیقت سے نا آشنا تھا، کائنات کے حقایق اوہام و التباس کے حجابات میں مستور تھے، عقل شکستہ پا ان کے ادراک سے عاجز تھی، اس کے لیے ایسے عشق بیتاب کی ضرورت تھی، جو ان تمام حجابوں کو چاک کر کے حسن حقیقت کا جلوہ عام اور عالم انسانیت کو اس کے نور سے منور کردے، یہ عشق نور محمدی کی شکل میں ظاہر ہوا، جس نے دائرۂ وجود کی دونوں کمانوں کو ملا دیا، دیکھیے ان نازک مسائل کو سہیل نے کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے،

مکتب عشق میں ہنوز طفل خرد ہے مبتدی ورنہ ہے باصرہ نواز جلوۂ حسن سرمدی

عقل ضعیف ہو کہاں کنہ ازل کی راز داں یہ وہ مقام ہے جہاں بے خردی ہے بخردی

دل کا کبھی گذر نہ ہو حسن کی بزم ناز تک دفتر عقل اگر نہ ہو غرق شراب بیخودی

عشق نے فاش کر دیا سر حریم کبریا ورنہ یہ خاکدان تھا فانی عمد محدد

عشق وہ ہے جو کھول دے پردۂ راز کائنات فرق نیاز کو ملے جس سے عروج فرقدی

عشق سے جگمگا اٹھے صفحۂ جان اس طرح جیسے خط شعاع سے یہ ورق زبرجدی

پردۂ عشق میں ملا حسن کو خلعت ظہور پوری ہوئی جو بات تھی صبح ازل کہی بدی

ہو گئی دل کی جلوہ گاہ مطلع حسن لا الٰہ تا تو چو ماہ نیم ماہ سر زد حجاب یزدی

دائرۂ وجود کی دونوں کمانیں مل گئیں بندہ و کردگار میں تیرا قدم سرحدی

اس کے بعد بعثت نبوی کی منزل آتی ہے، اس سے پہلے رحمۃ للعالمینؐ کی عظمت و جلالت اور ان کے علوئے منزلت کی تصویر دیکھ لیجیے،

کہاں کا دشت ایمن طور کیا برق تجلی کیا یہ سب کچھ تھی جمال مصطفےٰ کی پرتو افشانی

محمدؐ وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی

محمدؐ یعنی وہ حرف نخستیں کلک فطرت کا محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعات ربانی

وہ فاتح جس کا پرچم اطلسِ زنگاری گردوں ۔۔۔ وہ امی جسکے آگے عقلِ کُل طفلِ دبستانی

وہ سلطان الامم فخرِ دو عالم برزخِ کبریٰ ۔۔۔ رسالت جسکی تصدیقی جلالت جسکی اذعانی

بشر جسکی بعثت کا ظہور عیسیٰ مریم ۔۔۔ مصدق جسکی عظمت کا لبِ موسیٰ عمرانی

تراشا جسکے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل ۔۔۔ غسالہ جسکے تلوؤں کا زلالِ آبِ حیوانی

تعالی اللہ جمالِ مصطفیٰ کا حسن لاثانی ۔۔۔ کہ یکساں جمع ہیں جسمیں تمام اوصافِ امکانی

دعائے یونسی، خلقِ خلیلی، صبرِ ایوبی ۔۔۔ جلالِ موسوی، زہدِ مسیحی، حسنِ کنعانی

آپ کے اوصاف و کمالات اور خصوصیات محمدی کا دوسرا مرقع ملاحظہ ہو۔

احمد مرسل فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ مظہرِ اول مرسلِ خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

جسم مزکّی روح مصوّر قلب مجلّی نور مقطر ۔۔۔ حسن سراپا خیر مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

طینت جسکی سب سے مطہر بعثت جسکی سب سے موخر ۔۔۔ خلقت جسکی سب سے مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

جسکی ہراول فوجِ سلیماں جسکے منادی موسیٰ عمراں ۔۔۔ جس کے مبشر عیسیٰ مریم صلی اللہ علیہ وسلم

جسکا نام اچھالے داور آپ رفعنا لک فرما کر ۔۔۔ بزمِ تجلی جس کا مخیم صلی اللہ علیہ وسلم

جتنے فضائل جتنے محاسن ممکن ہیں ممکن ہو سکتے تھے ۔۔۔ حق نے کیے سب آپ میں فراہم صلی اللہ علیہ وسلم

علم لدنی شان کریمی خلق خلیلی نطق کلیمی ۔۔۔ زہدِ مسیحا عفتِ مریم صلی اللہ علیہ وسلم

آپ اگر مقصود نہ ہوتے کون و مکاں موجود نہ ہوتے ۔۔۔ اور موجود نہ ہوتے آدم صلی اللہ علیہ وسلم

اوجِ شرف کا بدر وہی ہے بزمِ رسل کا صدر وہی ہے ۔۔۔ بدرِ منور صدرِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

صدرِ امم سلطانِ مدینہ وہ جسکے کفِ پا کا پسینہ ۔۔۔ گل کدۂ فردوس کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

اس کے بعد بعثت نبوی اور نبوت کے کارناموں کا مرقع سجایا ہے، مگر اس سے پہلے بعثت نبوی کے وقت دنیا کی حالت پر ایک نظر ڈال لیجئے، یہ محض افسانہ اور خوش اعتقادی نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ

بعثت نبوی سے پہلے ساری دنیا میں ایک عام تاریکی چھائی ہوئی تھی، خدا شناسی کا کہیں وجود نہ تھا۔ انسان جس کے سر پر اشرف المخلوقات کا تاج رکھکر نیابت الٰہی کے منصب جلیل سے سرفراز کیا گیا تھا اور ساری مخلوق اس کے تابع فرمان بنائی گئی تھی، اس نے شجر و حجر تک کو اپنا معبود بنا لیا تھا، جس چیز سے بھی اس کو فائدہ کی امید یا نقصان کا خطرہ تھا، اس کے سامنے اس کی جبین عبودیت سجدہ ریز ہوگئی تھی، اخلاق و روحانیت اور عدل و مساوات کا نام و نشان تک باقی نہ تھا، ہر کمزور طاقتور انسان کا غلام تھا، بڑائی کا معیار اخلاق و تقویٰ کے بجائے نسلی و مالی برتری تھی، خدا کا کنبہ جغرافی اور قبائلی حدبندیوں میں بٹا ہوا تھا، مذہب بھی تعیش اور حصول اقتدار کا ذریعہ بن گیا تھا، مذہبی پیشواؤں کو خدائی کا درجہ حاصل تھا، عورتوں کی کوئی حیثیت نہ تھی، وہ سارے انسانی حقوق سے محروم تھیں، لڑکی کو زندہ درگور اور بیوہ کو نذر آتش کر دیا جاتا تھا، انسان وحشت و درندگی اور ہوس پرستی میں جانوروں تک کو شرماتا تھا، غرض اخلاق و روحانیت کی دنیا بالکل ویران ہو چکی تھی عین اس حالت میں غیرت الٰہی جوش میں آتی ہے، ریگستان عرب سے رحمت کی گھٹا اٹھتی ہے جس کے ایک ہی چھینٹے سے انسانیت کی سوکھی ہوئی کھیتی لہلہا اٹھتی ہے، اور اخلاق و روحانیت کے نور سے ساری دنیا معمور ہو جاتی ہے، عالم انسانیت کی اس بہار کا منظر سہیل کے خامۂ رنگیں رقم سے ملاحظہ ہو،

بہارستان ہستی کے لیے دور شباب آیا　　رگ فطرت میں ریعان نمو کا اضطراب آیا

نظام آفرینش کو پیام انقلاب آیا　　فضائے کن مکان میں پرچم تمکی مآب آیا

شہنشاہ دو عالم مہبط ام الکتاب آیا

وہ موج بے قرار اٹھی ہے عمان تجلی سے　　زمانہ جگمگا اٹھا ہے فیضان تجلی سے

شبستان جہاں روشن ہوئی شان تجلی سے　　ہوئی ظلمت گریزاں جوش طوفان تجلی سے

رسالت کے افق پر نور حق کا آفتاب آیا

وہ آئینہ دکھایا جس نے عکس روئے جاناں کو
نمایاں کر دیا جس نے فروغِ حسن پنہاں کو

عطا کی دولتِ نظارہ جس نے دیدۂ جاں کو
چراغاں کر دیا جس نے تجلی گاہِ امکاں کو

وہ جلوہ اب جمالِ احمدی میں بے نقاب آیا

معارف کا خیاباں تازہ جسکی رشحہ باری سے
مکارم کا چمن شاداب جسکی آبیاری سے

شناسا جس نے عالم کو کیا توحید باری سے
دلوں کی کھیتیاں سیراب جسکے فیض جاری سے

وہ دریائے کرم آیا وہ رحمت کا سحاب آیا

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

وہ ناسخِ مذاہب جس کے مقدم نے کیا باطل
فروغِ دینِ زردشتی شکوہِ دینِ نصرانی

وہ مقصودِ وجودِ عالم مستغاثِ قاصی و دانی
کیا جس نے مکمل نسخۂ اخلاقِ انسانی

وہ حاذق جس کا تنہا نسخۂ تنزیلِ قرآنی
دوائے جملہ علتہائے اخلاقی و روحانی

وہ رابط عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے
وہ فارق زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی

وہ عادل جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے
غبارِ مسکنت ہو یا وقارِ تاجِ سلطانی

وہ جامع جس نے یکجا کر دیے بکھرے ہوئے دانے
مٹا دی آکے جس نے باہمی تفریقِ انسانی

وہ درس آموز فطرت جس نے پہلے سبق دنیا میں
بتائے اہلِ عالم کو حقوقِ جنسِ نسوانی

اٹھا دی خودکشی کی بزدلانہ رسم دنیا سے
سکھایا مشہدِ توحید پر آئینِ قربانی

وہ گنجورِ معارف جسکے ہر ہر حرف میں پنہاں
نکاتِ فلسفی اسرارِ نفسی رازِ عمرانی

ایک دوسری نعت میں نبوت کے کارناموں کی تصویر اس ایجاز و جامعیت کے ساتھ دکھائی ہے اس کی مثال اردو کی نعتوں میں نہیں مل سکتی، اس کے ایک ایک فقرے میں کئی کئی شعروں کے مطالب سما دیے ہیں، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں،

کفر کی ظلمت جس نے مٹائی دین کی دولت جس نے لٹائی
لہرایا توحید کا پرچم صلی اللہ علیہ وسلم

باغ جہاں کا ناس نامی جس نے مٹائی رسم غلامی
پھر سے سنوارا گلشن عالم صلی اللہ علیہ وسلم

بزم ملل تھی نظم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق کے لآلی
اس نے کیے سب آکے منظم صلی اللہ علیہ وسلم

وہم کی ہر زنجیر کو توڑا رشتہ ایک خدا سے جوڑا
شرک کی محفل کر دی برہم صلی اللہ علیہ وسلم

فرد و جماعت امر و اطاعت کسب و فنا عفو و شجاعت
حل کیے جو اسرار تھے مبہم صلی اللہ علیہ وسلم

ربط و تصادم طوع و تحکم فقر و تنعم عدل و ترحم
سب کے حدود بتائے باہم صلی اللہ علیہ وسلم

حفظ مراتب پاس اخوت سعی و توکل رفق و فتوت
تا کہ حدود اللہ میں منضم صلی اللہ علیہ وسلم

ارض و سما میں آیۂ رحمت روز جزا میں سایۂ رحمت
اس کے لوائے حمد کا پرچم صلی اللہ علیہ وسلم

راہ میں کانٹے جس نے بچھائے گالی دی پتھر برسائے
اس پر چھڑکی پیار کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

فقر و غنا دونوں کا سلطاں روح و جسد دونوں کا درماں
دین اور دنیا کا سنگم صلی اللہ علیہ وسلم

اس سلسلہ میں معراج کی ایک نظم جو نعت ہی کا ایک حصہ ہے سننے کے قابل ہے، معراج نبوی عام انسانی تخیل سے ماورا ہے، اس لیے اس کی کیفیت میں خود مسلمانوں میں اختلاف ہے کہ وہ روحانی تھی یا جسمانی، عالم خواب میں تھی یا بیداری میں، مادی جسم کا عالم افلاک پر جانا بڑے بڑے عقلاء و حکماء کی فہم سے باہر ہے، اور عالم لامکاں میں جو احوال و کوائف پیش آئے، ان کا تصور بھی انسانی عقل نہیں کر سکتی، اس لیے جن شعراء نے معراج پر لکھا ہے ان میں کم ایسے ہیں جن کو معراج کے واقعات کا صحیح علم ہے، اس لیے انھوں نے زیادہ تر شاعرانہ بلند پروازی سے کام لیا ہے، مگر سہیل کی نظر معراج کی حدیثوں پر تھی، اس لیے انھوں نے صحیح واقعات کو اس دلکشی سے نظم اور معراج کے نازک مقامات کو اس خوبصورتی سے طے کیا ہے کہ ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے، اس کے جستہ جستہ اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا، ناظرین بھی اس عالم روحانیت کی سیر فرمائیں۔

حریم ام ہانی میں حضور آرام فرما تھے
یہ دولت پہ قدسی و ملک تھے محو دربانی

وہ چشم نرگسی تھی بند لیکن چشم دل وا تھی
سرہانے طالع بیدار کرتا تھا مگس رانی

ادب سے آکے جبریل امین نے یہ گذارش کی
کریں سرکار بزم نور تک تشریف ارزانی

سنی روح القدس کی جب طلب بزم خداوندی کی
اٹھے اور دی براق پاک پر داد سبک رانی

ذیل کے اشعار میں جسمانی اور روحانی معراج کے مسئلہ اور جسمانی معراج کے استحالہ کو کس دلنشین انداز میں اور کیسی ندرت و لطافت سے حل کیا ہے۔ ....

....

براق برق پیکر نے چلایوں ذات والا کو
فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضور اس طرح گذرے گنبد مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشہ سے گذر جاتی ہے آسانی

عالم بالا میں استقبال اور عالم مثال کے مناظر کی سیر

ملائک اور رسل صف بستہ استقبال کو آئے
اٹھا افلاک پر ہر سمت شور تہنیت خوانی

کھلی آنکھوں سے دیکھا محرم سر حقیقت نے
جزائے محسن و قباحت سزائے مذنب و جانی

نظر سے عالم ناسوت کے سارے حجاب اٹھے
برای العین کی سیر بہارستان نخوانی

اس کے بعد ان مناظر کی تصویریں ہیں جو حضور کو عالم مثال میں مشاہدہ کرائے گئے، ان مراحل کے بعد لامکان کی سرحد شروع ہوتی ہے، جہاں عالم ناسوت کے سارے وسائل جواب دیجاتے ہیں اور جس سے آگے بڑھنے میں جبریل کے بھی پر جلتے ہیں

اگر یک سر موے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

اسلیے براق و جبرئیل آخر رکے سدرہ کی منزل پر
کہ تھی یہ انتہائے سرحد اقلیم امکانی

وہ یہاں سے لے چلیں پھر آپ کو موجیں تجلی کی
وہ رفرف ہو کر انوار ازل کا جوش فیضانی

رفرف کی کیفیت معلوم نہیں اسلیے تجلی کی موجوں اور انوار ازل کے جوش سے اسکی تعبیر بڑی حکیمانہ، دلنشین و دلآویز ہے۔

اسکے بعد حریم احدیت کے حدود شروع ہوجاتے ہیں، جہاں کسی کا گذر نہیں، اسلیے رفرف کے قدم بھی رک جاتے ہیں،

کہاں اس خلوت وحدت میں اذن گرم جولانی
سواد لامکاں تک لے گیا رفرف کر اسکو بھی

اس خلوت سرائے وحدت میں راز و نیاز کے جو کوائف پیش آئے اسکو کس خوبی سے تعبیر کیا ہے،

کسی نے لے لیا خود بڑھ کے آغوش محبت میں
ہوا ملک قدم خلوت سرائے بزم امکانی

ظلال و ذات میں پھر کیا ہوا اللہ ہی جانے
بجز صدیق اکبرؓ یہ حقیقت کس نے پہچانی

اس مصرعہ "بجز صدیق اکبرؓ یہ حقیقت کس نے پہچانی" میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ معراج کی صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ لوگوں سے بیان کیا تو مشرکین نے اس کا بڑا مضحکہ اڑایا، اس موقع پر بھی نبوت کے سب سے پہلے مصدق صدیق اکبر نے اسکی تصدیق کی اور کہا حضور جو کچھ فرماتے ہیں سب سچ ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ ان نعتوں کی معنوی خصوصیات سے متعلق تھا، یہ نعتیں ادبی و شاعرانہ محاسن سے بھی معمور ہیں، اوپر جس قدر اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی شعر بھی ادبی محاسن سے خالی نہیں ہے، لیکن اب خالص ادبی حسن و لطافت کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں، ان نعتوں میں مختلف قسم کے جذبات و خیالات اور احوال و کیفیات کی تصویریں ہیں اور جو خیال اور جو منظر بھی پیش کیا گیا ہے وہ ادبی حسن و لطافت سے ایسا آراستہ ہے کہ پوری نعت شعر و ادب کا نگارخانہ معلوم ہوتی ہے، جس کا ہر مرقع اس قدر دلکش و دلآویز ہے کہ ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے، ایک نعت کی تشبیب میں ظہور قدسی کے اہتمام میں باغ عالم کی چمن آرائی کا منظر دیکھیے:

بہار آئی ہوئی آراستہ پھر بزم امکانی
ہوا گلزار عالم پھر جواب باغ رضوانی

کہیں پھولوں کے جھرمٹ میں شاعر کی نظربازی
کہیں خود جلوۂ خورسی گلوں کی جاگدامانی

کہیں دوش صبا پر رقص کرنا نکہت گل کا
کہیں شاخ نشیمن پر عنادل کی غزلخوانی

ادھر سبزہ کا جاگ اٹھنا خمار خواب نوشیں سے
ادھر بادِ سحر سے زلفِ سنبل کی پریشانی

صبا کے گدگدانے سے ادھر کلیوں کا ہنس دینا
ادھر شبنم سے پھولوں کی عرق آلود پیشانی

رگِ گل نے بچھا رکھا ہے ہر سو دامِ نظارہ
عبث ہے گر کرے مرغِ نگہ سعی پرافشانی

چمن کا جلوۂ رنگین ہے یا اک شعرِ فطرت ہے
کہ جس پر ذوقِ فطرت خود ہے محوِ آفریں خوانی

جبینِ صبح پر قشقہ ہے یا خطِ شعاعی ہیں
ایاغِ لالہ میں شبنم ہے یا صہبائے ریحانی

نگاہیں جذب کر لی ہیں بہارِ عارضِ گل نے
رگِ گل کی حقیقت آج ہم نے جا کے پہچانی

کہاں کا دشتِ ایمن طور کیا برقِ تجلی کیا
یہ سب کچھ تھی جمالِ مصطفی کی پرتوافشانی

یہ اشعار نہیں تختۂ گل ہے جس کے پھولوں کی نزہت و رنگینی باغ رضواں کے پھولوں کو شرماتی ہے اور جس کی مہک سے مشامِ جاں معطر ہو جاتا ہے، اب جمالِ محمدی کے کچھ جلوے ملاحظہ ہوں۔

قبلہ نمائے سجدہ گذاراں شعلۂ سینا جلوۂ فاراں
صبحِ بہاراں جس کا مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

شرحِ الم نشرح وہ سینہ برقِ تجلی کا گنجینہ
جگمگ جگمگ چم چم چم چم صلی اللہ علیہ وسلم

نوری تن کملی میں چھپائے بادل میں بجلی لہرائے
نور کا مینہ برسائے رم جھم صلی اللہ علیہ وسلم

اوجِ شرف کا بدر وہی ہے بزمِ رسل کا صدر وہی ہے
بدرِ منور صدرِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جس نے بسائی دل کی بستی جس کا ظہور شباب ہستی
نزہتِ گیتی جس کا مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

صدرِ امم سلطانِ مدینہ جس کے کفِ پا کا پسینہ
گلکدۂ فردوس کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

مہرِ رسالت ماہِ جلالت عینِ عدالت خضرِ دلالت
اے بکمالات ناطقہ ابکم صلی اللہ علیہ وسلم

سروِ سیادت قامتِ رعنا صبحِ سعادت جلوۂ سیما
طاقِ عبادت ابروئے پرخم صلی اللہ علیہ وسلم

یہ اشعار بلاغتِ ادا، الفاظ کی مرصع کاری، ترکیبوں کی چستی اور تشبیہات کی خوبی و لطافت کا مرقع ہیں، اس کا ایک اور بلیغ نمونہ معراج کے ایک منظر میں ملتا ہے، معراج میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مناظر مشاہدہ کرائے گئے تھے، ان میں قصر فاروقی یعنی حضرت عمرؓ کا محل بھی تھا، اس کے شکوہ و عظمت، حسن و جمال اور آرایش و زیبایش کی تصویر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے،

بڑھے آگے تو وسطِ ساحتِ فردوس میں دیکھا بلند و پر شکوہ و دلکشا اک قصر نورانی

وہ نزہت جس کا ہر گوشہ ریاضِ خلد کا حاصل وہ رفعت جس کا ہر زینہ حریفِ کاخِ کیوانی

اس شکوہ و عظمت کے ساتھ اس کے حسن و جمال، خوبی و زیبایش اور زینت و آرایش کی یہ تشبیہ شاعری نہیں ساحری ہے۔

وہ شفاف شفق گوں رنگ جیسے حل ہو کر ڈھیں بتاشیرِ سحر، سیمِ قمر، یا قوتِ رمانی

چمن میں اشکِ شبنم کی جگہ دُرِ نجفِ غلطاں روش پر سنگ ریزوں کے عوض لعلِ بدخشانی

حضرت عمرؓ کے مرتبہ، اوصاف اور ان کے کردار کی مناسبت ان تشبیہوں میں خاص طور سے توجہ کے قابل ہے،

محاسن کے توازن میں مثالِ عدلِ فاروقی مناظر کے تناسب میں جمالِ ماہِ کنعانی

قوایم اس کے عزمِ انبیاء کی طرح مستحکم در و بام اسکے قلبِ اصفیا کی طرح نورانی

یہ مثالیں ان نعتوں کے ادبی محاسن کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں سہیل عربی زبان سے پوری طرح واقف تھے، اور آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی پر بھی ان کی نظر تھی، اس لیے ان کی نعت اور منقبت دونوں میں جا بجا اس کی بلیغ تلمیحات ملتی ہیں، اور وہ ان کے ٹکڑے اشعار میں نگینہ کی طرح جڑ دیتے تھے، مثلاً

خلق خدا کا راعی، آخر دین ہدیٰ کا داعی آخر جس کی دعوت اَسلِم تَسلَم صلی اللہ علیہ وسلم

آئینۂ الطاف الٰہی رحمت جس کی لامتناہی جس کی ہدایت اِرحَم تُرحَم صلی اللہ علیہ وسلم

حفظ مراتب پاس اخوت سعی و توکل، رفق و فتوت تلک حدود اللہ میں منضم صلی اللہ علیہ وسلم

نظمِ سہیل انکا ہی کرم ہے ورنہ یہاں کیا ہے فہم
ان اللہ تعالیٰ اعلم صلی اللہ علیہ وسلم

عشق نے فاش کر دیا سرِ حریم کبریا
ورنہ یہ خاک ان تھا فی عہدِ محمد

چمن پیرائے کن صدقے تری نیرنگ سازی کے
لبِ ہر غنچہ پر ہے "کل یوم ہو فی شان"

خدا جانے خود اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا
غلامِ بارگہ جسکے کہیں "ما اعظم شانی"

سہیل کی نعتوں کی خصوصیات محض ان ہی پہلوؤں تک محدود نہیں ہیں، اس کے اور بھی گوناگوں پہلو ہیں، مگر اس مختصر مضمون میں ان سب کی تفصیل کی گنجایش نہیں ہے، اور مذکورۂ بالا مثالیں سہیل کی قادر الکلامی اور ان کی نعتوں کی اہم خصوصیات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں اسلیے اس تبصرہ کو بارگاہ رسالت میں سہیل ہی کی اس التجا پر ختم کیا جاتا ہے،

تیرے غلامِ آستاں اور جھکائیں سر کہاں
انت انت غایتی انت انت مقصدی

حکمائے اسلام

حصہ اول و دوم

اردو میں ابتک مشاہیر حکماء کے حالات میں کوئی جامع کتاب نہیں تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حکمائے اسلام کے حالات میں ایک جامع کتاب لکھی گئی ہے جس میں ان کے حالات و سوانح کیساتھ انکی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے پہلے حصہ میں یعقوب کندی، ابونصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابوریحان بیرونی، امام غزالی، ابوالبرکات بغدادی کے حالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ابن ماجہ، ابن طفیل، ابن رشد، امام رازی مغلوں اور تاتاریوں کے عہد کے حکماء، حکمائے متاخرین، خاندان فرنگی محل، خاندان خیرآباد اور مختلف خاندانوں کے حکماء مثلاً ملا محمود جونپوری، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ کے حالات ہیں اور انھوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل ہے۔

(مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم) قیمت: جلد اول معہ، جلد دوم ے

منیجر

حضرت تاج کی نعتیہ شاعری

از جناب سید منظور الحسن صاحب برکاتی فاضل دار العلوم خلیلیہ ٹونک

اصناف شاعری میں "صنفِ نعت گوئی" ایک سخت اور دشوار ترین صنفِ سخن تسلیم کی گئی ہے، اس صنف پر طبع آزمائی کرنے والے شعرا نے ہمیشہ اس راہ کی مشکلات کا اعتراف کیا ہے اور اس کے حق سے عہدہ برآ ہونے میں اپنی دماغی و قلمی تمام توانائیوں کے صرف کرنے کے بعد بھی یہی کہا ہے ؎

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عرفی جیسے بلند خیال، قادر الکلام شاعر نے جب اس راہ میں قدم رکھا اور اس راہ کی دشواریوں کو مشاہدہ کیا تو بے ساختہ اس کی زبان و قلم سے نکلا ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کسی معزز و اہم شخصیت کی تعریف و توصیف میں شاعرانہ محاسن کے ساتھ اشعار کا موزوں کر لینا اور مبالغہ آمیز قصائد کہہ دینا تو کوئی مشکل اور دشوار کام نہیں ہے، لیکن نعتِ سرورِ کائنات لکھنا، ممدوحِ خدا، محبوبِ رب العٰلمین، خاتم النبیین، افضل البشر اور صاحب لولاک لما صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع و اعلیٰ شان میں لب کشائی کرنے اور زبان و قلم کو حرکت میں لانے کے لیے شاعرانہ مہارت و کمال کے ساتھ ادب و احترام، خلوص و عقیدت، احساسِ عظمت و رفعت حدود شناسی و مرتبہ دانی کی بھی بڑی شدید ضرورت ہے،

ماہنامہ "معارف" جولائی ١٩٦٧ء، جلد ١٠٠، شمارہ ١

کیونکہ یہ وہ مقدس بارگاہ ہے جہاں جلیل القدر ملائکہ بھی لرزہ براندام نظر آتے ہیں۔

حضور سرور کائنات، فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع کمال وصفات، برگزیدہ ومقدس ہستی کے اوصاف ومحامد کا بیان، آپ کے اخلاق حمیدہ، شمائل ومحاسن کا تذکرہ، نبوت کے حقیقی کمالات کی تصویر کشی، پھر خدا کے ساتھ آپ کا قرب خاص اور مراتب عالیہ کا ذکر، اور اس ذکر میں الوہیت ونبوت کے حدود کا لحاظ، خدا اور اس کے پیارے رسول وحبیبؐ کے مدارج میں فرق وامتیاز، ان سب باتوں کے لیے قدرت بیان اور شاعرانہ کمال کے ساتھ فطرت صالحہ، صحیح اسلامی تصورات سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی دینی ومذہبی معلومات وبصیرت درکار ہے، یہاں بغیر احساس عظمت ورفعت اور بلا واقفیتِ حدود شریعت، محبت وعقیدت کا اظہار کرنا، ایک قسم کی جرأت رندانہ ودیوانگی ہے، اور بارگاہ سید کونین میں ایسی دیوانگی ناقابلِ معافی ہے۔

وہی شاعر اس وادی کو کامیابی اور سلامتی سے طے کر جاتا ہے، جو شاعرانہ نزاکتوں پر قدرت رکھتے ہوئے

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

کے اصول کو ملحوظ رکھے اور اپنے جذبات محبت وعقیدت کو بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرنے میں منزل ادب شناسی سے سر مو تجاوز نہ کرے۔

بابائے اردو مولانا عبدالحق، مولانا حالی کی نعت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نعت میں وہی ذکر ہونا چاہیے جو خدا کے نبی کے لیے شایان ہے اور جس کے پڑھنے اور سننے سے لوگوں پر روحانی اور اخلاقی اثر پڑے اور معلوم ہو کہ "کمال بشریت" اسے کہتے ہیں"۔

حضرت والی آسی مقدمہ ارمغانِ نعت میں رقم طراز ہیں کہ

"محبت نبوی اور عشق محمدی کا پاک ولولہ اور مخلصانہ ذوق وشوق زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے" اور اس متاع کی حفاظت جان زندگی اور اس کے اظہار کے لیے ادب کی شرط حقیقی شرط، کیونکہ آپ کا ادب ہی ایمان واسلام ہے اور اس سے محرومی کفر، اس ادب کی حقیقت کو سمجھنے کیلیے قرآن پاک پر نظر ڈالنا ضروری ہے، قرآن حکیم میں تمام انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جہاں کہیں کیا ہے، وہاں ان سب کو ناموں سے پکارا گیا ہے اور ان کے واقعات کا ذکر بھی ان کے ناموں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں کہیں صرف "عبد" اور کہیں صرف "عبداللہ"۔ اور اسی طرح جب رب کائنات نے آپ کو پکارا تو یا آدم، یا زکریا، یا یحییٰ، یا موسیٰ، یا عیسیٰ یا الیاس کی طرح یا محمد نہیں پکارا، بلکہ کبھی صدائے عزت یا ایہا الرسل، اور کبھی طریق محبت یا ایہا المزمل، یا ایہا المدثر سے پکارا ہے، اور اپنے بندوں کو "تعزروہ وتوقروہ" (اس کی عزت کرو اس کی توقیر بجالاؤ) کا حکم دے کر آپ کی عظمتوں کی انتہا بتلا دی، اور یہ معلوم ہوتے ہی عرفی شیرازی کی زبان میں کہنا پڑا ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است (ص ۱۸ و ۱۹)

اس معیار اور کسوٹی پر اگر شعرائے نعت گو کے کلام کو کسا اور پرکھا جائے تو صرف چند نعت نگار ایسے ملیں گے جو اس معیار پر پورے اتریں گے۔

یہاں ہم ایک ایسے نعت گو، مداح رسول، عاشقِ نبی اور غلام غلامانِ آلِ محمد کی نسبت پر فخر کرنے والے شاعر کے نعتیہ کلام پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں جس کی نعتیں اپنے تمام محاسن ولوازم کے ساتھ مثالی ہیں، اور جو خود ایک ریاست کا تاجدار اور حکمراں رہا ہے، لیکن

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

وہ تاجداروں کے تاجدار اور شاہنشاہوں کے شاہنشاہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ درباری اور خادم بننے میں دین و دنیا کی سعادت و فلاح سمجھتا ہے۔ اور اس اعلیٰ خدمت پر اس قدر نازاں، اتنا مسرور اور اس درجہ بے نیاز ہے کہ سلطنتِ قیصر و جم بھی اس کے نزدیک بے حقیقت چیز بن گئی ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے ؎

مل گئی خدمتِ دربارِ رسالت ہم کو اپنی ٹھوکر میں ہے اب سلطنتِ قیصر و جم

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (رواہ بخاری مسلم)

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکو اپنے ماں باپ سے اور سب لوگوں سے زیادہ میری محبت نہ ہو۔

کے تقاضا اور مطالبہ کی تکمیل و تعمیل میں سرکار دو عالم، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کو جان و مال، عزت و آبرو، وقار و تمکنت، اعزا و اقارب حتی کہ ماں باپ تک سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ اور عشق نبی و محبت رسول کو اپنے ہی لیے نہیں، ہر قلبِ حزیں کے لیے باعثِ تسکین و راحت اور موجبِ طمانیت سمجھتا ہے ؎

آپ کا عشق تسلی دہ ہر قلبِ حزیں نور بخشِ نظر دیدۂ مشتاق ہیں آپ

وہ انجمنِ عشق کے شایاں ہی نہیں ہے جو دل سے نہ ہو شیفتۂ ذاتِ محمد

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ماہ مبارک جب طلوع ہوتا ہے تو اس کے ایوانِ ریاست میں جشن و مسرت کا پیغام لیکر آتا ہے، اور اس کے دل و دماغ پر سرور و کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس بہار و بہجت اور فضل و برکت کے مہینہ میں خصوصیت کے ساتھ ذکرِ رسول

اور مدحتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متبرک محافل و مقدس مجالس کا بڑی عقیدت و محبت اور خلوص و احترام سے اہتمام و انصرام کرتا ہے، اور اس جذبہ کی سرشاری و مستی میں بے اختیارانہ پکار اٹھتا ہے کہ

مری دولت مری جاں محفلِ میلاد پر قرباں — یہ وہ محفل ہے جس کی رونق محفل محمدؐ ہیں

اس سے میری مراد ٹونک کے ساتویں اور آخری فرمانروا اعلیٰ حضرت نواب اسمٰعیل علی خاں بہادر تاج بالقابہ کی ذاتِ گرامی ہے،

حضرت تاج رئیس ابن رئیس ہونے کے ساتھ شاعر ابن شاعر بھی ہیں اور نعت گو ابن نعت گو بھی، ریاست و امارت کے ساتھ شاعری اور بالخصوص مدحتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذوق و جذبہ آپ کو وراثت میں ملا ہے،

آپ کے پدر بزرگوار خلد آشیاں امین الدولہ نواب ابراہیم علی خاں بہادر خلیلؔ باحشمت رئیس و حکمراں ہونے کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے نغز گو شاعر اور مداحِ رسول بھی تھے، حمد و نعت کا ایک وافر ذخیرہ آپ کی یادگار رہے، جو اپنے زورِ بیان، شوکتِ الفاظ اور پُرعظمت ترکیب کے اعتبار سے ادب العالیہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے ہر ہر لفظ سے عشقِ نبی اور شیفتگیٔ رسول کا جذبہ نمایاں ہے،

حضرت خلیلؔ کا جذبۂ حبِ رسول ان کی اولاد اور ان کے صاحبزادگان میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان میں جناب تاج سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں ہیں،

آپ چونکہ خود بھی ایک مایۂ ناز اور قادر الکلام شاعر ہیں، اس لیے اپنے عشقِ نبی اور محبت رسول کے پُرخلوص و پُرسوز جذبہ کو نظم و شعر کے قالب میں ایسے مؤثر انداز میں ڈھالا ہے کہ سننے والا اور پڑھنے والا بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔

آپ کے نعتیہ کلام میں عقیدت و احترام کا جو جوش و جذبہ پایا جاتا ہے، وہ آپ کے دل کی آواز ہے،

حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی ذات ستودہ صفات سے آپ کو جو خلوص، جتنی حسن عقیدت اور جو عشق ہے، اس کا اندازہ اور مشاہدہ آپ کی منعقد کردہ محافل میلاد اور مجالس ذکر رسول میں ہوتا ہے۔ ان گنہگار آنکھوں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ ذکر رسول کے وقت حضرت تاج کی آنکھیں اشکبار رہتی ہیں، اور جب تک یہ مقدس مجالس جاری رہتی ہیں حضرت تاج آنسوؤں کے در شہسوار بارگاہ رسالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرتے رہتے ہیں، ان کا دامن اور رومال آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے، وہ انتہائی ادب و احترام سے دوزانو نشست فرما ہوتے ہیں، اور سراپا عجز، سراپا انکسار، سراپا نیاز، سراپا ذوق، سراپا شوق، ہمہ تن گوش، ہمہ تن سوز، پیکر تہذیب، مرقع تادیب اور مجسمۂ اخلاص و عقیدت کی صورت میں سیرت مقدسہ کا بیان سماعت فرماتے ہیں،

قاضی عیاض "شفا" میں فرماتے ہیں کہ جب آپ کا ذکر شریف کسی موقع پر ہو تو اہل ایمان پر اس ذکر پاک کی تعظیم و تکریم اسی طرح واجب ہے، جیسے خود آپ کی تعظیم و تکریم حالتِ حیاتِ مبارکہ میں کیجاتی تھی۔

یہ ہمارا عقیدہ و ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثمرہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ آخرت میں جو ثمرہ ملے گا وہ اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس سے بڑھ کر کونین میں اور کوئی ثمرہ ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حضور انور اپنے روبرو منبر پر کھڑا کرتے، اور ان کیلئے دعا فرماتے کہ اللھم ایدہ بروح القدس، وہ تو خیر جلیل القدر صحابی تھے، کعب بن زہیر جو اپنی شاعرانہ گستاخیوں کے جرم میں واجب القتل قرار دیے جا چکے تھے، جب دربار نبویؐ میں دفعۃً معذرت خواہ ہو کر حاضر ہوئے، اور اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" شروع کیا اور

39225

یہ شعر پڑھا :-

ان الرسول لنور یستضاء بہ　　مھند من سیوف اللہ مسلول

بے شک اللہ کے نبی ایک ایسا نور ہیں کہ جن کی ذات سے کائنات روشنی حاصل کرتی ہے ، اور وہ خدا کی ایک برہنہ تلوار ہیں جس نے بیدینی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینک دیا ہے۔

توحضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو کر اپنی ردائے مبارک اتار کر ان کو مرحمت فرمادی ،

صاحب قصیدۂ بردہ نے فالج میں مبتلا ہونے کے بعد جب قصیدہ تحریر کیا ، تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں ان کے پاس تشریف لائے اور اپنا دست مبارک ان کے بدن پر پھیرا ، اس کی برکت سے ان کو شفا ہو گئی ،

حضرت تاج کو اس دنیا میں جو اعزاز و وقار حاصل ہے ، وہ بھی اسی محبت کا ثمرہ ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

تاج پر جب آپ کے الطاف کا سایہ پڑا　　زور دوراں کا نہ کچھ بھی اس کے آگے چل سکا

آپ کے صدقے میں تاج و تخت کا مالک بنا　　یہ سعادت بھی میسر ہو شہر ہر دوسرا

حاضر دربار ہو یہ تاج با شوق تمام　　اور پڑھے باچشم پرنم الصلوٰۃ والسلام

اور آخرت کے لیے ان کو امید وار رہنا چاہیے کہ انشاء اللہ معیت رحمۃ للعالمین اور رفاقت شفیع المذنبین جیسا گرانقدر اور اعلیٰ ثمرہ انھیں حاصل ہو گا جس کی بشارت حضرت انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت سے ملتی ہے ، جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے :

حضرت انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی ؟ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے لیے بھلا تو نے کیا سامان تیار کیا ہے ،

اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، نہ بہت سی نمازوں کا توشہ ہے نہ روزوں کا، نہ صدقہ کا، ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میرے دل میں ہے، یہ سنکر آپ نے فرمایا

انت مع من احببت — پھر قیامت میں تو ان ہی کے ساتھ ہوگا جن سے تجھے محبت ہے

صاحب ترجمان السنۃ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ آخری جملہ انت مع من احببت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ جب صحابہ نے ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا تھا جو کسی جماعت سے محبت تو رکھتا ہے، مگر اس کے جیسے عمل نہیں کرسکا، آپ نے ان کے جواب میں بھی فرمایا المرء مع من احبّ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی آئین میں محبت کا صلہ معیت ہے، اور ایک عاشق کی منتہائے تمنا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، اسی لیے بعض روایات میں حدیث مذکور کے آخر میں ہے "قال انس فما رأیت المسلمین فرحوا بشیٔ بعد الاسلام فرحھم بھا" انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسلام کے بعد صحابہ کو اتنا خوش ہوتے ہوئے کسی بات پر نہیں دیکھا جتنا کہ اس خوشخبری پر۔

یہ خوشخبری ہر محب رسول، عاشق نبی اور مداح محبوب رب العالمین کے لیے آج بھی بہت بڑی خوشخبری ہے، قیامت کے دن معیت رسول اور رفاقت شفیع المذنبین سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہو سکتی ہے، اس انعام خداوندی پر جس قدر بھی ایک مداح رسول اور ثناخوانِ مصطفےٰ وجد و فخر کرے بجا ہے۔

ان ہی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں اس کی تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من احبنی کان معی فی الجنۃ" جو کوئی مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

حضرت تاج کی ذاتِ رسالت مآبؐ سے محبت و عقیدت اور ذکر رسول و ثنائے نبیؐ سے شیفتگی ان کی نعتیہ شاعری کا سرمایہ ہے وہ انشاء اللہ ان کے لیے بخشش کا ذریعہ ہوگا،

قیامت کے دن جب وہ بارگاہ رسالت مآبؐ میں اپنی بشری کمزوریوں، خطاؤں اور لغزشوں پر ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے عرض کریں گے ؎

یہ حاضر ہوا ہے بصد انکساری ذرا کیجئے اس کی کچھ پردہ داری

نہ ہو حشر میں اس کی کچھ بے وقاری ہے تاجؔ آپ کا امتی یا محمدؐ

زسرتا بپا رحمتی یا محمدؐ

نظر جانب ہر گنہگار داری

تو انشاء اللہ رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت و محبت اپنے آغوش میں لے لیگی، اور جب وہ محبوب رب العالمین کے ظلِ شفاعت میں کھڑے ہوکر بارگاہِ رب جلیل میں بزبانِ خلیل عرض رسا ہوں گے ؎

کوئی ہے زہد پہ نازاں کوئی عبادت پر یہاں تو لے مرے آمرزگار کچھ بھی نہیں

ترے کرم کا الٰہی مرے گناہوں کا حساب کچھ بھی نہیں، شمار کچھ بھی نہیں

خدایا رحم ہے بخشش کے واسطے درکار سوائے فضل خداوندگار کچھ بھی نہیں

تو اس کی رحمت و مغفرت کی بارش سارے گناہوں کو دھو دے گی۔

حضرت تاج کی نعت گوئی کے اس پس منظر، ذکر رسول سے آپ کی شیفتگی، ذاتِ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی سچی اور پرخلوص عقیدت و محبت اور اس کے ثمرات کے تذکرے کے بعد احادیث نبوی کی روشنی میں ان کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم، جب تک تو مجھ سے گناہوں کی بخشش مانگتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا، میں تجھ کو بخشوں گا، تو نے جو بھی برا کام کیا ہو گا مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی، یعنی تو چاہے کتنا ہی بڑا گنہگار ہو، تجھے بخشنا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے ـــــ اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے بخشش چاہے تو میں تجھ کو بخش دوں گا، اور مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں ہوگی ـ اے ابن آدم! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے ساتھ گناہوں سے بھری ہوئی زمین ہو تو میں تیرے پاس بخشش و مغفرت سے بھری ہوئی زمین لیکر آؤں گا، بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو ـ یعنی شرک میں مبتلا نہ ہوا ہو ـ

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص نے یہ جانا کہ میں گناہوں کو بخشنے پر قادر ہوں تو میں سے بخشدوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی ـ بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے ـ

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کا اس بات کو جاننا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت پر قادر ہے، اس کی مغفرت و بخشش کا سبب ہے ـ کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش پر قدرت رکھتا ہے، وہ اس سے امید رکھتا ہے اور جو شخص کریم سے امید رکھتا ہے، کریم اسے محروم نہیں رکھتا ـ ایک اور حدیث قدسی ہے کہ

انا عند ظن عبدی بی — میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے ـ

مذکورہ بالا احادیث کو پڑھیے اور پھر حضرت تاج کی مناجات کے یہ بند پڑھیے :

اے خدا تو ہی مرا معبود ہے　　اے خدا تو ہی مرا مسجود ہے

اے خدا تو ہی مرا مقصود ہے　　میں ہی حامد تو مرا محمود ہے

بادشاہا جرم مارا درگزار

ما گنہگاریم تو آمرزگار

دافعِ امراضِ روحانی ہے تو　　دافعِ حزن و پریشانی ہے تو

دافعِ رنج و گراں جانی ہے تو　　واقفِ اسرارِ پنہانی ہے تو

بادشاہا جرم مارا درگذار

ما گنہگاریم تو آمرزگار

باوجود اس کے کہ ہے تو بے نیاز　　اپنے بندوں کا ہے تو ہی چارہ ساز

جانتا ہے تو مرے سربستہ راز　　ہے تو ہی میرا کفیل و کارساز

بادشاہا جرم مارا درگذار

ما گنہگاریم تو آمرزگار

قیامت کے ہولناک دن محشر میں پیش آنے والے جن واقعات کی اطلاع احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وضاحت کے ساتھ دی گئی ہے، اور جن پر ایک مومن کو ایمان لانا اور یقین کرنا ضروری ہے، ان میں سے ایک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کئی قسم کی ہوگی اور بار بار ہوگی، سب سے پہلے جبکہ سارے اہلِ محشر خداوندِ ذوالجلال کے جلال سے سراسیمہ اور خوف زدہ ہوں گے اور کسی کو لب ہلانے کی جرأت و ہمت نہ ہوگی اور حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر بھی "نفسی نفسی" کے عالم میں ہوں گے، اور کسی کے لیے

شفاعت کی جرأت نہ کر سکیں گے، تو اس وقت عام اہل محشر کی درخواست پر اور انکی پریشانی وتکلیف سے متاثر ہو کر شفیع المذنبین، محبوب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم ہمت کر کے اللہ کے لطف وکرم پر اعتماد کر کے آگے بڑھیں گے اور پوری نیازمندی اور حسن ادب کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں اہل محشر کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ آیت تلاوت فرمائی:

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ

یعنی اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے (یعنی انکی وجہ سے بہت سے آدمی گمراہ ہوئے) پس جو لوگ میری پیروی کریں وہی میرے ہیں۔ پس ان کے لیے تو میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ تو انکو بخش دے

اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا جو قرآن پاک میں ہے

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ

اے اللہ اگر آپ میری امت کے ان لوگوں کو عذاب دیں تو یہ آپکے بندے ہیں، (یعنی عذاب دینا آپ کو پورا حق ہے)

یہ دونوں آیتیں تلاوت فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یاد کیا اور دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور کہا، اے میرے اللہ، میری امت، میری امت، اور اس دعا میں روئے،
اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو فرمایا تم محمد کے پاس جاؤ، اور اگرچہ تمھارا رب سب کچھ خوب جانتا ہے، پھر بھی تم جا کر ہماری طرف سے پوچھو کہ ان کے اس رونے کا کیا سبب ہے، پس جبرئیلؑ

آپ کے پاس آئے اور آپ سے پوچھا، آپ نے جبرئیل کو وہ بتلا دیا جو اللہ سے عرض کیا تھا، یعنی اس وقت میرے رونے کا سبب امت کی فکر ہے، جبرئیل نے جا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو فرمایا کہ محمد کے پاس جاؤ اور ان کو ہماری طرف سے کہو کہ تمہاری امت کے بارے میں ہم تمھیں راضی اور خوش کر دیں گے اور تمھیں رنجیدہ و غمگین نہیں کریں گے۔" (مسلم)

مذکورہ بالا حدیث کو سامنے رکھ کر حضرت تاج کے حسب ذیل اشعار پڑھیے ؎

صرف امت کی شفاعت کا ہے جذبہ دل میں — اللہ اللہ رے ارمانِ رسولِ عربی
مظہر ربِ غفور تاج کے پیارے رسول — شافع یوم النشور تاج کے پیارے رسول
ایک گنہگار بھی مایوس و ہراساں نہ رہے — عرصۂ حشر میں ہونگے نگراں میرے نبی
اے راحتِ روحِ رواں اے داروئے دردِ نہاں — اے حامیٔ دل خستگاں اے شافعِ کل مذنبیں

ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں ہے کہ" حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے حق میں ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے۔"

یہ حدیث بھی خطاکارانِ امت اور اہل معاصی کے لیے اپنے اندر بڑی زبردست بشارت رکھتی ہے، اور حضرت تاج کے حسب ذیل اشعار کی تائید کرتی ہے ؎

زہر عصیاں کا اتار آپ شفاعت سے کیا — ہر گنہگار یہ کہتا ہے کہ تریاق ہیں آپ
رنج سے کیوں رہیں رنجور — جب طبیب و شفا ہے ذات رسولؐ
دوائے دل بیکساں ہیں محمدؐ — علاجِ غمِ عاصیاں ہیں محمدؐ
محمدؐ ہیں شفیعِ روزِ محشر — طبیبِ دردِ دو جہانی محمدؐ

متذکرہ بالا سطور میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں حضرت تاج کے نعتیہ کلام

کی جو وضاحت و صراحت کی گئی ہے، اس سے جہاں ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی نعتیہ شاعری کس درجہ احادیث نبوی سے مناسبت رکھتی ہے، اور آپ نے نعت کہتے وقت کس حد تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کے مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے، وہاں دوسری طرف یہ بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے تاجدار مدینہ، شافع روز جزا، محبوب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ محامد و محاسن، کمالات نبوت، اخلاق حمیدہ اور گنہگاران امت کے ساتھ آپ کی رحمت و شفقت کے تعلق کو بیان اور اپنے جذبات عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں کس قدر پاس ادب، تعلیمات شرعی، تصورات اسلامی، عقائد مذہبی، حدود شناسی اور آداب نعت گوئی کا لحاظ رکھا ہے، اور پھر اس سب کے باوجود آخر میں یہ کہکر ؎

عالم الغیب کے سوا اسے تاؔج کون جانے کہ کیا ہے ذات رسول

اپنے انتہائی عجز و انکسار کا اعتراف و اقرار کیا ہے۔

آخر میں حضرت تاؔج کے متفرق نعتیہ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

سارے عالم پر گھٹائیں رحمتوں کی چھا گئیں جب جہاں میں رحمۃ للعالمیں پیدا ہوئے

عام تھا دنیا میں معبودان باطل کا اثر پج رہے تھے آگ پانی خاک پتھر اور شجر

کوہ و دریا، برق و باراں، انجم و شمس و قمر ماحی کفر و ضلالات جب ہوئے تھے جلوہ گر

آپ نے لہرا دیا روئے زمین پہ لا کلام وحدت خالق کا پرچم الصلوٰۃ والسلام

جو رضواں نے دیکھی بہار مدینہ تو سب جنتیں کیں نثار مدینہ

جدھر تاؔج اٹھ جائیں میری نگاہیں مرے سامنے ہو دیار مدینہ

جدھر دیکھئے جلوہ آرا محمدؐ جدھر دیکھئے آشکارا محمدؐ

نہ پرہیزگاری نہ زہد و عبادت ہے بخشش کا میری سہارا محمدؐ

ادھر مغفرت اور رحمت خدا کی — جدھر آپ کا ہو اشارا محمد

سب نذرِ خزاں ہو گئے دنیا کے گلستاں — سرسبز گلستانِ رسولِ عربی ہے

اس ہاتھ میں کونین کے ہیں سارے خزانے — جس ہاتھ میں دامانِ رسولِ عربی ہے

اے تاج یہ سب حسنِ حسینانِ جہاں کا — اک پرتوِ رخسارِ رسولِ عربی ہے

جس سے حاصل ہو نجاتِ اخروی — بالیقیں وہ اقتدائے مصطفیٰ

تاج اس کا رتبۂ عالی نہ پوچھ — ہو گیا جو خاکِ پائے مصطفیٰ

یہی میرا ایماں یہی میرا مذہب — تلاشِ خدا جستجوئے محمدؐ

جھکے تاجداروں کے سر جس پہ — وہ دنیا میں ہے صرف کوئے محمدؐ

یہ سارا جہاں فیضِ تجلائے نبی ہے — ہر ذرہ نقابِ رخِ زیبائے نبی ہے

واعظ تجھے جنت کے نظارے ہوں مبارک — نظروں میں مری گنبدِ خضرائے نبی ہے

مانا کہ عبادات ہیں بخشش کا ذریعہ — کافی مری بخشش کو تولائے نبی ہے

ممکن نہیں محشر میں نہ ہو اس کی شفاعت — اے تاج تہِ دل سے جو شیدائے نبی ہے

جامعِ ہر کمالِ انسانی — قابلِ ہر ثنا ہے ذاتِ رسول

عالم الغیب کے سوا اے تاج — کون جانے کہ کیا ہے ذاتِ رسول

جلوۂ شمعِ سرِ طورِ رسولِ عربی — جس کا سایہ نہیں وہ نورِ رسولِ عربی

کر دیا اپنے بھٹکے ہوئے انسانوں کو — مئے توحید سے مخمورِ رسولِ عربی

تجلیِ روئے محمد کا صدقہ — یہ سب رونقیں محفلِ دوسرا کی

حمایت پہ جب خواجۂ دوسرا ہیں — تجھے فکر کیا تاج روزِ جزا کی

جلد ۱۱۸ ماہ دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ عدد ۶

نعت قدسی اور اس کی مقبولیت

از ڈاکٹر سمیع الدین احمد، لکچرار شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فارسی کی چند معروف ترین نعتوں میں سے ایک نعت قدسی کی نسبت سے بیحد مقبول اور مشہور رہے۔ اس نعت کا مطلع یہ ہے:۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی ۔۔۔ دل وجان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

متاخرین میں کئی شاعر ایسے گذرے ہیں جن کا تخلص قدسی تھا، لیکن سب سے زیادہ شہرت اور امتیاز حاجی محمد جان قدسی مشہدی کو حاصل ہوا جو عہد دربار شاہجہانی کا ایک محترم اور ممتاز شاعر گذرا ہے، لہذا اگرچہ کوئی تحریری دلیل موجود نہیں لیکن قیاس یہی ہے کہ اس نسبت کا مرجع اسی قدسی مشہدی کو قرار دیا جائے جس کے نام اور شعری کارناموں سے شناسائی خاصی عام ہے۔

بہرحال (شاید پہلی بار) مرحوم شیخ محمد اکرام صاحب نے ارمغان پاک میں اس نعت کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی تصنیف بتایا ہے، اور اس کے نمونۂ کلام میں شامل کیا ہے، اور اسی سلسلہ میں مندرجۂ ذیل اشعار درج کیے ہیں:[1]

مرحبا سید مکی مدنی العربی ۔۔۔ دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

من بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم ۔۔۔ اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

---

[1] ملاحظہ ہو ارمغانِ پاک، ص ۱۴۸

چشمِ رحمت بکشا سوی من انداز نظر — اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی
نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را — بہتر[1] از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات — رحم فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی
نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم — زاں کہ نسبت بہ سگِ کوی تو شد بی ادبی
عاصیانیم، ز ما نیکی اعمال مپرس — سوی ما روی شفاعت بکن از بی سببی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی — آمدہ سوی تو قدسی پئے درماں طلبی

اس صریح اور واضح نسبت کی موجودگی میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً پڑھے لکھے اور باذوق حضرات اس نعت کا مصنف قدسی مشہدی ہی کو سمجھتے رہے ہوں گے اور شاید اسی بنا پر صاحبِ ارمغان پاک نے بھی اس کو قدسی مشہدی کا کلام بتایا ہے لیکن مندرجۂ ذیل اسباب اور قرائن کی روشنی میں اس شاعر کے نام کے ساتھ اس نعت کا انتساب مشتبہ اور مشکوک ہے،

اولاً یہ کہ عام طور سے قدسی کے دیوان یا کلیات کے متداول نسخوں میں یہ نعت نہیں ملتی، اس سلسلہ میں راقم نے علی گڑھ، رام پور، بانکی پور اور حبیب گنج کے ذخیروں کے کلیات و دواوین کا مطالعہ کیا لیکن یہ نعت ان میں دستیاب نہ ہوسکی، اس کے علاوہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس اور دوسرے ذخیروں کی کسی بھی فہرستِ مخطوطات میں قدسی مشہدی کے ذکر اور اس کی شرح کلام کے تحت اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ قدسی مشہدی نے چند مواقع پر نعتیہ اشعار کہے ہیں لیکن مخصوص طریقہ سے نعت کے موضوع پر ایک بھی نظم اس کے کلیات یا دیوان کے

[1] خمسہ نگاروں نے اکثر "بہتر" کے بجائے "برتر" لکھا ہے۔

اکثر نسخوں میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ موجود ہے جس کے اشعار مع مطلع یہاں پیش کیے جا رہے ہیں ۔

ای بجائی رفتہ کانجا نیست جای جبرئیل — سر حکمت را تو جبرئیل برای جبرئیل

گر خدا را جا معین می شدی، ہر دم برت — اوست می گفتم کہ می آید بجای جبرئیل

جبرئیل از درگہِ فیضت گدائی می کند — گرچہ بودند انبیا، دائم گدای جبرئیل

آرزو در خاطرش بسیار می ماند گرہ — گر نمی شد لطفِ تو مشکل کشای جبرئیل

می گذارد دیدۂ جبرئیل بر رویت نگہ — خود توئی معشوقِ جبرئیل، فدای جبرئیل

قدسی نے اپنی مثنوی ظفر نامہ (یا شاہجہاں نامہ) میں حمد و مناجات کے بعد نعتیہ اشعار بعنوان 'داستان نعت' لکھے ہیں جن کا آغاز یوں ہے :-

من و نعتِ احمد کہ روزِ نخست — شد ایمان نظمم بہ نعتش درست

اس کے علاوہ بھی بعض جگہوں پر نعتیہ اشعار اس نے کہے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بنیادی طور پر نعت گو شاعر کی حیثیت سے شہرت نہیں رکھتا ۔ علاوہ بریں اگر مندرجۂ بالا نعت کے اشعار کا موازنہ اکرام صاحب کی پیش کردہ مشہور نعت سے کیا جائے تو اسلوب و انداز کا فرق بھی نظر آئے گا ۔

قدسی مشہدی کی حیات، ادوار، اس کی شاعری کے مطالعہ کے سلسلہ میں اس مشہور نعت پر کہی ہوئی متعدد تضمینوں کے ذوجہ اگانہ مجموعے 'حدیث قدسی' اور 'صحیفۂ قدسی' کے نام سے راقم سطور کی نظر سے گذرے ۔ یہ دونوں مجموعے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں بالترتیب شمارہ ۸ ۔ ۱۳۱۳ھ ر ۱۸۹۱ اور شمارہ ۱۱ا ۴ ق ۱۳۱۴ھ ر ۱۸۹۱ کے تحت موجود ہیں، پہلے مجموعہ کے مرتب قاضی محمد عمر ہیں جنہوں نے سن ۰ ۴ھ عں

۱۲۷۲ھ میں اس مشہور و معروف نظم پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے خمسے جمع کیے اور پھر یہ مجموعہ (حدیث قدسی) مطبع مصطفائی کانپور میں باہتمام بدیع الزماں چھپ کر شائع ہوا، دوسرا مجموعہ بنام 'صحیفۂ قدسی' حاجی سید شمشیر علی (باشندۂ قدیم قصبہ گوہانہ ضلع رہتک، حال مقیم دہلی) نے ۱۳۰۳ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) میں جمع کرنا شروع کیا جو ۱۳۰۴ھ (مطابق ۱۸۸۶-۸۷ء) میں محمود المطابع دہلی میں چھپکر منظر عام پر آیا، حدیث قدسی کے مرتب نے کہیں اس بات کا اشارہ نہیں کیا کہ یہ تضمینیں کس شاعر کی نعت پر ہیں، البتہ دیباچہ میں یہ بیان ملتا ہے:

"نکتہ شناسان دقیقہ یاب پر مخفی اور محتجب نہ رہے کہ اس جزو زماں یعنی ۱۲۷۲ھ (بارہ سو بہتر ہجری) قدسی میں فقیر احقر قاضی محمد عمر کے خاطر میں اس اندیشہ نے خطور کیا اور فکر رسا نے اس کوچہ میں رہنمائی کی کہ اگر مخمسات غزل قدسی کہ جسکا مطلع یہ ہے:

مرحبا سید مکی مدنی العربی　　　دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

جس قدر دستیاب ہو سکیں جمع کر کے اس صورت سے یہ مجموعہ مرتب کیا جائے کہ ہر شاعر کے نام کے نیچے مختصر مختصر حال بھی اس کا مرقوم ہو تو البتہ لطف سے خالی نہ ہوگا....."

صحیفۂ قدسی کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:-

(" الحمد للہ کہ مجموعہ تضمین شعرای ہندوستان بر غزل حضرت مولانا محمد جان صاحب قدسی، مسمیٰ بہ صحیفۂ قدسی ...."

اسی مجموعہ کے اصل متن میں خمسوں کے آغاز سے پہلے بطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے:-

"خمسہ بر غزل حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی"

چونکہ صحیفۂ قدسی میں پورے وثوق اور صراحت کے ساتھ اس نعت کو قدسی دہلوی کی

تصنیف بتایا گیا ہے، لہذا اس وقیع شہادت کی بنیاد پر بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعت متداولہ حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی نہیں بلکہ اسکے ہم نام کسی اور بزرگ شاعر مولانا محمد جان قدسی دہلوی کی تصنیف ہے اور شاید نام اور تخلص دونوں کی اس درجہ مماثلت اور یکسانیت کیوجہ سے اشتباہ ہو گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہوگی کہ یہ نعت قدسی مشہدی کے نام سے جو یقیناً زیادہ مشہور اور متعارف شاعر تھا منسوب کر دی گئی۔

اس مشہور نظم پر کہے ہوئے اکثر و بیشتر خمسے چونکہ انیسویں صدی کی تصانیف ہیں، لہذا بظاہر قدسی دہلوی اور تضمین نگاروں کے درمیان قرب زمانی بھی معلوم ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ لفظ 'مرحوم' سے جو اس کے نام کے ساتھ شامل ہے، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر جس کا وطن دہلی تھا، انیسویں یا اٹھارویں صدی یعنی عہد متاخرین کا شاعر رہا ہوگا۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قدسی مشہدی کی غیر معمولی شہرت اور اس کے نام اور شاعری سے واقفیت اس درجہ عام تھی کہ پڑھے لکھے لوگوں کا دونوں کے ناموں کو غلط ملط کر دینا یا محض سہواً قدسی مشہدی کو قدسی دہلوی لکھ جانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر قدیم و جدید ماخذوں میں قدسی مشہدی کے نام کے شروع میں 'حاجی' کا لفظ ملتا ہے۔ لیکن صحیفۂ قدسی میں جس میں نعت گو شاعر کا نام دو بار چھپا ہے، مولانا کا لفظ درج ہے، نیز 'مرحوم' اور 'رحمۃ اللہ علیہ' کے لفظوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی ایسے شخص کے لیے یہ کلمے استعمال کیے گئے ہیں جس کے انتقال کو بہت زیادہ مدت نہیں گذری، اس سے بھی خمسوں کے مرتبین اور قدسی دہلوی کے درمیان زمانی قرب کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

جامع صحیفۂ قدسی کے بیان سے جو اس نے دیباچہ میں دیا ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کو نعت نگار کی ذات سے تعلقِ خاطر تھا۔ لہذا خمسوں کی ترتیب و تدوین کے وقت اس کو دہلوی لکھنا ایک ایسی شہادت ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس نے یہ نسبتا

بلا تحقیق از خود نہ لکھی ہوگی، اور اس بات کا قطعی امکان نہیں کہ اس کو سہو ہوا ہو، وہ شاعر کی ذات اور شخصیت سے بخوبی واقف ہے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے ایسے جانے بوجھے شخص کی نسبت عمداً یا غیر عمداً غلط لکھ دی ہو، یہ بہر حال یقینی امر ہے کہ مرتب مجموعۂ ہذا کی حیثیت ایک غیر آگاہ ناقل کی نہیں بلکہ ایک واقف کار مورخ کی سی ہے جو کسی معاملہ کی نوعیت سے کما حقہٗ واقف ہوتا ہے اور جس کا بیان محقق اور مستند ہوتا ہے،

نعت مذکور کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کا انداز گذشتہ صدی کے کسی خالص ہندوستانی شاعر کا ہے، اور قدسی مشہدی کے اسٹائل اور طرز شاعری سے بہت مختلف ہے۔

اس نعت کی شہرت اور مقبولیت آج بھی قائم ہے اور عام طور سے ارباب ذوق اور ذی علم حضرات اس کو قدسی مشہدی ہی کی تصنیف بتاتے اور خیال کرتے ہیں لیکن ہماری نظر میں ان شواہد و قرائن کی موجودگی میں اس کو قدسی مشہدی کی تصنیف بتانا یا لکھنا صحیح نہیں،

اپنے دور میں تو یہ نظم بظاہر بہت ہی زیادہ مقبول و معروف رہا ہے، اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیسیوں شاعروں نے اس پر خمسے نظم کیے لیکن ان چند شاعروں کو چھوڑ کر جنھوں نے تضمینیں فارسی میں کہی ہیں، بیشتر شعرا اردو کے ہیں، کچھ ایسے بھی تضمین نگار ہیں جن کا کلام عربی یا پنجابی زبان میں ہے[1]، ایسے شعرا انیسویں صدی کے ہیں اور اس بات سے بھی نعت متداولہ اور تضمین نگاروں کے عہد کے تعین میں مدد ملتی ہے،

صحیفۂ قدسی کے مرتب کے دیباچہ سے اس نعتیہ غزل کی بے انتہا مقبولیت کا پتہ چلتا ہے، اس نے لکھا ہے کہ صحیفۂ قدسی کی ترتیب سے بھی پہلے اس نے ۲ دو حصے مجموعہ نعت کے نام سے شائع کرائے تھے،

---

[1] صحیفۂ قدسی کا (ص ۱۴۹) میں ایک ہی خمسہ پنجابی میں نظم کیا ہوا ملتا ہے تضمین نگار کا نام مولوی شیخ عبد الواحد دہلوی کا المتخلص بہ واحد دیا گیا ہے۔

اس دیباچہ سے چند دوسرے ضروری اور متعلق امور کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

"اول تو یہ کہ مرتب مجموعۂ ہٰذا کو ہمیشہ سے رسولِ اکرمؐ کی مدح خوانی یا نعت خوانی کا شوق تھا اور بہت سے خمسے اس کو زبانی یاد تھے، جو وہ مجلسوں میں پڑھتا تھا۔ اکثر شائقین اور باذوق حضرات اس سے ان خمسوں کی نقل کا مطالبہ کرتے کہ "یہ خمسہ لکھ دو یا نقل کر دو"۔ اس لیے اس نے طے کیا کہ جتنے خمسے اس کو یاد ہوں ان کو جمع کر کے چھپوا دیا جائے، لہٰذا" بہ عنایت الٰہی ۱۲۹۳ھ میں بندہ نے مجموعۂ نعت کے نام سے دو حصے چھپوا دیے، پھر میری نظر سے حدیث قدسی گذری جو کہ ۱۲۷۳ھ میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا کہ میں بھی قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں پس میں نے بھی بہ عنایت الٰہی کمر ہمت باندھ کر جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخباروں میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شاعروں کو بیرونجات میں خط لکھے، اب بفضلِ ایزدی بہ عرصہ دو سال میں یہ مجموعہ تیار ہو گیا جو کہ ہدیۂ شائقین و ناظرین ہے ....

اور بندہ نے ہر ایک شاعر کے تخلص کو ابجد کے حساب سے ترتیب دے کر مرتب کیا ہے تاکہ ہر ایک شخص کو خمسہ کے نکالنے میں دقت نہ ہو، اور نام اس کتاب کا صحیفۂ قدسی حصۂ دوم حدیث قدسی رکھا۔[۱] .... الخ"۔ مرتب نے آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ

[۱] حقیقتاً مجموعہ صحیفہ قدسی، حدیث قدسی کا حصہ دوم نہیں ہے لیکن محض اس بنا پر کہ یہ نسخہ موخر تھا اور حدیث قدسی کے بعد تیار کیا گیا تھا، مرتب نے اس کو یہ نام دے دیا ہے۔ ورنہ حقیقتاً دونوں الگ اور جداگانہ کوششیں ہیں۔

جتنے خمسے پہلے مجموعۂ یعنی حدیث قدسی میں چھپ چکے ہیں وہ مجموعۂ ہٰذا میں شامل نہیں کیے گئے۔[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزل متداولہ کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ان دو کوششوں سے قبل ہی تضمینوں کی تدوین اور جمع آوری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، لہٰذا قریب العہد شاعروں نے جن میں چند بڑے اور ممتاز شاعر شامل تھے، اور معمولی درجہ کے سخن گو حضرات بھی، اس نعت پر خمسے لکھ ڈالے، حاجی سید شمشیر علی، تخلص شمشیرؔ، مرتب صحیفۂ قدسی نے بھی اپنا خمسہ تضمین کیا جو اس مجموعہ کے صفحہ ستر پر درج ہے،

متذکرۂ بالا اقتباس کے پیش نظر تضمینوں کی ترتیب کے سلسلہ میں حدیث قدسی کو سید شمشیر علی کے مجموعوں پر تقدم زمانی اور فوقیت حاصل ہے، اور غالباً یہ پہلی کوشش تھی جو اس ضمن میں وجود میں آئی، اس مجموعہ کی اہمیت اور وقعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں چند عظیم المرتبت ہندوستانی شاعروں جیسے آخری تیموری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی، حکیم مومن خاں مومنؔ، امام بخش صہبائیؔ، میر حیدری مجروحؔ، غلام امام شہید اکبرآبادی وغیرہ اور دوسرے متعدد (نسبتاً کم متعارف) شاعروں کے خمسے شامل ہیں،[2] غالبؔ اور صہبائیؔ کے خمسے فارسی میں اور بقیہ تین اصحاب کے خمسے اردو میں ہیں،[3] اس کے علاوہ بھی کئی شعراء ایسے ہیں جنھوں نے اس نعت پر خمسے فارسی میں موزوں کیے ہیں، مرتب نے صفحہ ایک سو پچیس[125] پر اکیس[21] اشعار کی ایک غزل درج کی ہے جس میں اس نے ان شعرا کا نام یا تخلص لکھا ہے جنھوں نے تضمینیں کہی ہیں، اس غزل کا عنوان یوں پیش کیا گیا ہے،

---

[1] یہ صحیح نہیں اس لیے کہ خمسہ حافظ عبدالرحمٰن خاں صاحب متخلص بہ احسان جو صحیفۂ قدسی میں صفحہ نو[9] پر درج ہے اور جس کا مطلع ہے: "مستعد بہر شفاعت بسر شہا تجہ سا نبی" الخ، حدیث قدسی میں بھی صفحہ ۵ پر مندرج ملتا ہے۔ [2] ان شعراء کے خمسوں کے لیے ملاحظہ ہو بالترتیب صفحات ۵۵-۱۱۴-۹۱-۱۱۳-۹۲ اور ۱۱۵ [3] غالب کی تضمین بعنوان خمسہ بر غزل مولانا قدسی قدس اللہ سرہٗ کلیات غالب (مرتبہ امیر حسن نورانی) میں صفحہ ۱۸۷ پر درج ہے۔

"غزل از نکمۂ ناقص قاضی محمد عمر مولف مجموعۂ ہذا در ذکر شعرا"۔ مطلع یہ ہے :۔

(۱) آج پھر بزم سعادت کی ہے ترتیب نئی　　جمع ہوتے ہیں سبھی مدح سرایان نبی

اگلے شعر میں مرتب نے سب سے پہلے بہادر شاہ ظفر کا نام لیا ہے، شعر ہے :۔

(۲) گوہر مملکت و سایہ حق، مہر عطا　　شاہ ذیجاہ ظفر مظہر نور قدسی

بقیہ انیس[۱۹] اشعار بھی یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے وہ سارے نام سامنے آسکیں گے جو بقول مرتب 'مدح سرایانِ نبی' کی صف میں شامل ہیں :

شعر ۳: خازن جوہر عرفان خدا، حضرت فخر　　جس کی پیشانی سے ظاہر تھے فیوض ابدی

۴: منبع فضل و کرم، معدن فیاض ازل　　ساقی میکدۂ علم و ہنر، صہبائی

۵: شیر میدانِ سخن، غالب یکتای زمن　　فخر خوش فہمی و خوش گوئی و شیریں سخنی

۶: سوزدہ شمع سر محفل علم و حکمت　　جن کی مشہور جہاں میں ہے سخن کی گرمی

۷: یوسف مصر معانی و عزیز خوشگو　　اور نقیں شانۂ کش کاکل اسرار خفی

۸: اختر و عصمت و آشفتہ و احسان و حزیں　　بسمل او رج و وفا رحمت و موزون و ذکی

۹: حشمت و رفعت و تحسین و حیا و سوزش　　مظہر و مخلص و طراز[ل] و صفیر و کافی

۱۰: مومن و مضطر و مدہوش و حیائے جید　　بسمل و ناب و آشفتہ و اسحاق و غنی

۱۱: مضطر دیگر و امداد و رسا و راحت　　سالک، و صابر، و مجروح و انیس و ردی

۱۲: ذائق و خستہ و شیدا و امیر و طیب　　مثل و مہر و سلیم و طرب و فرد ذکی

۱۳: فضل و عیش و قلق و خبیر و امانت، عاجز　　شاد، شاداں و شگفتہ و دبیر و مجدی

۱۴: راحت و جوش و لطیف اور شہید و شہرت　　ماہر و طیب و تنویر و فسون و کیفی

۱۵: گوہر و قیس و فن اور ظہور و مضطر　　عبد و مسکین و ثنائی و خلیل و علوی

ل۔ وزن شعر میں لانے کے لئے اس کو طراز یعنی مشدد ر کے ساتھ پڑھنا پڑے گا۔

شعر ۱۶: تا در دعیش و غنی فکر و شعر رہ چالاک — اور مشیر اور ضمیر اور مذاق و عرشی

شعر ۱۷: واصف و دحشت و خورشید و آبدار شاکر — نازنین و تمر و صادم و عاشق و نامی

شعر ۱۸: اور تحمل کہ مجرد ہے مجرد کی طرح — اور مخبر ہے معزز کی صفت لاثانی

شعر ۱۹: صاحب فکر رسا، قائم خوش فکر کلام — مجرد و مجرکہ ہے شعر و سخن میں نامی

شعر ۲۰: وہ قناعت وہ وجاہت وہ رضائی اور شہید — وہ شہید کی اور رحیم اور وہ نسیم و نقشی

شعر ۲۱: جن کی ہے طبع رسا معدن اسرار خدا — جن کی خاک کف پا سرمۂ چشم قاضی

مجموعہ حدیث قدسی میں شامل ان تمام شعراء کے نام جنہوں نے تضمینیں موزوں کیں مع تخلص یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

۱۔ حکیم منور علی خاں آشفتہ رئیس میرٹھ
۲۔ پنڈت امر ناتھ المتخلص بہ آشفتہ
۳۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں تخلص احسان
۴۔ خمسہ اختر تخلص از خاندان تیموریہ کہ آمش در پردۂ عصمت است
۵۔ حاجی محمد اسحاق المتخلص بہ اسحاق
۶۔ امانت علی المتخلص بہ امانت
۷۔ مولوی امداد اللہ تھانوی تخلص امداد
۸۔ محمد امیر صاحب تخلص امیر
۹۔ سید قاسم علی خاں، تخلص انیس
۱۰۔ میاں اوج صاحب دہلوی
۱۱۔ غلام بسم اللہ بریلوی المتخلص بہ بسمل
۱۲۔ سید قطب الدین صاحب بسمل تخلص
۱۳۔ حکیم مولوی سید احمد المتخلص بہ تائب
۱۴۔ تجمل رسول خاں، تجمل تخلص
۱۵۔ محمد حسین خاں دہلوی المتخلص بہ تحسین
۱۶۔ مرزا عاشور بیگ تنہائی
۱۷۔ محمد نظام الدین جوش تخلص (مہتمم مطبع مصطفائی دہلی)
۱۸۔ نواب دلیر الدولہ میرزا محمد علی خاں بہادر تخلص حیدر
۱۹۔ محمد حیات خاں، تخلص حیات
۲۰۔ صاحب عالم میرزا رحیم الدین، حیا تخلص
۲۱۔ صاحب عالم میرزا فخر الدین حشمت تخلص
۲۲۔ حزین شاگرد عارف

۲۳- خلیل الدین المتخلص بہ خلیل رئیس میرٹھ

۲۴- حافظ الطاف حسین تخلص خستہ (رئیس پانی پت)

۲۵- خیرالدین تخلص خیر

۲۶- محمد فاضل، المتخلص بہ دبیر

۲۷- میاں ذائق

۲۸- مرزا محمود بیگ دہلوی المتخلص بہ راحت

۲۹- میاں راحت شخصے دیگر

۳۰- میرزا کریم الدین، المتخلص بہ رسا

۳۱- میرزا پیارے صاحب تخلص رفعت

۳۲- مولوی محمد صدیق حسن قنوجی تخلص روحی

۳۳- خمسہ میاں رحمت صاحب

۳۴- نواب محمد زلنجان بہادر لکھنوی، المتخلص بہ زکی

خمسہ گروزکی در صنعت کمرز

۳۵- مولوی عبدالکریم سوز تخلص

۳۶- حافظ عبدالرحمٰن کاندھلوی، سوزش تخلص

۳۷- مولوی سلیم اللہ، سلیم تخلص

۳۸- مرزا خجستہ بخت، سالک تخلص

۳۹- منشی تفضل حسین تخلص شاد

۴۰- مرزا عالی بہادر لکھنوی، المتخلص بہ شیدا

۴۱- خمسہ مولوی شہید صاحب لکھنوی

۴۲- مولوی علی بخش، شرر تخلص

۴۳- میاں احمد خاں دہلوی شریر تخلص

۴۴- سندر لال لکھنوی، المتخلص بہ شگفتہ

۴۵- مرزا حاجی صاحب تخلص شہرت

۴۶- نواب عبدالوہاب خاں، شاداں

۴۷- میاں خان صاحب دہلوی، صفیر تخلص

۴۸- مرزا قادر بخش دہلوی، صابر تخلص

۴۹- فصیح الدین سہارنپوری ضمیر تخلص

۵۰- فصیح الدین رہتکی، المتخلص بہ طیب

۵۱- سید حیدر علی، المتخلص بہ طبیب

۵۲- رحیم بخش، تخلص طرب

۵۳- محمد شاہ میر دہلوی طراز تخلص

۵۴- بہادر شاہ بادشاہ دہلی خلد اللہ ملکہ ظفر تخلص

۵۵- مولانا مولوی محمد ظہور علی ظہور تخلص[۱]

۵۶- مولوی عبدالعزیز، عزیز تخلص

۵۷- مولوی احمد حسن قنوجی، عرش تخلص

۵۸- قادر علی عبد تخلص

---

[۱] یہی نام اور تخلص لیکن مختلف اشعار کے ساتھ صحیفہ قدسی (ص ۸۲) میں بھی ملتا ہے۔

۵۹۔ خمسہ میاں عاجز صاحب
۶۰۔ منشی عزت سنگھ دہلوی تخلص عیش
۶۱۔ حکیم آغا جان عیش تخلص
۶۲۔ مولانا مولوی حکیم محمد عبداللہ تخلص علوی
۶۳۔ عبدالغنی ساکن بریلی، غنی تخلص
۶۴۔ خمسہ نامدار خاں غنی تخلص عہدہ دار مطبع ہذا
۶۵۔ حکیم محمد بشارت علی، تخلص فرد
۶۶۔ خمسہ میاں فنا
۶۷۔ قاضی فضل الرحمٰن متخلص بہ فضل
۶۸۔ میر حسن علی ترمذی، تخلص فنا
۶۹۔ میر بندہ علی دہلوی تخلص فکر
۷۰۔ میرزا منجھلے صاحب المتخلص بہ فسون
۷۱۔ میرزا نصیرالدین قناعت
۷۲۔ محمد عنایت اللہ خاں قیس تخلص
۷۳۔ میرزا قادر شکوہ، قادر تخلص
۷۴۔ شیخ مولا بخش، تخلص قلق
۷۵۔ مولوی کفایت علی مرادآبادی کافی تخلص
۷۶۔ خمسہ کیفی صاحب از خاندان تیمور
۷۷۔ میاں علیم اللہ گوہر
۷۸۔ فدا حسین پیرجی، لطیف تخلص
۷۹۔ مولوی رعایت حسین سہارنپوری مضطر تخلص
۸۰۔ محمد مردان علی خاں المتخلص بہ مضطر مرادآبادی
۸۱۔ حافظ حکیم مظفر حسین خاں مسکین تخلص
۸۲۔ میر مظہر علی مظہر تخلص
۸۳۔ حافظ اعظم علی، مضطر تخلص
۸۴۔ میاں غلام نبی مدہوش تخلص
۸۵۔ خمسہ میاں مخبر صاحب
۸۶۔ میاں دلدار علی، مذاق تخلص
۸۷۔ مرزا محمد بیگ، محوی تخلص
۸۸۔ محمد اکبر مخلص تخلص
۸۹۔ سید محمد علی معزز تخلص
۹۰۔ خمسہ میاں مہر صاحب
۹۱۔ خمسہ حکیم مومن خاں مرحوم مومن تخلص
۹۲۔ خمسہ میر مہدی صاحب المتخلص بہ مجروح
۹۳۔ حافظ محمد قطب الدین دہلوی مشیر تخلص
۹۴۔ مرزا محمد ظہیرالدین مغل تخلص (خلف حضور والا)
۹۵۔ خمسہ میرزا جمعیت شاہ، ماہر تخلص
۹۶۔ میرزا محمد قادر بخش، موزوں تخلص

۵۹۔ خمسہ میاں عاجز صاحب

۶۰۔ منشی عزت سنگھ دہلوی تخلص عیش

۶۱۔ حکیم آغا جان عیش تخلص

۶۲۔ مولانا مولوی حکیم محمد عبداللہ تخلص علوی

۶۳۔ عبدالغنی ساکن بریلی، غنی تخلص

۶۴۔ خمسہ نامدار خاں غنی تخلص عمدہ واز طبع ہذا

۶۵۔ حکیم محمد بشارت علی، تخلص فرد

۶۶۔ خمسہ میاں فنا

۶۷۔ قاضی فضل الرحمن متخلص بہ فضل

۶۸۔ میر حسن علی ترمذی، تخلص فنا

۶۹۔ میر بندہ علی دہلوی تخلص فکر

۷۰۔ میرزا منجھلے صاحب المتخلص بہ فسون

۷۱۔ میرزا نصیر الدین قناعت

۷۲۔ محمد عنایت اللہ خاں قیس تخلص

۷۳۔ میرزا قادر شکوہ، قادر تخلص

۷۴۔ شیخ مولی بخش، تخلص قلق

۷۵۔ مولوی کفایت علی مرادآبادی کافی تخلص

۷۶۔ خمسہ کیفی صاحب از خاندان تیمور

۷۷۔ میاں علیم اللہ گوہر

۷۸۔ فدا حسین پیر جی، لطیف تخلص

۷۹۔ مولوی رعایت حسین سہارنپوری مضطر تخلص

۸۰۔ محمد مردان علی خاں المتخلص بہ مضطر مرادآبادی

۸۱۔ حافظ حکیم مظفر حسین خاں مسکین تخلص

۸۲۔ میر مظہر علی مظہر تخلص

۸۳۔ حافظ اعظم علی، مضطر تخلص

۸۴۔ میاں غلام نبی مدہوش تخلص

۸۵۔ خمسہ میاں مخیر صاحب

۸۶۔ میاں دلدار علی، مذاق تخلص

۸۷۔ مرزا محمد بیگ، محوی تخلص

۸۸۔ محمد اکبر، مخلص تخلص

۸۹۔ سید محمد علی معزز تخلص

۹۰۔ خمسہ میاں مہر صاحب

۹۱۔ خمسہ حکیم مومن خاں مرحوم مومن تخلص

۹۲۔ خمسہ میر مہدی صاحب المتخلص بہ مجروح

۹۳۔ حافظ محمد قطب الدین دہلوی مشیر تخلص

۹۴۔ مرزا محمد ظہیر الدین مقبل تخلص (خلف حضور والا)

۹۵۔ خمسہ میرزا جمعیت شاہ، ماہر تخلص

۹۶۔ میرزا محمد قادر بخش، موزون تخلص

۹۷۔ خدابخش خاں، تنویرؔ تخلص
۹۸۔ شیخ امیر علی دہلوی، مجردؔ تخلص
۹۹۔ میرزا علی نازنینؔ تخلص
۱۰۰۔ مولوی حکیم محمد نسیم اللہ، نسیمؔ تخلص
۱۰۱۔ بدرالدین علی خاں، نقشیؔ تخلص
۱۰۲۔ خمسہ میاں نامیؔ صاحب
۱۰۳۔ حکیم محمد نصر اللہ خاں دہلوی المتخلص بہ دعاؔ
۱۰۴۔ مولوی احمد حسن، وحشتؔ تخلص
۱۰۵۔ احمد علی خاں وجاہتؔ تخلص
۱۰۶۔ سید حیات اللہ واصفؔ تخلص
۱۰۷۔ سید جمیل الدین ہجرؔ تخلص
۱۰۸۔ سید محمد حسین خاں، یقینؔ
۱۰۹۔ صفدر علی بیگ، بلند تخلص [۱]
۱۱۰۔ حکیم حافظ ایوب علی، قائمؔ تخلص
۱۱۱۔ ترجیع بند غلام امام شہید اکبرآبادی شہیدؔ تخلص (نیز ایک خمسہ)
۱۱۲۔ (خمسہ فارسی) جناب مولوی امام بخش صہبائی مدرس
۱۱۳۔ خمسہ نواب اسد اللہ خاں غالبؔ تخلص میرزا نوشہ
۱۱۴۔ میرزا رحیم بیگ رحیمؔ تخلص
۱۱۵۔ سید احمد حسن، المتخلص بہ صارمؔ
۱۱۶۔ نواب مرزا والاجاہ بہادر لکھنوی المتخلص بہ عاشقؔ
۱۱۷۔ سید امیر مرزا، خورشیدؔ تخلص
۱۱۸۔ خمسہ میرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ ولی عہد بہادر المتخلص بہ رمزؔ
۱۱۹۔ مسدس مولوی محمد بشیر الدین، تخلص شاکرؔ

اس آخری شاعر کی تضمین کے بعد جو مسدس کی شکل میں ہے، ایک مشہور مخمس نعتِ نبیؐ میں (لیکن بہ شکل تضمین نہیں) ملتا ہے، مقطع سے نشاندہی ہوتی ہے، کہ اس کا مصنف کوئی شاعر متخلص بہ شہیدؔ ہی ہے۔ اس مخمس کے بعد ایک سرخی "تضمین بر غزل استادنا نسیم دہلوی" مندرج ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ تضمین مرتب حدیث قدسی نے اپنے استاد نسیمؔ دہلوی کی کسی غزل پر موزوں کی ہوگی۔ اس عنوان کے بعد مرتب کی دی غزل جو تضمین نگاروں کے ناموں

---

[۱] ایک خمسہ اسی نام اور تخلص سے بجنسہٖ انہی اشعار کے ساتھ جو اس مجموعہ میں مندرج ہیں صحیفۂ قدسی (ص ۲۲) میں بھی موجود ہے۔

یا تخلصوں پر محتوی ہے، اور جس کو راقم نے گذشتہ سطور میں نقل کیا ہے' ملتی ہے، اسکے بعد متفرق اشعار بعنوان "ابیات متضمن نصیحت برائے مومنین طالب جمعہ" اور ایک سرخی بعنوان غزل بھی موجود ہے جس کے بعد تمت کا عنوان اور قطعہ تاریخ طباعت فارسی میں درج ہے، جو حسب ذیل ہے،

"چوں دریں آوان بعون کردگار — نعت شاہ انبیاءؐ مطبوع شد
گفت شائق سال آں از روئے طبع — وصف محبوب خدا مطبوع شد

اس کے بعد ملحقات کے عنوان سے چند اور بھی تضمینیں اسی مجموعہ میں موجود ہیں جو بعد میں بدیع الزماں مہتمم مطبع ہذا نے شعرائے نامی سے موزوں کروا کے زینت دہ رسالۂ ہذا کئے یعنی مجموعہ میں شامل کئے، ان مخمسوں کا ذکر ہم طوالت کے خوف سے یہاں نظرانداز کرتے ہیں' ان تضمین نگار شعراء کے ذکر یا ان کے کلام کو قاضی محمد عمر نے متن اصلی میں شامل نہیں کیا ہے، ان مزید خمسوں کی کل تعداد بارہ[۱۲] ہے، تضمین نگاروں کی فہرست سے علم ہوتا ہے، کہ شعراء کی تعداد ایک سو انیس[۱۱۹] اور کل خمسوں کی تعداد ایک سو اکیس[۱۲۱] ہے،

صحیفۂ قدسی کے مرتب نے اپنی تالیف کے آخر میں لکھا ہے کہ

"حدیث قدسی کے پہلے حصہ میں ۱۳۲ (کذا) خمسے ہیں، اور وہ نو (کذا) جزو پر ہے صحیفۂ قدسی حصۂ دویم میں ۲۰۰ خمسے جمع کر کے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں، یہ حصہ ۱۱ (کذا) جزو کا ہے"[۵]

---

[۵] حدیث قدسی کے پہلے حصہ سے مراد خود مجموعۂ حدیث قدسی اور صحیفۂ قدسی حصۂ دویم سے مراد خود صحیفۂ قدسی ہے، یہ مرتب حدیث قدسی کو حصۂ اول اور اپنی کوشش کو حصۂ دویم کا نام دیتا آیا ہے، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، حقیقتاً یہ دونوں بالکل جداگانہ مجموعے ہیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ جزو سے مرتب کی مراد کیا ہے،

اس متبرک اور پاکیزہ غزل پر تضمین نگاری کے سلسلہ میں شعراء نے بلا تفریق مذہب و ملت حصہ لیا، اور اس طرح اپنے جذبات خلوص و ارادت کا اظہار کیا، یہ بات بھی اس نعت کی مقبولیت اور عظمت کی واضح اور بین دلیل ہے۔ صحیفۂ قدسی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے چند ہندو حضرات نے خمسے نظم کئے تھے، جو سرور کونین کی ذات والاصفات سے ان شعرائے کرام کی عقیدتمندی کا کھلا ہوا ثبوت ہیں، جن ہندو شاعروں کی تضمینیں اس مجموعہ میں شامل ہیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں،

۱۔ منشی تلجا رام با تخلص جوہر (ص ۴۴)

۲۔ منشی ہرلال، تخلص رسوا، دہلوی (ص ۱۷۰)

جیسا کہ تضمین نگاروں کی فہرست سے ظاہر ہے، حدیث قدسی میں ان دو حضرات کے نام موجود ہیں،

۱۔ پنڈت امرناتھ، المتخلص بہ آشفتہ (ص ۴) (۲) سندر لال لکھنوی تخلص شگفتہ (ص ۳۲)

۳۔ منشی عزت سنگھ دہلوی المتخلص شگفتہ (ص ۴۶)

شیخ اکرام صاحب نے اس نعت کے کل آٹھ اشعار دیئے ہیں، جب کہ ان دونوں مجموعوں میں عام طور سے دس اشعار ملتے ہیں[۱]۔ ان آٹھ اشعار میں سے جو زیر نظر مقالہ کے شروع میں نقل کر دیئے گئے ہیں، ایک شعر تو وہ ہے جو عام طور سے مخمسات میں کم ملتا ہے وہ بیت یہ ہے،

عاصیانیم ز ما نیکی اعمال مپرس[۲] سوئے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی

اس کے علاوہ بقیہ سات اشعار کلیۃً مشترک ہیں، باقی تین ابیات جو کم و بیش ہر خمسہ میں شامل تضمین ہیں اور ارمغان پاک میں دستیاب نہیں، یہ ہیں :-

---

[۱] اور کہیں کہیں گیارہ، مثلاً فاروق علی المتخلص بہ انجم کے خمسوں میں جو صحیفہ قدسی میں صفحات ۳۶ اور ۳۷ پر درج ہیں۔ (۲) اکثر خمسوں میں بجائے مپرس مخواہ درج ہے،

۱۔ نخل بستان مدینہ ز تو سر سبز مدام　　زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

۲ ذات پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور　　زاں سبب آمدہ قرآن بزبان عربی

۳۔ شب معراج عروج تو گذشت از افلاک　　بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی[1]

ایک اور بھی زاید بیت جو باندھا گیا ہے (اگرچہ بکثرت نہیں) یہ ہے،

بر در فیض تو استادہ بصد عجز و نیاز　　رومی و زنگی و طوسی و یمنی و حلبی

حدیث قدسی کے ایک دو خمسوں میں یہ شعر بھی دیکھنے میں آیا،

در حریم حرم کعبہ وصلش نرسی

دست در دامن اولاد نبی تا نزنی

بہ حیثیت مجموعی صحیفۂ قدسی کی اہمیت نسبتاً کم ہے، حدیث قدسی کی برتری کی ایک وجہ تو وہی تقدم زمانی ہے، جس کے بارہ میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ صحیفۂ قدسی میں خمسوں کی تعداد میں اضافہ کے باوجود تضمینوں کا معیار فکر و فن کے اعتبار سے کچھ بہت بلند نہیں، اور کوئی بھی صاحب امتیاز شاعر تضمین نگاروں میں شامل نظر نہیں آتا، البتہ شیخ ابراہیم ذوق اور مولوی امام بخش صہبائی کے "تلامذہ کے خمسے شامل ہیں یعنی شوقی؟ شاگرد صہبائی، سید میرن شاہ المتخلص بہ صفا، تلمیذ ذوق دہلوی، بدرالدین صہبا (صبا) شاگرد صہبائی، اور سید دلدار علی بدایونی تخلص مذاق، شاگرد حضرت ذوق،

---

[1] مفہوم اصلی کے اعتبار سے بجائے "نرسد" "رسید" ہونا چاہیے، بہر حال اس کلمہ "نرسد" سے جو فعل مضارع کا صیغہ ہے، حال اور مستقبل دونوں کے معنی نکلتے ہیں، گویا نبی آخر الزماں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بعد بھی کسی نبی کی بعثت کی گنجائش باقی رہتی ہے، یا رہے گی، اور یہ بات اس باب میں امت مسلمہ کے عقیدہ کے بالکل منافی پڑتی ہے،

بہرحال صحیفۂ قدسی میں شعراء کی کل تعداد ایک سو اکیاون[151] ہے اور خود مرتب کے قول کے مطابق جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، خمسوں کی تعداد دو سو[200] ہے جن میں چند مسدس اور ایک دو مثلث بھی شامل ہیں۔ اسی مجموعہ میں صفحہ ۲۹ پر ایک خمسہ بنام تیمور درج ہے، جس کے ہر بند میں کل نو[9] مصرعے ہیں یعنی دو نعت گو شاعر کے اور بقیہ سات تضمین نگار کے۔

کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ (شاید) قدسی دہلوی نے یہ نعت بارگاہ نبوی میں موجودگی اور حاضری کے وقت موزوں کی ہوگی جیسا کہ اس مصرع سے ظاہر ہے:

ع آمدہ سوی تو قدسی پئ درماں طلبی

صحیفۂ قدسی (۴۲) میں خمسہ محمد حمید اللہ خاں متخلص حمید کے آخری بند کا ایک مصرع اور پھر نعت نگار کا آخری شعر اس طرح درج ہے:

....	در پہ حاضر ہے حمید آپ کے مثلِ قدسی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی	آمدہ سوی تو قدسی پئ درماں طلبی

اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے اشارے چند دوسرے خمسوں میں بھی ملتے ہیں، اسکے علاوہ خود نعت کے ایک اور مصرع:

ذاتِ پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور

سے بھی سرزمین حجاز میں شاعر کی موجودگی یا اس سے قربت کا احساس ہوتا ہے۔

متذکرۂ بالا مجموعوں (خاص طور سے صحیفۂ قدسی) کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نعت متداول کی شہرت، اس کے مقبول خاص و عام ہونے کی بنا پر، ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے علاقوں جیسے دہلی، پنجاب، یوپی وغیرہ

کے علاوہ دور دراز حصوں اور شہروں مثلاً میسور، کوئمبٹور، حیدرآباد، پونا، جبل پور، ہوشنگ آباد، اندور (مالوہ) عظیم آباد (پٹنہ) جھجھر، برہان پور اور گلبرگہ وغیرہ کے شعرائے بھی پورے ذوق وشوق اور خلوص وعقیدتمندی کے جذبات کے ساتھ اس پسندیدہ نعت پر تضمینیں اور خمسے مرتب کئے۔

صحیفۂ قدسی کے جامع نے بالکل آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے امیر خسرو کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے

ای چہرۂ زیبای تو رشک بتانِ آذری ہر چند وصفت میکنم درحسن زاں زیباتری

کی تضمینوں کی جمع آوری کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا، لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا یا نہیں۔

وہ لکھتا ہے:-

"بندہ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کی غزل کے خمسے جمع کرنے شروع کیے ہیں، میرا ارادہ ہے کہ انشاء اللہ ان کو اسی طرح چھپوا دوں، اس لیے عرض ہو کہ جس صاحب کے پاس اس غزل کا خمسہ یا مثلث یا مسدس ہو یا اب طبع آزمائی فرمائیں اور مجھکو مرحمت کریں تو میں بعد چھپنے کے ایک کتاب ان کو نذر کر دوں گا۔ غزل یہ ہے ؎
"ای چہرۂ زیبائے تو.........." الخ

اس بات کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ قدسی اور اس کی نظم کردہ نعت پر اس بحث کے ضمن میں یہ تو تمام خمسوں کی نقل کی یہاں گنجایش ہے اور نہ ضرورت، لہذا ہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے بطور مثال اور نمونہ ان چند نامور تاجداران اقلیم سخن کے مخمسات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن کا کلام فکر کی ندرت اور پاکیزگی، بیان و انداز کی تازگی اور

دلنشینی کا حامل ہے، اور جس میں خلوص جذبہ کی آمیزش نے تاثیر کا گہرا رنگ بھر دیا ہے، ان نمونوں کے انتخاب میں وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے، جو پیشتر عنبط تحریر میں آچکی ہے،

خمسہ بہادر شاہ ظفر :-

سرورا تو وہ نبی جس کے نہیں بعد نبی — دیکھ کر شان تری عرش کی بھی شان دبی
انبیاء تجھ سے کہیں وقتِ شفاعت طلبی — مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

ہے ترے جلوہ سے مسجودِ ملایک آدم — تیرے ہی نور سے پُر نور حدوث اور قدیم
دیکھ کر حسن کے شیدا ترے دونوں عالم — مِن بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

تجھ کو گر خالقِ کونین نہ پیدا کرتا — پھر کبھی ارض وسما ہوتے نہ پیدا اصلا
گرچہ اولاد میں آدم کی ہوا تو پیدا — نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را

برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

جب گیا سوی فلک کر کے زمیں کے طے دشت — دیکھے سب باغ بہشت ایک سے لیکن ہشتا ہشت
کرچکا گلشنِ نہ چرخ کی جب تو گلگشت — شبِ معراجِ عروج تو ز افلاک گذشت

بمقامیکہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

ابر احسان کرم سے ترے سیراب انام — ثمر خلق سے ہے تیرے جہاں شیریں کام
اے تر و تازگی افزای ریاضِ اسلام — نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

موسیٰ و عیسیٰ و داؤد جہاں تھے مامور — وہیں نازل ہوئیں توریت اور انجیل و زبور

ان کی ہر خاص زباں میں کہ نہ ہو فہم سو دو
ذاتِ پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآن بزبانِ عربی

وہ فرشتہ کہ جو ہو حامل عرش اعظم
آئے در پہ ترے آنکھوں کو اگر کرکے قدم
تو ادب سے یہ کہے کھاکے ترے در کی قسم
نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگِ کوی تو شد بی ادبی

سوزِ عصیاں سے جگر سوختہ جب مخلوقات
آئیں صحرای قیامت میں طلبگار نجات
کہیں سرچشمۂ احسان ہی شہا تری ذات
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ زحد میگذرد تشنہ لبی

ہے ظفر کے دل بیمار کا بھی حال وہی
اور اسی طرح سے اب چارہ طلب ہے وہ بھی
کہہ گیا آگے ثنا میں تری جیسے قدسی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوی تو قدسی پیٔ درماں طلبی

خمسہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی، در فارسی :-

کیستم تا بجز و شم زدم بی ادبی
قدسیاں پیش تو در موقفِ حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمہ زیر لبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

ایکہ روی تو دہد روشنی ایمانم
کافرم کافر اگر مہر منیرش خوانم
صورتِ خویش کشیدست مصور دانم
من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

ای گلِ تازہ کہ زیب چمنی آدم را
باعثِ رابطۂ جان و تنی آدم را

کرده در یوزهٔ فیض تو غنی آدم را نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را

برتر از عالم و آدم تو چه عالی نسبی

ای لبت را بسوی خلق ز خالق پیغام روح را لطفِ کلام تو کند شیریں کام

ابر فیضی که بود از اثر رحمتِ عام نخل بستانِ مدینه ز تو سر سبز مدام

زاں شده شهرهٔ آفاق به شیریں رطبی

خواست چوں ایزد دانا که بساطی از نو گستر د در همه آفاق چه نزدیک چه دو

حکم اصدار تو در ارض و سما یافت صدو ذاتِ پاک تو دریں ملکِ عرب کرد ظهو

زاں سبب آمده قرآن بزبان عربی

وصفِ رخش تو اگر در دلِ ادراک گذشت نه همیں رست که از دایرهٔ خاک گذشت

همچو آں شعله که گرم از خس و خاشاک گذشت شب معراج عروجِ تو ز افلاک گذشت

بمقامیکه رسیدی، نرسد هیچ نبی

چه کنم چاره که پیوند خجالت گسلم منکه جز چشمهٔ حیواں نبود آبِ گلم

منکه چوں مهر درخشاں نه بد نور دلم نسبتِ خود به سگت کردم و بس منفعلم

زانکه نسبت به سگِ کوی تو شد بی ادبی

دل ز غم مرده و غم برده ز ما صبر و ثبات غمگسار کن و بنمای بما راهِ نجات

وا دسوز جگر ما که دهد نیل و فرات ما همه تشنه لبانیم و توئی آبحیات

رحم فرما که ز حد میگذرد تشنه لبی

غالب غمزده را نیست دریں غمزدگی جز بامید ولای تو تمنای بهی

از تپ و تب، و تابِ دلِ سوختهٔ غافل نشوی سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی

آمده سوی تو قدسی پی درماں طلبی

خمسہ حکیم مومن خاں مومن دہلوی :

ہوں تو عاشق مگر اطلاق یہ ہے بے ادبی ۔۔۔ میں غلام اور وہ صاحب ہے، میں امت وہ نبی
یا نبی یک نگہ لطف یا امی(؟) و ابی ۔۔۔ مرحبا سید مکی، مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

مظہر نور خدا، شکل ہے محسوس صنم ۔۔۔ محو تیرے ملک و حور، پری و آدم
کیا ہے عالم کہ ہے تصویر سی کا سا عالم ۔۔۔ من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمالست بدین بوالعجبی

دشت عالم میں سراسیمہ گدائے اوقات ۔۔۔ آج تک منزل مقصود نہ پائی ہیہات
مدد اے خضر کرامت کہ نہیں پائی ثبات ۔۔۔ ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات

لطف فرما کہ زحد میگذرد تشنہ لبی

خود کہا ابن ذبیحین تو ظاہر میں کہا ۔۔۔ جوہر پاک کی خوبی ہے فرشتوں سے سوا
سر سے لے پاؤں تلک نور خدا نامِ خدا ۔۔۔ نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را

برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

صاحبِ خانہ سے ہوتا ہے مکاں کا اکرام ۔۔۔ وہی جنت ہے جہاں میں ہو جہاں تیرا مقام
آبِ ہر چشمہ کرے کوثر و تسنیم کا کام ۔۔۔ نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

ہوئی انجیل کہاں ناسخ توریت و زبور ۔۔۔ تیری خاطر سے خدا نے یہ نکالا دستور
ہے رعایت تری ہر بات کی کتنی منظور ۔۔۔ ذات پاک تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور

زاں سبب آمدہ قرآن بزبانِ عربی

کر سکے پایۂ عالی کو ترے کون ادراک
تیرے درجہ کو نہ عیوق ہی پہنچے نہ سماک
گرچہ کافی تھی فضیلت کو حدیثِ لولاک
شبِ معراج عروجِ تو گذشت از افلاک
بہ مقامیکہ رسیدی، نرسد ہیچ نبی

جوش میں شوق کے کچھ یاد رہی مدح نہ ذم
یہ نہ سمجھے کہ یہ کیا جای ہے اور کیا ہیں ہم
خود ستائی ہے زبس رسمِ فصیحانِ عجم
نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگِ کوی تو شد بی ادبی

مومنِ زار کی صحت کا نہ تھا کچھ اسلوب
نہ دوا اور نہ پرہیز، مرض حرص ذنوب
پر ترا لطف ہے اعجاز مسیحا سے بھی خوب
یا طبیب الفقراء انت شفاء القلوب
زاں سبب آمدہ قدسی پی درماں طلبی

خمسہ فارسی جناب مولوی امام بخش صہبائی :-

زیں طرب کز پیِ امت تو شفاعت طلبی
برلبِ رحمت حق خندہ بود زیرلبی
نسبتِ عرش بہ جاہ تو بود بی ادبی
مرحبا سید مکی، مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

برق زد لمعۂ خورشید رخت بر جانم
زاضطراب آئینہ وش ریخت ہمہ مژگانم
ایکہ مہر تو بہ تن جان و بہ دل ایمانم
منِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی

چوں ترا یافتہ باشم چہ کنم عالم را
از ہمہ بیشی و با بیش نخواہم کم را
داند آنکس کہ شناسد ز گہر شبنم را
نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

طوطی سدرہ نشیں از شکرت شیریں کام
طوبیٰ از فیض تو در خلد دہد میوہ کام

زمزم از بحر کف جود تو سیراب تمام
نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

بود تا مسکن و ماوای تو در عالم نور
بی زباں داشت سخن حق بتو در بزم حضور

ہست اسباب چو در عالم اسباب ضرور
ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور

زاں سبب آمدہ قرآنِ بزبانِ عربی

رخش جا لاک توزیں عرصہ چہ بیباک گذشت
کز زمیں جست بلند و ز جہاں پاک گذشت

رفعتِ شان تو تنہا نہ ازیں خاک گذشت
شب معراج عروجِ تو ز افلاک گذشت

بہ مقامیکہ رسیدی، نرسد ہیچ نبی

ہمچو جاں شوق تو رہ یافتہ در آب و گلم
نقش زد حرف وفا خامۂ مہرت بدلم

لیک چوں می نگرم در تو در خود خجلم
نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم

زانکہ نسبت بہ سگت نیز بود بی ادبی

ای ز حق بر تو و بر آلِ تو دائم صلوات
از لب لعلِ تو یک جنبش و از خلق نجات

سوز ما بین و بدہ بر لب تسنیم برات
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات

لطف فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی

زاں زماں کامدہ لعلت پی مردہ دلی (؟)
تہمت معجزہ نابستہ کسی بر عیسیٰ

دست صہبائی دلسوختہ بپسند تہی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی

آمدہ سوی تو قدسی پی درماں طلبی

اس ضمن میں اور بھی تضمینیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم نے طول کلام کے ڈر سے عمداً ان کو

نظر انداز کر دیا ہے، لہذا انھیں چند نمایندہ اقتباسات پر زیر نظر مقالہ کو ختم کیا جا رہا ہے، آیندہ کسی صحبت میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ان تمام نسخوں کا جو مطالعہ میں آئے ہیں، ایک مفصل تنقیدی جائزہ لیا جائے تاکہ نعت گوئی کے میدان میں ان کی اہمیت اور ان کا معیار متعین کیا جا سکے، ہمیں امید ہے کہ ان سطور سے جو بحث کی گئیں نعت قدسی کی تصنیف اور اس کے مصنف اعلیٰ کے تعین میں کسی حد تک مدد مل سکے گی اور اس طرح ایک دلچسپ بحث کے مختلف گوشے ناظرین کے سامنے آسکیں گے۔

سلسلۂ شعر العجم

مرتبہ مولانا شبلیؒ

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور انکے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ہر عہد کے تمام مشہور شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے:

شعر العجم حصہ اول:۔ عباس مروزی سے نظامی تک کا تذکرہ، قیمت ۹۵ روپے

〃 〃 دوم:۔ شعرائے متوسطین یعنی خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ شیرازی اور ابن یمین کا تذکرہ مع تنقید کلام، قیمت ۷۵ روپے

〃 〃 سوم:۔ شعرائے متاخرین فغانی سے ابو طالب کلیم تک کا تذکرہ اور کلام کی خصوصیت۔ قیمت ۷۵ روپے

〃 〃 چہارم:۔ شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی خصوصیات شاعرانہ مرقع و سیر پر بسیط تبصرہ قیمت [illegible]

〃 〃 پنجم:۔ قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت [illegible] روپے

منیجر

ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ، اپریل 1970ء

غزل قدسی در نعتِ سرورؐ

از جناب کالیداس گپتا رضا، بمبئی

دسمبر ۱۹۷۶ء کے معارف میں ڈاکٹر سمیع الدین احمد لکچرار شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک مضمون بعنوان "نعتِ قدسی اور اس کی مقبولیت" شائع ہوا ہے۔

نعت قدسی (مرحبا سید مکی مدنی العربی) پر متعدد تضمینوں کے دو جداگانہ مجموعے "حدیث قدسی" اور "صحیفۂ قدسی" ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر رہے ہیں، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں، کتاب "حدیث قدسی" قاضی محمد عمر نے ۱۲۷۰ھ میں اس مشہور و معروف نظم پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے خمسے جمع کر کے ترتیب دی، ۱۲۷۹ھ میں چھپی، مجموعہ صحیفۂ قدسی حاجی سید شمشیر علی نے ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں ترتیب دینا شروع کیا، جو ۱۳۰۴ھ میں محمود المطابع دہلی میں چھپکر منظر عام پر آیا، ڈاکٹر صاحب کا مضمون جو ص ۵۴۴ سے ص ۴۶۹ تک پھیلا ہوا ہے، انہی دو مجموعہ ہائے مخمسات پر مبنی ہے، ظاہر ہے میرا مضمون "غزلِ قدسی اور تضمینِ غالب" (مطبوعہ آجکل فروری ۱۹۷۴ء) ان کی نظر سے نہیں گذرا ورنہ شاید انھیں اپنے مضمون کی بیشتر باتیں لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی،

اسی قسم کی نامکمل واقفیت کی بنا پر سید وزیر الحسن نے بھی فرض کر لیا تھا کہ قاضی محمد عمر والا مجموعہ مخمسات "حدیث قدسی" دراصل دلی کے ایک نعتیہ مشاعرے

کا گلدستہ ہے، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا۔[1] میرا مضمون مطبوعہ آجکل فروری ۱۹۷۷ء اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے شائع کیا گیا تھا،

حقیقت یہ ہے کہ قاضی محمد عمر صاحب حدیث قدسی کے اولین مرتب نہیں، پہلا مجموعہ محمد حسین خاں تحسین شاگرد ذوق نے (جو اس عہد میں مطبع مصطفائی دہلی کے مالک و مہتمم تھے) اس خیال سے کہ "بعد چھوٹ جانے اس دار فانی کے واسطہ بقائے نام اور وسیلۂ نیکی سرانجام کا ہو" اس وقت کے نامی گرامی شعرائے ہند سے کچھ ذاتی تعارف کی بنا پر اور کچھ بذریعہ خط و کتابت مخمسات حاصل کر کے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں مرتب کیا تھا۔

میرے کتب خانے میں تضامین غزل قدسی کے چھ مجموعے ہیں، یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ارتقاء پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے اور ان نسخوں کا مختصر جائزہ لیا جائے، پھر حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی،

۱۔ 'مخمسہائے غزلِ قدسی' یا 'چمن مدحِ نبی'

مطبع مصطفائی دہلی سے محمد حسین خاں تحسین کے اہتمام سے طبع ہوئی، مطبع کے اندراج کے علاوہ سال تاریخ محمد نظام الدین جوش[2] کے قطعہ سرورق سے بھی ثابت ہوتا ہے ؎

---

[1] "دہلی کے اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمینیں" آجکل ۱۵ر فروری ۱۹۷۷ء

[2] منشی نظام الدین جوش خلف وجیہ الدین پنجابی۔ شگفتہ طبیعت پائی تھی، علی گڑھ میں رہا کرتے تھے،...... خمخانۂ جاوید۔ جلد دوم ص ۳۸۵

جب ہوئی زیب دہ طبع خوشا صلؔ علی   فکر تاریخ میں گلشن کی طرف میں جو گیا

بلبل از جوشِ طرب خواند بشاخِ گلہا   وہ چہ گرویدِ شگفتہ چمن مدحِ نبی

چونکہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں مرتب ہو کر ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی تھی، اسلئے اس میں ۱۲۶۹ھ، ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۷۱ھ تینوں سال کے قطعہ ہائے تاریخ ملتے ہیں، خاتمۃ الطبع میں ایک قطعۂ تاریخ جس سے ۱۲۷۱ھ برآمد ہوتا ہے بہت دلچسپ ہے، یہ مرزا علی رضا دہلوی نازنین تخلص کا طبع زاد ہے، اور جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے، ریختی میں ہے ؎

نازنین تجھکو اک بتاؤں بات   کہ نگوڑی ٹبری ہو بات تیری

سال چھپنے کے اس کتاب کے لکھ   اے بوا اس میں ہے نجات تیری[1]

کتاب کے آخری صفحات میں تحسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکر شعراء" ہے، جس میں مرتب سمیت ان ایک سو سات شعراء کا ذکر ہے جن کے مخمسے زینتِ کتاب ہیں، حالانکہ تحسین استاد ذوق کے شاگرد تھے، تاہم وہ ذوق کو تضمین غزل قدسی پر آمادہ نہیں کر سکے، وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ شاہ ظفر کی تضمین کے ہوتے ہوئے ذوق نے اپنی شمولیت کو بادشاہ کے احترام کے منافی خیال کیا ہوگا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ذوق ہی کی تضمین ہو اور بادشاہ ظفر کے نام سے شائع ہوئی ہو، قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

معنیٔ بیتِ دو عالم شہِ ذیجاہ ظفر   لفظ معنیٔ سخاوت شہِ با فتح و ظفر

غالبؔ کا ذکر اس طرح آتا ہے ؎

ماہرِ فنِ سخن یعنی جناب غالبؔ   کہ ہیں حبِّ اسد اللہ کے بے شک مظہر

---

[1] یہاں تری نہیں بلکہ تیری ہی شمار میں آئیگا، ورنہ ۱۰ عدد کم ہو جائیں گے،

پھر بہت سے شعراء کا ایک ساتھ ذکر کر کے کہا ہے ؎

یہ سخن رس ہیں سخن سنج ہیں بے مثل و عدیل　　　ہیں یہ مشہور سب اقلیمِ سخن کے سرور

اور قطعہ میں خود تحسین مجسم انکسار بنے دست بستہ کھڑے ہیں ؎

ان میں تحسینؔ بھی داخل ہو مگر جیسے نفر　　　آگے شاہوں کے کھڑا ہووے بحالِ ابتر

۲- حدیثِ قدسی

مطبع مصطفائی واقع کانپور سے بدیع الزماں کے اہتمام سے ۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی، سرورق پر یہ قطعہ درج ہے ؎

طالبِ مدحِ نبی را ہر طرف　　　نعرۂ ہذا حدیثِ قدسی است
شکر خالق را کہ از طبعِ بدیع　　　شہرۂ ہذا حدیث قدسی است

خاتمۃ الطبع میں یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چوں دریں آواں بعون کردگار　　　نعتِ شاہ انبیا مطبوع شد
گفت شائقؔ[1] سالِ آں از روئے طبع　　　وصفِ محبوبِ خدا مطبوع شد

مادہ درج نہیں ہے، مگر شمار کرنے پر چوتھے مصرع (۱۲۷۰ھ) میں 'ط' کے نو عدد ملانے سے ۱۲۷۹ھ نکلتا ہے، یہ قطعہ آغاز طبع میں کہا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس کتاب

---

[1] شائق۔ حافظ الٰہی بخش خلف شیخ محمد حاجی باشندہ کانپور سید وارث علی سیفی کے شاگرد تھے، ان کا دیوان ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا، تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی، ایک کتاب بھی فن تاریخ گوئی میں "آئینۂ تواریخ" کے نام سے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں چھپی تھی جس میں صرف ۳۰۰ تک کے مادے شامل تھے، دوسرے ایڈیشن (۱۸۹۸ء) میں مادوں کی تعداد ۲۰۰۰ تک کے اعداد تک کر دی گئی تھی۔ (یہ دونوں ایڈیشن مع دیوان شائق میرے کتاب خانے میں موجود ہیں) کتاب میں ۷۹۶ کے تحت بطور مادہ 'حدیث قدسی' بھی شامل ہے۔

کی ترتیب کا دعویٰ قاضی محمد عمر صاحب نے ان الفاظ میں (حدیث قدسی ص۲) کیا ہے :۔

"...... ۱۲۷۲ھ بارہ سو بہتر ہجری میں فقیر احقر قاضی محمد عمر کے خاطر میں اس اندیشہ نے خطور کیا اور زنگر رسا نے اس کوچہ میں رہنمائی کی کہ اگر مخمسات غزل قدسی ...... جس قدر دستیاب ہو سکیں جمع کر کے اس صورت سے یہ مجموعہ مرتب کیا جائے کہ شاعر کے نام کے نیچے مختصر حال بھی اس کا مرقوم ہو تو البتہ لطف سے خالی نہ ہوگا اور اسی اندیشہ کی مدد و معاون ہوئی رائے......... حافظ انعام اللہ[۱] ساکن پانی پت کی جس طرح جی چاہتا تھا، صورت مراد نے نقش باندھا..... اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب سے فراغت ہوئی اور نام اس کا 'حدیث قدسی' رکھا۔"

یاد رہے کہ خمسہ ہائے غزل قدسی، مرتبہ محمد حسین خاں تحسین ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی، اور حدیث قدسی کی ترتیب کا خیال قاضی محمد عمر صاحب کو ۱۲۷۲ھ میں آیا، جو ۱۲۷۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، در اصل قاضی صاحب کو اتنی مدت انتظار کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ انھوں نے اس کی ترتیب میں ذرہ بھر مشقت نہیں اٹھائی، خمسہ ہائے غزل قدسی مرتبہ محمد حسین تحسین چھپی چھپائی سامنے تھی، انھوں نے اس کی اشاعت کے پورے دس سال بعد بہت معمولی حذف اور اضافے کے ساتھ اسی کو اپنی تالیف کہہ کر 'حدیث قدسی' کے نام سے چھاپ دیا[۲]، حذف یہ کیا کہ تحسین کی کتابہ ۔

---

[۱] ان صاحب کے متعلق اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ [۲] حقیقت یہ ہے کہ قاضی محمد عمر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پورا فائدہ اٹھایا، نظام درہم برہم ہو چکا تھا، کسی کو کچھ ہوش نہ تھا، انیسویں صدی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی، اور ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ قصۂ پارینہ بن چکی تھی، ایسے میں تحسین کی "مدح حسین بنی" کسے یاد رہتی، اب بھی اس کا ایک ہی نسخہ تا حال معلوم ہے، جو خوش قسمتی سے میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

کے سرورق کی جگہ "حدیث قدسی" کا ٹائیٹل اور "غزل ذکر شعرا" کی جگہ اپنے رنگ میں "غزل ذکر شعرا" کلکر ڈال دیے اور اضافہ یہ کیا کہ تحسین کے ایک سو سات[11] شعرا کے علاوہ تیرہ دیگر شعرا کے خمسے بڑھا کر تعداد مخمسات ایک سو بیس[12] کر دی، اور تاریخ خاتمۂ کتاب، درج کر دی؛ بعد ازاں بارہ[13] مزید خمسے بھی بدیع الزماں مہتمم مطبع مصطفائی کانپور کے ذریعے موزوں کرا کے کتاب کے آخر میں بعنوان ملحقات شامل کر دیے، تحسین نے خمسہ ہائے غزل قدسی کے اختتام پر ناظرین سے امید کی تھی کہ ان کی محنت پر نظر کرکے وہ انھیں دعائے خیر سے یاد فرمائینگے مگر انجام برعکس ہوا، قاضی محمد عمر صاحب تحسین کو دعائے خیر سے یاد تو کیا فرماتے، انھوں نے تو ان کی خمسہ ہائے غزل قدسی (چمن مدح نبی) کو مستقبل کے ذہنوں ہی سے فراموش کر دیا،

قاضی صاحب نے پیش لفظ میں کہا تھا کہ وہ ہر شاعر کے نام کے نیچے اس کا مختصر حال بھی مرقوم کریں گے اور دعوی بھی کیا تھا کہ جیسا وہ چاہتے تھے، ویسا ہی ہوا بھی، مگر قاضی صاحب کو کہیں اپنے کہے کا پاس نہیں، چنانچہ مختصر حال تو کیا شعراء کے نام وغیرہ بھی وہی ہیں جو تحسین نے خمسہ ہائے غزل قدسی میں دیے ہیں، قاضی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا،

۳۔ حدیثِ قدسی

یہ ایڈیشن قاضی صاحب والے ایڈیشن ہی کا نقش اول معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں ملحقات شامل نہیں ہیں، باقی ہر چیز وہی ہے، چونکہ اس کے پہلے چھ صفحے غائب ہیں اس لیے اسے حدیث قدسی نمبر ۲ کے بعد درج کیا گیا ہے، ورنہ خاتمۃ الطبع میں قطعۂ تاریخ وہی ہے جو اڈیشن نمبر ۲ میں ہے، مطبع کا علم نہ ہو سکا، کتابت قطعاً جداگانہ ہے،

۴۔ حدیث قدسی۔

یہ ایڈیشن مطبع فتح الکریم بمبئی سے شائع ہوا، غالباً ۱۲۹۹ھ میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۳۰۱ھ میں

"......بعد تصحیح تام و خوش خطی با لاکلام باہتمام جناب قاضی محمد فتح محمد و صلاح محمد و عبد الکریم صاحب برادران قاضی ابراہیم صاحب مرحوم فرزندان افضل الحاج قاضی نور محمد صاحب مغفور ...."

شائع ہوا۔ یہ قاضی محمد عمر ہی کے ملحقات والے ایڈیشن کا ری پرنٹ ہے، صرف شائق کے قطعۂ تاریخ میں 'ط' کی جگہ 'ل' کے اعداد ڈال دیے گئے ہیں اور شائق کی جگہ ہاتف لکھ دیا گیا ہے، تیسرا اور چوتھا مصرع ملاحظہ ہو ؎

گفت ہاتف سال آں از روئے لطف   وصف محبوب خدا مطبوع شد

۰ ،۷ ۱۲ + ۳۰ = ۱۳۰۰ھ

۵۔ صحیفۂ قدسی حصہ دوم حدیث قدسی۔

سرورق سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کو حاجی سید شمشیر علی ولد میر عزیز اللہ صاحب ساکن گوہانہ ضلع رہتک نے (جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے) ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں جمع کیا اور محمود المطابع دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا، پیش لفظ ص ۲ پر اپنا شوق مدح خوانی حضرت سرور کائنات وغیرہ بیان کر کے فرماتے ہیں کہ پھر

"........میری نظر سے حدیث قدسی گزری جو کہ ۱۲۷۳ھ[1] (۱۸۵۶ء) میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی، اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا

[1] حدیث قدسی کا قاضی محمد عمرؒ کے اہتمام سے ۱۲۷۳ھ میں چھپنا قرین قیاس نہیں، کیونکہ یہ رسالہ خمسہ بر غزل قدسی (ضمن مدح نبی) از محمد حسین خاں تحسین ہی کی نقل ہے جو ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوا تھا، قاضی صاحب یہ جرأت ہرگز نہیں کر سکتے تھے کہ دو ہی سال کے اندر اندر اس سرقے کو اپنے نام سے طبع کرا کے خاص و عام کے لیے شائع کریں اور تحسین کا نام تک نہ لیں۔ غالباً ۱۲۷۳ھ قاضی محمد عمر صاحب کا بیان کردہ ۱۲۷۲ھ ہے۔

کہ میں بھی قدسی کے غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوادوں۔ بس میں نے بھی بعنایت الٰہی کمرِ ہمت کو باندھ کر جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخباروں میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شاعروں کو بیرون جات میں خط لکھے۔ اب فضل ایزدی سے عرصہ دو سال میں یہ مجموعہ تیار ہو گیا...... بندہ نے التزام کیا ہے کہ جس قدر خمسے پہلے مجموعہ حدیث قدسی میں چھپ چکے ہیں، وہ اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ فقط۔"

حاجی شمشیر علی بھی محمد حسین خاں تحسین کا نام جو غزل قدسی کے مخمسات کے اصل مؤلف ہیں، نہیں لیتے اور قاضی محمد عمر کی طرح غلط دعویٰ کرنے سے نہیں ہچکچاتے، میرے نسخے کے چند آخری اوراق ضائع ہو چکے ہیں، اس لیے خاتمۃ الطبع اور قطعہ ہائے تاریخ کا علم نہیں، تاہم ان کا یہ دعویٰ کہ پہلے مجموعۂ حدیث قدسی کے خمسے ان کے رسالے میں شامل نہیں کیے گئے، درست نہیں۔ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان، مرزا اصغر علی بیگ بلند، زین العابدین خاں حزیں، مرزا قادر بخش صابر، قادر علی عبد، میاں نامی وغیرہ کے خمسے حاجی شمشیر علی نے قاضی محمد عمر ہی کے مجموعے سے لیے اور قاضی محمد عمر کی دوکان تو محمد حسین خاں تحسین ہی کے مال سے سجائی گئی تھی۔

حاجی صاحب رقم طراز ہیں کہ انھوں نے جنوری ۱۸۸۵ء میں دہلی کے اخبارات میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شعراء بیرون جات کو خط لکھے اور نتیجے کے طور پر خدا کے فضل و کرم سے دو سال میں یہ مجموعہ (حدیث قدسی کا حصہ دوم) تیار ہو گیا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دسمبر ۱۸۸۶ء یا جنوری ۱۸۸۷ء تک حاجی صاحب کے پاس انکی کوششوں سے خمسوں کی خاصی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔

اگر یہ سچ ہوتا تو واقعی ایک قابل قدر کارنامہ ہوتا، مگر یہ سچ نہیں ہے،

حاجی صاحب اخلاقی جرأت میں قاضی محمد عمر سے بھی بڑھ کر نکلے، انھوں نے کچھ خمسے قاضی محمد عمر کے یہاں سے نقل کر دیے، کچھ بذریعہ خط و کتابت یا ذاتی تعلقات کی بنا پر حاصل کیے اور ایک بڑی تعداد ہفتہ وار جریدۂ روزگار مدراس سے لیکر بغیر کسی حوالے کے درج کتاب کر دیئے اس بڑی چوری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۸ر اگست ۱۸۸۵ء سے ۱۲ر جولائی ۱۸۸۶ء یعنی صرف سال بھر کے پرچوں سے کم از کم بیس۲۰ خمسے لیکر زیب حدیث قدسی حصۂ دوم کئے گئے ہیں ۱۸۸۵ء سے پہلے کے پرچوں سے کتنے خمسے لیے گئے یہ معلوم نہیں،

۶- جریدۂ روزگار

بارہ۱۲ بڑے صفحوں کا یہ اخبار مدراس سے ۱۸۷۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا، مالک سید میر تقی شاہ قادری آفندی تھے، ۱۹۰۳-۴ء تک جاری رہا، اور اس وقت اس کے مالک سید مرتضیٰ تھے، غزل قدسی پر جتنی تضمینیں اس اخبار میں شائع ہوئی ہیں شاید اور کہیں نہیں ہوئیں، چار سال ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء کے پرچوں میں دو سو سے زائد خمسے چھپے، یہ تو میرے سامنے ہیں، خیال غالب ہے کہ خمسوں کی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہوگی، کوئی صاحب چاہیں تو "حدیث قدسی" حصہ سوم بلکہ حصہ چہارم بھی اس جریدے کی مدد سے بآسانی تیار کر سکتے ہیں،

مندرجۂ بالا سطور سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ قاضی محمد عمر اور حاجی شمشیر علی دونوں قطعی نامعتبر شخصیتیں ہیں،

ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب اس نعتیہ غزل کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کا کلام نہیں مانتے، ان کا خیال ہے کہ یہ ان کے ہم نام مولانا محمد جان قدسی دہلوی کا

نتیجہ فکر ہے جو انیسویں یا اٹھارہویں صدی یعنی بعد متاخرین کا شاعر رہا ہوگا، اسکے وجوہ کم وبیش یہ ہیں :

(۱) حاجی شمشیر علی صاحب کی کتاب صحیفۂ قدسی کے اصل متن میں خمسوں کے آغاز سے پہلے لبطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے ۔

"خمسہ بر غزل حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی"

جس سے ظاہر ہے کہ شاعر کا وطن دہلی تھا،

(۲) مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ کے لفظوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شاعر (قدسی) کے انتقال کو بہت زیادہ مدت نہیں گزری ۔

(۳) جامع صحیفۂ قدسی (حاجی شمشیر علی) کو نعت نگار (قدسی دہلوی) کی ذات سے تعلق خاطر تھا، لہذا خمسوں کی ترتیب وتدوین کے وقت اس کو دہلوی لکھنا ایک ایسی شہادت ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، حاجی صاحب نے یہ نسبت بلا تحقیق از خود نہیں لکھی ہوگی اور اس بات کا قطعی امکان نہیں کہ ان کو سہو ہوا ہو، مرتب کی حیثیت ایک واقف کار مورخ کی سی ہے، اور اس کا بیان محقق اور مستند ہے ،

(۴) عام طور سے حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے دیوان یا کلیات کے متداول نسخوں میں یہ نعت موجود نہیں ۔

یہاں ان تمام وجوہ کا نمبر وار جائزہ لیا جاتا ہے ۔

(۱) ۱۔ قدسی کے بعد دہلوی لکھنا قطعی سہو کاتب ہے، اور یہ مخمسات غزل قدسی کے پانچ مختلف مجموعوں کا اجمالی ذکر آچکا ہے، یہ سب میرے کتب خانے میں موجود ہیں اور میرے سامنے ہیں، ان سب کو ایک ساتھ دیکھکر کوئی بھی اس نتیجے پر پہنچ

سکتا ہے کہ ان میں کتابت، طباعت اور معیار کلام کے لحاظ سے حاجی شمشیر علی کا مرتبہ "مجموعہ صحیفۂ قدسی" سب سے ادنیٰ درجے کا ہے۔

پروف ریڈنگ میں بھی قطعاً لاپروائی برتی گئی ہے، اور حاجی صاحب کا اپنا کلام بھی سطحی اور معمولی ہے، حاجی صاحب خود سرورق پر صحیفۂ قدسی کو "مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان بر غزل مولانا محمد جان صاحب قدسیؒ" لکھتے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی قدسی دہلوی ہوتے تو وہ ان تضمینوں کو "مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان" کیوں کہتے، کیا دہلوی شاعر شعرائے ہندوستان سے الگ ہیں، بالفرض حاجی صاحب نے قدسی کو جان بوجھ کر دہلوی لکھا بھی ہے، تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہ خیال کارفرما ہوسکتا ہے کہ قدسی شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھا، اور اسی دربار سے ملک الشعراء کا خطاب اول اس نے پایا تھا۔

ب۔ تحسین کی "خمسہائے غزل قدسی" کے ص ۹۹ پر عنایت اللہ خاں قیس کا قطعۂ تاریخ آغاز اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

کیا ہی قدسی کی غزل نعت میں ہو صلّ علیٰ ۔۔۔ جس کے ہر مصرع میں ہر حرف ہی موتی سا جڑا

اس کا تیسرا شعر یہ ہے ؎

شاعروں نے جو لکھے ہند کے خمسے اسکے ۔۔۔ جنکے ہر بند پہ قربان ہو دل و جاں اس کا

اس شعر کے مصرع اول سے صاف ظاہر ہے کہ ہند کے شاعروں نے خمسے اس شاعر کے کلام پر کہے ہیں جو خود ہندوستان کا رہنے والا نہیں ہے،

ج۔ تحسین ہی کے مجموعے کے ص ۳۲ پر حاجی محمد اسحاق اسحاق کا خمسہ ہے، اس کا پہلا بند دیکھئے ؎

ہے یہ اسحاق ترا ایک غلام عجمی		اس پہ ہو یک نگہِ لطف رسولِ عربیؐ

تیرے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی		"..................."

اس 'غلام عجمی' کا ذہن قدسی کے بارے میں قطعاً صاف ہے، وہ اسے سعدی اور ظہیر (فاریابی) کے ساتھ رکھتا ہے، خسرو اور فیضی کے ساتھ نہیں۔

د۔ تحسین کے خمسہائے غزل قدسی کے سرورق پر قطعۂ تاریخ طبع سے پہلے یہ الفاظ ہیں:

"تاریخ طبع خمسہاے غزلِ قدسی فخر شعرا"

طباعت کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں فارسی زبان کا شباب ابھی باقی تھا، غالب، مومن، صہبائی، آزردہ سب حیات تھے، کیا اس وقت یا اس سے سو پچاس سال پہلے کا کوئی ایسا عظیم دہلوی شاعر جس کا نام محمد جان تخلص قدسی تھا اور جو اس لائق تھا کہ اسے 'فخر شعرا' کہا جا سکے، اس وقت کے فارسی گویوں اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا؟

(۲) مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ سے وقت کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے، صرف یہ متعین ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جس کے لیے یہ دعا کی گئی ہے زندہ نہیں، غرض کہ یہ الفاظ کسی مرے ہوئے کے لیے آتے ہیں، اس کے لیے وقت کی قید نہیں، کوئی شخص کسی زمانے میں بھی فوت ہوا ہو اس کے لیے یہ الفاظ بولے اور لکھے جا سکتے ہیں، اور بولے جاتے ہیں، ان الفاظ سے یہ اندازہ کرنا کہ قدسی تخلص کا کوئی شاعر حال ہی میں فوت ہوا ہے، قطعاً نادرست ہے۔

(۳) جامع صحیفۂ قدسی حاجی شمشیر علی کو قدسی سے قطعی تعلق خاطر نہ تھا۔ حاجی صاحب محقق تھے نہ مورخ، عالم تھے نہ مستند، وہ محض مدح خوانی رسول اکرمؐ کے غایت درجہ پر شائق تھے، اس وجہ سے اکثر خمسے اور قصیدے وغیرہ انھوں نے یاد کر لیے تھے، وہ

جہاں بھی جاتے اور یہ یاد کیا ہوا کلام سناتے تو لوگ ان سے اس کلام کے طالب ہوتے، چنانچہ انھوں نے لکھنے یا نقل کرنے کی زحمت سے بچنے کے لیے ۱۲۹۳ھ میں مجموعۂ نعت (غزل قدسی کے خمسے نہیں) کے دو حصے چھپوا دیے، اس وقت تک قدسی سے تو کیا 'حدیث قدسی' مرتبہ قاضی محمد عمر تک سے ان کو واقفیت نہ تھی، حالانکہ حدیث قدسی کو (جو تحسین کی خمسہائے غزل قدسی کی نقل ہے) چھپے چودہ[14] برس گذر چکے تھے، وہ اس بات کا خود اقرار کرتے ہیں، اس لیے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ممکن ہے کہ یہ نعت[1] قدسی کے کلیات اور دیوان کے متداول نسخوں میں نہ ہو، مگر محض اس بنا پر اسے کسی مفروضہ قدسی دہلوی کی ملک قرار دینا صریحاً زیادتی ہے، متداول نسخوں (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شاعر کے سارے کلام کا شامل ہونا ضروری نہیں،

ص ۴۵۴ پر قاضی محمد عمر کی غزل در ذکر شعرا" میں ایک مصرع یوں درج ہے ؎

مظہر و مخلص و طراز و صفیر و کافی

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اس صفحے پر طراز کے لیے حاشیے میں فرماتے ہیں کہ "وزن شعر میں لانے کے لیے اس کو طرّار یعنی تشدید کے ساتھ پڑھنا پڑے گا" خمسہ محمد شاہ میر صاحب دہلوی طرّاز تخلص کا ہے نہ کہ طراز تخلص کا۔ تحسین کے خمسہائے غزل قدسی ص ۴۴ پر تو عنوان میں بھی صاف طرّار لکھا ہے، مگر حدیث قدسی کے متن (ص ۵۵) میں بھی بطور تخلص طرّار ہی مرقوم ہے، ڈاکٹر صاحب نے غور نہیں فرمایا۔

اگر محمد جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو یہ انکی عدم واقفیت ہے، چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے اسلیے انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ قدسی حاجی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے قدسی کو احتراماً مولانا لکھ دیا۔

---

[1] یہ نعت غزل قدسی کے نام سے مشہور ہے، اسلیے غزلیات قدسی بھی اگر نہ دیکھی ہوں تو دیکھ لینی چاہئیں۔

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۸ء عدد ۳

نعت قدسی اور اس کا مصنف[۱]

از ڈاکٹر سمیع الدین احمد ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

اپریل ۷۷ء کے معارف میں جناب کالی داس گپتا صاحب (بمبئی) کا مقالہ بعنوان 'غزل قدسی در نعت سرورؐ' جو میرے مضمون 'نعت قدسی اور اس کی مقبولیت' (معارف دسمبر ۱۹۷۶ء) کے جواب میں شائع ہوا ہے، نظر سے گذرا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے ایک خالصۃً علمی اور ادبی بحث کو جس کے پیش کرنے میں میں نے بہت محتاط اور متوازن روش اختیار کی ہے، ایک قسم کے مناقشہ کا رنگ دے دیا ہے، میں نے موضوع اور نفس مسئلہ کو بالکل تحقیقی اور علمی نقطۂ نظر سے لکھا ہے، اور مضمون کے ابتدا ہی میں لکھ دیا ہے کہ:۔

"مندرجہ ذیل اسباب اور قرائن کی روشنی میں شاعر کے نام کے ساتھ اس نعت کا انتساب مشتبہ اور مشکوک ہے:"

نیز مقالہ کے اختتامیہ جملے ملاحظہ ہوں:۔

"ہمیں امید ہے کہ ان سطور سے جو پیش کی گئیں، نعت قدسی کی تصنیف اور اسکے مصنف اصلی کے تعین میں کسی حد تک مدد مل سکے گی"۔

---

[۱] زیر نظر مقالہ کئی ماہ پہلے مکمل و مرتب ہو چکا تھا لیکن چند مجبوریوں اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے اسوقت بغرض اشاعت ارسال نہ کیا جا سکا۔ تاخیر کے لیے راقم معذرت خواہ ہے۔

قدسی کی نعت یا غزل سے متعلق مختصراً میرے دو بنیادی معروضات ہیں:۔

(۱) اول تو یہ کہ قرائن اور شواہد کی روشنی میں یہ قدسی مشہدی کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی،

(۲) دوسرا معروضہ یہ ہے کہ چونکہ گذشتہ صدی کے بالکل اواخر میں ایک مطبوعہ مجموعہ قصائد میں صراحت کے ساتھ اس کی نسبت ایک شاعر قدسی دہلوی سے قائم کی گئی ہے، لہذا یہ امکانی صورت پیدا ہوسکتی ہے کہ یہ اسی موخر شاعر کا نتیجۂ فکر ہو،

میرے پہلے معروضہ کی تردید میں اگرچہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ گپتا صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ یہ نعت قدسی مشہدی ہی کی ہے، لیکن ان کے چند اضافی بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کو اسی شاعر (قدسی مشہدی) کا نتیجۂ فکر سمجھتے ہیں، اس خیال کے تحت انھوں نے اپنے معروضات کے ثبوت میں مندرجہ ذیل بیانات پیش کئے ہیں جن کا جواب میں سلسلہ وار دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ موصوف (ص ۳۰۵ پر) رقمطراز ہیں کہ:۔

"قدسی کے بعد دہلوی لکھنا قطعی سہو کاتب ہے"

یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ سہو کاتب سے گپتا صاحب کی کیا مراد ہے، سہو کی دو ہی شکلیں ہوسکتی ہیں، یا تو کاتب نے لفظ "دہلوی" کا اضافہ اپنی جانب سے کردیا، جدت تحریر اور عقل رسا جس کی عام طور سے اس سے توقع نہیں کی جاتی، دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مشہدی کے بجائے غلطی سے "دہلوی" معرض تحریر میں آگیا ہو، لیکن اس کا بظاہر امکان نہیں اس لئے کہ املا کے اعتبار سے مشہدی اور دہلوی میں بہت فرق ہے۔

یہ تو سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ کاتب حضرات حروف اور الفاظ میں تحریفات اور تصحیفات کرتے رہتے ہیں، مثلاً "جان" کو "خان" لکھ دیا یا "پشیمان" کو "پشتبان"، لیکن اپنی طرف سے الفاظ کا اضافہ کر دینا عام طور سے سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا، لہذا دہلوی کے لفظ کا یہ اضافہ سہو کاتب کیسے ہو سکتا ہے، بہرحال اگر پہلی صورت حال مراد ہے تو کاتب کا از خود دہلوی کی نسبت اس شاعر کے نام کے ساتھ جوڑ دینا جس کے بارے میں وہ تو وہ گپتا صاحب کے خیال کے مطابق خود مولف صحیفۂ قدسی حاجی شمشیر علی کی واقفیت صفر کے برابر تھی[1]، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اسی نکتہ کے ذیل میں گپتا صاحب کے بیانات میں صریح تضاد ملاحظہ ہو، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، ایک طرف تو وہ پورے وثوق کے ساتھ قدسی کے بعد دہلوی لکھنے کو "قطعی سہو کاتب" لکھتے ہیں دوسری جانب یہ فرماتے ہیں کہ "بالفرض حاجی صاحب (یعنی حاجی شمشیر علی مرتب صحیفۂ قدسی نے) قدسی کو جان بوجھ کر دہلوی لکھا بھی ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہ خیال کارفرما ہو سکتا ہے کہ قدسی شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھا، اور اس دربار سے ملک الشعرا کا خطاب اول اس نے پایا تھا۔"

---

[1] گپتا صاحب نے لکھا ہے کہ اگر محمد جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو یہ انکی عدم واقفیت ہے چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے، اسی لئے انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ قدسی حاجی بھی تھے، لہذا انھوں نے احتراماً مولانا لکھدیا۔

[2] یہ "جان بوجھ کر" کا فقرہ قارئین کی خصوصی توجہ کا طالب ہے۔

[3] شاہجہاں کے دربار دہلی سے منسلک ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ مشہدی ہی کہلاتا آیا ہے نہ کہ دہلوی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دو بیانوں میں سے کسی کو قبول کیا جائے یا کسی کو بھی نہیں، اس سلسلہ میں خود گپتا صاحب کا ذہن صاف نہیں اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں،

مزید یہ کہ اس سلسلہ میں حاجی صاحب کے خیال کی کارفرمائی اور دہلوی کی تاویل جو گپتا صاحب نے کی ہے، دونوں غلط ہیں، شاید گپتا صاحب کو علم نہیں کہ قدسی مشہدی سرے سے دربار شاہجہانی کا ملک الشعراء ہوا ہی نہیں، نہ اول نہ آخر۔

معاصر مورخ محمد صالح کنبو لاہوری صاحب عمل صالح نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، ابو طالب کلیم کی دربار شاہجہانی میں رسائی اور ملازمت اور ملک الشعراء کا عہدہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ۔

"وبعد از جلوس مبارک ملازم سرکار خاصہ شریفہ گشتہ، بہ تحریک بخت کارفرما چوں گفتارش ہوش فریب و دل آویز و طبعش معنی رس و فیض آموز بود بہ خطاب ملک الشعراء امتیاز یافت اگرچہ استحقاق آں منصب جلیل القدر حاجی محمد جان قدسی داشت اما ازیں رو کہ پیش از رسیدن حاجی او بہ این خطاب سرافرازی یافتہ بود، تا دم آخر برو بحال ماند و تغیرے بداں راہ نیافت"[1]

اس کے علاوہ بھی ایسے معاصر اور مستند مآخذ ملتے ہیں، جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قدسی مشہدی کبھی بھی ملک الشعراء نہیں ہوا، لیکن یہاں طول کلام کے خوف سے ہم ان حوالوں کو نظرانداز کرتے ہیں، علاوہ بریں قدسی کو دہلوی کی نسبت سے یاد کرنا صحیح نہیں کیونکہ کسی بھی

---

[1] عمل صالح ج ۳ ص ۴۰۲؛

معاصر یا متاخر مورخ، تذکرہ نگار یا شاعر اور ادیب نے اس کو دہلوی نہیں لکھا، نیز اس کی مستقل سکونت بھی دہلی میں کم ہی رہی، اپنے قلیل مدت قیام میں اس نے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت بھی کی، مثلاً آگرہ، کشمیر، لاہور وغیرہ۔

شاہجہان کے پانچویں سال جلوس یعنی ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں وہ ہندوستان پہونچا، اور کم و بیش ۲۰ سال بعد یعنی ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں انتقال کر گیا، اس کی وفات یا تدفین بھی دہلی میں نہیں ہوئی، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بنیاد پر حاجی شمشیر علی جیسے ناواقف اور ناقل محض شخص نے اس کو دہلوی لکھ دیا، اور وہ بھی بڑی علمی سوجھ بوجھ کے ساتھ اور عمداً!

ایک طرف تو گپتا صاحب کے بیان کی روشنی میں حاجی صاحب بالکل ناواقف تھے، دوسری طرف ان کو قدسی مشہدی کے بارے میں اتنی ساری معلومات بھی حاصل تھیں؟ عقل کام نہیں کرتی کہ اس تضاد کو کس چیز پر محمول کیا جائے۔

۲۔ اس ضمن میں اسی صفحہ (۲۰۹) پر گپتا صاحب نے لکھا ہے کہ:

"حاجی صاحب خود سرورق پر صحیفۂ قدسی کو مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان بر غزل مولانا محمد جان صاحب قدسیؔ لکھتے ہیں اگر ان کے ذہن میں کوئی قدسی دہلوی ہوتے تو وہ ان تضمینوں کو مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان کیوں لکھتے، کیا دہلوی شاعر شعرائے ہندوستان سے الگ ہیں؟

جواب میں عرض ہے کہ اگر شعرائے ہندوستان نہ لکھتے تو کیا شعرائے ترکستان یا شعرائے افغانستان وغیرہ لکھتے ...

کے مختلف حصوں اور گوشوں کے شعرا، اور یہ بات ان مجموعوں کے مطالعہ سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ اس نعت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ملک کے ہر حصہ کے شاعروں نے تضمین نگاری میں ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیا تھا، ایسا نہیں تھا کہ صرف دہلی یا اس کے قرب و جوار کے شعرا نے ہی تضمینیں لکھ ڈالی ہوں "شعرائے ہندستان" کے فقرہ سے محض یہ بتانا مقصود ہے کہ اس وسیع پیمانہ پر اس نعت پر خمسے لکھے گئے کہ ملک کا شاید کوئی بھی گوشہ باقی نہ رہا۔[1]

۳۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحسین کی "خمسہائے غزل قدسی" کے صفحہ ۹۹ پر عنایت اللہ قیس کے قطعہ تاریخ کا ذکر گپتا صاحب نے کیا ہے اور پہلا شعر درج کرنے کے بعد تیسرا شعر نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

شاعروں نے جو لکھے ہند کے خمسے اس کے جن کے ہر بند پہ قربان ہو دل و جان اسکا

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں۔

"اس شعر کے مصرعہ اول سے صاف ظاہر ہے کہ ہند کے شاعروں نے خمسے اس شاعر کے کلام پر لکھے ہیں، جو خود ہندستان کا رہنے والا نہیں ہے"۔

جواب میں عرض ہے کہ پہلے مصرعہ میں "ہند" کے فقرہ سے ہندوستانی اور ایرانی شاعروں میں امتیاز اور فرق کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں غالباً اس بات کی صراحت مقصود ہے کہ صرف ایک شہر، دو یا مخصوص حصۂ ملک نہیں پورے ہندوستان کے شاعروں نے خمسے لکھے بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ امتیاز کرنا مقصود ہے

---

[1] اس موضوع کی وضاحت گذشتہ مضمون میں کی جا چکی ہے۔

اور مولف نعت ہذا کوئی ایرانی النسل شاعر ہی ہے تو بطور اطلاع عرض ہے کہ پندرھویں یا سولھویں صدی عیسوی سے لے کر عصر حاضر تک ایک دو نہیں، متعدد ایرانی شاعر اس تخلص کے گذرے ہیں، خود ہمارے ملک میں اسی صدی میں اکا دکا شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کا تخلص قدسی تھا، اور جن کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے [1]۔

میں اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اگرچہ قدسی مشہدی ایرانی نژاد تھا لیکن وہ ہندوستان ہی میں، لاہور میں فوت ہوا تھا، اور وہیں دفن بھی ہوا، ملک الشعراے دربار شاہجہاں ابو طالب کلیم نے جو قدسی کا قریبی اور مخلص دوست، ندیم خاص اور ہمکار بھی تھا، ایک بہت عمدہ اور پر اثر مرثیہ ایک طویل ترکیب بند کی صورت میں اس کی موت پر لکھا ہے جس کا ایک قابل توجہ شعر یہ ہے ؎

شد بہ لاہور گران گنج معانی در خاک　　　رفت اطلس ولی غلغلۂ نوحہ گرش

۴۔ آگے چل کر اسی صفحہ پر گپتا صاحب نے مزید اپنے دعوی کے ثبوت میں تحسین ہی کے مجموعہ (ص ۳) کا حوالہ دیتے ہوئے حاجی محمدؐ اسحاقؒ کے خمسہ کا ذکر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ۔

تحسین ہی کے مجموعہ کے ص ۳ پر حاجی محمدؐ اسحاق اسحاقؔ کا خمسہ ہے، اس کا پہلا بند دیکھئے۔ [2]

ہے یہ اسحاق ترا ایک غلام عجمی　　　اس پہ ہو یک نگہ لطف رسول عربی

---

[1] اس موضوع کی تفصیل انشاء اللہ ایک جداگانہ مضمون کی شکل میں معارف کی کسی آئندہ اشاعت میں پیش کی جا سکے گی، [2] میرے سامنے جو حدیث قدسی کا نسخہ ہے اس میں یہ بند آخر میں درج ہے، یعنی پہلا بند نہیں بلکہ آخری بند ہے،

تیرے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی . . . .

اس غلام عجمی کا ذہن قدسی کے بارے میں قطعی صاف ہے، وہ اسے سعدی اور ظہیر فاریابی کے ساتھ رکھتا ہے، خسرو اور فیضی کے ساتھ نہیں،

اس اعتراض میں کئی قباحتیں ہیں. جن کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ حاجی محمد اسحاق کی حیثیت کسی مستند مورخ معتبر تذکرہ نویس یا کسی ذی علم شاعر کی نہیں ہے وہ ایک معمولی درجہ کا شاعر معلوم ہوتا ہے لہذا یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس ادنیٰ درجہ کے شاعر کا علمی معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا ہوگا،

دوسرے یہ کہ محض ذکر قدسی سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ شاعر کا اشارہ قدسی مشہدی کی طرف ہے. جب کہ یہ یقین ہے کہ قدسی مشہدی کے علاوہ متعدد دوسرے ایرانی اور ہندی النسل شاعر بھی اسی تخلص کے ہوئے ہیں، تیسری بات یہ کہ حاجی محمد اسحاق کی عدم واقفیت اور علمی کم مائیگی کے سلسلے میں صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ وہ نعت گو شعرا کی فہرست میں قدسی کے نام سے پہلے ظہیر کا نام لیتا ہے، اس جگہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ تضمین نگار نے صرف ظہیر لکھا ہے، البتہ گپتا صاحب نے اپنی جانب سے فاریابی کا لفظ غالباً اس بنا پر کہ وہ زیادہ مشہور رہے، محض اندازہ سے بڑھا دیا ہے، حالانکہ اس نام کے بھی کئی شاعر گذرے ہیں، مثلاً ظہیر دہلوی، ظہیر اصفہانی وغیرہ لہذا قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ ظہیر فاریابی مراد ہے یا کوئی اور ظہیر، ہماری حقیر رائے میں قطعیت کے ساتھ ظہیر فاریابی کا نام لکھتے وقت گپتا صاحب کو پہلے اس شاعر کی حیثیت بہ طور ایک ممتاز نعت گو سخن ور متعین کر لینی چاہیے تھی۔ اور اس بات کی

تصدیق کر لینی چاہئے تھی، کہ آیا وہ نعت گوئی میں نمایاں درجہ رکھتا بھی ہے، یا نہیں محض اندازہ سے ظہیر فاریابی لکھ دینا مناسب نہ تھا، بہر حال اگر ظہیر فاریابی مراد ہے، جیسا کہ گپتا صاحب نے از خود اضافہ کر دیا ہے، تو یہ عرض ہے کہ ظہیر فاریابی کا شمار قطعاً نعت گو شعرا میں نہیں ہوتا، وہ ایک خالص مدح گو اور درباری شاعر تھا، اس کو نعت گوئی سے کیا سروکار البتہ خاقانی، جامی، رومی، عطار، احمد جام، نظامی، شاہ نعمت اللہ کرمانی وغیرہم جیسے شاعروں میں سے کسی کا نام لیا جاتا تو بات بن سکتی تھی۔ اب اس حقیقت کی روشنی میں یہ مصرع ؏
"تیرے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی"، پڑھئے تو حاجی محمد اسحاق کے بیان کا کھوکھلا پن سب پر روشن ہو جائے گا۔ تلاش و تحقیق تو یہ کہتی ہے کہ ظہیر سرے سے نعت کا شاعر ہی نہیں اس لیے کہ اس کے کلام کا بہت بڑا حصہ قصائد اور مدحیہ نظموں پر مشتمل ہے۔

بہر حال جو شاعر علمی اعتبار سے اس درجہ کا ہو کہ ظہیر دیہ نہیں ظہیر فاریابی یا کوئی اور ظہیر کو مداحان رسول میں گردان دے، اس کے قول پر کیا بھروسہ کیا جائے، معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس نے محض وزن شعر پورا کرنے کے لیے سعدی اور ظہیر کے الفاظ استعمال کئے ہیں جس کے ایک نئے معنی گپتا صاحب نے پہنا دیے ہیں۔ اس کے علاوہ حاجی محمد اسحاق اگر چاہتے بھی تو خسرو اور فیضی کے نام نہیں لا سکتے تھے، اس لیے کہ وہ خارج از وزن و بحر ہوتے اگر اتفاق سے قدسی سے پہلے ان دو شاعروں کے نام آگئے، جو ایرانی تھے، تو نعت نگاری کا صرف ایرانی شاعروں اور تضمین نگاری کا صرف بشیر اردو نویس ہندوستانی کے لئے ہی مخصوص ہو جانا ایک ایسا امر ہے جس کو عقل قبول کرنے سے قاصر ہے۔ (باقی)

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۵ء عدد ۴

نعت قدسی اور اس کا مصنف

از ڈاکٹر سمیع الدین احمد ریڈر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۳)

میرے معروضات کی تردید میں گپتا صاحب کا اگلا بیان (ص ۳۰۰ پر) یہ ہے۔

"تحسین کے خمسہائے غزل قدسی کے سرورق پر قطعہ تاریخ طبع سے پہلے

یہ الفاظ ہیں:-

"تاریخ طبع خمسہائے غزل قدسی فخر شعرا"

طباعت کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں فارسی کا شباب ابھی باقی تھا، غالب، مومن، صہبائی، آزردہ سب حیات تھے، کیا اسوقت یا اس سے تین چار سو سال پہلے کا کوئی ایسا عظیم دہلوی شاعر جس کا نام محمد جان تخلص قدسی تھا، اور جو اس لائق تھا کہ اسے فخر شعرا کہا جا سکے، اس وقت کے فارسی گویوں اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا؟"

جواب میں عرض ہے کہ اول تو قدسی کے ساتھ "فخر شعرا" کی شمولیت سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ وہ قدسی ہی کے لیے استعمال کیے گئے ہیں محض قیاسی رائے زنی ہے، اس کو قطعیت کا درجہ بالکل نہیں دیا جا سکتا، یہ عام بات ہے کہ تذکرہ نویس

(نقاد اور محقق نہیں) مورخ، سیرت نگار، وغیرہ ان لوگوں کے لیے جن کا ذکر وہ کسی وجہ سے عقیدت مندی یا احترام کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، اور ان کے ذاتی صفات یا خصوصیات کو امتیازی حیثیت دینا چاہتے ہیں، ان کے نام کے اول یا آخر بڑے بڑے مبالغہ آمیز تعریفی اور توصیفی کلمات الفاظ اور فقرے جوڑ دیتے ہیں، اس قسم کی مدح سرائی فارسی اور اردو ادب کی نمایاں خصوصیت رہی ہے، اور اس سے ہر ذی علم بخوبی واقف ہے لہذا "فخر شعرا" کا کلمہ کسی امتیازی خصوصیت کا حامل نہیں، تذکرہ نویس ہوں یا مرتبین کلام جس سے خوش ہوئے یا جس کو خوش کرنا چاہا اور ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا مقصود ہوا تو کوئی نہ کوئی بہتم بالشان قسم کا لقب، نام کے ساتھ شامل کر دیا، مبالغہ آمیز القاب کا استعمال تذکرہ نگاروں خاص طور سے متاخرین نے عام طور سے کیا ہے، اگر ان تذکروں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی،

اس بات کے ثبوت کے لیے میں اسی شخص کا بیان نیچے پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے "فخر شعرا" کا فقرہ استعمال کر کے ہم سب کو اور خصوصیت کے ساتھ فاضل مضمون نگار کو وہم میں ڈال دیا ہے، گپتا صاحب نے (صفحہ ۲۹۸) لکھا ہے کہ کتاب (یعنی خمسہائے غزل قدسی یا چمن مدح نبی) کے آخری صفحات میں تحسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکر شعراء" ہے، جس میں مرتب سمیت ایک سو ستّاسات شعراء کا ذکر ہے، جن کے خمسے زینت کتاب ہیں، یہ بات واضح ہے کہ چند بڑے سخنوروں کو چھوڑ کر جیسے غالب، مومن، ظفر، آزردہ، صہبائی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب دوسرے معمولی درجہ کے شاعر ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ تحسین (مرتب مجموعہ) نے ان سب کو

جو بہت بڑی اکثریت میں ہیں، "اقلیم سخن کے سرور" کے بلند پایہ لقب سے یاد کیا ہے:۔

ع ہیں یہ مشہور سب اقلیم سخن کے سرور

اور یہی نہیں بلکہ سخن رس، سخن سنج، بے مثل و عدیل (یہ سخن رس ہیں، سخن سنج ہیں، بے مثل و عدیل) بھی بتایا ہے، جب ان معمولی شاعروں کو اقلیم سخن کے سرور، سخن رس، سخن سنج اور بے مثل و عدیل کہا جا سکتا ہے تو کسی دوسرے شاعر کو فخر شعرا کہہ دینا کون سی حیرت کی بات ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو فخر شعراء اور اقلیم سخن کے سرور میں معنوی اعتبار سے سر مو فرق نہیں بلکہ فخر شعراء کے مقابلہ میں "اقلیم سخن کے سرور" میں زیادہ وزن اور جان ہے۔ آگے چل کر (ص ۲۹۹ پر) گپتا صاحب رقمطراز ہیں:۔

"اور قطعہ میں خود تحسین مجسم انکسار بنے دست بستہ کھڑے ہیں"۔

ان میں تحسین بھی داخل ہے گر جیسے فقیر آگے شاہوں کے کھڑا ہوتے بحال ابتر

گویا ان اقلیم سخن کے سروروں کا مرتبہ اور بھی بڑھ گیا اور بمنزلہ شاہ ہو گئے۔

کیا فاضل مقالہ نگار مجھے بتا سکیں گے کہ ان چند گنتی کے بڑے شاعروں کو چھوڑ کر معمولی شعرا میں سے کون کون اقلیم سخن کے سرور کہلانے کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں؟ کیا واقعی اس وقت کے "نامی گرامی شعرائے ہند"[۵] مثلاً میاں اوج، خیر الدین تخلص خیر ساکن پانی پت قوم شیخ، میاں ذائق، مرزا پیارے صاحب، میاں رحمت صاحب، میاں احمد خان دہلوی شریر تخلص، مرزا حاجی صاحب تخلص شہرت، میاں خان صاحب دہلوی صفیر تخلص، سید حیدر علی صاحب جالیسری المتخلص بہ طبیب حضرت مولانا مولوی محمد ظہور علی صاحب تھانہ دار ظہور تخلص، میاں عاجز صاحب سلمہٗ اللہ تعالےٰ، منشی عزت سنگھ صاحب دہلوی تخلص عیش، حکیم آغا جان صاحب عیش

---

۵ نامی گرامی شعرائے ہند، کا فقرہ خصوصی توجہ کا طالب ہے۔

میاں عبدالغنی صاحب ساکن بریلی غنی تخلص، میاں ثنا صاحب، مرزا منجھلے صاحب المتخلص بہ فسون، کیفی صاحبہ از خاندان امیر تیمور، میاں مخیر صاحب، میاں دلدار علی صاحب مذاق تخلص، محمد اکبر متوطن سہرادہ (؟) تھانہ دار ہم (؟) مخلص تخلص، سید محمد علی لکھن پوری معزز تخلص، میاں نور صاحب، مرزا جمعیت شاہ صاحب ماہر تخلص، مرزا علی صاحب نازنین تخلص، میاں نامی، سید احمد حسن تخلص صارم وغیرہم[۱] میں سے ایک بھی اس قابل ہے، کہ اسے "اقلیم سخن کا سردر کہہ کر پکارا جائے یا" نامی گرامی شعرائے ہند" کے زمرہ میں شمار کیا جائے؟

اگر سیرت نگاری کا یہی معیار ہو کہ مدحیہ القاب کو سامنے رکھ کر ہی کسی شاعر کا ذکر خواہ وہ کتنے ہی معمولی درجہ کا کیوں نہ ہو، تذکروں میں درج کیا جانا چاہیے تو پھر ان سب معمولی حیثیت کے شعرا کے حالات جن میں سے ہر ایک کو تحسین نے "سرور اقلیم سخن" کہا ہے، ضرور اس عہد کے تذکروں اور تاریخوں کی زینت ہونے چاہئے تھے،

اس بات کا کھلا ہوا ثبوت کہ جوش غلو میں تذکرہ نویس یا شاعر اپنے ممدوح کی ذات کو کس درجہ والاصفات اور عالی مقام بنا دیتے ہیں، تحسین کے اس توصیفی شعر سے ملتا ہے، جو اس نے کتاب کے آخر میں اپنے "قطعہ" در ذکر شعرائیں بہادر شاہ ظفر کے لیے لکھا ہے، گپتا صاحب کے بیان (ص ۲۹۸) کے مطابق قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے، یعنی

معنی بیت دو عالم شہ ذیجاہ ظفر　　معنی لفظ سخاوت شہ با فتح و ظفر[۲]

ظاہر ہے کہ "معنی بیت دو عالم" کہہ کر ظفر کا درجہ کس قدر بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے علی الرغم غالبؔ جیسے عظیم شاعر اور صاحب فن کے لیے صرف "ماہر فن سخن" کا لقب کافی سمجھا گیا، یعنی:-

---

[۱] ان نام نہاد نامی گرامی شعرائے ہند کی فہرست خاصی طویل ہے، میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے،
[۲] (حاشیہ آگے صفحے پر ملاحظہ ہو)

ماہر فن سخن یعنی جناب غالب کہ ہیں حُبِّ اسد اللہ کے بیشک مظہر

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیرت نگار یا شاعر حضرات کے بیانات کس درجہ ناقابل اعتبار اور بے بنیاد ہو سکتے ہیں اور ان کی تنقیدی بصیرت کس قدر قابل گرفت ہو سکتی ہے، لہٰذا ایسے مدحیہ القاب کو کسی تحقیقی نکتہ اور اصول کی بنیاد بنا لینا مناسب اور صحیح نہیں ہے،

۔۔ یہ صحیح ہے کہ مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ سے وقت کی تعیین نہیں ہو سکتی لیکن عموماً کسی بھی شاعر کو جو فوت ہو چکا ہے خواہ وہ کتنا ہی عظیم اور ممتاز کیوں نہ ہو، مرحوم، اور رحمۃ اللہ علیہ کے القاب کے ساتھ یاد نہیں کرتے،

گپتا صاحب لکھتے ہیں کہ "کوئی شخص کسی زمانہ میں فوت ہوا ہو اس کے لیے یہ الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں" میری حقیر رائے میں موصوف کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اول تو یہ کہ یہاں معاملہ صرف ایک شخص کا نہیں بلکہ شاعر کا ہے، ادب اور شعر و شاعری کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ ڈالیے کسی بھی ادیب و شاعر کو خواہ وہ امتیازی حیثیت کا مالک ہی کیوں نہ ہو، اور وفات پا چکا ہو، مرحوم کہہ کر نہیں پکارا جاتا، وہ صرف اپنی ذات سے پہچانا جاتا ہے کسی نے سنا یا پڑھا نہ ہوگا کہ انگریزی کے کسی بڑے شاعر و ادیب مثلاً ملٹن، شکسپیر، کولرج، ورڈس ورتھ، ٹینی سن وغیرہ کے لیے ' Late ' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہو، یا پھر فارسی ادب کی تاریخ میں کہیں بھی مرحوم فردوسی، رودکی رحمۃ اللہ علیہ، مرحوم شیخ سعدی، افضل الدین خاقانی مرحوم و مغفور، مرحوم عبید زاکانی، خیام رحمۃ اللہ علیہ،

(حاشیہ ص ماقبل) گپتا صاحب کے مضمون میں ص ۲۹۰ پر یہ مصرعہ یوں لکھا ہوا ہے ۱۔ لفظ معنی سخاوت شہ با فتح و ظفر جو بظاہر صحیح نہیں ہے، یہ سہو یا تو تخمین کی خمسہ غزل قدسی (چمن مدح نبی) کے کاتب سے ہوا ہوا ور گپتا صاحب اسکی تصحیح نہیں کر سکے، یہ بھی ممکن ہے کہ موصوف سے سہو ہو گیا ہو یا پھر ان کے اسی مضمون کی کتابت کی غلطی جو زیر نظر ہے،

مرزا حبیب قاآنی مرحوم، علامہ فقید محقق دوانی قدس اللہ سرہٗ یا سراج الدین علی خان آرزو
مرحوم و مغفور وغیرہ کلمات لکھے ہوئے ملتے ہوں۔

متقدم اور متاخر تذکروں اور کتب تاریخ میں بھی عموماً متوفی شاعروں اور سخنوروں کے نام کے ساتھ یہ الفاظ منسلک نہیں ملتے، یہاں تک کہ قریب العہد شعرا کے لیے بھی عام طور سے یہ کلمات مستعمل نہیں، مثلاً کوئی بھی میر تقی میر کو مرحوم میر تقی میر، یا غالب کو مرزا نوشہ اسداللہ خان غالب رحمۃ اللہ علیہ یا مومن و داغ کو حکیم مومن خان مومن علیہ الرحمۃ اور نواب مرزا خان داغ مرحوم و مغفور نہ لکھتا ہے، اور نہ کہہ کر پکارتا ہے، کہیں کہیں یہ کلمات خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کے لیے ضرور استعمال ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں، جو اپنے تقدس ذات کے لیے مشہور رہیں لیکن ان کا شمار مستثنیات میں سے ہے۔

۷۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حاجی شمشیر علی نے صحیفہ قدسی کی ترتیب و تدوین سے تقریباً گیارہ سال پہلے یعنی ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں مجموعہ نعت کے دو حصے چھپوا کر شائع کر دیے تھے، اس بات سے اور خود اس کے اپنے قول سے کہ وہ
ہمیشہ سے رسولؐ اکرم کی مدح خوانی کا شائق تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"
نعت گوئی یعنی شاعروں کے موزوں کردہ نعتیہ کلام اور بالخصوص مدح خوانی رسولؐ اکرم سے اس کا تعلق ثابت ہو جاتا ہے، اور یقیناً اسی بنا پر (جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے) حدیث قدسی یا قدسی سے کسی قسم کی واقفیت سے پیشتر ہی شائقین نعت رسولؐ کے مطالبات کے پیش نظر وہ نعت رسولؐ کے دو مجموعے ترتیب دے چکا تھا لہٰذا حاجی شمشیر علی کو قدسی سے اس معنی میں خواہ رسمی اور سطحی ہی کیوں نہ ہو، ضرور تعلق خاطر تھا کہ چونکہ مدح و نعت رسولؐ اس کا مشغلۂ خاص تھا لہٰذا خصوصی طور پر

ایک ایسے شاعر بھی، جس کی نعتیہ غزل شہرت عام کی حامل تھی، اور جس کے خمسوں اور تضامین کی جمع آوری اس کے فطری ذوق اور مادی ضروریات سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس کو ایک طرح کی مناسبت پیدا ہو گئی تھی، اور ایسی صورت حال میں ایک قسم کا معنوی رشتہ قائم ہو جانا بالکل فطری امر تھا، جس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی، اسی قسم کا تعلق خاطر اس کو امیر خسرو دہلوی سے بھی تھا، جس کی تفصیل میں نے[1] آئندہ سطور میں پیش کی ہے، علاوہ بریں اگر یہ شوق حدیث قدسی یا کسی اور مجموعہ تضامین کے مطالعہ کے بعد وجود میں آتا تو اس شوق کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی، لیکن چونکہ یہ سلسلہ پہلے ہی سے موجود تھا لہذا حدیث قدسی کو دیکھتے ہی اس کے شوق میں اضافہ ہو گیا، اور وہ غزل قدسی کے خمسوں کی جمع آوری اور تدوین میں لگ گیا، صرف یہی نہیں بلکہ جیسا کہ اس نے صحیفہ قدسی کے آخر میں لکھا ہے، اس نے امیر خسرو کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے:۔

اے چہرہ زیبائے تو رشک بتان آزری ہر چیز وصفت می کنم در حسن زان زیباتری

کی تضمینوں کی جمع آوری کا سلسلہ بھی شروع کیا[2]، اور باقاعدہ اس کام کے لیے اخباروں میں اشتہار بھی دینا شروع کئے تھے، وہ لکھتا ہے:۔

"بندہ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کی غزل کے خمسے جمع کرنے شروع کیے ہیں، میرا ارادہ ہے کہ انشاء اللہ ان کو اسی طرح چھپوا دوں، اس لیے غرض ہے کہ جن صاحب کے پاس اس غزل کا خمسہ یا مثلث یا مسدس ہو یا اب طبع آزمائی فرمائیں اور مجھ کو مرحمت کریں تو میں بعد چھپنے کے ایک کتاب ان کو نذر کر دوں گا"[3]

---

[1] اس بات کا ذکر میں نے اپنے گذشتہ مقالہ میں کیا ہے [2] کیا خسرو کی غزل کے خمسوں کی ترتیب اور جمع آوری کیلئے بھی اس نے کسی حدیث قدسی یا جریدہ روزگار سے سرقہ اور نقل کا بندوبست کر لیا تھا؟

غزل یہ ہے :۔ ؎

ای چہرہ زیبائے . . . . الخ

دو گذشتہ مجموعہ ہائے نعت تو اس نے طالبین و شائقین مدح رسول اکرمؐ کی خواہش اور تقاضوں کے جواب میں ترتیب دے تھے، لیکن غالباً خسرو کی غزل کے خمسوں کی تدوین و جمع آوری کا خیال اور شوق اس کو از خود اپنے فطری ذوق و ضرورت کی بنا پر پیدا ہوا تھا اگر اس کو اس شغل سے مناسبت نہ ہوتی تو وہ خود ہی بغیر کسی کے ایما و سفارش کے اس چیز کو اخباروں میں مشتہر کیوں کراتا، حدیث قدسی کے مطالعہ کے بعد شاعر متذکرہ کی غزل پر کہے ہوئے خمسوں کی جمع آوری کی خواہش کا ذکر وہ کچھ اس طرح پر کرتا ہے کہ گویا اس کے لیے شاعر کی شخصیت جانی بوجھی سی ہے، وہ لکھتا ہے،

"پھر میری نظر سے حدیث قدسی گذری جو کہ ۱۲۷۳ھ میں قاضی محمد عمرؒ صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی، اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا کہ میں بھی قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں"

"قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں"، کا ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ غالباً مولف اس کی ذات سے اگر واقف نہیں تو ناآشنا بھی نہیں، گیتا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ "حاجی شمشیر علی قدسی سے واقف نہ تھے"[1] اگر واقف نہیں تھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ناواقفیت کے عالم میں انھوں نے اس کا نام لیتے وقت شناسائی کا لہجہ کیوں استعمال کیا، اگر یہ سمجھا جائے کہ چونکہ قدسی مشہدی کی ذات متعارف خاص و عام تھی لہٰذا جب بھی کہیں کوئی شخص قدسی کا نام لیتا تو لازماً قدسی مشہدی مراد لینا ہوتا تھا تو پھر قدسی کی دوسری خصوصیات کا علم بھی اس سے متوقع ہونا چاہئے

[1] ملاحظہ ہو ص ۳۰۹

بہرحال ایک ایسے شخص کے لیے جس سے کسی قسم کی واقفیت نہ ہو، عام طور سے بے تکلفی اور آشنائی کا یہ انداز نہیں اختیار کیا جاتا، اور پھر گپتا صاحب یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حاجی شمشیر علی، قدسی سے واقف نہ تھے جب کہ فاضل مقالہ نویس اس سے پہلے اپنے مضمون کے صفحہ ۳۰۶ پر لکھ آئے ہیں کہ حاجی سید شمشیر علی نے حاجی محمدؐ جان قدسی کو عمداً دہلوی لکھا ہے گویا مرتب صحیفہ قدسی کو شاعر (قدسی) کے بارے میں کم و بیش ساری ضروری باتوں کا علم تھا، یعنی نام، تخلص، جائے سکونت وغیرہ، نیز یہ بھی علم تھا کہ وہ انتقال کر چکا ہے تبھی تو مرحوم اور رحمۃ اللہ وغیرہ لکھا، اس کے تقدس ذات کی خصوصیت کا بھی بخوبی علم تھا، تب ہی تو حضرت اور مولانا کے القاب استعمال کئے اگر علم نہیں تھا تو بدقسمتی سے صرف اس بات کا کہ وہ حاجی، بھی تھا، گویا ناواقفیت کی منزل صرف بجائے 'حاجی' مولانا کے لفظ کے لکھنے سے شروع ہوتی ہے، اور وہیں پر ختم ہو جاتی ہے، قیاس یہی کہتا ہے کہ جب دوسری باتوں کا علم تھا تو یہ بھی علم ہونا چاہئے تھا کہ قدسی حاجی بھی تھا، بہرحال فاضل مقالہ نگار کا ایک جگہ (ص ۳۰۶) حاجی شمشیر علی کو قدسی کا واقف حالات اور دوسری جگہ (ص ۳۰۸) ناواقف قرار دینا ان کے استدلال کو قطعی کمزور اور پھسپھسا بنا دیتا ہے، گپتا صاحب کا دوسرا بیان حسب ذیل ہے،

> "اگر محمدؐ جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو انکی عدم واقفیت ہے چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے، اس لیے انھیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ قدسی حاجی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے قدسی کو احتراماً مولانا لکھ دیا"

اس طرح خود گپتا صاحب کے اس بیان سے حاجی شمشیر علی کے دل میں شاعر

کے لیے جذبہ احترام کی موجودگی کا ثبوت مل جاتا ہے، لیکن تعظیم کا یہ احساس محض اتفاقی امر نہیں معلوم ہوتا۔ سرورق پر "حضرت مولانا محمد جان صاحبؒ قدسی" اور اصل متن میں مضمون کے آغاز سے پہلے عنوان میں بھی "حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی" لکھا ہوا ہے، اگر توجہ اور غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو "حضرت" "مولانا" "صاحب" "رحمۃ اللہ علیہ" کے کلمات سے قدسی کی شخصیت کے تعین میں مدد مل سکتی ہے، یہ فقرے یا الفاظ عام طور سے ایسے اصحاب کے لیے مستعمل ہوتے ہیں، جو لوگوں کی نظروں میں (غالباً) اپنی نیکی، ذاتی فضیلت یا درویش منشی اور تقدس ذات کی وجہ سے مستحق تعظیم ہیں اور مرجع احترام ہوتے ہیں، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ اس تعلق خاطر کا سرچشمہ دینی احساس عقیدت یا جذبہ احترام ہو جس کی جانب راقم الحروف نے اشارہ کیا ہے، جب ایسی صورت حال ہو تو حاجی شمشیر علی کا شاعر متذکرہ سے کسی قسم کی عقیدت قائم کر لینا نہ تو غیر فطری ہے اور نہ غیر ممکن یا محال،

امیر حسن نورانی صاحب نے بھی جنھوں نے کلیات غالب (فارسی) کی تدوین کی ہے اس شاعر کے لیے جس کی نعت پر غالب نے اپنی تضمین لکھی ہے "مولانا" اور "قدس اللہ سرہٗ" کے تعظیمی کلمات استعمال کیے ہیں، اور تضمین ہٰذا کا مندرجہ ذیل عنوان قائم کیا ہے،

خمسہ غالب بر غزل مولانا قدسی قدس اللہ سرہٗ

ان شہادتوں کی روشنی میں بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت بزرگ و محترم رہی ہوگی ورنہ وہ "حضرت" "مولانا" "صاحب" "رحمۃ اللہ علیہ" اور بالخصوص "قدس اللہ سرہ" کے القاب سے یاد نہ کیا جاتا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آ سکی کہ نورانی صاحب کے لیے کون سا امر مانع تھا کہ وہ قدسی کے لیے "مشہدی" کی نسبت

کی تصریح سے باز رہے، جب کہ یہ یقین ہے کہ اس کی شخصیت ادبی اور علمی دنیا میں خاصی مشہور اور متعارف ہے، خود غالب نے بھی اپنے ادبی خطوط میں چند علمی و ادبی مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں قدسی مشہدی کا ذکر کیا ہے، اور بیشتر حاجی محمدؐ جان قدسی لکھا ہے۔[۱] فارسی کلیات غالب کے فاضل مولف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ۔

"کلیات غالب کا یہ اڈیشن غالب کی وفات کے سو سال بعد شایع ہو رہا ہے، اس کی ترتیب و تصحیح کی بنیاد انھیں دو مستند نسخوں پر ہے، جو غالب نے خود شایع کرائے تھے، ایک نسخہ مطبع دار السلام (۱۸۴۵ء) دوسرا مطبوعہ نولکشور (۱۸۶۳ء) متفرق کلام جو ان دونوں نسخوں کے علاوہ تھا، وہ ان مطبوعہ انتخابات اور کتابچوں سے لیا گیا ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصلی ماخذ یا ماخذ دن میں بھی خمسہ غالب کا وہی عنوان ثبت ہوگا جو نورانی صاحب نے درج کیا ہے، اور اگر غالب کی یہ تضمین قدسی مشہدی کی نعتیہ غزل پر کہی گئی ہوتی تو غالب گمان یہی ہے کہ اس پر حاجی وغیرہ الفاظ کی تصریح بھی شامل ہوتی جیسا کہ خطوط غالب میں عموماً کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) محاورہ "آب در بنا رسیدن" اور "بنا بہ آب رسانیدن" کی بحث کے سلسلہ میں غالب نے شاعر کا پورا نام حاجی محمدؐ جان قدسی لکھا ہے،[۲] اور اس کا مندرجہ ذیل بیت بطور تشویش کیا ہے جو قدسی مشہدی کے دیوان میں ملتا ہے،

بگو محتسب را رساند این خطاب کہ بنیاد کان را رساند بآب[۳]

---

[۱] ماخذ ادبی خطوط غالب، مولفہ مرزا محمد عسکری۔ [۲] اگرچہ مشہدی کی صراحت نہیں لیکن دوسرے شواہد سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ قدسی مشہدی ہی ان موضوعات کا مرجع ہے جیسا کہ میں نے متن میں اسی صفحہ پر عرض کیا ہے۔ [۳] ادبی خطوط غالب، تدوین عسکری، ص ۹

اہل زبان، رسالہ قواعد فارسی، لغت و فرہنگ نویس اور رشید اسکروی اور قدسی مشہدی کے درمیان ادبی و شعری مناقشہ کی بحث کے ذیل میں بھی حاجی محمدؐ جان ؔقدسی ہی لکھا ہوا ملتا ہے۔[1]

(۳) اسی موضوع و بحث کے تحت:-

"خلاصہ مضمون خط یہ کہ نہ تو صاحب زبان ہے نہ زبان دان ہے۔ یعنی مقلد اور کاسہ لیس اہل ایران ہے۔ حاجی محمدؐ جان کے کلام کو سند پکڑے، تجھے کس نے کہا ہے کہ اس سو لڑیا پھر صرف 'قدسی' لکھا ہوا ملتا ہے جیسا کہ اسی تالیف یعنی ادبی خطوط غالب مولفہ مرزا محمدؐ عسکری میں صفحات ۸۹، ۱۰۰ وغیرہ پر درج ہے، بہرحال ان قرائن و شواہد کی بنیاد پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالباً حاجی محمدؐ جان قدسی مشہدی اور مولانا قدسی دہلوی دو جداگانہ اور مختلف شخصیتیں ہیں، اور ان کو ایک سمجھنا قرین صواب نہیں۔

میرے سامنے جو حدیث قدسی کا نسخہ ہے اس میں زبطور عنوان) ص ۹۵ پر عبارت "مخمسہ محمدؐ شاہ میر صاحب دہلوی طراز تخلص" (یعنی بغیر تشدید رائے مہملہ) درج ہے، مقطع میں بھی 'ر' بالکل صاف طور پر غیر مشدد لکھی ہوئی ہے، نیز اسی نسخہ میں غزل در ذکر شعرائے اول کے مصرعہ میں بھی یہ لفظ بغیر تشدید مرقوم ہے، جس کو میں نے بجنسہ اپنے گذشتہ مضمون میں نقل کر دیا ہے، لفظ 'طرّاز' بھی ہو سکتا ہے اور 'طراز' یعنی بغیر تشدید بھی، اگر کسی نسخہ میں تشدید کی نشاندہی نہ ہو تو مضمون نگار کے ذہن کا طراز سے 'طرّاز' کی طرف منتقل نہ ہو پانا ایک ایسا فطری اور بشری سہو ہے کہ جس کی طرف اگر اشارہ نہ کیا جاتا تو زیادہ بہتر اور مستحسن ہوتا۔ اور پھر یہ کوئی ایسا معرکتہ الآرا قسم کا تحقیقی نکتہ

---

[1] ادبی خطوط غالب تدوین عسکری ص ۱۰۰ [2] ایضاً ص ۱۰۱

یا کارنامہ بھی نہیں جس کا ذکر کرنا اور اس کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا ایک لازمی امر قرار پاتا، ویسے راقم الحروف نے جو بات لکھی ہو وہ فی نفسہٖ ہو صحیح، غلط قطعی نہیں، اگر اس کے برعکس ضبط تحریر میں لائی جاتی تو البتہ فاضل مقالہ نگار کو حق حاصل ہوتا کہ وہ اس کی نشاندہی کر دیتے، چونکہ وہاں طراز (تشدید کے ساتھ) درج نہیں تھا، لہٰذا میں نے اس کی صراحت کر دی اور نتیجہ وہی نکلا جو گپتا صاحب نے لکھا ہے، یعنی لفظ (تخلص) طرّاز ہے نہ طراز۔

محترم گپتا صاحب نے میرے پیش کردہ تمام وجوہ کا نمبروار جائزہ لیا ہے، اور انکا جواب بھی دیا ہے، لیکن زیر بحث نعتیہ غزل اور حاجی محمدؐ جان قدسی مشہدی کے کلام کے درمیان اسٹائل اور طرز ادا کا جو بیّن فرق نظر آتا ہے، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں تحریر فرمایا، اور دونوں کے طرز شاعری میں واضح اور نمایاں فرق کے نکتہ کے بارے میں جس کو میں نے خصوصیت کے ساتھ واضح کیا ہے، انھوں نے شاید اس وجہ سے کہ کلام قدسی مشہدی کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا ہے، اپنی کوئی رائے نہیں پیش کی، حالانکہ میرے نزدیک کسی شاعر کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس کے کلام کا اسلوب ایک نہایت اہم نکتہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی رہنمائی میں کبھی کبھی کسی پیچیدہ اور مشکل علمی یا ادبی مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے، یہ بات اب بھی بڑے وثوق اور پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نعت متداولہ کا مجموعی اسلوب حاجی محمدؐ جان قدسی مشہدی کے کلام کے عام طرز سے بالکل الگ ہے، اور دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، لہٰذا نعت قدسی کے مصنف اصلی کو سراغ اور تعیین کے وقت اس اہم نکتہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ میں گذشتہ مضمون میں عرض کر چکا ہوں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ غزل مذکور کا سبک کسی ہندستانی شاعر کا ہے، اور قدسی مشہدی کے اسٹائل اور طرز شاعری سے بہت مختلف ہے،

جیسا کہ میں نے اپنے گزشتہ مقالہ میں بھی عرض کیا ہو نعت یا غزل مذکور کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی تصنیف ماننے میں مجھے سب سے بڑا تامل اس بنا پر ہے کہ یہ اس کے کسی بھی متقدم یا موخر مجموعہ کلام میں دستیاب نہیں، گپتا صاحب کا یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے کہ "متداول نسخوں (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شاعر کے سارے کلام کا شامل ہونا ضروری نہیں" لیکن اس صورت میں محض قلم کی ذرا سی جنبش سے، یہ کہہ کر وصوف اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکے، بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کلیات یا دواوین (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شامل نہ ہونے کے باوجود یہ نعت قدسی مشہدی ہی کی ملک ہے تو گپتا صاحب کو اس کے اثبات کیلئے بڑے ٹھوس اور مستند دلائل پیش کرنے ہوں گے،

بجائے اس کے کہ وہ کسی طرح مثبت اور موثر دلایل اختیار کرتے اور مستند شہادتوں کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ نعت یا غزل متذکرہ حتماً حاجی محمد جان قدسی ہی کی تصنیف ہے، انھوں نے ایک لحاظ سے بحث کا منفی پہلو اختیار کر لیا ہے، یعنی نعت قدسی کے مصنف اصلی پر بحث کرنے کے بجائے، غزل قدسی کے مخمسات کے اولین اور اصل مولف کے موضوع پر زیادہ روشنی ڈالی ہے، نیز اس بات کی کوشش کی ہے کہ قاضی محمد عمر مرتب حدیث قدسی اور حاجی سید شمشیر علی مولف صحیفہ قدسی کو سارقین اعظم اور انکی جمع کی ہوئی تضامین کو زبردست سرقہ ثابت کر دکھائیں، اور یہ فیصلہ قطعی بھی صادر کر دیں کہ قدسی دہلوی کی شخصیت بالکل مفروضہ ہے، فاضل مقالہ نگار ان مرتبین کے بیانات تحریر کو اس لیے قابل اعتبار نہیں سمجھتے کہ وہ "دونوں قطعی نامعتبر شخصیتیں ہیں"۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ ان نامعتبر اور سارق قسم کے اصحاب کے اقوال و بیانات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، لہذا غزل مذکور کی قدسی دہلوی کے ساتھ قائم کردہ نسبت بھی قابل

اعتبار نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سرقہ شدہ تضامین کے مجموعہ میں انتساب فرضی اور غلط ہے تو اس سے ماقبل کے قابل اعتبار یا وثوق اور صحیح المضمون مجموعہ میں قدسی مشہدی کے نام کا واضح اور صریح حوالہ کیوں نہیں ملتا، حیرت کی بات ہے کہ دو سو سال سے زائد مدت[1] کی گمنامی کے بعد یہ غزل اچانک منصۂ شہود پر اس انداز سے ابھری کہ چار دانگ ملک میں غلغلہ مچ گیا، اور اس درجہ مشہور ہوئی، اور ہندوستانی شاعروں کو اس قدر بھائی کہ سنہ ۱۲۷۱ھ دسنہ ۱۸۵۴ء سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک دیا اس کے بعد بھی جب تک کہ اخبار جریدہ روزگار مدراس سنہ ۱۹۰۳ء یا سنہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا، سیکڑوں[2] کی تعداد میں خمسے نظم کر دئے گئے لیکن مرتبین یا مالکان اخبار میں سے کسی ایک نے بھی مصنف اصلی کا نام تک نہیں لیا، اور اس حقیقت کے تذکرہ سے سب خاموش رہے،

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اتنی مدت کے بعد تضمینوں کا یہ سلسلہ کیوں جاری ہوا یعنی اس سے پہلے خمسہ نگاری کے لیے کون سے امور مانع تھے؟ کیا اس سے پہلے یہ غزل مقبولیت اور شہرت کی حامل نہ تھی؟ اسی طرح یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ معاصر دور میں کسی بھی ذی علم اور دانشور محقق[3] نے قدسی مشہدی کے حالات زندگی یا اس کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس نعت یا اس کی مقبولیت یا اس پر لکھی ہوئی تضامین کا حوالہ نہیں دیا۔

---

[1] قدسی مشہدی کا انتقال سنہ ۱۰۵۶ھ میں ہوا، اور محمد حسین خان تحسین کی کتاب سنہ ۱۲۷۱ھ میں شایع ہوئی۔ [2] تاریخ اشاعت خمسہ ہائے غزل قدسی (چمن مدینہ) مرتبہ محمد حسین خان تحسین

[3] جیسے (مرحوم) پروفیسر محمد شفیع، مولف تذکرہ میخانہ عبدالنبی فخر الزمانی (جس میں قدسی اور اس کے کلام کا ذکر ہے) وغیرہم، شاید جناب قاضی عبدالودود صاحب نے بھی اپنے کسی مقالہ میں قدسی مشہدی کی طرف اس غزل کے انتساب کی تردید کی ہے،

یہ بات بھی سمجھ میں نہ آسکی کہ محض "خمسہ ہائے غزل قدسی" یا "غزل قدسی فخر شعرا" یا "تضمین بر غزل قدسی" لکھنے یا کہنے سے قدسی مشہدی کی نسبت اور اس کی تاویل کی گنجایش کس طرح نکل سکتی ہے، ؟ اگر بالفرض حدیث قدسی کو خمسہای غزل قدسی (از محمد حسین خان تحسین) کا سرقہ مکمل اور صحیفۂ قدسی کو حدیث قدسی نیز اخبار جریدہ روزگار (مدراس) میں چھپنے والی تضمینوں کی نقل تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ نعت مذکور بطور قطعی حاجی محمد جان قدسی مشہدی ہی کی فکر کا نتیجہ ہے بلا شبہ تحسین کا مجموعہ، خمسہای غزل قدسی، (چمن مدح نبی) متقدم (یا گپتا صاحب کے قول کے مطابق پہلا) مجموعہ تضامین قرار پاتا ہے، جس میں مخمسات غزل قدسی جمع کئے گئے ہیں[1] لیکن اس نسخہ کے متقدم یا اولین ہونے سے بھی مسئلہ کا کوئی حل ہمارے سامنے نہیں آتا، بات تو اس وقت بنتی جب کہ مجموعہ بالا میں صراحت ہوتی کہ خمسے جو جمع کیے گئے ہیں، وہ حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی نعتیہ غزل پر بطور تضمین نظم کئے گئے ہیں، بہر حال تحسین جیسے باکمال، واقف کار شاعر اور مولف کے قلم سے شاعر اصلی کے نام اور نسبت کی عدم وضاحت کے باوجود یہ نتیجہ محض قیاساً اخذ کر لینا کہ مصنف اصلی قدسی مشہدی ہی اسلیے کہ وہ زیادہ مشہور رہے ہو سکتا ہے، قطعی قرین صواب نہیں،

گپتا صاحب رقمطراز ہیں کہ خمسہ ہائے غزل قدسی، مرتبہ محمد حسین خان تحسین ۱۲۷۱ھ (مطابق ۱۸۵۴ء) میں شائع ہوئی، اور حدیث قدسی مرتبہ قاضی محمد عمر ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) یا ۱۲۸۱ھ (مطابق ۱۸۶۴ء) میں چھپ کر منظر عام پر آئی، گویا

---

[1] میں نے خود بھی حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ 'حدیث قدسی' تضامین کا پہلا اور اولین مجموعہ ہے؟ اسکے بارے میں میرا بیان یہ تھا" اور غالباً یہ پہلی کوشش تھی جو اس ضمن میں وجود میں آئی (معارف دسمبر ۷۶ء)

دونوں کتابوں کی اشاعت میں آٹھ، دس سال کا فرق ہے تعجب کی بات ہے، کہ اس آٹھ دس سال کی مدت میں جو ایک ادبی فضا کے لیے کوئی بہت بڑی مدت نہیں ہوتی، لوگ تحسین کے مجموعے کو بالکل فراموش کر بیٹھے اور کسی بھی شاعر، عالم، مصنف یا ادیب نے قاضی محمد عمر کے اس زبردست جعل اور سرقہ کی نشاندھی نہیں کی اور نہ ہی کوئی بازپرس کی، بلکہ اس عظیم کھلم کھلا چوری اور نقل کو سب نے بے چون وچرا قبول اور برداشت کر لیا، فاضل مضمون نگار کے بیان سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ گویا قاضی محمد عمر ۱۲۷۲ھ میں حدیث قدسی کی ترتیب کا ارادہ اپنے ذہن میں قائم کر کے غدر یعنی جنگ آزادی کی آمد کا انتظار کرنے لگے کہ جیسے ہی نظام درہم برہم ہو، حالات بگڑیں اور لوگوں (بالخصوص ارباب علم وذوق) کے ذہنوں سے تحسین کی چمن مرج نبی، محو ہو وہ اس کی ہو بہو نقل بنام حدیث قدسی بہت معمولی حذف اور اضافہ کے ساتھ اپنے نام چھاپ دیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران سارا سیاسی، اجتماعی اور تہذیبی شیرازہ بکھر چکا تھا، اور چہار طرف انتشار و بدامنی اور بربادی کا دور دورہ تھا، لیکن فتنہ وفساد فرو ہونے پر حالات معمول پر آنے لگے، حدیث قدسی کی اشاعت کے وقت نہ صرف غالب حیات تھے، بلکہ ان کے شاگردوں، شناساؤں اور کرم فرماؤں کی ایک کثیر تعداد زندہ اور موجود تھی جن میں سے بیشتر شاعر وادیب، مصنف اور صاحبان فضل وعلم تھے، مثلاً میر مہدی مجروح وغیرہ، نیز تلامذہ صہبائی، وذوق بھی حیات اور موجود رہے ہوں گے، فارسی گوئی اور فارسی خوانی کی گرم بازاری اس وقت بھی قائم اور جاری تھی

لہ یاد رہے کہ قاضی محمد عمر کے مجموعہ میں میر محمد مہدی مجروح کا خمسہ شامل ہے۔ ؎ غالب گمان یہی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے وقت خود محمد حسین خان تحسین بھی حیات ہونگے۔

اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا چلن باقی تھا، ان حالات میں کسی شاعر، عالم یا ادیب کا اتنے زبردست جعل کی طرف قطعی متوجہ نہ ہونا حیرت خیز بات ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ انیسویں صدی کے خمسہ گو اور تضمین نگاروں کے پیش نظر باوجود اس کے کہ (بظاہر) قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید کلیات یا دیوان قدسی (مشہدی) میں نعت متداولہ دستیاب نہیں تھی، ایسا کون سا نسخہ یا مآخذ تھا جس میں یہ نعتیہ غزل موجود تھی اور جس کو بنیاد بنا کر اور جس سے متاثر ہو کر ہندوستان کے طول و عرض کے چھوٹے بڑے شعراء نے طبع آزمائی کی اور خمسے نظم کر ڈالے، یہاں تک کہ مدراس سے نکلنے والے ایک اخبار میں بھی، ایک دو نہیں؛ بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں تضامین چھپ کر شایع ہوگئیں۔

لہٰذا کلیات، دواوین، تذکروں اور کتب تواریخ میں اس کی عدم موجودگی کی صورت میں ہمارے لئے کسی ایسے قابل اعتماد مآخذ کا پتہ چلانا ضروری ہوگا، جس کی صحت پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکے، اور جس سے قطعی طور پر اس غزل کی نسبت قدسی مشہدی کے حق میں ثابت ہو سکے، جب تک ایسی کوئی مستند دستاویز بطور ثبوت نہیں حاصل ہو جاتی یہ دعویٰ کہ نعت متذکرہ قدسی مشہدی ہی کی تصنیف ہے، از روی تحقیق صحیح نہ ہوگا۔

جلد ۱۲۲ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۸ء عدد ۳

شمائل النبیؐ

(عبدالمجید زرّین)

از سیدہ عزت النساء، ایم اے، ریسرچ اسکالر (عثمانیہ یونیورسٹی)

عبدالمجید نام، زرّین تخلص، عہد مغلیہ کا ایک افغانی الاصل دکنی شاعر ہے، لیکن شاعر کے تعلق سے تفصیلی معلومات بہم نہ ہوسکے، "شمائل النبیؐ" کے علاوہ اس کی ایک اور مثنوی "نورنامہ" کا پتہ چلتا ہے، جو کتب خانہ سالار جنگ بہادر میں محفوظ ہے، جس میں زرّین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپاے مبارک اور اخلاق و عادات کا تذکرہ خوبی سے کیا ہے، لیکن نقل روایات میں تحقیق و تنقیح سے کام نہیں لیا، بلکہ رطب و یابس سبھی جمع کردیا ہے۔ زیر بحث مثنوی "شمائل النبیؐ" اوائل سنہ ۱۱۰۰ھ میں ضبط تحریر میں لائی گئی، اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زرّین نے اسے پشتو زبان سے دکنی میں ترجمہ کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پشتو زبان سے بھی واقف تھا، اس مختصر سی مثنوی میں بھی زرّین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک اور اخلاق و عادات کو پیش کیا ہے، لیکن صحیح اور غیر صحیح روایات میں امتیاز نہیں کیا ہے، نصیر الدین ہاشمی رقمطراز ہیں:

> "عبدالمجید زرّین نے گیارہویں صدی کے اوائل میں ایک مثنوی "شمائل النبیؐ" کے عنوان سے لکھی ہے ..... اس مثنوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا اور اخلاق و عادات کو نہایت خوبی سے قلم بند کیا ہے"

اس مثنوی کے نسخے کتب خانۂ آصفیہ، کتب خانۂ سالار جنگ، اور کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو میں

محفوظ ہیں، شاعر پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سے مثنوی کی ابتدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے خدا! تو سچا ہے، نیک ہے، رحیم ہے، تو نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم کر دی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کرم سے میرا دل شاد کر دے، پھر شاعر اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ اے خدا! تو میری زبان کھول تاکہ میں نبیؐ کے شمائل بیان کر سکوں، اس کے بعد شاعر زیر نظر مثنوی کے ماخذ کے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے اس کو پشتو سے دکنی زبان میں منتقل کیا ہے۔

اس کے بعد شاعر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپائے مبارک کا بیان اس طرح شروع کرتا ہے کہ میں نبیؐ کے شمائل بیان کرتا ہوں، اس کو کان جس قدر سن سکے سنے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر بارہ لاکھ تیرہ ہزار تین سو بال تھے اور ریش مبارک میں چھ لاکھ بیس ہزار دو سو بال تھے، جن کی خوشبو مشک وسنبل سے بڑھ کر تھی، مگر ان میں سترہ سو بال سفید ہو گئے تھے، جو موتی کے مانند چمکتے تھے، مگر موئے مبارک کی تعداد کی تصریح کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں، اور سفید بالوں کی تعداد تو صریحاً غلط ہے، روایات صحیحہ میں بہت کم تعداد بیان کی گئی ہے۔

بعد ازاں شاعر معراج کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ترسٹھ برس کو پہونچے تو خدا نے حضورؐ کو ملاقات کا شرف بخشا، یہ بیان بھی صریح غلط ہے، کیونکہ ترسٹھ سال کی عمر میں حضورؐ کی وفات ہو گئی تھی، تریّن کہتا ہے کہ اس رات حضورؐ کا دل سوز عشق سے لبریز اور خدا کی محبت سے چمکتا چہرہ زرد تھا، اور حضورؐ نے ایک من دو سیر خوراک تناول فرمائی تھی (یہ روایت بھی بالکل غلط ہے، نہ عقلاً درست ہے اور نہ عادۃً) یہاں شاعر معراج کے واقعہ کو مکمل کرنے کے بجائے پھر سراپائے مبارک کی طرف رجوع ہو جاتا ہے، اور کہتا ہے کہ حضورؐ کے ابرو میں دو ہزار بال تھے، جو بہت چمکتے تھے، پلکوں میں دو سو چار بال تھے جو چاند کے مانند چمکتے تھے، مونچھوں میں دو ہزار بال تھے، بالوں کی یہ تعداد بھی صحیح نہیں ہے، اس کے بعد شاعر جبرئیل علیہ السلام کے

بارہ میں کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم لاتے ہیں، حکم خداوندی کے مطابق جبریل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس وقت جب کہ نہ دنیا وجود میں آئی تھی اور نہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا جمال عطا کیا، جس کا ثانی کوئی نہیں، حضورؐ کا بدن مبارک سفیدی مائل گندمی تھا اور کشادہ پیشانی کی تابناکی چاند اور سورج کی روشنی سے بڑھ کر تھی، حضورؐ کی بھنویں بڑی باریک اور خوبصورت تھیں، بڑی بڑی آنکھوں میں سیاہ پتلیاں عجب سماں پیش کرتی تھیں، ناک بلند تھی، چاند سے رخساروں پر جنت کے موتیوں کی لالی تھی اور ان رخساروں کے گرد موتیوں سے زیادہ چمکتی ہوئی داڑھی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی ؛ حضورؐ کے ہاتھ دراز تھے، آپ جہاں بھی تشریف لیجاتے ابر چھتری کے مانند سایہ فگن رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قد نہ تو دراز تھا اور نہ پست، بلکہ حضورؐ میانہ قد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وصورت یوسف علیہ السلام سے زیادہ خوبصورت تھی، جس کے آگے چاند کی روشنی بھی شرمندہ تھی، کمر پتلی اور نہایت خوبصورت تھی، کشادہ سینہ پر بالوں کی لکیر تھی۔

حدیث کے حوالہ سے شاعر کہتا ہے کہ سرور انبیاءؐ فرماتے ہیں کہ جو کوئی میرے شمائل پڑھے یا سنے، اس کو اللہ تعالیٰ کونین میں بے فکر رکھے گا، اس کو عذاب سے نجات مل جائے گی، اور اللہ تعالیٰ اس کو چاروں کتابوں (زبور، توریت، انجیل، قرآن) کا ثواب عطا فرمائے گا، اس کے علاوہ اسے حج اکبر کے ثواب سے بھی سرفراز کرے گا، جنت میں مقام دے گا اور جنگ احد کے شہیدوں کا درجہ ملے گا۔ مگر یہ روایات صحیح نہیں ہیں۔

شاعر اس کے بعد ایک غیر معتبر حکایت بیان کرتا ہے، کہتا ہے کہ بادشاہ محمود غزنوی نے جب شمائل النبیؐ کے فضائل اور برکتیں سنیں تو اسی وقت اس سے مسرور ہو کر اپنا خزانہ لٹا دیا، اس کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ اسی رات وہ خواب میں محبوبِ خدا کے دیدار اور ہم کلامی سے

مشرف ہوا، جب خدا نے اسے جنت کا مژدہ سنایا۔ محمود غزنوی خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپائے مبارک دیکھتا ہے اس کی تعریف شاعر نے اس طرح کی ہے کہ حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر کا نور تھا حضورؐ کی کشادہ پیشانی پر ایسا نور تھا جیسے سورج طلوع ہوا ہو۔ ناک چمپا کی کلی کے مانند اور سیدھی تھی، دندان مبارک جنت کے موتیوں کے مانند روشن اور چمکیلے تھے، اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کا دل خاص طور پر اخلاص سے بنایا تھا، حضورؐ کی آنکھیں شرم و حیا سے لبریز تھیں، دونوں ہاتھوں میں سخاوت کی بڑی قوت تھی، حضورؐ کا دونوں جہان کو روشنی دینے والا سینہ جنت کے لعل و گہر سے بنایا گیا تھا، آنحضرتؐ کو خدا نے خیر البشر کا درجہ عطا کیا، ان کے ہونٹ امرت کے چشمے کے مانند تھے اور دانتوں میں ہیروں جیسی چمک دمک تھی اور آواز ایسی تھی جس کو سن کر ساری دنیا مست ہو جاتی تھی، ابرو کمان دار اور پلکیں پر نور تھیں، خوبصورت اور منور گردن خدا کی عبادت میں جھکی رہتی تھی، دونوں ہاتھ سخاوت اور شجاعت میں یکتا تھے۔ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے صبر و شکر سے شکم سیر رکھا تھا، وہ ہر وقت حق تعالیٰ کی عبادت میں کمربستہ رہتے تھے اور حضورؐ کے قدم مبارک ہمیشہ خدا کی عبادت میں لگے رہنے سے اعلیٰ مقام حاصل کر چکے تھے۔

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ ان شمائل کو اچھی طرح سمجھ لو جس کو شاعر نے دکنی میں نظم کیا ہے، آگے لکھتا ہے کہ اگر ان شمائل کو کوئی پڑھے یا سنے یا دیکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیگا۔ شاعر اللہ تعالیٰ سے استدعا کرتا ہے کہ اے خدا تو میرے گناہوں کو بخش دے، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک تیرے رسول ہیں، مجھ بندے کی مناجات کو تو قبول فرما، آخر میں شاعر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہزاروں درود اور سلام بھیج کر مثنوی کو ختم کرتا ہے۔

دکنی شعراء اور علماء نے جو تصوف پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں وہ نہ روایت کی صحت کو دیکھتے ہیں اور نہ درایت سے کام لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر قدیم نظم و نثر میں ضعیف اور غیر صحیح

روایات نظم ہوگئی ہیں، اس مثنوی میں بھی ترین نے ضعیف روایتوں کا سہارا لیا ہے۔

زبان اور اسلوب بیان | عہد مغلیہ تک دکنی زبان ترقی کے کافی مدارج طے کر چکی تھی، چنانچہ دور ماسبق کی بہ نسبت اس عہد میں کلام صاف اور نکھرا ستھرا ہوگیا تھا، جس کا اندازہ عشرتی، ولی ویلوری، بحری، امین، ضعیفی، وجدی اور ولی اورنگ آبادی کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے جس میں ہمیں سلاست، متانت، لطف زبان، سادگی اور صفائی ملتی ہے، لیکن جہاں تک عبد المجید ترین کی زبان اور اسلوب بیان کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی زبان میں وہ خصوصیات نہیں ہیں، جو اس کے عہد کے نامور شعراء کے یہاں پائی جاتی ہیں، اگرچہ زبان صاف ہے، تشبیہات کا استعمال بھی برمحل ہوا ہے، جذبات عقیدت کی شدت بھی ملتی ہے، لیکن انداز بیان بالکل سپاٹ ہے، ترین بنیادی طور پر مذہبی شاعر ہے اور چونکہ مذہبی شاعری پر تنقید نگار کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی اور خود ایسے شاعر بھی فن کے بجائے موضوع کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم ترین کو ادبی تنقید کی کسوٹی پر رکھیں تو بڑے درجہ کا شاعر قرار نہیں دے سکتے۔

مسجدِ قرطبہ
فکری و فنی حیثیت سے

از

از جناب سید محمد ہاشم صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

مسجد قرطبہ اقبال کی اعلیٰ ترین نظموں میں سے ایک ہے، یہ اُن کے فکر و فن کا نچوڑ ہے، اس کے آئینہ میں ہم ان کے احساسات اور خیالات کی تقریباً تمام پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں، شاعری میں اعجاز کی شان اُس وقت پیدا ہو جاتی ہے، جب فکر و فن ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں، مسجد قرطبہ اس دور میں لکھی گئی ہے، جب اقبال کی فکر فن میں ڈھل چکی تھی، اور فن میں فکر کی روح سرایت کر چکی تھی، انھیں اب اپنی فکر کے اظہار کے لئے کسی صناعی یا مینا کاری کی ضرورت نہیں تھی، یہ نظم اس زمانہ میں لکھی گئی تھی، جب اقبال نے کہا تھا، ع

میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا ۔۔۔ حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا ۔۔۔ مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

اس نظم کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اگر صرف یہی نظم لکھتے تو بھی اُن کا شمار بڑے شعراء میں ہوتا، بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں :

"مسجد قرطبہ جدید اردو ادب کا شاہکار ہے، اس میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی
سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے، اس میں آرٹ، تاریخ اور فلسفہ ایسی خوش اسلوبی سے
سموئے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا ہے اور داد دیتا ہے"

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایشیا میں تڑپتے مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ سے اقبال کے دل و دماغ میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا تھا، اس وقت کوئی اسلامی سلطنت آزاد نہیں تھی، پھر جب انقلابات رونما ہونے شروع ہوئے، اور ایشیا کے سر پر ناامیدی و مایوسی کے منڈلاتے ہوئے بادلوں میں شگاف پیدا ہوا تو اقبال کے دل میں بھی امید کی ایک کرن پھوٹی ع روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب

دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر اقبال نے مسجد قرطبہ کو دیکھا، اس سے بہت متاثر ہوئے، انھوں نے محسوس کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی عظمت کی عبرت انگیز کہانی ہے اس لئے کہ یہ اور اس کے بنانے والے عالمی تہذیب کے امام تھے، انھوں نے یورپ کی تاریک راتوں میں علم کی مشعلیں روشن کیں، انھوں نے اپنی پاک بینی سے شرق و غرب کی تربیت کی، بادشاہت کو فقر کا مماثل بنا کر ایک نئے انداز سے دل کی دنیا پر حکومت کرنا سکھایا' وغیرہ، اور آج یہ عالم ہے کہ اُن کا کوئی پرسان حال نہیں، تقریباً سات سو سال سے مسجد قرطبہ اپنی عظمتِ رفتہ کی داستان زبانِ حال سے سنا رہی ہے، اور زمانے کے تمام نشیب و فراز کو ایک طویل عرصہ سے دیکھ رہی ہے،

اقبال مسجد قوت الاسلام یا تاج محل وغیرہ پر کوئی نظم لکھ سکتے تھے، لیکن جن افکار و خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے اُن کے لئے یہ عمارتیں ناکافی تھیں، مسجد قرطبہ میں ان کے سب ہی بنیادی تصورات پوری جامعیت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، اس میں ان زمان و مکان

و مکاں مردِ مومن اور خودی کے تصورات کے ساتھ عشق، حسن، فن اور تاریخ کے نظریات موجود ہیں، اس میں "شکوہ" کا جذبہ "خضر راہ" کی فکر اور "طلوعِ اسلام" کا اضطراب بھی ملتا ہے،

مسجد قُرطبہ اقبال کے سامنے فنِ تعمیر کے ایک بے مثال نمونے کی حیثیت میں ہی نہیں آتی بلکہ اس میں اسلامی تہذیب اور اس کی شان و شوکت کے ساتھ اس کے در و دیوار اور نقش و نگار میں ایک مثالی انسان کے اخلاقِ حسنہ، جلال، جمال، اخلاص، لِلّٰہیت، سادگی، بلند نظری، عالی ہمتی اور وسیع القلبی، وغیرہ کی تمام صفات، دکھائی دیں، یہ "مسجد قرطبہ" آٹھ بندوں پر مشتمل نظم ہے، ہر بند میں آٹھ اشعار ہیں، ہر بند نئے تصور کے ساتھ شروع ہوتا ہے ختم ہونے سے پہلے خیالات کے لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ جاتا ہے، جو آئندہ شروع ہونے والے بند کے لئے پس منظر کا کام دیتا ہے، اقبال کی بہترین نظموں میں یہ رجحان ملتا ہے کہ اصل بات کہنے سے پہلے ایک مختصر جامع اور پرفریب پس منظر تیار کرتے ہیں، اور ایسی فضا آفرینی کرتے ہیں، کہ اصل مقصد چشمہ کی طرح خود بخود پھوٹ پڑتا ہے،

مسجدِ قرطبہ تخیل کی نہایت بلندی سے شروع ہوتی ہے، وقت یا زمان کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ انتھک کوششوں کے باوجود اس کی اصلی نوعیت سمجھنے اور سمجھانے سے بڑے بڑے علماء قاصر رہے ہیں، افلاطون زمان کی حقیقت کا قائل نہ تھا، اشاعرہ نے زمان کو منفرد آنات کا ایک تواتر بتایا ہے، نیوٹن کے نزدیک زمان ایسی شے ہے جو اپنے ہی اندر مساوی طور پر متحرک رہتی ہے، ملا باقر کا خیال ہے، کہ زمان عمل تخلیق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جس کی بدولت الیغوے الٰہی اپنے تخلیقی امکانات کا شمار کراتی ہے، محی الدین ابن عربی نے دہر کو اسماء حسنیٰ میں شامل کیا ہے، قرآن نے زمان کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور زندگی کی مسلسل حرکات کا ایک آلہ بتایا ہے۔ "اپنی رحمت سے دن اور رات بنایا تاکہ رات میں آرام کرو اور دن کی زندگی کو حرکی بناؤ" ابن خلدون

نے . . . پہلی بار قرآن حکیم کے مطابق یہ نظریہ مرتب کیا کہ زمان میں مسلسل حرکت کے لحاظ سے تاریخ ایک ایسی حرکت نہیں ہے، جس کی راہ پہلے سے مقرر شدہ ہو بلکہ ایک ایسی حرکت ہے جو خالص تخلیقی ہو، برگسان زمان کو دو قسموں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک وہ جو شب روز یا ماضی حال مستقبل میں اسیر ہے، اور دوسرا اس سے بالاتر ہے، اس کے نزدیک موثر زمان وہ زمان ہے جس کا عموماً ہمیں احساس ہوتا ہے، اور جس پر طوالت و اختصار کا اطلاق ہو سکتا ہے، در اصل یہ زمان مکانی ہے،

جن لوگوں نے بھی زمان کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ کسی نہ کسی حد تک نظریۂ قرآن سے ضرور متاثر ہیں، اقبال کے زمان کا سرچشمہ بھی قرآن ہے، انھوں نے فلسفہ اور سائنس کے جدید نظریات کی روشنی میں شاعرانہ انداز میں بڑے کمال کے ساتھ اس مسئلہ کو سلجھایا ہے، انھوں نے ابن خلدون کی طرح اس پر غور کیا، اور برگسان کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے آگے نکل گئے، ان کے پیغام کی کامیابی کا راز بڑی حد تک اس تصور میں مضمر ہے کہ زمان ایک حقیقت ہے، اور زندگی زمان میں مسلسل تغیر اور حرکت کا نام ہے، ان کا زمان بھی دو شکلوں میں ملتا ہے، ایک دائمی ہو مرد خدا کا عمل اسی سے منسلک ہے، عشق کی بدولت رنگ ثبات دوام حاصل کر لیتا ہے، اور یہ ہے:

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اسے زمانِ ایزدی کے نام سے بھی یاد کیا ہے، جو شخص زمانِ ایزدی میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے اس میں صفات الٰہیہ پیدا ہو جاتی ہیں اس زمان کی صفات حسب ذیل ہیں،

اے خوش آن روزی کہ از ایام نیست ‏ صبح او را نیمروز و شام نیست

روشن از نورش اگر گردد روان ‏ صوت را چون رنگ دیدن می توان

غیب اذ تاب ادگرو حضور ‏ نوبتِ ادلایزال وبے مرود

دوسرا زمان عارضی ہے، جو ماضی حال مستقبل میں محصور ہے، اسی میں شب و روز کا سلسلہ بنتا ہے یہی دراصل نقش گر حادثات ہے، اسی میں خدا ے تعالیٰ اپنی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی جھلک غالبؔ کے اس مطلع میں بھی ملتی ہے،

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ‏ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

یہیں دنیا کے امتحان گاہ ہونے کا تصور ملتا ہے، ع

اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت بھی اسی زمانے میں آتی ہے، بے ثباتی و فنا کا تصور بھی اسی سے وابستہ ہے، پہلے بند کے سب ہی اشعار اس کی مثالیں ہیں،

آنی و فانی تمام معجزہ ہاے ہنر ‏ کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات

اس زمان کو جاوید نامہ میں "تسلسلی زمان" کہا ہے، اسے روز بے سوز سے تعبیر کیا ہے، جس پر غالب آکر اور اس سے نجات حاصل کرکے شاعر زمانِ ایزدی کا طلبگار ہوتا ہے،

زمانے کی حقیقت پر بڑے فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے، اس کی اہمیت عظمت اور تقدس کو تسلیم کیا ہے، اسی لئے انھوں نے حدیث کا ترجمہ بھی پیش کیا کہ " زمانے کو بُرا مت کہو، زمانہ میں خود ہوں"،

پوری نظم پر زمانے کا تصور حاوی نظر آتا ہے، سلسلۂ روز و شب کی تکرار سے شروع کرکے وقت کی کارفرمائیوں کا ایک تصور پیش کیا ہے، نظم لکھتے وقت اقبال کے ذہن میں وقت کا، تر شدت کے ساتھ موجود تھا، وقت کے آئینہ میں وہ پوری نظام تکوینی کا نظارہ کرتے ہیں وقت کا ایک مہیب اور خوفناک تصور بھی ہے، یہ محلات کو کھنڈروں میں اور بیابانوں

کو شہروں میں بدلتا رہتا ہے، اور تخریب و تعمیر کی منزلوں سے گزر کر ہمیشہ ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ اس سفاک اور ظالم وقت کے سامنے تمام تدابیر دنیا فعال حقیقت بے ہیں، وقت کی اس تاریکی میں صرف ایک چراغ جلا ہوا ملتا ہے، جو اس ساری ظلمت کو قطع کر کے اسے منور کرتا جاتا ہے، وہ عشق کا چراغ ہے جو مرد مومن کے سینے میں جاگزیں ہے، اس مایوسی کے عالم میں جو چیزیں آنی و فانی نہ ہو کر باقی اور دائمی بن جاتی ہیں، ان کی بنیاد اقبال کے اس شعر پر ہے؛

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

اللہ تعالیٰ نے اخلاق کی تعلیم بھی قرآن کے ذریعہ دی جس کی کامل اطلاع رسول اکرمؐ نے کی، اسی لئے حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ کسی نے آپ سے معلوم کیا کہ حضورؐ کا اخلاق کیا تھا، ؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا، اقبال کا انسان کامل رسول اکرمؐ ہیں آپ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کر کے انسان کامل بن سکتا ہے، انسان اپنے اندر عشقِ رسول سے خدا کا اخلاق اور خدا کی صفات پیدا کرے، تو اس کے ہر کام میں غیبی مدد شامل ہو جائے گی، وہ کام اس کا ذاتی نہیں رہے گا، بلکہ خدا کا ہو جائے گا، اسی لئے

ع:- ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

مردِ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن کر لازوال ہو جاتا ہے، مردِ مومن خود لافانی ہوتا ہے کیونکہ اسے جس چیز سے جلا ملتی ہے، وہ عشق ہے ع

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

اور یہ سرکش اور مہیب وقت جو سب کو اپنے پنجہ میں اسیر کئے ہوئے تھا، اپنی قہرمانی سے ہاتھ دھو کر خود عشق کا اسیر ہو جاتا ہے جو پوری کائنات پر محیط نظر آتا ہے، کیونکہ ع

عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

یہاں آکر وقت کی حیثیت خطۂ ارض میں پھیلی ہوئی آگ کی ہو جاتی ہے، اور عشق سمندر بن کر اس پر غالب آجاتا ہے،

اقبال کے یہاں عشق کا جامع اور ہمہ گیر تصور ہے، یہ ایک شدید اور گہرا جذبہ ہے، جو حقیقت کے ادراک کی رسائی کا ایک موثر وسیلہ ہے، یہ ایک قوت حیات ہے، جو تمام صلاحیتوں کو بیدار کر راہ میں حائل سب دشواریوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی مقصود تک پہنچ جاتی ہے، ذات کو علویت کے انتہائی مقامات تک پہنچانے، جوہر وجود یعنی خودی کو چمکانے اور ارتفاع بخشنے کے لئے جس شے کی ضرورت ہے، وہ عشق ہے، یہ وہ گرمی اور حرارت ہے جو اسے بیدار رکھتی ہے، اور زندگی کا خیر مقدم کرتی ہے،

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات   عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

عشق ایسی فعال اور حیات آفریں ولولہ خیز قوت ہے، جو افراد اور قوموں میں زندگی کے تسلسل اور روانی کو قائم رکھتی ہے، زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے، اور زندگی کے امکانات کی امین و محافظ ہے، یہ عشق متصوفانہ عشق کی ضد ہے، یہ "پیوستن" نہیں "گسستن" ہے، سُلاتا نہیں بیدار کرتا ہے، سکون نہیں تڑپ پیدا کرتا ہے، وصل سے گریزاں اور ہجر سے محبت کرتا ہے، یہی بے خطر ہو کر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے، یہی خودی کی تربیت کرتا ہے، اور مزاحم قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے، یہ عشق فقہ اسلامی کی تشریح و توضیح کرتا ہے، یہی قافلوں کا سالار ہے، اور ابن السبیل ہے،

ابن السبیل (مسافر) حرکت کی علامت ہے عشق بھی حرکت ہے، اور یہ عشق سب ہی کچھ ہے،

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق   معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق دمِ جبرئیل بھی ہے، دلِ مصطفےٰ بھی ہے، خدا کا رسول اور خدا کا کلام بھی ہے،

اس کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتا ؎

عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

یہی وہ نور ہے جو حضرت آدمؑ کو دیا گیا اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا اپنی اصلی منزل پر آکر ٹھہر گیا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ وغیرہ کو اسی نے امتحان میں کامیاب کرایا، اور خود فنا نہیں ہوا،

ایک اور نظم "عشق اور موت" میں موت دعویٰ کرتی ہے کہ میں سب پر غالب ہوں، سب کو نیست و نابود کر دیتی ہوں لیکن وہ نور جو نورِ مطلق کی آنکھ کا تارا ہے، اس کے سامنے موت کو بھی موت ہے، اور یہ نورِ عشقِ الٰہی ہے، جو مردِ مومن کا سرمایۂ نشاط اور دائمی اثر کا حامل ہے۔

ع : عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

مردِ مومن کے ذریعہ سے ایک کارنامہ دو وجوہ سے لازوال بن جاتا ہے، ایک تو وجہ خاص عشق کی ہے، دوسری وجہ وہ بے حد خلوص اور محبت ہوتی ہے کسی فن کو عظیم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں خونِ جگر صرف کیا جائے، زندگی کی پوری دوڑ میں عموماً اور فنونِ لطیفہ میں خصوصاً اس کی ضرورت پڑتی ہے، اس کا اطلاق مصوری، سنگ تراشی، تعمیر، شاعری اور موسیقی وغیرہ پر بھی ہوتا ہے، یہ فن کی تزئین اور استحکام کا سب سے بڑا وسیلہ ہے" مسجد قرطبہ" میں صرف دو اشعار ایسے ہیں جن سے اقبال کا نظریۂ فن سامنے آتا ہے لیکن یہ اس قدر جامع اور مبسوط ہیں کہ پورے نظریہ کی روح اُن کے اندر سمٹ آئی ہے،

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت		معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اور خونِ جگر کے بغیر ہر عشق ناتمام اور ہر نغمہ سودائے خام ہے،

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر		نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

یہ قطرۂ خونِ جگر اگر پتھر جیسی سخت چیز پر بھی پڑ جائے تو وہ مضطرب ہو کر دل کی طرح دھڑکنے لگے،

قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل خونِ جگر سے ہے صدا سوز و سرور و سرود

اقبال کی شاعری کی نشو و نما بھی اسی خونِ جگر سے ہوتی ہے۔

خونِ دل و جگر سے مری نوا کی پرورش ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

یہ قطرۂ خونِ جگر ہے کیا، ؟ اگر خونِ جگر اس سُرخی کی علامت تسلیم کر لی جائے جو مسجدِ قرطبہ کے رنگ کی شکل میں جلوہ گر ہے، تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن دراصل یہ خونِ جگر خلوص اور حقیقی جذبے کا دوسرا نام ہے، دل میں اس کی صداقت، اس کا حسن اور یقین و ایمان اپنی جگہ مستحکم کر لیتا ہے، تو ہر تکوینی عمل کا محرک بھی یہی حقیقی جذبہ ہو جاتا ہے،

یہ حقیقی خلوص اور شدید جذبہ صرف مردِ مومن کے دل میں ہوتا ہے، فن سے اس کے کارنامے لازوال بن جاتے ہیں، مسجدِ قرطبہ فنِ تعمیر کا بے نظیر نمونہ اسی لئے ہے کہ اس کے معماروں کا سوز و گداز اور خلوص اس میں شامل ہے، مردِ مومن عشق کی بدولت اپنی خودی کو پہچان کر اور خدا کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر فطرت کو تسخیر کرتا ہے، ایک نئی کائنات بنا کر خدا کی کائنات کو تکمیل بخشتا ہے،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن زوالِ آدمِ خاکی زیاں میرا ہے یا تیرا

اقبال کے نزدیک جس میں جلال و جمال پورے طور پر موجود ہوں وہی صاحبِ کمال ہے ان کے یہاں جمال کی دلبری ساحری بن جاتی ہے اور اگر دلبری یا قاہری ہو تو پیغمبری بن جاتی ہے، اقبال کے نزدیک مسلمان کے عناصرِ ترکیبی مندرجۂ ذیل ہیں،

قہاری و جباری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال اپنے مرد مومن میں بھی یہی اوصاف دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کا مرد مومن ساقیِ ارباب ذوق، اور فارسِ میدان شوق ہوتا ہے، ایسے ہی صاحبانِ کمال کے ہاتھوں مسجد قرطبہ وجود میں آئی،

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل　　وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود　　عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بُود

دوسرے اور تیسرے بند میں مندرجۂ بالا تصورات سمو دینے کے بعد چوتھے اور پانچویں بند میں مرد مومن کی صفات کا شمار کراتے ہیں، وہ خلیفۃ اللہ ہے، اس کی زمین بے حدود اور افق بے ثغور ہوتا ہے، اس کا سوز و گداز اسے فرشتوں سے بلند کر دیتا ہے، اس انسانِ کامل کو دیکھ کر فرشتے دنگ رہ جاتے ہیں، ع

نوریاں یہ تماشائے خاکیاں مستمند

حضرت جبرئیل بھی سوزِ آدم کے طلب گار ہیں۔

مرا راز و نیاز آدمے دہ　　مرا سوز و گداز آدمے دہ

مومن عشق کے پروں سے اڑ کر عشق کی وسعتوں سے آگے نکل جاتا ہے، مہ و پرویں اس کے نخچیر ہوتے ہیں، اور پکار اٹھتا ہے کہ ع　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

کائنات کی ساری توانائی اس کے دم سے ہے لیکن اقبال کا مرد مومن نیٹشے کے فوق البشر سے مختلف ہے فوق البشر خواہشات دنیاوی کا اسیر ہوتا ہے لیکن مومن کامل خواہشات سے پاک اور اغراض سے بلند ہوتا ہے، اقبال مسجد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں، :

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز　　اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

چھٹے بند میں اندلس کے عہدِ رفتہ (اُن کے شاندار و پُر اقتدار) کے ان مسلمانوں پر نظر جاتی ہے جنھوں نے ایمان و اخلاص کے ساتھ اس مسجد کو تعمیر کیا تھا، جسے اقبال حرم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ان حاملینِ خلقِ عظیم نے یورپ پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ آج بھی اندلس بلکہ سارے یورپ میں اسلامی اثرات نظر آتے ہیں جس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں نے قیصر و کسریٰ کی طرح شہنشاہی نہیں کی، بلکہ یہ ثابت کر دکھایا کہ ع

سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

آن مسلمانان کہ میری کردہ اند　　در شہنشاہی فقیری کردہ اند

اقبال ایسے مردانِ مومن کی تلاش میں ہے، وہ کہتا ہے

کون سی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے　　عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

ساتویں بند میں عالمی انقلابات کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے، جرمنی، فرانس اور روم کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی روح تڑپ اٹھتی ہے، اور اس کی زبان سے نکلتا ہے،

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب　　راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

پھر کہتا ہے :-

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا　　گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

آخری بند میں بھی دریائے کبیر کو مخاطب کر کے اس انقلاب کی پیشین گوئی کی ہے، جو ابھی پردۂ خفا میں ہے، :

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں　　میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے　　لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

پھر مسلمانوں کو ہر لحظہ سرگرم عمل رہنے کی تلقین کرنے کے بعد آخر میں اس شعر پر نظم تمام کر دی ہے؛

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

فنی اعتبار سے یہ نظم نہایت چست اور Compact ہے، آٹھوں بند فطری زیر و بم کے حامل اور ابتدا و انتہا سے منسلک ہیں، ابتدا سے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک پر شور دریا کے کنارے کھڑا ہوا سلسلۂ روز و شب کی تکرار سے موجوں کے تند تھپیڑوں کا مشاہدہ کر رہا ہے، اور یہ بہاؤ اور روانی ہر مصرعہ کے ساتھ تیز تر ہوتی جاتی ہے، اس میں بلا کا مد و جزر ہے، الفاظ کے در و بست سے اس میں رجز کی موسیقی پیدا کی گئی ہے، ان میں غنائیت کے ساتھ ساتھ ٹھہراؤ بھی ہے لیکن اس سے روانی مقصود نہیں ہوتی، یہ ٹھہراؤ مقصد کو زیادہ موثر اور دلنشیں کر دیتا ہے، مسجد قرطبہ کی بحر فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے، اس میں یہ ٹھہراؤ اپنے عروج پر ہے،

اس کی فنی صناعی اور فکری تعمیر کو اقبال نے خود مسجد قرطبہ کی صناعی اور حسن سے ہم آہنگ کر دیا ہے، الفاظ کا انتخاب اس طرح کا ہے جیسے کوئی کاریگر ہر ہر پتھر کو مناسب جگہ پر پیوست کرتا چلا جا رہا ہے،

وحدتِ تاثر اس کی بڑی خوبی ہے، افسانہ کی طرح نظم مختلف کلائمکس سے گزرتی اپنے منطقی منتہا کو پہونچتی معلوم ہوتی ہے، جس طرح افسانہ کے خاتمہ پر تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے، اسی طرح اس نظم کے خاتمہ پر اچانک پن کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے،

ندرتِ اسلوب کے اعتبار سے یہ اقبال کی منفرد نظم ہے، اقبال کی کسی دوسری نظم کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہے جو مسجد قرطبہ کو حاصل ہے،

نعتیہ شاعری کی معنوی اہمیت

اور

ادبی قدر و قیمت

از ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد،

فطرت انسانی پر حسن و احسان کا اثر انسان فطرتاً بندۂ حسن و احسان ہے، ہر حساس

شاعری میں اس کا ظہور دل حسن و احسان کے جلووں پر فدا ہوتا ہے، اور

ان کی بدولت ہر قلبِ سلیم میں تحسین و تشکر کے جذبات حرکت میں آتے ہیں، ممنونِ نظر

اور مرہونِ کرم اگر شاعر بھی ہو تو حسینوں اور محسنوں کی تعریف و تحسین کا دریا

جب امنڈنے لگتا ہے تو یہ جذبات شعر و سخن کے دلربا رنگ و روپ اختیار کر لیتے ہیں،

اور عرض و نیاز کے یہ نغمے ادب کا سرمایۂ ناز بن جاتے ہیں۔

شعر حافظ را کہ یکسر مدحِ احسان شماست ہر کجا بشنیدہ اند از لطف تحسین کردہ اند

حسن کی ایک نظر اور کرم کی ایک امید بھی شاعر کو قصیدہ گوئی اور غزل سرائی

پر ابھارتی ہے، فارسی غزل اور قصیدے کے ارتقا کی ایک ایک کڑی اس حقیقت پر

برہان قاطع ہے۔

مدحیہ اور اکابر کی تعریف اور اس کی چند قسمیں انسانی فطرت اور شاعرانہ مزاج کو یہ موضوع اس قدر

محبوب و مطلوب ہے کہ شاعر، درامانہ گو اگر کسی نیم تاریخی

اور کسی محسن و ممدوح کا انتخاب نہ کرے گا تو نظم، ڈرامہ، افسانہ یا ناول میں کچھ

خیالی کرداروں میں انسانی خوبیوں کا وہ رنگ بھرا کہ افسانہ پر اصل کا گمان ہونے لگا اور وہ ادبی کردار ضرب المثل نمونے بن گئے۔

شمہ از داستان عشق شور انگیز ماست این حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

مذہبی پیشواؤں کی تعریف | یہی وجہ ہے کہ قوموں کی شاعری کے ابتدائی شاہکار اکثر مذہبی پیشواؤں، انسانیت کے محسنوں اور مشاہیر قوم کی تعریف و تعظیم کے مضامین اور افکار پر مشتمل ہیں۔ رامائن، مہابھارت، شاہنامہ اور ایلیڈ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ عظیم الشان انبیاء کی تاریخی شخصیتوں تک پہونچتا ہے جن کی بدولت شاعری کو معنوی معراج نصیب ہوتی ہے۔

انسانیت کے محسنوں میں انبیاؑ کا مقام | انسانیت کے محسنوں میں انبیاء علیہم السلام کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے۔ ایک موقع پر عثمانیہ یونیورسٹی کی مجلس میلاد میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے نامور سائنسداں سرسی وی رامن نے فرمایا تھا

"انسانی زندگی کی تاریخ سے مہاتما بدھ، حضرت مسیحؑ اور حضرت محمدؐ جیسے محسنوں کے نمونے اور ان کے اثرات کو نکال دو پھر دیکھو کہ انسانیت کے لئے فخر و ناز کا کیا سرمایہ رہ جاتا ہے۔"

محققین تصوف کے لیے نعتیہ شاعری کی اہمیت | تاریخ ادب سے صاف ظاہر ہے کہ تصوف اور رسوخیات دینیہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری بھی ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی۔ تصوف کے محققوں اور طالب علموں کے لیے بھی نعتیہ شاعری بہت اہمیت کی حامل ہے اس سے خاص طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے نزدیک نبوت کا

کیا تصور ہے اعیان سے لے کر مختلف مدارج ظہور و کمال عروج میں نبی کا کیا مقام ہے۔

بڑے صوفی شعراء کی نعتیہ شاعری ان کے صوفیانہ مسلک و مشرب اور عارفانہ فلسفہ و حکمت کی تعلیم و تلقین کا ایک بنیادی اور مرکزی حصہ بن گیا۔ تصوف کے چند مرکزی تصورات ہیں۔

صوفیا کی نظر میں عظمت انسان اور نعتیہ شاعری کا ربط	تصوف کی انسان دوستی ایک مسلم حقیقت ہے روح انسانی کی عظمت اور انسانیت کی قدر و قیمت کے

روح افروز نغمے سب سے زیادہ صوفی شعراء ہی کے کلام میں سنائی دیتے ہیں۔

صوفیانہ شاعری میں عظمت آدم کا یہی احساس ترقی کرتے کرتے فطری طور پر عظمت انبیاء کے عرفان تک بلند ہوتا ہے اور تعظیم انبیاء کے ادراک و اظہار کا یہ ارتقا خاتم الانبیاء کی رفعت ذکر یا نعت شریف میں اپنی معراج کو پہونچتا ہے یعنی نعت سرور انبیاء، صوفیانہ شاعری میں انسانی عظمت کی تحسین و تعریف کی معراج ہے۔

فارسی نعتیہ شاعری میں یہ نکتہ خاص طور پر توجہ کا محتاج ہے کہ اولین بڑے نعت گو شاعر حکیم سنائی ہی کے کلام میں عظمت آدم اور نعت کا فطری ربط نمایاں طور پر ملتا ہے۔

غرض عالم آدم از اول ÷ غرض آدمؑ احمدؐ مرسل[1]

اسی طرح آخری دور کے ایک نامور صوفی شاعر شاہ نیاز احمد بریلوی

---

[1] حدیقہ سنائی ص۱۸۶

فرماتے ہیں

زہے عز و علائے منتہائے اوجِ انسانی ۞ نبی یثربی و مہبطِ تنزیلِ فرقانی[1]

عبدیت اور الوہیت کا ربط | تصوف کا مرکزی مسئلہ ربطِ الوہیت و عبدیت ہے

صوفیا کے نزدیک انبیائے کرام شانِ عبدیت کے بہترین نمائندے اور تجلیاتِ الٰہیہ کے بہترین مظہر ہیں ان کے معارف علومِ الٰہی کے ترجمان اور ان کے اخلاق، اخلاقِ الٰہی کا پرتو ہیں۔

نعت احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء کی نعت ہے | جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کہی جاتی ہے تو صوفیہ کے نقطۂ نظر سے اس کی ایک خاص اہمیت یہ بھی ہے کہ اس تعریف و توصیف میں تمام انبیاء کی تحسین و نعت شامل ہے۔

نامِ احمدؐ نامِ جملہ انبیاست ۞ چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست[2]

اسی طرح دوسرے انبیاء کے محاسن و مکارم کے بیان میں بھی لازماً خاتم الانبیاءؐ کی تحسین مضمر ہوتی ہے۔

عارف رومی تو تمام انبیاء پر لازمی ایمان کی توجیہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی کل کے مربوط اور لاینفک اجزاء ہیں۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ[3]	ہم رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے

چوں رسولاں از پئے پیوستن اند ۞ پس چہ پیوندند شاں چوں یکتن اند[4]

اس زاویۂ نگاہ سے ہم اس ادب اور شاعری پر ایک نئی نظر ڈالنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس میں مختلف انبیاء کی تعریف و توصیف کی گئی ہے چاہے

---

[1] دیوان شاہ نیاز احمد ص ۳ [2] مثنوی دفتر اول ص ۵۹ [3] آیت ۲۸۵ سورہ بقرہ
[4] مثنوی دفتر اول ص ۲۵

...د کسی زبان میں ہو اور کسی قوم کے نبی کی ہو۔

عرفانِ رسول عرفانِ حق کا وسیلہ ہے | نعتیہ شاعری میں حقائق محمدیہ کے مربوط تصورات موجود ہیں اکابر صوفیہ کے اندر عظمت، محبت اور اتباع نبوی کے جذبات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں ان کے نزدیک عرفان رسول ہی عرفان حق کا وسیلہ ہے،

نیاز اندر دلت گر مہر عرفان خدا باشد   فدائے شان دلجوئے محمد شو محمد شو[1]

اصلاح انسانیت میں نعتیہ شاعری کا حصہ | انسان نے کائنات کی جس قدر تسخیر کی ہے اس تناسب سے اپنے آپ کو اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کو حق و انصاف کے آگے نہ جھکا سکا، باہم جنگ و جدل کا یہی سبب ہے، اس حالت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد و اقوام کی نگاہ کو نسلی، جغرافی یا طبقاتی حدود سے بالاتر کرکے ان کے اندر ایک صحیح، قوی اور وسیع انسانیت اور متوازن سیرت کا جذبہ پیدا کیا جائے، اس کام میں اس ادبی سرمایہ سے بڑی مدد مل سکتی ہے، جس میں سیرت انسانی کی بلند مثالیں اور محاسن پیش کیے جاتے ہیں۔ ان ادبیات میں شاعری کا وہ شعبہ سب سے زیادہ قیمتی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کے محاسن بیان کیے گئے ہیں۔

متوازن سیرت اور نعتیہ شاعری | نعتیہ شاعری فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایسی سیرت کا دلکش نمونہ یا اسوۂ حسنہ پیش کرتی ہے جس میں جذبۂ تسخیر کائنات اور روح تسلیم بہ حق کمال حسن و تناسب کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یعنی انسان سارے کائنات کو اپنے لیے جھکائے اور خود اپنے آپ کو حق کے آگے جھکا دے اسی پائدار اور ترقی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ایسی سیرتوں کا علم،

---

[1] دیوان شاہ نیاز احمد ص ۲۹

ان کی محبت اور اتباع اولین شرط ہے۔

خارجی انقلاب، باطنی تربیت اور نعتیہ شاعری | زندگی کے خارجی ماحول میں کوئی دیرپا انقلاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ نفس انسانی کے اندرونی احساسات و اقدار میں انقلاب نہ ہو۔ اس انقلاب حال کو بروئے کار لانے کے لیے نعتیہ شاعری سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے مضامین کا اکثر حصہ ان اخلاقی و روحانی حقائق اور اجتماعی اقدار پر مشتمل ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔

مختلف تہذیبوں کا باہمی تعارف اور نعتیہ شاعری | اسی طرح مختلف قوموں اور تہذیبوں کے باہمی تعارف و تعاون کی ترقی کے لئے بھی ایسے ادب کے عمیق اور وسیع مطالعہ و اشاعت کی ضرورت ہے جس سے مختلف اقوام کے مقدس پیشواؤں کی انسانی خدمات اور تبلیغ و ہدایت کی عظمتوں سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ ح انبیاء یا نعتیہ شاعری کا مطالعہ بھی ان مقاصد عالیہ کی تکمیل کا ایک نہایت اہم اور لطیف وسیلہ ہے۔

ذاتی ذوق اور انتخاب موضوع | میرے شخصی ذوق اور مزاج کو بڑے انسانوں اور ... کی تاریخ اور تعریف سے غیر معمولی شغف ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ خدا کی خدائی میں سب سے بڑی نعمت، بڑے انسان ہوتے ہیں اور رسل و انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم انسانیت کی جان اور آدمیت کی شان ... نگاہ میں تو ایک لحاظ سے سب سے بڑے آدمی جن ... کمالات انبیاء ہی کا عکس ہوتے ہیں، جن کا ... حقیقت جزیہ ہے۔

چیرا عیست درین خانہ کہ از پرتو آں : ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

نعتیہ شاعری کی ادبی قدر و قیمت | نعتیہ شاعری کا دامن بہار حدیقہ، نکات مخزن الاسرار، مطلع الانوار اور تحائف تحفۃ الاحرار سے ع داماں باغبان و کف گلفروش ہے۔ شاعری کے جس میدان میں سنائی نے حدیقہ آرائی کی، خاقانی نے قصیدہ خوانی کے جوہر دکھائے، نظامی نے نظم پر دین کا رنگ جمایا، عطار نے عطر بیزی سے مشام جان کو معطر کیا، رومی نے حکایت نے سنائی، سعدی نے سادگی و پرکاری کا ہنر دکھایا، خسرو نے شیریں سخنی کا خراج ادا کیا، جامی نے جس جام میں عکس رخ یار دکھایا، قدسی نے جس چمن رس میں نغمہ خوانی کی، عرفی نے جس راستہ میں سر کو قلم بنایا، اور اقبال نے جس موضوع کی بدولت شعر و سخن کو بلند اقبال کیا، کیا کسی سخن شناس کو شاعری کے اس شعبہ کی معنوی نعت، ادبی قدر و قیمت، اور شاعرانہ اہمیت سے انکار یا اختلاف ہو سکتا ہے، اس کو پذیرائی یا تحصیل حاصل ہے۔

نعتیہ شاعری مختلف اصناف سخن میں | نعتیہ شاعری کسی ایک صنف شاعری میں محدود نہیں ہے، یہ ایک وسیع موضوع ہے اور ہر صنف سخن پر حاوی ہے۔ نعت نبوی میں قصیدے بھی لکھے گئے ہیں، مثنویات و غزلیات بھی لکھی گئی ہیں اور رباعیات بھی تحریر ہوئی ہیں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ صوفیانہ اور نعتیہ شاعری نے ہر صنف سخن کی معنویت اور ادبیت کو بلند کرنے میں خاص حصہ لیا ہے، اگر فارسی شاعری کو صوفیانہ میدان فکر اور نعتیہ شاعری جیسے موضوع نہ ملتے تو لطافت اور نزاکت سخن کے یہ مدارج عالیہ اس کے نصیب میں کہاں آتے۔

از عشق نبودی و غم عشق نبودی چندیں سخن نغز کہ گفتی کہ شنیدی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰		اپریل ۱۹۷۹ء

نعتِ سنائی

از

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

فارسی زبان کے صوفی اور نعت گو شعرا میں حکیم سنائی کو مقام رفیع اور مرتبۂ عالی حاصل ہے۔ مشرب فقر میں مشائخ صوفیہ انہیں شیخ عالی قدر تسلیم کرتے ہیں۔ اسم گرامی مجدود بن آدم ہے اور کنیت ابوالمجد ہے۔ سنائی تخلص فرماتے ہیں۔

شعرا را بلفظ منفو دم		زین قبل نام گشت مجدودم (سنائی)

سنہ ولادت بہ تحقیق و تعین مذکور نہیں لیکن مدرس رضوی نے تحقیق کے بعد ۴۷۳ھ کو قرین قیاس کہا ہے[1]۔ وطن غزنین تھا۔

گرچہ مولد مرا بہ غزنین بود		نظم شعرم چو نقش ماچین بود

ابتدا میں شعر گوئی کو مدح امرا میں وسیلۂ معاش بنا لیا تھا[2]۔ ایک دن ایک رند پاکباز کے اس طنز فلصانہ پر کہ سنائی دروغ گو ہے یعنی مداح امرا ہے، اگر قیامت میں سوال ہو کہ دربار میں کیا لایا ہے تو کیا جواب دے گا، اس مشغلہ سے توبہ کرکے گوشۂ قناعت اختیار کیا بعد ازاں حلقۂ تصوف میں داخل ہو گئے۔

من یکے شاعرو دخیل و غریب		راہ عزلت گزیدہ در عالم

یا تو یہ حال تھا کہ شب و روز تاجداروں کے درباروں میں مدح خوانی کرتے

---

[1] مقدمہ دیوان سنائی مرتبہ مدرس رضوی ص د [2] ایضاً ص ہ

گذرتی تھی یا اب یہ حال ہوا کہ تاجداروں کی نذر تک قبول نہ کرتے اور اپنے ہاں ان کی حاضری کی درخواست یہ لکھ کر رد فرما دیتے کہ "ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا" دین و دیانت کا یہ درجہ تھا کہ

بعنایت ازلی راہ بسر چشمۂ ازلی بردہ و بطوریکہ خود گفتہ بندۂ دین و چاکر ورع دیار سنائی بودہ است[۱]

برہنہ سر و پا عالم بے تابی و اضطراب شوق میں حج و زیارت مبارک سے مشرف ہوئے غزنین واپس ہوئے تو جذب و مستی کا ایک عالم طاری تھا۔ حال دل ترک ماسوا پر مائل تھا شیخ ابو یوسف ہمدانی سے بیعت ارادت فرمائی۔ پھر صحبت شیخ نجم الدین کبریٰ سے بھی فیضیاب ہوئے۔ وفات کے وقت یہ شعر ورد زبان تھا

بازگشتم زاں چہ گفتم زاں کہ نیست ۔ در سخن معنی و در معنی سخن

پایان زندگی کے متعلق قرین صواب قول ۵۳۵ھ (۱۱۵۰ء) سے پہلے کا ہے ا شاعر نے یہ تاریخ وصال کہی

عقل تاریخ نقل او گفتا طوطی او ج جنت والا[۲]

حکیم سنائی نے تقریباً ۲۵ ہزار اشعار کہے ہیں جو ان کی مندرجہ ذیل تصانیف میں مندرج ہیں:۔

(۱) دیوان قصائد و غزلیات۔ ایک بار یہ دیوان طہران میں اور پھر بمبئی میں طبع ہوا ہے اس میں تقریباً گیارہ ہزار اشعار ہیں[۳]

---

۱ نفحات الانس جامی ص ۳۸۹ ۲ مقدمہ دیوان سنائی از مدرس رضوی ص دک ب۔

۳ مقدمہ دیوان حکیم سنائی از رضوی ص بز ۴ مقدمہ سیر العباد الی المعاد از سعید نفیسی۔

(۲) مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ وشریعۃ الطریقۃ اس مثنوی میں بھی تقریباً گیارہ ہزار اشعار ہیں، ارباب نظر اس کو حکیم سنائی کا شاہکار شمار کرتے ہیں جسکی تکمیل ایک سال کی مدت میں ہوئی

(۳) طریق التحقیق | کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں "طریق التحقیق حکیم سنائی" کے نام سے فارسی تصوف میں ایک قلمی مثنوی ہے[۱] اس کو محمد فخرالدین صاحب کاتب نے کسی نسخہ سے نقل کیا ہے، آخر کتاب میں یہ عبارت درج ہے:-

تمت ھذہ الرسالۃ الشریفۃ مسمیٰ طریق التحقیق حکیم سنائی قدس اللہ سرہ العزیز

اس مثنوی میں چند مختلف صوفیانہ اور الٰہیاتی عنوانوں پر منظوم بحث و تلقین ہے لیکن اس میں کوئی عنوان نعت سے متعلق نہیں ہے

(۴) مثنوی سیر العباد الی المعاد | حکیم سنائی نے حدیقہ ہی کی بحر میں یہ مثنوی لکھی ہے، اس کے شائع ہونے کی عرصۂ دراز تک نوبت نہیں آئی تھی، جامعۂ طہران کے نامور ادیب پروفیسر سعید نفیسی کی تصحیح اور حسین کوہی کرمانی کے اہتمام سے چھاپ خانہ آفتاب طہران میں شائع ہوئی ہے، مثنوی کی معنوی قدر و قیمت کے لحاظ سے حدیقہ کے بعد اس مثنوی کا مرتبہ مانا جاتا ہے

مثنوی سیر العباد الی المعاد کہ پس از حدیقہ پُر مغز ترین و بہترین مثنویات ہست[۲]

لیکن اس کتاب میں بھی کوئی نعتیہ کلام موجود نہیں،

(۵) حدیقہ میں نعت | عام طور پر شعرا مثنویات میں حمد کے بعد نعت کو آغاز سخن میں بطور تبرک جگہ دیتے ہیں لیکن نعتیہ شاعری کے اس اولین ممتاز مخزن "حدیقہ سنائی"

---

۱ فہرست مخطوطات کتبخانہ آصفیہ نمبر ۴۴۳، تصوف فارسی ۲ سیر العباد الی المعاد مقدمہ آقای سعید نفیسی صفویادب

بیری صورت: حال یہ نہیں ہے باب اول تقریباً سو مختلف نظموں پر مشتمل ہے تحمید،
توحید، معرفت، فقر و توکل کے کئی پہلو ان پر! ان نظموں میں دقیق مباحث درج
ہیں۔ یہ باب اول زیر نظر نسخہ کے ۱۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس طویل باب
کے آخر میں دو نظمیں ہیں ایک کا عنوان ہے "التمثیل فی خلقۃ آدم و عیسیٰ بن مریم علیہما السلام"
دراصل یہاں سے کلام کا رخ نعت کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اس نظم میں حقیقت
آدم و فضیلت آدمیت پر چند بلیغ اشارات ہیں۔ مثلاً

پدر آدم اندریں عالم — ہست ازاں دم کہ زاد مریم
تن کہ تو شد ز رنگ آدم شد — جان کہ جان شد ز بوئی آن دم شد
ہر کرا آن دم است آدم اوست — واں کرا نیست نقش عالم اوست[1]

اس کے بعد اس باب کی آخری نظم بعنوان "ذکر الانبیاء خیر من حدیث"[2] بھلا ہے۔
یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نظم کا ایک حصہ دراصل سید الانبیاء کے ذکر و نعت کی
ایک عام تمہید ہے۔ کلام کا آغاز منصب انبیاء کے اس ذکر سے ہوتا ہے

انبیاء را متابعان دین بودند — عقل را راہ راست بنمودند[3]

لیکن انبیاء علیہم السلام کے راستہ کو لوگ ترک کرنے لگے اور دین حق
روپوش ہونے لگا۔ لوگ سرگشتۂ رسوم و قیود و حجاز ہوگئے۔

دین حق را ولے خود نہاں کردہ — ہر یکے دین بد عیاں کردہ
بدعت و شرک سبز بر آوردہ — زندقہ جملہ سر بر آوردہ[4]

حتیٰ کہ بیرت انبیاء کے ظہور سے پہلے بجز بریں انسانیت کی تباہی و گمراہی

---

[1] حدیقہ باب اول نظم التمثیل فی خلقۃ آدم ص ۱۷۷۔۱۸۰، [2] حدیقہ باب اول ص ۱۷۹
[3] ایضاً ص ۱۸۰

کا یہ عالم ہوا سہ

ملکہ توران و مملکت ایران شدہ از جور یکدگر ویران

حبشہ را خستہ سوسے یثرب فیل یا ابر ہہ ز مرغ ضرب

خانہ کعبہ گشتہ بت خانہ بگرفتہ بغصب بیگانہ (بیگانگراں)

بر جہالت جہاں دیر نیرنگ بر خرد مندراہ دین شدتنگ[1]

عالم انسانیت کی اس تباہی و گمراہی کو دور کرنے کے لیے نور ہدایت محمدی طلوع ہوا، جیسا کہ پہلے بھی عہد بعہد انبیأ مطالع انوار بن کر ظہور پذیر ہوتے رہے، ظلمات شرک انوار توحید ہی سے رفع ہوتے ہیں، اور توحید کے حامل و علمبردار انبیاء ہی ہوتے ہیں، اس لیے حکیم سنائی ثنار حق کے بعد ثنائے انبیاسپرد قلم کرتے ہیں، خاصۃً نعت احمد مرسلؐ در حت عالم

چوں بگفتی ثنائی حق طردل پس بگو نعت احمدؐ مرسل

چوں ز توحید گفتہ شد طرفے گفت خواہم ز انبیاء شرفے

خاصۃً نعت رسول بازپسیں آن ز پیغمبراں بہیں و گزیں[2]

اس تمہید کے بعد باب ثانی یعنی "باب الثانی فی فضیلۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم" سے نعتیہ نظموں کا سلسلہ شروع ہے، پہلی نظم بعنوان "فی فضیلۃ نبیّنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وعلی سائر الانبیاء" ہے۔

ابتدا کے چند شعر آفتاب سعادت کی چند تجلیات کا تذکرہ ہیں کہ آفاق میں ایسا یا مرد کوئی ظاہر نہیں ہوا کہ اس کے نور کی تعظیم کے لیے دونوں عالم

---

[1] حدیقہ باب اول ص ۱۸۱ [2] حدیقہ باب اول ص ۱۸۱ ذکر الانبیاء

سجدہ ریز ہوگئے ہوں'

آمد اندر جہاں جان ہر کس | جان جانہا محمد آمد و بس
چوں بخندید بر سپہر جلی | آفتاب سعادت ازلی
آن سپہرش چہ بارگاہ ازل | آفتابش کہ احمد مرسل[1]

سنائی نے اس کے بعد سارے انبیاء پر فضیلت کے چند پہلو اور وجوہ کمال بلاغت سے لکھے ہیں'

دیدہ جان پاک آدم ازو | معنی بکر[2] لفظ محکم ازو
انبیاء پختہ ہم از زر او | ہرچہ شان نقد بود بر سر او
تاشب نسبت صبح ہستی زاد | آفتاب چنیں نداد و نیاد[3]

ذکر فضیلت کے اختتام پر "عالم جزو" و "نفس کل" کے ساتھ آپ کی نسبت کا بیان ہے'

عالم جزو را نظام بدو | غرض نفس کل تمام بدو
قدمش در ازل نفرسودہ | قدمش در ابد نیاسودہ[4]
ہست کردہ ز نور و لطف گلش | شرق و غرب ازل درون دلش[5]

دوسری نظم کا عنوان ہے "فی معراجہ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ" اس نظم کا مطلع ہے'

ہر نہادہ ز بہر تاج قدم | پائے بر فرق عالم و آدم[6]

---

[1] حدیقہ باب اول ص ۱۸۴، ذکر الانبیاء [2] معنی بکر لفظ محکم کہ عبارت از آیات محکم است۔ ص ۱۸۴ [3] ۱۸۵ [4] حدیقہ ص ۱۸۴ [5] حدیقہ ۱۸۵-۱۸۴ [6] ایضاً ۱۸۵-۱۸۴

اس کے بعد ذکر معراج شروع ہوتا ہے اور صرف سات آٹھ اشعار میں واقعات کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے، واقعات کے بیان نے اختصار کے باعث جامع اشارات کی سی صورت اختیار کر لی ہے۔

گفت سبحانش الذی اسریٰ شدہ زانجا بہ مسجد اقصیٰ

در شب از مسجد حرام بکام رفتہ دیدہ و آمدہ بمقام

بنمودہ بد عیاں مولیٰ آیۃ الصغریٰ و آیۃ الکبریٰ[1]

معراج مبارک کے اس بیان میں بیانیہ مثنویات کا سا نہ تسلسل ہے نہ تفصیل صرف چند اشعار میں بلا ترتیب چند اہم واقعات کی طرف اشارے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ فارسی شاعری کا پہلا معراج نامہ ہے، ادبیت و معنویت کی وجہ سے اس کی اہمیت ہے، یہ معراج نامہ کی پہلی کڑی ہے، سنائی کے بعد کے بڑے نعت گو شعراء نے معراج نامہ کو ارتقاء کے مدارج کمال پر پہونچا دیا، خصوصاً نظامی کی نعتیہ شاعری میں معراج نامے نعتیہ شاعری کی معراج پر پہونچ گئے ہیں۔

واقعات معراج کے بعد کی گفتگو معراج کے چند معنوی پہلوؤں پر مرکوز ہو گئی ہے۔ برخلاف اس کے بعض شعراء واقعات معراج ہی کے سلسلہ میں معنوی نکات سمیٹ لیتے ہیں، اس کے بعد سات اشعار حقائق محمدی کے سات نکات کے ترجمان ہیں،

شدہ اندر زمین بفضل و نظر خاک آدم ز آفتابش زر

---

[1] حدیقہ ص ۱۰۲

زادہ از یکد گر بعلم و بدم	آدمؑ از احمدؐ احمدؐ از آدمؑ
غرض عالم آدمؑ از اول	غرض آدمؑ احمدؐ مرسل
از پے او زمانہ را پیوند	بسر او خدائے را سوگند
در او بودہ جائے روح القدسؑ	پائے او سجدہ جائے روح القدس
گر نہ از بہر عز او بودے	ذل خاک ایں کمال نمودے
خلق او مایۂ روح حیواں را	خلق او دایہ نفس انساں را[1]

تشبیہات ہیأت و فلکیات | ان نکات کے اختتام پر چند نعتیہ مضامین نے ہیأت و فلکیات سے ماخوذ تشبیہات کا پیرایہ اختیار کیا ہے[2]

اس کے بعد نئی نظم کا عنوان پہلی نظم کا تتمہ ہے البتہ بعنوان فی بدایۃ ذاتہ علیہ السلام ایک مستقل نظم ہے اس نظم کے مباحث یہ ہیں

(۱) ظہور سے پہلے نور محمدی کا کیا مقام تھا اور کہاں (۲) فضل قدم نے اس رحمت الٰہی کو کیوں اور کس طرح رحمت عالم آب و گل دی (۳) اس ظہور رحمت کے کیا آثار پیدا ہوئے

اس کا جواب سنائی کی زبان پر یہ ہے۔

جان او بودہ در طریقت حق	گوہر حضرت حقیقت حق
رحمت آب و گل دریں عالم	رحمتش نام کردہ فضل قدم
زانکہ بنمود حق بجان و دلش	رمزہاے حقیقت از دلش
طینتش زمنت جہاں آمد	راحتش راحت رواں آمد[3]

---

[1] حدیقہ ۱۸۷ [2] ایضاً ۱۸۸ [3] ایضاً ص ۱۹۴ و ۱۹۳

اس کے بعد کی نظم میں سنائی "رسول کی یہ کرامت واضح بیان کرتے ہیں کہ اگر پیش آدم ملک ابلیس ہو گیا تو آپ کا شیطان مسلمان و ملک ہو گیا آپ "نور بینندہ و دل جوئندہ" ہیں۔

واسطہ میان خلق و حق | فی اتباعہ علیہ السلام کے زیر عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ قرار دیا ہے۔

معجزات | اس کے بعد معجزۂ شق القمر اور آتشکدہ کے سرد ہونے کا ذکر ہے۔

نطق رسول اور دیدۂ قبول | معجزات کے بعد سنائی کہتے ہیں کہ "نطق رسول نے جو کچھ عقول انسانی پر پیش کیا اُسے فطرت انسانی اور روح ایمانی نے دیدۂ قبول پر رکھا"

نطق او ہرچہ در عقول نہاد روح بر دیدۂ قبول نہاد

یہ نظم اس پر ختم ہوتی ہے کہ جو کچھ نعتیہ مضامین بیان ہوئے ہیں انکی شرح یا سرچشمہ الم نشرح ہے۔

ہمہ خلق و دو فاد بسط و فرح شرح این نعتہا الم نشرح[1]

شرح صدر رسول | بعد کی نظم کا عنوان اسی مناسبت سے "فی انشراح صدرہ علیہ السلام" ہے۔

سینۂ او کشادہ روح نخست ہرچہ جز پاک دید پاک بشست[2]

عقل و رسالت | عقل کا تجربہ جوں جوں بڑھتا جائیگا یہ محسوس ہوتا جائیگا کہ عقل کو اشارہ رسول پر چیدہ سر اور گوش برآواز ہونا چاہیے نور رسالت کے بغیر "عقل" یار دیو نفسانی ہوتی ہے اور انوار رسالت کے ساتھ فکر عقل روحانی بن جاتی ہے۔

نور کز خلق او موثر شد چشمۂ آفتاب دکوثر شد

عقل داؤد دار در محراب پیش او خرد ر اکعا و اناب

شرع او روح عقل روحانیست رائے تو یار دیو نفسانیست[3]

---

[1] حدیقہ ص ۱۹۹ [2] حدیقہ ص ۱۹۹ [3] حدیقہ ص ۲۰۲

ماہ جولائی ۱۹۸۱ء تا دسمبر ۱۹۸۱ء

امیر خسرو کی مشہور نعتیہ غزل

از

جناب شہاب سرمدی صاحب علی گڑھ

گذشتہ جنوری میں دہلی میں چودھویں صدی ہجری پر جو بین الاقوامی سیمینار دہلی میں ہوا، اس موقع پر جناب شہاب سرمدی سے بڑی پُرکیف اور مخلصانہ ملاقاتیں سیمینار کے اجلاسوں اور لودی ہوٹل کے اندر ہوتی رہیں، ذکر آیا کہ وہ نعتیہ غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

امیر خسرو کی ہے یا کسی اور خسرو کی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ یہ امیر خسرو کے کسی دیوان میں نہیں، اس لیے ان کی نہیں ہوسکتی ہے، جناب شہاب سرمدی نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ یہ ان ہی کی ہے، وہ فن موسیقی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے انھوں نے باضابطہ موسیقی کے تال اور سُر کا مظاہرہ کرکے ثابت کیا کہ یہ امیر خسرو کے سوا کوئی اور کہنے کی قدرت نہیں رکھ سکتا، انھوں نے جو تفصیلی گفتگو کی اس کو سن کر میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ یہ سب کچھ لکھ کر بھیج دیں، ذیل میں ان کی یہ تحریر پیش کی جارہی ہے، وہ اس وقت دہلی کے انڈین ہسٹاریکل ریسرچ کونسل کے فیلو ہیں، قیام علی گڑھ میں رہتا ہے، پرانی تہذیب اور شائستگی کے نمونہ ہیں، وطن الٰہ آباد ہے۔ "ص ع"

خسرو علیہ الرحمۃ کی جس غزل کا آپ نے ذکر فرمایا تھا اس کے سلسلے میں ایک اور بات سمجھ میں آئی یا یوں کہیے کہ یاد آئی جو بنایت متعلق معلوم ہوئی! وہ یہ کہ یہ عام معلومات کی بات ہے کہ ان کا کلام جتنا تحریر میں

آسکا یا لایا گیا اس سے کچھ زیادہ دیا آننا ہی وہ کلام تھا، جو سپرد سینہ ہی رہا چنانچہ :-

شعر را گر دو سہ دفتر بہ تحریر آمدی علم موسیقی سہ دیگر بود، اگر باور بود

"گر باور بود" توجہ طلب ہے، ہونہ ہو خسرو کو یہ اندیشہ تھا کہ شنیدہ اور دیدہ میں 'دیدہ' بازی لے جائے گا، پھر بھی جو مجھے سمجھیں گے، وہ میرے اس کہے کو بھی سمجھیں گے، وہ اور اسے باور کریں گے ـ اب ذرا غزل کی جانب تھوڑی دیر کے لیے پوری توجہ فرمائیے؛ مگر پہلے ایک دو حرف تمہیدی :

دیباچہ غرۃ الکمال میں موصوف نے غزل کو ایک صنفِ پیش پا افتادہ تو خیر نہیں کہا، مگر کہتے کہتے رہ گئے، اس لیے کہ یہ انہی کا کہا ہے، کہ آج کی دلی میں جسے دیکھیے وہ ساٹھ شعر موزوں کر لیتا ہے، اور بے نکل اونٹ کی طرح بلبلاتا پھرتا ہے، اس کے بعد جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ان کے اسی دیوان میں ایک دو دس پانچ نہیں، سیکڑوں پوری کی پوری غزلیں شامل ہیں، ایسا کیوں ہوا، آپ ضرور جانتے ہوں گے، میں اب تک نہیں جان سکا مگر میرے لیے یہ قطعاً قرینِ قیاس ہے، کہ اس کی ایک معتدبہ وجہ تھی، "لا ابالی غزل" کا "مطرب و ساقی کی محفل" سے نکل کر خانقاہ پہنچنا اور خسرو ہی کے ہاتھوں اس کا متدین و معتبر ہو جانا تھا۔ خوش بختانہ اس قرینے کے حق میں دستاویزی شہادتیں زیادہ نہ سہی، مگر کافی پھر بھی ہیں؛ چنانچہ میر خورد کی بنج کی محفل اور اس میں امیر خسرو نے شیخ اوحد کی غزل پر یا اُن کے صاحبزادے امیر حاجی نے سعدی کی غزل پر جو ٹکڑے لگائے ہیں، کیا وہ ان کے کسی بھی دیوان میں اب تک مل سکے؟ اس کی تصدیق ضروری ہے۔

اسی طرح ان سے منسوب یہ دوہا :

کھسرو رین سہاگ کیری جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوء بھئے اک رنگ

یہ دوہا بہ یک نظر ان کے اس شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے :

(تن میرو من ... پیو کو) (دوء بھئے اک رنگ)
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ؛ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری [1]

---

[1] حاشیہ ص ۵۹ پر۔

کیا یہ دوہا کہیں لکھا ہوا ملا؟ اب تو خیر ملتا ہے، مگر جب کی یہ بات ہے تب بھی یا اس کے فوراً بعد بھی اس کا ذکر کسی نے کیا؟

اب آئیے غزل کی طرف:

نمی دانم چہ محفل بود شب جائے کہ من بودم

یہ بھی اب تک ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں مل سکی، مگر کیا صرف اتنا کہنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، کہ یہ غزل ان کی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا نہ ممکن ہوگا، نہ مناسب، اس لیے کہ یہ امر مسلّم ہے کہ خسرو نے حسبِ گفتۂ خود: "دفتر کے دفتر" صرف سخن بندی اور سرود و سماع کے لیے تصنیف کیے تھے، اور اس لیے انھیں تحریر میں لانا بھی ضروری نہ جانا تھا، یا کم سے کم انھیں اپنے پاس لکھ کر محفوظ نہیں رکھتے تھے، یہ غزل جو لازماً اور یقیناً ادبی نہیں، قطعاً ایک غنائی تصنیف تھی، سے بھی انھوں نے اپنے عندلیبانِ دہلی کے حوالہ کر دینے کے بعد بھلا دیا ہو تو کیا عجب!

ان سب کے علاوہ ایک بڑی میرے نزدیک اور میری ناچیز نظر میں ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ اس غزل سے خود ہی کیوں نہ پوچھ لیا جائے کہ یہ ہے کس کی؟ آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی عالم آشکارا تالیف "بازیافتِ ہند" میں امیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا کچھ کلام جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے، اگر ان کا نہیں، تب بھی کسی خسرو جیسے ہی کا ہو سکتا ہے، میری بھی یہی گذارش اس غزل کے بارے میں ہے، خاص کر اس بنا پر کہ اس کا ہر مصرع یہ بتاتا ہے کہ مجھے جس نے نظم کیا ہے، اس کے خداداد حس و شعور کی فنی گرفت میں صرف بحر و وزن ہی نہیں، لحن، ابعاد، ضرب، ایقاع کے تقاضے بھی تھے، چنانچہ آپ خسرو کی ایسی تمام غزلوں بالخصوص اس غزل کی تقطیع کر دیکھیے، فارسی زبان کی بقول علامہ شبلی علیہ الرحمہ الفاظ کے معاملہ میں

(حاشیہ صفحہ ۵۸) ملا۔ اس شعر کو بھی میں خسرو ہی کا سمجھتا آیا ہوں، ورانھی لیکہ مطبوعات میں ان کے نام سے نہیں ملتا، آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ ان کا نہیں تو کس کا ہے۔

تہی دامنی، اس لیے مفردات کی جگہ مرکبات کی بھرمار کے باوجود ہر رکن ایسا سموچا اور سڈول ہوگا کہ اسے سُر اور لے کے سانچوں ڈھانچوں میں جس طرح چاہیے ڈھال لیجئے، ایک دلچسپ اور مفید پہلو اور ہے، یعنی اردو فارسی لغات کے اختتامیوں کا ساکن، بلکہ کبھی کبھی ساکنین کی صورت میں ان زبانوں کی خصوصیات میں شامل ہونا، موسیقی کے لیے یہی خصوصیت ایک بڑی قباحت بن جاتی ہے کہ اس یا ان غیر متحرک آواز یا آوازوں کو نہ ابھارا جائے، تو بات نہیں بنتی، اور ابھارا جائے، تو کیسے۔ خسرو غزل و ترنم دونوں کے رسیا تھے، انھوں نے صرف اپنے فطری سلیقہ سے اس مشکل کو جس طرح آسان کیا ہے، وہ ان ہی کے کہے کو جانچ پرکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو

اس کی تقطیع ہوگی،

خدا خود میر (ے) مجلس بو (د) دُ اندر لا مکاں خسرو

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

اضافت جو صوتی اعتبار سے ہمزہ ہوتی ہے، اسے کس طرح ایک رکن خفیف بنایا ہے۔
دال کی آواز کو پیوستہ آواز ہمزہ سے ضم کر کے کیا خوبصورت کام لیا ہے، کہ ہر حرکت ایک دوسرے میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہے،

اب ذرا اس مصرع کو گیت کا ایک پد تصور فرمائیے، تو اس کے ارکان کی ماترک گنتی ہوگی،

مفاعیلن م فا عی لن

۱ ماترے = ۱ ، ۲ ، ۲ ، ۲

یعنی اسی سے اس غزل کی قدرتی لے قائم ہوتی ہے۔
اس لیے ماتروں کی کوئی تال چلیے مثلاً مغلئی جسے بعد میں رد پک کہا جانے لگا،

اس کے بول ہیں:

|| دھن نگ | دھن نگ | تن تن نگ ||

اسی طرح تیوڑا ہے، مگر پشتو تو مذکورہ بحر و وزن کے مزاج و کردار دونوں سے اقرب ہے۔

غور فرمائیے پشتو بھی وہی ۷ ماترؤں کی تال ہے اور اس کی چال ہے،

|| دھین (ایں) تگ | دھین ایں | دھا دھا ||

(وقفہ)

اور ڈھولک کے بول ہیں، اور میں جانتا نہیں لیکن عجب نہیں یہی بول دف کے بھی رہے ہوں، یعنی:-

تَ کَ دھی نَ (برام) (وقفہ) دھا دھا دنَ

م فا عی لن ء م فا ئی لن

یہ خالص عمل کی باتیں ہیں، اس لیے زیادہ تفصیل میں جانے سے جی ڈرتا ہے کہ مبادا آپ اکتا جائیں پھر بھی آپ خسرو شناس ہیں اور حق آشنا، ان تمام باتوں پر ایک بات اور مضاف فرما لیجیے، اور وہ اصولی ہی نہیں بڑے کانٹے کی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان تو میں جیسے ایک آس کا سُر اور اس کے علمی و عملی عوامل اپنے ساتھ لائیں، ویسے ہی تال کا تصور بھی بصورت دائرہ لائیں، اس لیے جہاں سے شروع وہیں پر ختم یعنی مفاعیلن کا وزن قائم ہوا، تو وہی اساسی زیج ہیں زحافات و متنوعات چاہے جیسے اور جتنے بھی آجائیں۔

اگر کبھی کسی قدر فرصت سے نیاز حاصل ہو سکا تو اس غزل کو صرف Demonstrably خسرو کی ثابت کرنے کے لیے مغلئی اور پشتو دونوں تالوں میں پیش کرنے کا شرف حاصل کروں گا ان شاء اللہ الرحمٰن۔

ویسے آپ کسی جانکار قوال یا عطائی سے اس غزل کو سنیے آپ کو مدعا بس ہی نہیں معلوم ہو جائے گا

کہ یہ گنگنانے کے لیے نہیں گانے کے لیے کہی گئی تھی، اور اس کا کہنے والا یقیناً جتنا بڑا شاعر تھا اتنا ہی بڑا صاحبِ تصنیف ماہرِ موسیقی بھی تھا،

اس سلسلہ میں ایک ثبت بات اور: فارسی غزل ہمیشہ سے ایک غنائی صنفِ ادب رہی ہے، مگر اس کی غنائیت کتنوں سے نبھ پائی، ہمام و سعدی اس کے محسنین اولی رہے ہیں، حسن علا سجزی اور امیر خسرو دونوں نے اپنے قیام ملتان کے زمانہ میں ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، چنانچہ

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آزری

اسی زمین میں سعدی کی بھی غزل ہے، جس کا مشہور شعر ہے،

صورت گر دیبائے چیں آں صورتِ روشن ببیں
یا صورتے تکش بر ایں یا ترک کن صورت گری

ظاہر ہے کہ شیخ کی قدرت کلام اور قوت ابداع میں کس کو شک ہو سکتا ہے، مگر خسرو کی غزل کا ہر شعر گویا ایک نغمہ ہے، شیخ کا کامیاب ترین شعر بھی زیادہ سے زیادہ جانِ تغزل ہے، اور بس، ابن بطوطہ کہتا ہے، جب میں چین پہونچا تو وہاں لوگوں کو شیخ علیہ الرحمہ کی ایک غزل پر وجد کرتے پایا، اس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے:-

تا دہ ام	فکر اب	در بحر یہ	دادہ ام	مہرت	چوں دل ب
فاع لن	فع لن	مفعول	فاعِ لن | فع لن		مف عول
بندری	محرا	اگوئی ب	تادہ ام	مازمیں	چوں در ن
فاع لن	فع لن	مفعول	فاع لن	فع لن	مف عول

شیخ کی غزل نقشِ اول ہے، اس کی تقطیع پر نظر کیجیے، حروف کی، اصوات کی کترنیں اڑتی ہوئی ملیں گی، خسرو کی ہر غزل سُر تال سے لیس ہونے کی وجہ سے ٹک سک درست ہے، اسے کن بند کیجیے،

تو ہر ٹکڑا اپنی جگہ خود مکتفی ہوگا۔

آخر میں یہ کہ قول فیصل تو نہ اپنا کہا ہو سکتا ہے، نہ کسی اور کا، مگر حق و عدل دونوں کا عندیہ یہی ہے، کہ ایک ہی غزل کیا خسرو کا سارا کلام جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہونچا ہے، خاص کر وہ جو آج سماع کے سوز و ساز کی جان بنا ہوا ہے، اسے قانون شہادت کے مطابق — Unless the Contrary is proved ہمیں خسرو ہی کی تسلیم کرتے رہنا ہوگا۔ خدا کرے کہ مزید تحقیق بھی یہی ثابت کرے۔ آمین!

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این۔ پی ۴۳ اگست ۱۹۸۶ء

اردو میں حمدیہ شاعری

از

جناب سید یحییٰ نشیط صاحب کالی (دولت خاں)، مہاراشٹر

مذاہبِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ خدا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں ہر وقت موجود رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں دورِ جدید کی غیر مہذب اور دورِ عتیق کی مہذب ترین قوموں میں بھی اگر ہم جھانکیں تو وہاں بھی خدا کا تصور ہمیں ملے گا۔

چنانچہ پروفیسر میکس مولر افریقی مذہب کے عناصرِ اعلیٰ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ادجی یا اشانتی قبائل کے نزدیک، آسمان سب سے بڑا معبود ہے، جیسے وہ شخصی خدا، خالق اور تمام اچھائیوں کا مالک مانتے ہیں"...... بشمین قوم کے لوگ بھی خالقِ حقیقی میں یقین رکھتے ہیں، انکا کہنا ہے کہ اسی نے سب چیزیں بنائی ہیں اور ہم اسکی عبادت کرتے ہیں۔ عراق کی قدیم بابلی اور آشوری قوموں میں بھی خدا کا تصور پایا جاتا تھا۔ انکی حمد و مناجات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی عظیم ترین قوت کا نفوذ اور اثر تسلیم کرتے تھے۔ ان کے یہاں قوت خداوندی رحمٰن اور رحیم اور عفو و درگذر کرنے والی تھی۔

قدیم مصر میں "پتاح" کا تصور خدا کے تصور سے قریب تر تھا۔ اس کے بارے میں ایک قدیم مصری شاعر کا یہ خیال ملاحظہ فرمائیے۔

"کسی باپ نے تجھے پیدا نہیں کیا اور نہ کسی ماں نے تجھے جنم دیا۔ تو نے خود اپنے کو بنایا، بغیر کسی دوسری ہستی کی مدد کے۔"

یونانِ قدیم میں جب تکوینِ عالم کے سلسلے میں غور کیا گیا تو فلاسفۂ یونان اس نتیجے پر پہنچے کہ

خدا ایک ہے۔ جو دیوتاؤں اور انسانوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کا جسم اور دماغ مثل انسان کے نہیں ہے، وہ سراپا بصارت، سراپا سماعت اور سراپا عقل ہے۔" امریکہ کی قدیم ازتیک قوم میں خدا کا یہ تصور تھا کہ "وہ اپنی صیقل شدہ ڈھال میں انسانوں کے کل اعمال دیکھتا ہے، روح کو قبض کرنے کے لیے وہ تاریک راستوں میں مثل ہوا کے دوڑتا ہے، وہ مجیب الدعوات بھی ہے"[1]

برادرانِ وطن میں بھی معبود پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے، چنانچہ ان کے قدیم مذہبی صحیفہ رگ وید میں پرجاپتی کی حمد اس طرح کی گئی ہے۔

"پرجاپتی نے کاریگر کی طرح اس عالم کو گھڑا۔ دیوتاؤں کے ابتدائی زمانے میں نا شے سے شے وجود میں آئی .... ایک اگنی جو بہت سی شکلوں میں روشن ہوتی ہے، ایک سورج جو سب پر چمکتا ہے، ایک شفق ہے، جو ان سب کو منور کرتی ہے وہ جو ایک ہے۔ یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔"

یجروید میں خدا کی توصیف اس طرح کی گئی ہے۔ "خدا ایک ہے، وہ غیر متحرک ہے تاہم دماغ سے زیادہ سریع السیر ہے۔ حواس اس تک نہیں پہنچ سکتے، اگرچہ وہ ان میں ہے۔"

اتھروید میں جس خدائے برتر کی تعریف کی گئی ہے وہ "ورن" ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

کہ ــــــــــ ورن آقائے اعلیٰ دیکھتا ہے۔

گویا وہ نزدیک ہو جب کوئی شخص کھڑا ہوتا یا چلتا یا چھپتا ہے۔ اگر وہ لیٹے جاتا ہے یا اٹھتا ہے۔ جب دو آدمی پاس بیٹھ کر کانا پھوسی کرتے ہیں، تو بھی شاہ ورن کو اس کا علم ہوتا ہے، وہ وہاں مثل ثالث کے موجود ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کوئی آسمان سے پرے بھاگ کر جانا چاہے، تو بھی وہ شاہ ورن سے نہیں بچ سکتا۔"

---

[1] "Encyclopaedia of Religion" بحوالہ نگار خدا نمبر" لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۵۶ء ص ۰۰۴

ایران کے مانوی مذہب میں بھی اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گائے گئے ہیں۔ یہودیوں کے یہاں بھی خدائے واحد کا تصور پایا جاتا ہے۔ اور قوم نصاریٰ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خدائے واحد کی دعوت دی۔ چنانچہ یوحنا کے تیسرے باب کی سترہویں آیت میں بیان ہوا ہے کہ "خدا واحد اور برحق ہے" لوقا کی انجیل میں کہا گیا ہے کہ "کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر مہذب و غیر مہذب قوم میں خدائے واحد کی پرستش کے آثار نمایاں ہیں۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ـــ

"آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لیکر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس (خدا کے) تصور کی امنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بنا شروع تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی اور حتیوں (Hititties) اور عیلائیوں نے جب اپنے تعبدانہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے تو انسانی تمدن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں، مصریوں نے ولادت مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا، اور کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کیے، جو گزری ہوئی قوموں کو انھیں ورثے میں ملے تھے"۔[1]

لیکن علاوہ اسلام کے ادیانِ عالم میں وحدانیت کا تصور بڑی حد تک ناقص ہی رہا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ پیغمبرانِ دین اور مصلحینِ قوم سے عقیدت میں غلو ان قوموں میں اس قدر رواج پا گیا کہ "خدائی صفات" بھی ان جلیل القدر اور عظیم ہستیوں سے منسوب کر دیئے جانے لگے تھے۔

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد۔ "غبار خاطر"۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ص ۱۲۸۔ ۱۲۷۔

(زردشت (۶۶۰ - ۵۸۳ ق-م) کے یہاں خدائے واحد کا قدیم تصور ہونے کے باوجود یزداں واہرمن کی ثنویت پیدا ہوگئی۔ قوم ہنود نے مختلف دیوتاؤں کی صورتوں میں ایک خدا کی پرستش شروع کی اور رفتہ رفتہ ایک کے بجائے زمین آسمان کے کئی دیوتا ماننے جانے لگے۔ عیسائی قوم میں ایک خدا کا تصور بڑھتے بڑھتے "خدا اور اس کا بیٹا" اور پھر خدا، عیسیٰ، اور روح الامین کی تثلیث میں تبدیل ہوگیا۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جو باوجود ادیان عالم میں سب سے کم عمر ہونے کے خدا کی وحدانیت کا صحیح ترین اور واضح تصور پیش کرتا ہے۔

اس بزرگ و برتر ہستی کے آگے جب انسان خود کو بے بس و مجبور تصور کرتا ہے، تو پھر اللہ کا خوف اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے، اسی خوف کے ساتھ جب عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو پھر اللہ کی بڑائی اس کی زبان سے نکلتی ہے۔ خوف و عقیدت کا یہی اظہار حمدیہ نغموں اور تمجیدی زمزموں میں کیا جاتا ہے۔ جن سے ادبیات عالم کا بیشتر حصہ بھرا پڑا ہے۔ ان نغموں میں خدا کی مختاری اور انسان کی مجبوری، خدا کی کارسازی اور انسان کی کوتاہی، خدا کی چارہ سازی، اور انسان کی درماندگی خدا کی توصیف اور انسان کی تحقیر کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ دورِ جاہلیت کی عربی شاعری میں کچھ ایسے آثار پائے جاتے ہیں۔ جو "حمدیہ شاعری" کی نشاندہی کرتے ہیں۔ زید بن عمرو بن نفیل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ؎

عبادك يخطئون لانت رب   بكفيك المنايا والحتوم

(یعنی تو پروردگار ہے۔ سب لوگوں کا بادشاہ ہے۔ موتیں اور فیصلے تیرے ہی قبضہ میں ہیں)

أربّاً واحداً ام الف رب   ادين اذا تقسمت الامور

تركت اللات والعزىٰ جميعا   كذالك يفعل الرجل البصير

(یعنی میں ایک پروردگار کو مانوں یا ہزار کو جب کاموں کی تقسیم ہو، میں نے لات و عزیٰ

سب کو چھوڑ دیا۔ سمجھدار آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے)

ملاءِ اعلیٰ اور حاملینِ عرش کا ذکر بھی اس دور کی شاعری میں خوب ہوا ہے۔ امیہ بن ابی الصلت کے تین اشعار یہاں بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

رجل وثور تحت رجل یمینہ — والنسر للاخری ولیث مرصد

والشمس تطلع کل آخر لیلۃ — حمراء یصبح لونہا یتورد

تأبی فما تطلع لنا فی رسلہا — الا معذبۃ والا تجلد

(یعنی آدمی اور بیل اس کے دائیں پاؤں کے نیچے ہیں۔ اور کرگس ایک پائے کا اور شیر دوسرے پائے کا محافظ ہے)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے امیہ کے اس شعر کو سن کر فرمایا تھا کہ اس نے سچ کہا ہے، اور اس کے بعد امیہ کے یہ اشعار ۔ع والشمس تطلع . . . . الخ پڑھے۔ جن کا مطلب ہے: "سورج ہر رات کے ختم ہونے کے بعد صبح کو سرخ اور گلابی رنگ کا نکلتا ہے۔ وہ خوشی سے ہمارے لیے طلوع نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ معذب ہو کر اور تازیانہ کھا کر آتا ہے (یعنی خدا کی قدرت سے مغلوب رہتا ہے)۔

حضرت حسانؓ بن ثابت الانصاری (م ۵۴۰ء)۔ مشرف باسلام ہونے پر اللہ کی حمد اور اس کی بڑائی یوں بیان کرتے ہیں۔

وانت الٰہ الخلق ربی وخالقی — بذلک ما عمرت فی الناس اشہد

تعالیت رب الناس عن قول من دعا — سواک الٰہا انت اعلیٰ وامجد

لک الخلق والنعماء والامر کلہ — فایاک نستہدی وایاک نعبد[1]

---

[1] بحوالہ۔ عربی میں نعتیہ کلام (مرتبہ عبداللہ عباس ندوی)، لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۲۵۔

"اور ساری مخلوق کا معبود میرا رب اور خالق ہے، ہم زندگی بھر اس کی شہادت دیتے رہیں گے۔ سارے جہاں کے رب تیری بڑی شان بڑی ہے، اور تو بلند ہے۔ اس شخص کے دلوں سے جو تیرے سوا کسی اللہ کو پکارتا ہے تو بہت بلند اور بڑائیوں والا ہے حیات بخشی اور نفع رسانی اور ساری حکمرانی صرف تیری ہے، ہم تجھ ہی سے ہدایت مانگتے ہیں۔ اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔"

خدا کے متعلق اس طرح کا تصور جدید عربی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے، العصبۃ الاندلسیۃ" تحریک سے وابستہ امریکہ کے عربی شعراء توحید یہ زمزمہ خوانی میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ اس تحریک کا مقصد عربی ادب کے قدیم خزانوں سے بے تعلقی اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ نئی زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ایک فکری ماحول کو کامیابی کے ساتھ عربی میں جنم دینا ہے۔

جہاں تک فارسی زبان و ادب کا تعلق ہے، تو اس میں حمدیہ نغموں کا سراغ اوستا سے ملنے لگتا ہے، اس مقدس کتاب کے تمام اجزا "یسنا" "ویسپرد" (Visuparo) وندیداد۔ یشت اور خردہ اوستا میں خدائے بزرگ و برتر اہورامزد، ایزدون اور فرشتوں کی حمد و ثنا، پاکی و سچائی، نیکوکاری اور سعی عمل کی تعریف ہے، اور دیوؤں، اہرمن، جھوٹ، خیانت اور فریب کی برائی بیان ہوئی ہے۔

فارسی زبان کو جب عروج حاصل ہوا۔ تو مذہبیات سے اس کا دامن بھر گیا۔ چنانچہ قدیم فارسی شعراء میں شیخ فضل اللہ ابوسعید ابوالخیر (م ۵۴۰ھ ۱۱۵۵ء)، عراقی، سعدی، رومی، اور جامی جیسے مشہور شعراء نے بڑے بلند پایہ حمدیہ شعر لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ابوالخیر کی ایک حمدیہ رباعی ملاحظہ ہو۔

حق تعالیٰ کہ مالک الملک است　　　　لیس فی الملک غیرہ مالک

ملے را ساند بیلٹ دگر مارا　　انہٗ قادر علے ذالک[1]

رودکی (م ۳۲۹ھ ۹۴۰ء) نے حمد کے سلسلہ میں جو شعر کہے ہیں وہ ضرب المثل کا حکم رکھتے ہیں۔ ایک شعر دیکھئے۔

خود ثنا گفتن ز من ترک ثنا است　　کیں دلیل ہستی و ہستی خطا است[2]

خدا کی ہستی کے سامنے ہماری ہستی ہی کیا ہے۔ چنانچہ رودکی کا یہ کہنا کس قدر معنی خیز ہے کہ اے خدا اگر میں تیری تعریف کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا بھی وجود ہے، لیکن تیری ہستی کے سامنے میری ہستی کا تصور ہی غلط ہے، چنانچہ میں اگر تیری تعریف کرنے لگوں تو یہ بات تعریف کے بالکل ضد ہو جائے گی۔ یہ ان کا دوسرا شعر بھی کیا تیور رکھتا ہے۔

اے خدا از فضل تو حاجت روا　　با تو یاد ہیچ کس بنود روا[3]

اے خدا تیری یاد کے ساتھ کسی اور کی یاد کرنا جائز و مناسب نہیں تیرے ہی فضل سے حاجت روائی ممکن ہے۔

عراقی (م . . . .) نے بھی عنایت الٰہی سے دستگیری کی دعا کس موثر اور لطیف پیرائے میں کی ہے۔

راہ یار یکست و شب تاریک و مرکب لنگ و پیر

اے سعادت رخ نما ای دای عنایت دستگیر

زآفتاب مہر خود حمد مرا نورے بخش

تا چو ذرہ در فضائے حمد تو یابم مسیر

---

[1] ابوسعید ابوالخیر (مرتبہ آقائے م۔ ا۔ رازی) "تاثرات"۔ لاہور۔ ص ۹۶۔

[2] رودکی (مرتبہ تملذ حسین)، مراۃ المثنوی۔ حیدرآباد ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء۔ ص ۳۰۵۔

[3] ایضاً۔

کے بود کز نورِ تو روشن شود تیرہ دلم؟

کے بود ز آید شبِ بیچارۂ خود را حقیر

از ہوائے خود بفریادم، اغثنی یا مغیث

در پناہِ لطف افتادم، اجرنی یا مجیر[1]

اب رہے مولانا عبدالرحمٰن جامی (م ۸۹۸ھ ۱۴۹۲ء) تو انھوں نے بھی اللہ رب العزت

حمد و ثنا بڑے دل نشین انداز میں کی ہے۔

حمدِ خدا نیست کہ از کلکِ کن بر ورقِ باد نوید سخن

نطق و ثنایش چہ تمناست این عقل و تمنایش چہ سوداست این

رشتۂ فکرش کہ بود پر گہر پر بود این جا ز گرہ سر بسر

می دہد این رشتہ ز سبحہ نشان صد گرہ افتادہ در و ہر سان[2]

عربی و فارسی کی طرح ہی اردو کے شعری سرمایے میں حمدیہ شاعری کو خاص مقام حاصل ہے۔ شعرائے اردو نے اپنے عقیدت و ایمان کے گلہائے معطر حمدیہ اشعار کی لڑیوں میں پرو کر باری تعالیٰ کے اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنہ کے گیسوہائے معنبر سجائے ہیں۔ خدائے عز و جل کی تحمید کے یہ نقش ہائے دلپذیر اور ثنا و توصیف کے یہ درہائے بے نظیر شعری پیکر میں ڈھل کر ادبی سرمایے میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کی طرح ہی حمدیہ و نعتیہ شاعری کے سلسلے میں بھی اردو شعرا نے ایرانی شعرا کے اس قبیل کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھا لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ ان کے تخیل نے دیگر اصناف کی طرح اس صنف میں بھی اپنے ہی دلی جذبات کی اپنے مخصوص انداز میں ترجمانی کی ہے، بلکہ جا بجا ایرانی مذہبی روایات

---

[1] عراقی۔ (مرتبہ سعید نفیسی) کلیاتِ عراقی، تہران۔ ۱۳۳۸ ش، ص ۸۳۔

[2] جامی۔ تحفۃ الاحرار۔ نولکشور۔ لکھنؤ۔ ص ۱۴۔

ہٹ کر بھی کچھ باتیں لکھی ہیں۔

اردو شعراء اپنے دیوان کی ابتدا حمد سے کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے، اور آج بھی اکثر و بیشتر اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، برادرانِ وطن کے یہاں چونکہ معبود پرستی کا رجحان ہے۔ اس لئے انھوں نے بھی اس روایت کو اپنایا اور ایسی حمدیں لکھیں جن میں خالص اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔

اصنافِ شاعری میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی میں حمد و مناجات کا شمار ہوتا ہے۔ مثنوی نگار شعراء نے اس میدان میں اپنے فن کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کیا ہے، چنانچہ پندرہویں صدی عیسوی کی پہلی مستقل تصنیف نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" اور میرانجی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء) کی تصانیف میں حمدیہ ترانوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سولھویں اور سترہویں صدی میں اشرف کی "نوسرہار" مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" ابن نشاطی کی "پھولبن" غواصی کی "مینا ستونتی" اور "طوطی نامہ" نصرتی کی "گلشنِ عشق" اور "علی نامہ" اور فائز کی "رضوان شاہ و روح افزا" میں حمدیہ اشعار کی وافر مقدار موجود ہے۔ شمالی ہند کے شعرائے متقدمین اور متوسطین کی مثنویوں میں حمدیہ شاعری پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اور دورِ جدید کے شعراء کے یہاں بھی حمدیہ نغمے مل جاتے ہیں۔ صوفی شعراء نے حمد کے علاوہ دلکش مناجاتیں بھی لکھی ہیں۔ خدا کے تصور کی فلسفیانہ توضیح کرنے والی نظمیں بھی اردو شاعری کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ایسی نظمیں لکھنے والوں میں علامہ اقبال (م ۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء) کا مقام بلند تر ہے۔ اس طرح اردو کی حمدیہ شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اولاً شرعی حمد ۔ جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور قدرتِ کاملہ کی تعریف پر مشتمل ہے۔

ثانیاً ۔ فلسفیانہ حمد ۔ اس میں عجمی و اسلامی فلسفے کو بنیاد بناکر کہی گئی حمدوں کا شمار ہوتا ہے اور

ثالثاً ۔ متصوفانہ حمد ۔ اس میں صوفیانہ طرز استدلال کی حامل حمدوں کا شمار ہوتا ہے جن میں تخاطب کا

انداز عاشقانہ بھی ہے، اور معشوقانہ بھی۔

ذیل میں حمد کی ان تینوں قسموں کا سرسری جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

شرعی حمد | جہاں تک شریعت اسلامیہ میں حمد کے مقام کا تعلق ہے۔ تو ہمارے شعراء نے قرآن و احادیث سے اس میں سرمو انحراف نہیں کیا۔ الہ العالمین کی ذات و صفات اور اس کی قدرت کاملہ کا بیان کرتے ہوئے اردو شعراء نے قرآنی نکات اور حدیث میں بیان کردہ ارشادات کو اپنی شاعری میں کلی طور پر برتا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ خدا کی حمد و ثنا بیان کرتے وقت بعض اشعار قرآنی آیات کے مطالب سے اتنی مطابقت رکھتے ہیں کہ محسوس ہونے لگتا ہے، گویا یہ کسی آیت قرآنی کا منظوم ترجمہ ہیں۔

شرعی اعتبار سے لفظ "اللہ" خدا کا اسم ذات ہے۔ قرآن و احادیث میں متعدد جگہ اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "اللہ لا الہ الا ھو"، "اللہ واحد القہار" وغیرہ۔ اسی اسم ذات کے تحت خدا کے جملہ صفات آتے ہیں، جنھیں "اسماء الحسنیٰ" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ صفات تو ذاتی ہیں اور کچھ فاعلی۔ مثلاً "الاحد" اللہ کی صفت ذاتی ہے۔ تو "الرزاق اور الجبار" وغیرہ صفت فاعلی، ہمارے شعراء نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو مختلف طور پر اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے باعتبار موضوع اگرچہ حمدیہ شاعری محدود محسوس ہوتی ہے، لیکن انداز بیان اور خیالات کے تنوع نے اسے بہت زیادہ وسعت بخشی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی "صفت رحیمی" ہی کو لیجئے کہ ہر شاعر نے اسے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔

ناسخ کہتے ہیں۔ ؎

نہیں حساب ہے جس طرح اس کی رحمت کا ‏ یوں ہی ہمارے گناہوں کا بھی شمار نہیں[۵]

یقیں کو تو پختہ یقین ہے کر۔ ؎

---

[۵] ناسخ (مرتبہ رشید حسن خاں)، انتخاب ناسخ، دہلی ۱۹۷۲ء ص ۲۰۵

ہیں دوزخ سے اتنا مت ڈراؤ اہد کہ ظاہر ہے

خدا ایسا ستم کب اپنے بندوں پر روا رکھے[1]

اور میرؔ نے تو واعظ سے صاف صاف کہہ دیا۔ سہ

خیال چھوڑ دے واعظ تو بے گناہی کا	رکھے ہے شوق اگر رحمت الٰہی کا[2]

دیاشنکر نسیمؔ "حمد باری" کو "ثمرۂ قلم" سمجھتے ہیں۔ ان کی حمدیہ شاعری میں گہری عقیدت اور اخلاص پایا جاتا ہے، لالہ نانک چند کھتری لکھنوی بھی حمد باری تعالےٰ میں سرشار نظر آتے ہیں، یقین میں ڈوبے ہوئے یہ حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

حشر میں جب مرے اعمال تلے اے نانکؔ	تو گراں رحمتِ معبود کا پلہ نکلا

اور

اپنی رحمت سے کیا تھا تو نے مجھ کو سرفراز	کیا حقیقت تھی مری، میں ایک مشتِ خاک تھا

حالیؔ اللہ کی رحمتِ بے پایاں سے ناامید نہیں ہیں۔ کیونکہ ۔

دیکھا ہے ہم نے عالمِ رحمت کو غور سے	ہے شش جہت میں قحط دلِ ناامید کا

شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں	انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر	"لا تقنطوا" جواب ہے "ھل من مزید" کا

جدید ترقی پسند اور اشتراکی رجحان رکھنے والے شعراء بھی اللہ تعالےٰ کی رحمت کا یقین رکھتے ہیں۔ وقار خلیل کی یہ حمدیہ نظم قابلِ غور ہے۔

---

[1] یقینؔ (مرتبہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ) دیوان یقینؔ، علیگڈھ سنہ ۱۹۳۰ء ص ۲۳

[2] میرؔ۔ کلیات میر (جلد اول) رام نرائن لال بینی مادھو۔ الہ آباد۔ سنہ ۱۹۷۲ء ص ۲۲۹ دیوان پنجم

[3] الطاف حسین حالیؔ (مرتبہ۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) کلیات حالیؔ جلد اول لاہور سنہ ۱۹۶۸ء ص ۵۰

وہ پہلا حرف، جو گنجینۂ اسرار عالم، بسر معنی ہے وہی تو ابتدا و احساس حرکت اور حرارت ہے
وہ بینا ہے، وہ دانا ہے وہ سرچشمۂ رحمت کا تجلّی ہی تجلّی ہے، تبسم ہی تبسم ہے
وہی باقی ہے، سب فانی اسی کے ذکر کو ترسیل کا ابلاغ کہتے ہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں، جو شرعی حمد کے ضمن میں دی گئیں۔ اب آئیے فلسفیانہ حمد پر غور کریں۔

فلسفیانہ حمد: تصوّرِ اللہ فلسفے کا دلچسپ اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ مابعد الطبعی تفکرات کی عقدہ کشائی کے لیے اہلِ فلسفہ ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں۔ ان کے پاس دلیل و برہان کے بغیر تحقیق کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اُس "مافوق الفطری ہستی" کے تعلق سے ان کے یہاں جتنی موشگافیاں پائی جاتی ہیں اتنی اور کہیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے خدا کی ذات کی تحقیق کے لیے ریاضیات، طبیعیات، منطقیات اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر مباحثہ کرکے اور اپنے دلائل و براہین پیش کرکے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کیں۔

عجمی فلاسفہ میں فیثاغورث اور کائنس نے ریاضیاتی نقطۂ نظر سے اللہ کی وحدانیت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، ان کا خیال تھا کہ جسطرح تمام اعداد ایک عدد یعنی وحدت سے نکلے ہیں، اسی طرح اللہ بھی ایک ہے جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے یہی وحدتِ مطلقہ ہے۔ اردو کے دکنی شاعر مختار اور صوفی شاعر امجد حیدرآبادی نے اپنے حمدیہ اشعار میں اسی فلسفیانہ نکتے کی وضاحت کی ہے۔ مختار کہتے ہیں:

احد ہے ولی دو عدد کا نہیں عدد کا احد اس کے حد کا نہیں
دلے دو عدد میں ہوا ہے ظہور عدد ہور احد سب اسی کا ہے نور[۱]

امجد کی یہ رباعی بھی ملاحظہ کیجئے۔

ذرّے ذرّے میں ہے خدائی دیکھو ہر بت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو

---

[۱] مختار۔ معراج نامہ (قلمی)، ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد۔ ورق ۱۔ ب

اعداد تمام مختلف ہیں باہم ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

اس رباعی کی شرح خود حضرت امجد نے یوں بیان کی ہے۔

"۲ مجموعہ ہے ۱+۱ کا اور ۳ مجموعہ ہے ۱+۱+۱ کا قس علیٰ ہذا۔ اکائی ہر عدد میں موجود ہے اور (۱) خود عدد نہیں ہے کیونکہ عدد حاشیتین کے مجموعہ کو کہتے ہیں جیسے (۲) اس کا ایک حاشیہ (۱) ہے اور دوسرا حاشیہ (۳)۔ (۱) اور (۳) کا مجموعہ (۴) اور (۴) کا نصف (۲) ہوتا ہے۔ فافہم۔"[1]

طبیعیاتی بنیادوں پر بھی بعض فلاسفہ نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی محمد ابن محمد ابن یعقوب الملقب ابن مسکویہ (م ۱۰۳۰ء) نے ارسطو کی تقلید کرتے ہوئے محرک اولیٰ یا علت العلل کا نظریہ پیش کیا، جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ کائنات کی تمام چیزیں متحرک اور تغیر پذیر ہیں۔ لہٰذا ان کا ایک محرک اولیٰ بھی ہے، جو غیر متحرک ہے۔ اور یہی خدا ہے۔ غالب کا یہ شعر اسی نظریہ کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔[2]

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اسی طرح برگساں کے نظریہ استدام یا فلسفۂ زماں میں بھی طبعی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ برگساں کا یہ نظریہ مشہور حدیث "لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ" سے مطابقت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی نظریہ کو قرآن کے اختلاف لیل و نہار سے ملا کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ اقبال جہاں یہ کہتے ہیں۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

وہاں ع نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ" کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔

---

[1] سید حسین احمد۔ رباعیات امجد۔ جلد اول۔ طبع نجم حیدرآباد۔ ص ۳۰ [2] غالب۔ دیوان غالب ایوان ایڈیشن۔ الہ آباد۔ ص ۱۰۹۔

اختر الایمان۔ کے یہاں بھی وقت کے تصوّر کو خدا سے جوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اپنے مجموعہ کلام "بنت لمحات" کے پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں۔

"میری ان نظموں میں "وقت" کا تصور اس طرح ملتا ہے جیسے یہ بھی میری ذات کا ایک حصّہ ہے . . . . کبھی یہ گذرے ہوئے وقت کا علامیہ بن جاتا ہے، کبھی خدا بن جاتا ہے، . . . . یہ تصوّر "ماِیا" کا تصور ہے۔ "فنا" کا . . . . . . یہ ایک زندہ و پائندہ ذات ہے جو "انت" ہے۔"[1]

منطقیاتی زاویۂ نظر سے بھی فلسفیوں نے دلائل کی جانچ پرکھ کر کے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ کتب السیر میں امام فخرالدین رازیؒ کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ امام رازی کا کسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت کے پاس سے گذر ہوا۔ وہ چرخہ اپنے سامنے رکھ کر کسی خیال میں غرق تھی۔ امام رازی کے پوچھنے پر وہ بوڑھیا چونک پڑی اور کہنے لگی کہ میں غور کر رہی ہوں کہ آخر میرا چرخہ کیوں نہیں چلتا۔ امام رازی نے اپنے ہاتھوں سے اس چرخہ کو گھمایا اور چرخہ چلنے لگا۔ اتنے میں بوڑھیا کو شرارت سوجھی اور اس نے چپکے سے چرخے کو دوسری سمت گھمایا جس کی وجہ سے چرخہ رک گیا۔ امام رازی نے جو طاقت لگائی تو چرخہ ٹوٹ گیا۔ انھیں بڑا افسوس ہوا۔ لیکن بوڑھیا کہہ اٹھی کہ چرخہ ٹوٹ گیا ہے تو بن جائے گا۔ لیکن اس چرخے نے ایک پیچیدہ مسئلہ حل کر دیا ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر اس کائنات کے چرخے کو دو خدا چلاتے تو دونوں کی کشاکش اور زور آزمائی میں یہ چرخہ ٹوٹ جاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم کی حسب ذیل آیت میں اس نظریہ کی وضاحت اس طرح ملتی ہے۔

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ　　　　اور اس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ کوئی اور

---

[1] اختر الایمان:۔ بنت لمحات۔ بمبئی ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۵۔

كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (مومنون ۔ ۵) (معبود نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو ساتھ لے لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے۔)

اردو شعرا نے خدا کے متعلق اس منطقیانہ نکتے کی وضاحت اپنے اشعار میں نہایت عمدگی سے کی ہے، اسمٰعیل میرٹھی کا یہ شعر بطور مثال پیش خدمت ہے۔

سخت فتنہ جہان میں اٹھتا　　　کوئی تجھ سا تیرے سوا نہ ہوا[۵۱]

ایمونل کانٹ نے اخلاقی بنیادوں پر خدا کے وجود کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی اس کا نظریہ مشہور حدیث "تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ" سے مطابقت رکھتا ہے، اس نظریے کی وضاحت بھی اردو شعرا نے مختلف پیرائے میں کی ہے مثلاً علامہ اقبال اپنی نظم "مدنیت اسلام" میں رقمطراز ہیں۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے　　　یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال　　　عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں[۵۲]

"خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات" کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔

قہاری و غفاری، قدوسی و جبروت　　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

یہ چار عناصر صفاتِ مولا اگر "خاکی و نوری نہاد" بندے میں آجائیں تو پھر مومن بندے کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ ع

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نے خدا کے متعلق تمام فلسفیانہ استدلال و نظریات میں "ایمان" کا عنصر ملا کر "فلسفہ الٰہ" کو قرآنی تصور الٰہ سے جوڑ دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے

---

۵۱ اسمٰعیل میرٹھی۔ کلیات اسماعیل میرٹھی ۱۹۱۰ء ص ۴۰۴
۵۲ اقبال (علامہ) کلیات اقبال (ضرب کلیم) پرویز بکڈپو۔ دہلی۔

ہمہ جہتی پہلو نکال کر اپنی حمدیہ شاعری کو چمکایا ہے۔

متصوفانہ شاعری | حمدیہ شاعری کی تیسری قسم ہمارے نزدیک متصوفانہ حمد ہے۔ جس طرح فلسفے نے دماغ کے سہارے خدا کی کھوج کی ہے۔ اسی طرح تصوف میں "قلب" یا "دل" کے سہارے خدا کو تلاش کیا جاتا ہے۔ جو زیادہ تر جذبات پر منحصر ہوتا ہے۔ تصوف کی بنیاد دراصل روحانیت پر ہے یہی روحانی علم ہندو عجم میں "ویدانت" اور باطنیت کے نام سے مشہور ہوا اور اسلام میں تصوف کے نام سے۔

صوفیوں کے یہاں اللہ تعالےٰ کے ذکر و اشغال کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مراقبہ میں خدا اور اپنی ذات پر غور و فکر کرایا جاتا ہے، تسبیحات و اوراد کی خاص طور پر مشق کرائی جاتی ہے۔ جسے روح کی غذا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غرض کہ اللہ کی بڑائی بیان کرنا، اس کی یاد کرنا اور اسی کے ذکر میں رطب اللسان رہنا، صوفیوں کے شعائر اور پاکیزہ عادات میں شمار ہوتے ہیں۔

باری تعالےٰ کا تصور صوفیوں کے یہاں تین طرح کا ملتا ہے۔ اس اعتبار سے صوفیا تین گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ ایجادیہ۔ وجودیہ اور شہودیہ۔ ایجادیہ کے نظریہ کے مطابق کائنات کی تخلیق "لاشے" سے ہوئی ہے۔ اس لئے خالق مخلوق سے جدا ہے۔ اس نظریے کے ماننے والے "ہمہ از اوست" کے قائل ہیں۔ انسان خدا کی مخلوق و محکوم اور خدا اس کا خالق و حاکم ہے۔ ایجادیوں کا کلمہ "لا معبود الا ھو" ہے۔ ان کے یہاں سالک روحانی سفر طے کرنے کے بعد بھی "انا عبدہ" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

وجودیوں کے یہاں کائنات میں بجز خدا کے کوئی نہیں ہے۔ خالق اور مخلوق کا جوہر ایک ہے، اس نظریہ کے مبلغ فرقۂ باطنیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ کہ "وجود حقیقی فقط ایک ہے اور وہ اللہ تعالےٰ ہے۔ اور باقی ہر وجود اس کا ظل ہے، جو اپنی بقا کے لیے اس پر منحصر ہے۔ لہٰذا ایک اللہ ہی واجب الوجود ہے۔ باقی ہر شے وجود ممکن۔ ہر وجود ممکن چونکہ عدم سے وجود میں آتا ہے، اس لیے وہ حادث ہے۔ اور ہر حادث قدیم یا حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وجود

ممکن حقیقی نہیں تو پھر وہ باطل ہوا۔ متکلمین نے قرآن کی روشنی میں اس اشکال کو اس طرح دور کر دیا کہ۔

"وجودِ ممکن نہ تو حقیقی ہے نہ باطل بلکہ موجود بالحق، یا قرآن کی اصطلاح میں تخلیق بالحق ہے"

خدا کے وجود کا یہی نظریہ "وحدت الوجود" کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے حامی "لاموجود الاھو" کا کلمہ بلند کرتے ہیں۔ یہی کلمہ تصوف کی زبان میں "ہمہ اوست" کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے تحت خدا اور انسان میں وہی نسبت سمجھی جاتی ہے، جو قطرہ اور دریا میں ہے۔ یا حباب اور پانی میں ہے۔ وحدۃ الوجودی نظریے کے مطابق عشق۔ عاشق اور معشوق تینوں ہی ایک ہیں۔ ان کے یہاں عشق کی آخری منزل میں طالب و مطلوب کا تعلق۔ ؏

من تو شدم، تو من شدی من تن شدم، تو جان شدی

کا ہو جاتا ہے۔ سالک ہمیشہ "خدا" کے وصل کا خواہاں "فراق" کے احساس سے تڑپتا رہتا ہے۔ اس نظریے کے مبلغین میں ذوالنون مصری (م ۲۴۶ھ/۸۵۹ء)، بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ/۸۷۴ء)، ابو سعید خراسانی (م ۴۴۰ھ/۱۰۴۹ء)، محی الدین ابن العربی (م ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) اور الجیلی (م ۸۳۳ھ/۱۴۲۸ء) کافی مشہور ہوئے۔ اس نظریے کو عوام الناس سمجھنے میں قاصر رہے، اور بعض دینی گمراہی کا شکار ہو گئے، اس لیے علماء کے ایک طبقہ میں اس کی برابر مخالفت ہوتی رہی۔ اس نظریے کے مخالفین میں شیخ رکن الدین۔ علاء الدولہ نے بغداد میں اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے ہندوستان میں شہودیہ دبستانِ خیال کی بنا ڈالی تھی۔ وحدۃ الوجودی نظریے کے رد میں ان لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ "عالم دما فیہا آئینہ کے مانند ہے جس میں صفاتِ الٰہی کا عکس نظر آتا ہے"۔ سالک کو تمام موجودات میں ذاتِ الٰہی نظر آتی ہے۔ اور وہ ایک خدا کا مشاہدہ ان چیزوں میں کرتا ہے۔ خدا کا غیر ان کے یہاں معدوم ہے، خدا کے متعلق اس طرح کا تصور شہودیہ نظریہ کی اساس ہے۔

تصوف میں خدا کے متعلق ایک اور نظریہ ہے۔ اس کی رو سے خدا کو

لہ ارمغان مالک ۔ فارابی کا نظامِ فکر جلد دوم دہلی ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۱۲۔

(۱) حقیقتِ انتہائی سمجھا گیا ہے۔

(ب) اس حقیقتِ انتہائی کو "جمال" یہ حسنِ ازلی قرار دیا گیا ہے۔

(۳) یہ حقیقتِ انتہائی ہی "نورِ اولیٰ" یا "نورِ مجرد" بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تعلق سے تصوف کے ان نظریات کی توضیح اردو کی حمدیہ شاعری میں نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ اردو شعراء نے چونکہ مندرجۂ بالا میں سے کسی خاص نظریہ ہی کو اپنی حمدیہ نظمیں کا محور نہیں بنایا۔ بلکہ اکثر و بیشتر ان کے یہاں ایک ہی حمد میں تمام نظریات کے حامل اشعار بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اردو کے ان شعراء کو ہم ایجادیہ، وجودیہ یا شہودیہ وغیرہ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ تاہم ان نظریات کی توضیح کرنے والے چند حمدیہ اشعار ہم بطورِ مثال ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

(ایجادیہ) (۱) تیرے نسیمِ لطف سے گل کو شگفتگی
وابستہ تیرے حکم پہ چلنا نسیم کا (کلیاتِ شیفتہ ص۱)

(۲) تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی، کیا آسماں بنایا
پاؤں تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی
اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا
مٹی سے بیل بوٹے کیا خوشنما اگائے
پہنا کے سبز خلعت ان کو جوان بنایا (کلیاتِ اسمٰعیل میرٹھی ص۲۴)

(وجودیہ) (۱) دیکھ تو کثرت میں وحدت کو ذرا
سو مقاموں میں یہ چھائی ہے ہوا
(میر حسن، رموز العارفین ص۳)

(۲) موجود اگرچہ نام خدا وہ کہاں نہیں — پس پر بھی آہ یاں تو کسو پہ عیاں نہیں
(دیوانِ اثر صفحہ ۲۰۵)

(۳) دل ہر قطرہ سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
(دیوانِ غالب ایوان ایڈیشن صفحہ ۲)

(۳)
(شہود) (۱) جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
(دیوانِ درد صفحہ ۱۹)

(۲) ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت

یاں بھی شہود تیرا، واں بھی حضور تیرا (ایضاً صفحہ ۱۳)

(۴)
(خدا بحیثیت حسنِ ازلی) الف (۱) حسن تیرا ہوا ہے عالمگیر

جم ہے نے آج نا سکندر ہے (دیوانِ فائز صفحہ ۲۱)

(۲) محو دیدار ترے حسن کے ہو جاتے ہیں

تاب آئینے تجھے دیکھ کے کب لاتے ہیں (دیوانِ عشق اورنگ آبادی صفحہ ۶۳)

(ب)
(نور راولی) (۱) تاباں ہے اس نگاہ سوں مج دل میں نور آج

جس نور میں ہوا ہے ہر اک کوہ طور آج (انتخابِ حاتم صفحہ ۱۱۹)

(۲) مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا

جوں شمع سراپا ہو اگر حرفِ زباں کا (انتخابِ سودا صفحہ ۳۴)

آخر میں یہ کہنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اردو کی حمدیہ شاعری جلال وجمال کی حامل، نشاط وانبساط اور کیف وسرور کی شاعری ہے، جو عقیدت و ایمان کے لحاظ سے نہ صرف بصیرت افروز ہے، بلکہ عشق کے والہانہ جذبات کی صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قاری کے دل کی تاریک گہرائیوں میں سرور و کیف کی شمعیں روشن کر دیتی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این۔ پی ۴۳ فروری ۱۹۹۰ء

اُردو کی حمدیہ شاعری میں فلسفیانہ رجحان

از

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط دروہا۔

"حمد ثنائے جمیل ہے"۔ اس ذاتِ محمود کی جو خالقِ سماوات والارض ہے جس کی کارفرمائی کے ہر گوشہ میں رحمت وفیضان کا ظہور اور حسن وکمال کا نور ہے پس اس مبدٔ فیض کی خوبی و کمال اور اس کی بخشش و فیضان کے اعتراف میں جو بھی تحمیدی و تمجیدی نغمے گائے جائیں گے ان سب کا شمار حمد میں ہوگا۔ حمد دراصل خدا کے اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ کی تعریف ہے" یہ معرفت الٰہی کی راہ میں بندۂ خدا کا پہلا تاثر ہے"[1]

تصور الٰہ فلسفے کا دلچسپ اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ فلاسفہ اس دائم و قائم بالذات ابدالآباد سرورِ کل ہستی کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں لیکن اس کے حصول میں انہیں ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ یہ بہر کیف وجود ماوریت سے مابعد الطبیعیات کی طرف لیجاتی ہے، جہاں وجدان کے بجائے عقل محض پر تکیہ ہوتا ہے اور بغیر دلائل و براہین کے تحقیق کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس لیے فلسفیوں کے یہاں خدا کی ذات کے متعلق جتنی موشگافیاں پائی جاتی ہیں اتنی اور کہیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے خدا کے وجود کو ریاضیات طبیعیات اور منطق و اخلاق کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو کو کوئی فلسفی شاعر نصیب نہیں ہوا۔ تاہم اردو شعراء اکثر و بیشتر اپنے اشعار میں بڑی خوبی سے فلسفیانہ خیالات پیش کرتے رہے ہیں جو یا تو کسی فلسفی کے نتیجۂ فکر سے مطابقت رکھتے ہیں یا پھر مستعار خیالات شعری پیکر میں ڈھال لیے جاتے ہیں۔ اردو کی حمدیہ شاعری میں اس قبیل کے سیکڑوں اشعار مل جاتے ہیں جن میں تصور الٰہ کی توضیح کسی نہ کسی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ چنانچہ میر دردؔ کا یہ کہنا ؎

یارب! یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار، آپ سے باہر نہ جا سکے[۲۱]

معرفت الٰہی میں شاعر کی درماندگی اور عاجزی کا مظہر ہے۔ مقام معرفت کی ابتدا اور انتہا دونوں سروں پر بندہ جو کچھ جان چکا ہوتا ہے وہ عقل و فہم کے تحیر اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے عرفان و بصیرت کے دعویداروں کو بھی بالآخر اس راہ میں گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اور بے ساختہ ان کی زبان پر یہ کلمات جاری ہو جاتے ہیں ع

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اور اپنی نارسائی فہم کا اقرار کرتے ہوئے وہ کہہ اٹھتے ہیں "رَبِّ زِدْنِی فِیْكَ تَحَیُّرًا" اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوندا! اپنی ہستی میں ہمارا تحیر بڑھا۔ معرفت الٰہی میں عجز و حیرت کی انتہا بے خودی یا بے خبری ہے، جہاں پہنچ کر سالک (بندہ) "تو" اور "میں" دونوں بھول جاتا ہے۔ سراج اورنگ آبادی (م ۱۷۶۳ء) کا معرفت الٰہی میں استعجاب و حیرت ملاحظہ کیجیے ؎

خبر! اے تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی[۳۱]

اس کی مثال ہمیں شارن (CHARRON) کے فلسفے میں بھی ملتی ہے۔ وہ لاادریت (AGNOSTICISM) کا قائل تھا اور ذات الٰہی میں تجسس کے مقابلے میں اسے تسلیم کر لینے اور مان لیے جانے پر زور دیتا تھا۔ گویا تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ (اللہ کی مخلوقات

ومصنوعات میں غور کرو اور اس کی ذات میں نہ غور کرو یہ اس کا ایمان تھا۔ وہ خدا کو لامحدود اور انسانی فہم سے وراء الوراء سمجھتا تھا۔ شاآن کے اسی خیال کا پرتو اکبر الہٰ آبادی کے اس شعر میں دکھائی دیتا ہے ؎

ذہن میں جو گھر گیا، لاانتہا کیونکر ہوا ۔ جو سمجھ میں آگیا، پھر وہ خدا کیونکر ہوا![۳۰] (الف)

ناقابل تحدید الوہیت کے اس نظریہ کو اکبرؔ نے عام فہم انداز میں پیش کر دیا اور فلسفے میں ذات اللہ کے متعلق جو تشکیک مثبت کا رجحان پایا جاتا ہے اس کی توضیح اس شعر میں سیدھے سپاٹ انداز میں کر دی جس کی وجہ سے یہ ادق مسئلہ نہایت سہل ہو کر رہ گیا۔ میرؔ نے بجائے "کنہ ذاتِ الٰہ" میں اپنی خرد کی حیرانی اور پشیمانی کا ذکر کیا ہے۔

خرد کنہ میں اس کی حیران ہے ۔ گماں یا پریشاں پشیمان ہے[۳۱]

حیرانی کیوں نہ ہو؟ کہ ذات الٰہ کے بارے میں انسان جو کچھ جانتا ہے اور جان سکتا ہے وہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" لفظ الٰہ کے مصدر "آلہ" کے معنی تحیر اور درماندگی کے بھی بتائے جاتے ہیں۔ پس ذات الٰہ میں میرؔ کی خرد کی پشیمانی مقتضائے فطرت ہے۔

شاہ نیازؔ بریلوی نے تو اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور ماہیت "پرے از سرحدِ امکان" ہونے سے اپنا "دلِ آگاہ تنگ" ہو جانے کا اقرار کیا ہے ؎

امکان سے باہر ہے تری کنہ کا پایا ۔ ورنہ دلِ آگاہ میرا تنگ نہ ہوتا[۳۲] (ب)

شاآن کے برخلاف ڈیکارٹ ذاتِ باری کو وجدان کے ذریعہ سمجھنے کا قائل تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ

"اگرچہ ہم خدا کی لامتناہیت کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے کہ وہ فی نفسہ کیا ہے لیکن اس کی

لا تنا ہی حقیقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جیسے ہم ایک بڑے اور مضبوط پیڑ کو دونوں ہاتھوں
سے نہ گھیر سکنے کے باوجود اس کی مضبوطی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔"[۵]

اس طرح ڈیکارٹ عقل کے بجائے قلب کی گہرائیوں میں ذات باری کا تصور کرتا ہے وہ اثبات حقیقی کے لیے فکر پر احساس کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ افکار منطقی استنباط کے احساسات بالعموم وجدانی کیفیات کے تابع ہوتے ہیں۔ فکر یقین میں شک کا دروازہ کھول دیتا ہے اور احساس "یقین" کو "ایمان" کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے فکر عرفان ذات الٰہ میں رہبری نہیں کر سکتا اور احساس ذات الٰہ کی کنہ میں بندے کی معرفت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جیمس کالینس (James collins) نے اپنی کتاب (GOD IN MODERN PHILOSOPHY) میں ڈیکارٹ کے اسی نظریہ الٰہیت کو پیش کیا ہے جس میں خدا کی وجودیت کی توضیح بڑے نرالے انداز میں کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"اس حقیقت کی بنیاد پر کہ میں خدا کا تصور اس کے وجود کے بغیر کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وجود کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حقیقتاً موجود ہے۔ یہ نہیں کہ میرے خیال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، بلکہ خدا کے وجود کا تقاضہ یہ خیال میرے دل میں پیدا کرتا ہے کہ خدا ہے۔"[۶]

ڈیکارٹ کے نظریۂ وجودیت کا عکس اردو شعراء کے اشعار میں دکھائی دیتا ہے لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ڈیکارٹ کے نظریہ کو پڑھ کر ہمارے شعراء متاثر ہوئے ہیں۔ یا ڈیکارٹ کے فلسفیانہ خیالات سے انھوں نے خوشہ چینی کی ہے، بلکہ خدا کے متعلق تو یہ عام تاثر بندگانِ خدا کا ہے کہ وہ اسی طور پر برملا اور بے ساختہ خدا کے وجود کا اقرار کر لیتے ہیں۔ حالی نے اسی تاثر کو ذیل کے شعر میں پیش کیا ہے ؎

مانا نہیں جس نے تجھکو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں ہے کھٹکا تیرا[۳]

یہی فکر ہے کہ اکبر الہ آبادی نے اللہ کی ذات کا عرفان حاصل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے[۴]

الیقان کی اس منزل میں عقل عجز و درماندگی کے اندھیارے میں ٹھوکر کھاتی نظر آتی ہے اور دل نورالٰہی سے معمور۔ عقل کی تہی دامانی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ خدا جو رگ جان سے بھی قریب تر ہے اور جو "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ" کی گواہی دے وہ سمجھ میں نہ آئے۔ فہم و ادراک کی اس درماندگی اور شعور و دانش کی تہی مائیگی کی بدولت انسان حجاب ہائے ذات حقیقی کا کاشف نہیں بن سکا اور عقل کی نارسائی کے ساتھ ہی دیدۂ بینا کی کور بینی نظارۂ جمال حسن مطلق میں حائل رہی جس کی وجہ سے ہم نے اس ذات مشہود کو نامشہود اور نامستور کو مستور بنا لیا ہے۔ بھٹکے ہوئے دل میں جس خدا کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور نہ ماننے ہوئے بھی جس کا احساس دلوں میں گھر کر چکا ہے بھلا اس کے موجود ہونے میں کوئی تردد یا شک ہو سکتا ہے؟ اسی لیے تو نطشے جس نے اپنی کتاب (THUS SPAKE ZARDUSTHRA) (نغمۂ زردشت) میں خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا اور جس کے نزدیک الحاد ایک پُر لطف چیز تھی) داخلی بے قراری کا شکار ہو گیا تھا، محض اس لیے کہ وہ ملحد ہوتے بھی خدا پرست تھا۔ منکرین حق کا اس طرح کا ذہنی تذبذب بھی خدا کے وجود کا گویا مظہر ہوتا ہے۔ جگر نے اسی لیے بڑے طمطراق اور طنزیہ انداز میں ملحدین اور مجازیوں کو للکارا ہے ؎

مجازی سے جگر کہہ دو ارے وہ عقل کے دشمن
مقر ہو یا کوئی منکر خدا یوں بھی ہے اور یوں بھی[۵]

وجود حق کے بارے میں مذبذب ذہنیت کا ردِ عمل سوائے بیقراری کے اور کچھ نہیں ہو سکتا اور یہی بیقراری بالآخر یہ اقرار کرنے پر آدمی کو مجبور کر دیتی ہے کہ "خدا ہے"۔ گویا یہ خدا کی عظمت

وجبروت کی عظیم بالشان نشانی ہے جس کے آگے وہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اس کی یہ سجدہ ریزی خدا کے اقرار کا عملی نمونہ ہوتی ہے۔ احسان دانش نے اسی نکتے کو ذیل کے شعر میں پیش کیا ہے ؎

خدا وہ ہے کہ جس کی عظمت و جبروت کے آگے — خود انسان سجدہ کرنے کیلئے مجبور ہو جائے[۱]

مندرجۂ بالا فلسفیانہ نظریات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عقلیت کے مؤید فلاسفہ بھی کنہ خداوندی کی عقدہ کشائی میں برخلاف عقل، لاادریت یا عقل منفی پر تکیہ کرتے ہیں۔ عقل کی درماندگی کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی مثال ہو سکتی ہے؟ شاید یہی وجہ ہے کہ حکماء کو بھی بالآخر یہ کہنا پڑا کہ "خدا کی تعریف نہیں کی جا سکتی"۔ اور ان کا یہ کہنا ہی خدا کی بہترین تعریف ہے۔

فلاسفۂ قدیم نے وحدت خداوندی میں ریاضیات سے بھی استنباط کیا ہے۔ چنانچہ فیثاغورث اور کاسینس نے کائنات کی عددی تشریح کی تھی ان کا کہنا تھا کہ "جس طرح تمام اعداد "ایک" یعنی وحدت سے نکلے ہیں اسی طرح تمام کائنات کی اصل بھی وحدت ہے اور یہی وحدت "خدائے واحد" ہے۔ حضرت امجدؔ نے اپنی حمدیہ رباعی میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے ؎

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو — ہر بت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم — ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو[۲]

اس رباعی کی شرح خود حضرت امجدؔ نے کی ہے۔

"۲ مجموعہ ہے ۱+۱ کا اور ۳ مجموعہ ہے ۱+۱+۱ کا، قس علیٰ ہذا۔ اکائی ہر عدد میں موجود ہے اور (۱) خود عدد نہیں ہے۔ کیونکہ عدد حاشیتین کے مجموعے کو کہتے ہیں۔

جیسے (۲) اس کا حاشیہ (۱) ہے اور دوسرا (۳)۔ (۱) اور (۳) کا مجموعہ (۴) اور چار کا

نصف (۲) ہوتا ہے۔ فافہم"۔[۱۱]

جس طرح ایک ہر عدد میں موجود ہے اسی طرح خدا (جو واحد ہے) ہر ذرے میں موجود ہے۔ آیۂ کریمہ "وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ" (حدید، ۴) میں بھی یہی مطلب پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔ غرضکہ امجدؔ کی رباعی وحدۃ الوجودی نظریے کی مکمل عکاس ہے۔ علمائے ظاہر البتہ واحد حقیقی کو واحد عددی کی طرح نہیں جانتے چنانچہ میر عبدالواحد بلگرامی رقم طراز ہیں۔

"توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ واحد حقیقی ہے، وہ واحد عددی نہیں ہے کیونکہ واحد عددی قابلِ تجزی و تبعیض ہے اور واحد حقیقی تجزی اور تبعیض سے مبرا اور منزہ ہے۔ واحد عددی کی نسبت جملہ اعداد سے ہوتی ہے۔ مثلاً نصف الاثنین، ثلث الثلث اور ربع الاربع وغیرہ جس عدد کو فرض کرتے ہیں، وہ واحد عددی کا ایک جز ہوتا ہے یعنی اکائیوں میں سے اکائی۔ اس لیے اکائی کی نسبت جملہ اعداد سے ہوتی ہے اور واحد حقیقی کو اعداد سے کسی قسم کی نسبت نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہے کہ واحد عددی تمام اعداد میں شامل ہوتا ہے اس کے برعکس واحد حقیقی ان قسم کی نسبتوں سے منزہ اور پاک ہے"۔[۱۲]

دکنی کے قدیم شاعر مختارؔ کے یہاں اسی خیال کا پرتو دکھائی دیتا ہے ؎

احد ہے وَلے دو عدد کا نہیں — عدد کا احد اس کی حد کا نہیں

وَلے دو عدد میں ہوا ہے ظہور — عدد بھور احد سب اسی کا ہے نور[۱۳]

مندرجۂ بالا دونوں مثالوں میں ریاضیاتی نقطۂ نظر سے کنہ خداوندی کی بحث کی گئی ہے۔ لیکن دونوں خیالات میں فرق نظر آتا ہے۔ اول الذکر شاعر امجدؔ نے اللہ کی وحدت کو

واحد عددی کے مشابہ مانا ہے۔ یہ تمثیل صوفیوں کے وحدۃ الوجودی نظریہ سے میل کھاتی ہے جس میں "ہمہ اوست" پر زور دیا جاتا ہے۔ وحدۃ الوجودی کے قائلین خالق اور مخلوق کا جوہر ایک مانتے ہیں اور عبد و معبود میں قطرہ و دریا کی سی نسبت تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں حضرت امجد نے ریاضیاتی اصول سے استنباط کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام اعداد باہم مختلف ہوتے ہیں ان میں "ایک" موجود ہے اسی طرح اعیان ثابتہ اور خارجہ بھی وحدت ہی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کثرت، وحدت ہی کی تفصیل ہے اور وحدت، کثرت کا اجمال۔ خارج اگر اعیانِ حق ہیں تو باطن وحدت حق لیکن اس عقیدے یا نظریئے کی رو سے "حلول" و "اتحاد" لازم آتا ہے۔ ذات حق میں تغیر و تبدل کا گمان ہوتا ہے اور واحد حقیقی زمظہر، قابل تقسیم و تجزیہ قرار پاتا ہے۔ اس طرح کا عقیدہ صریحاً "شرک فی الوجود" کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا اس خیال کے برعکس مختار نے وجود باری کے لیے ریاضیات ہی سے ایک الگ انداز میں استنباط کیا ہے۔ ماہیات (حقائقِ کونیہ) یا مخلوق، چونکہ نصِ قطعی سے غیر ذاتِ حق تسلیم کی گئی ہیں۔ "اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَتَّقُوْنَ" (نحل ۵۲) میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ ذات حق اور ذات حق قطعی طور پر من حیث الذوات ایک دوسرے کے غیر ہیں۔ ذوات خلق اعدام اضافیہ ہیں ان میں دائمیت ہے نہ استقلال۔ حدوث ان کا مقدر ہے۔ برخلاف اس کے حق تعالیٰ بالذات موجود ہے وہ ابدالآباد، قائم و دائم اور الحیی القیوم ہے اس لیے نہ واحد عددی (جس کا ذاتی وجود نہیں ہے) کی طرح واحد حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اس کی وحدت مطلقہ، قیاسی عدد میں مقید نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا (النساء ۱۲۶) اللہ تعالیٰ ہر شے پر محیط ہے۔ پس جو محیط مطلق ہو وہ کسی کی احاطت میں کیسے آسکتا ہے۔ پس ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ احد اور عدد میں اس کے نور کا ظہور ہے بقول دردؔ

خلق میں ہیں، پر جدا سب خلق سے رہتے ہیں ہم   تال کی گنتی سے باہر جس طرح روپک میں سم[۵]

موسیقی کی اصطلاح میں "روپک" ایک تال کا نام ہے۔ یوں تو تمام تالوں میں "سم" پر ضرب ہے لیکن روپک ہی ایسا تال ہے جس میں سم ہونے کے باوجود گنتی میں شمار نہیں ہوتا۔ اسی طرح ذات الٰہ تمام نسبتوں سے پاک ہے، وہ چونکہ لایتجزیٰ و لایتبعض ہے یعنی اسکے اجزا اور ٹکڑے نہیں ہو سکتے اس لیے ہندسی واحد سے اس کی کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔

طبیعیاتی بنیاد پر بھی بعض فلاسفہ نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونانی فلسفی ارسطو کی تقلید میں ابن مسکویہ (م ۱۰۳۰ء) نے "محرک اولیٰ" یا "علت العلل" کا نظریہ پیش کیا تھا، جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ کائنات کی تمام چیزیں متحرک اور تغیر پذیر ہیں۔ لہٰذا ان کا ایک محرک اولیٰ بھی ہے، جو غیر متحرک اور تغیر سے مبرا ہے۔ یہی خدا ہے۔ ہمارے شعراء نے اسی خیال کو اپنے حمدیہ اشعار میں مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً میر درد اس محرک اولیٰ کی ثنا خوانی کچھ اس طرح کرتے ہیں ؎

تحریک ہے یہ اس ید قدرت کی ورنہ کب   بے دست و پا صبا سے کوئی پات ہل سکے[۶]

یہاں اشارہ "لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ" (کوئی ذرہ بھی حکم خداوندی کے بغیر حرکت نہیں کرتا) کی طرف ہے۔ غالب کے اسی قبیل کے اس شعر میں بھی دیکھیے کیا تیور ہیں!! ؎

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے   پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے[۷]

مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے تو محرک اولیٰ خدا کی ذات کے لیے "پوشیدہ کمانی" کا استعارہ استعمال کیا ہے ؎

چل رہی ہے جتنی بھی جسمانی مشین   کوئی پوشیدہ کمانی اور ہے[۸]

سرو چمن ہو یا صحرائی اشجار، بیل بوٹے ہوں یا خس و خاشاک اور گھاس، سبزے ہوں یا

پودے، ان کا لہلہانا جھومنا اور پتوں کا ہلنا یہ ساری حرکات بے دست و پا صبا کے بس کا کام نہیں۔ اس کی کیا بساط کہ معمولی برگ سبزہ ہی کو ہلا دے؟ وہ محرک ہستی تو کوئی اور ہے جسے عرف عام میں خدا کہا جاتا ہے۔ جس کا ذوقِ تخلیق لفظ "کن" سے ذروں میں چمک دمک پیدا کر دیتا ہے۔ آفتاب میں تمازت اور چاند کی روشنی میں خنکی دیتا ہے۔ کائنات کی باقاعدہ مسلسل حرکت (Cosmic Rhythm) بھی اسی کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ کائنات سے ہٹ کر اگر ہم خود اپنے اندر جھانکیں تو یہاں بھی ہمیں اللہ کی نشانیاں دکھائی دیں گی۔ ہماری "جسمانی مشین" اور اس کے دیگر کل پرزوں میں جو حرکت ہے وہ کسی "پوشیدہ کمانی" ہی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ پوشیدہ کمانی ہی وہ ذاتِ برحق ہے جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ رب العزت نے نظام کائنات کی ترتیب و تناسب ہی سے اپنے وجود پر استدلال کیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز "آیات اللہ" کے زمرے میں آتی ہے، جو اللہ کے وجود پر شہادت دے رہی ہے۔ گردشِ لیل و نہار، ہواؤں کی رفتار، طلوع و غروب سیارگانِ چرخ لاحد و کنار، زمین و آسمان کے حادثات، روئیدگیِ نباتات اور خود انسان کی اپنی ذات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان کا چلانے والا کوئی ہے۔ میر حسن نے قرآن کے اسی استدلال کو اپنے حمدیہ اشعار میں پیش کیا ہے ؎

نہ ہو یوں منتظم مجلس جب تک مجلس آرا ہو ولہ
کوئی باقی ہے بے شک محفلِ زیبائے عالم کا

محفلِ زیبائے عالم کا یہ منتظم آپ اپنی ذات میں اتنا زبردست مدبر ہے کہ منظم طریقے سے سجائی ہوئی اس کی مجلس کائنات میں ایک ادنیٰ سی تبدیلی لانا ممکن ہی نہیں محال ہے۔ کائنات کے ہر گوشے میں اس کی انتظامی صلاحیتوں کا نور جلوہ گر ہے۔ جسے دیکھ کر انسان محو حیرت ہے، تعقل کے قدم جہاں لڑکھڑا جاتے ہیں اور تحیر و درماندگی کے سوا آدمی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن وجدان کی برانگیختگی اور شعور کی بیداری آدمی کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ کارگاہ دنیا

کا ایک منتظم اعلیٰ ہے جو دانا و بینا اور حکیم و خبیر ہے۔

اس منتظم اعلیٰ کی ذات کے مطلق اور مضاف ہونے کی بحث بھی فلسفیوں نے کی ہے۔ ذاتِ الٰہ کے ساتھ صفات کی اضافتوں کا مسئلہ اسلام کے مابعد الطبیعیاتی فلسفے میں نہایت پیچیدہ اور نزاعی رہا ہے اسی نزاع سے اسلام میں معتزلہ اور اشاعرہ کے فرقے وجود میں آئے۔ اعتزال دراصل ایرانی تحریک تھی، ابوحذیفہ واصل بن عطاء (م ۱۳۱ھ) اس فرقے کا بانی تھا، جس نے اہلِ سنت والجماعت کی مخالفت کر کے اسلام میں کچھ نئے عقائد خلط ملط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اعتزال کے ماننے والے معتزلہ کہلائے۔ انھوں نے دقیق جدلیات کے ذریعہ خدا کی وحدت کا یہ تصور قائم کیا کہ خدا کی صفات اس کی ذات میں موجود ہیں یعنی اس کی ذات ہی ذات بھی اور صفات بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ خدا صفات کی اضافتوں سے مبرا ہے۔ لیکن اشاعرہ کی تحریک کے سربراہ اول الاشعری نے اسی جدلیاتی طریقے کو سندِ الہام ربانی کی حمایت میں استعمال کیا۔ اشاعرہ خدا کی ذات کو مع صفات تسلیم کرتے ہیں۔ خدا کی یہ صفات ذاتی اور فعلی ہونے کے علاوہ غیر مخلوق ہیں اس لیے فنا نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے معنی میں خدا کی ذات صفات سے متصف ہے۔ اہل سنت والجماعت کے بھی یہی عقائد ہیں۔ دردؔ نے ذیل کے شعر میں اسی خیال کو پیش کیا ہے ؎

مطلق بھی نہیں دردؔ! اضافت سے مبرا ہے
عہدے سے تقید کے، کوئی کیونکہ برآوے[۳۵]

جب خدائے واحد جو محیط و مطلق ہونے کے باوجود صفاتی اضافتوں سے مبرا نہیں ہے تو انسان کی کیا بساط کہ عہدۂ تقید سے باہر آجائے یعنی پابندیوں سے نجات حاصل کر لے۔ تقید گاہِ امکاں میں یہ ممکن نہیں ہے۔

برگساں کے نظریۂ استدام یا فلسفۂ زماں میں بھی طبعی نقطۂ نظر سے ذات الٰہ کی بحث

کی گئی ہے۔ برگساں کا یہ نظریہ مشہور حدیث "لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ"
پر استوار ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اسی نظریہ کو قرآن کے اختلافِ لیل و نہار سے ملا کر پیش
کیا ہے۔ ان کے نزدیک چونکہ استدام میں تغیر ہے لیکن تواتر نہیں، شدت ہے لیکن وسعت
نہیں اس لیے اس کی مدت سے ایسے خدا کا تصور کیا جا سکتا ہے جو مطلق بھی ہے اور
متغیر بھی۔ اگر اس تغیر سے تواتر خارج کر دیا جائے تو ہم خدا کا ایسا تصور قائم کر سکتے ہیں
جو حیّ و قیوم اور اپنی ذات میں مطلق بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے نظریۂ زماں
پر زور دیا جو ان کے تصورِ الٰہ کے لیے اساس بن جائے۔ اقبالؔ کے نزدیک زمانِ
خالص ہی زمانِ الٰہیہ ہے۔ یہی وہ ذات ہے جس کے وجود میں وسعت نہیں شدت
ہے۔ یہی وہ ذات ہے جو TRANSCENDENTAL ہے نہ IMMANENT۔
یہی تخلیقی قوت بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"اس کی تخلیقی فعالیت کے ممکنات جو اس کے اندرون وجود میں مضمر ہیں لامحدود
ہیں اور یہ کائنات جیسا کہ ہمیں علم ہوتا ہے، اس کا جزوی مظہر۔ حاصل کلام یہ کہ
ذاتِ الٰہیہ کی لامتناہیت اس کی اندرونی اور توسیع میں ہے امتداد اور پہنائی
میں نہیں۔ وہ ایک سلسلۂ لامتناہیہ پر تو ضرور مشتمل ہے لیکن بجائے خود یہ سلسلہ نہیں۔"[۱۲]

زمانے کی اس قوت کی وضاحت اقبالؔ نے اپنی ایک نظم "نوائے وقت" میں کی ہے۔ وقت
انسان کو خطاب کرتا ہے کہ "تو اگر مجھے دیکھنے کی کوشش کرے گا تو تجھے کبھی کامیابی نہیں
ہو سکتی۔ درآنحالیکہ میں تیری جان ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں فنا کے گھاٹ بھی اتارتا ہوں اور
حیاتِ جاوداں بھی عطا کرتا ہوں۔ قوموں کا عروج و زوال مجھ سے ہے۔ حیات و
کائنات کی ساری ہنگامہ آرائیاں میرے ابرو کے ایک اشارے سے وقوع پذیر

ہو جاتی ہیں"۔ ایسی ہی ایک نظم "زمانہ" میں اقبال وقت کی کرشمہ سازی بیان کرتے ہیں۔ وقت کہتا ہے ؎

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ![۲۲]

اقبال نے زمانے کے ذریعہ ایک ایسی ہستی کا اثبات پیش کیا ہے جو فی الواقع ذات الٰہ ہے۔ اس کے متعلق اقبال رقم طراز ہیں ؎

این و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی سریست از اسرارِ وقت
اصل وقت از گردشِ خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست
عیش و غم عاشور و ہم عید است وقت
سرِ تاب ماہ و خورشید است وقت
زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبوالدھر، فرمانِ نبیؐ است

وقت اقبال کے نزدیک اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللّٰہ

اقبال کے یہاں "وقت" کو خدا سمجھنے کا شعور غالباً "لاتسبوالدھر" والی حدیث اور برگساں کے نظریہ سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن "تشکیل جدید اسلامیۂ" کے بعض مباحث اور اقبال کے چند اشعار اس بات کی بھی گواہی دیتے ہیں کہ ان کا عقیدہ "اس معاملے" میں متزلزل رہا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ اقبال کہتے ہیں۔

"ہمیں کوئی ایسا عضو عطا نہیں ہوا جو زمانے کا ادراک کرے۔۔۔۔۔۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ زمان جوہری کا اطلاق ذاتِ الٰہیہ پر کیا جائے یعنی ہم اس کا تصور ایک ایسی زندگی کی شکل میں کریں جو ابھی معرضِ تکوین میں ہے، جیسا کہ پروفیسر الیگزینڈر

نے زمان و مکان و ذاتِ خداوندی (TimeSpace Deity) کے متعلق اپنے خطبات میں کہا ہے۔" ۳۳ے

اس لیے اقبال نے زمانِ جوہری کے بالمقابل "زمان خالص" کو ترجیح دی، تاکہ "وقت" کو ذات الٰہ کی صورت میں پیش کر سکیں۔ لیکن پھر بھی اقبال کے اعتقاد میں استقلال پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ برگساں اور اقبالی نظریۂ استدام اور مذکورہ بالا حدیث (لاتسبو الدھر فان الدھر ھو اللہ) دونوں آیت قرانیہ (القرآن ۴۵-۲۴) سے ٹکراتے ہیں۔ قرآن نے لوگوں کے اس خیال کی نفی کی ہے جو اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے "دہر" کو ہلاک کرنے والا سمجھتے ہیں۔ اسی بنیاد پر اقبال نے جہاں وقت کو لامتناہی ذاتِ الٰہ سے تعبیر کیا ہے وہاں بعض مقامات پر زمانے کی لامتناہیت پر ذات الٰہیہ کو محیط بتایا ہے ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند　　بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اور ع نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال نے اپنے نظریہ کی رو سے جہاں زمانے کو "خلاق" کہا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کو زمانے کا خالق بھی کہا ہے۔ بہرکیف زمانے کے تعلق سے اقبال کی نظموں میں حمدیہ آہنگ کی ایک مدھم سی لے بھی سنائی دیتی ہے۔

ایمیوئل کانٹ نے اخلاقی بنیادوں پر خدا کے وجود کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔ "اخلاق" کی تعریف کرتے ہوئے کانٹ کہتا ہے۔

"اپنے ہر کام میں انسانیت کی قدر و منزلت کا خود اپنی ذات میں اور دوسرے کی ذات میں احترام کرنا اور انسان کی ذات کو ہمیشہ ایک مقصد سمجھنا، کبھی محض ذریعے کے طور پر استعمال نہ کرنا (اخلاق ہے)" ۳۴ے

گویا اخلاق، نیک اعمال کا دوسرا نام ہے، جس کے ذریعہ ضروری ہے کہ آدمی کو راحت نصیب ہو۔ وہ کہتا ہے کہ "دنیا کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ نیکی کرنے والا نہ صرف راحت کا مستحق سمجھا جائے بلکہ اسے راحت میسر بھی آئے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں نیک آدمی کو اخلاقی عمل کے ذریعہ سے راحت نصیب نہیں ہوتی پس اس کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس زمانی زندگی کے علاوہ عالم معقولات میں ابدی زندگی بسر کرے"۔ لیکن "شک" اسے یہ پوچھنے پر مجبور کرتا ہے کہ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ابدی زندگی میں نیکی کے ذریعہ سے راحت حاصل ہوگی؟ اگر وہاں بھی عالم طبیعی کا قانون کارفرما ہو تو نیکوں کو راحت ہونا محال ہے"۔ اس لیے کانٹ کہتا ہے کہ "نظامِ طبیعی کو نظامِ اخلاقی کے ماتحت تصور کرنے کے لیے ایک قادرِ مطلق ہستی کو تسلیم کرنا ضروری ہے جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے اور ان دونوں میں یہ تعلق اور ترتیب قائم کی ہے"۔ [۲۵]

اس طرح کانٹ کے نظریہ کے مطابق خیر، صالح، نیک اور اعمال حسنہ کی جزا کے لیے "مالک یوم الدین" کا تصور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ منجانب اللہ، بندے پر جو احسانات کیے جاتے ہیں، جو مراعات بخشی جاتی ہیں، جو برکات اور رحمتیں تفویض کی جاتی ہیں ان سب کا استحقاق اسی ضابطۂ اخلاق کے تحت انسان کو مطیع و فرمانبردار بنا دیتا ہے، بس چاہیے کہ بندہ اپنے اندر صالح اخلاق پیدا کر کے اللہ کے احکام کا پابند ہو جائے۔ اگر بندہ ایسا کرتا رہیگا تو ابدی زندگی میں بھی وہ راحت و رحمت سے متمتع ہوتا رہے گا کیونکہ بقول امیر مینائی ؂

بارگاہِ حق سے ہر طاعت کی ملتی ہے جزا ہے بڑی سرکار، حق رہتا نہیں مزدور کا

اقبال مالکِ یوم جزا کی بڑائی یوں بیان کرتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

وہ زبان یقین سے بارگاہِ ایزدی میں یوں شکوہ کرتے ہیں ؎

ہم بندے! شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے | تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات | تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں

کانٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اخلاقی بنیادوں پر خدا کے وجود کو بحال کرنے کے بعد ہماری فطرت کا یہ تقاضا ہوگا کہ ہم نیک بنیں اور ایسا برتاؤ کریں، جیسے خدا کرتا ہے۔ دوسرے معنیٰ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نیک بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صفات عالیہ کو اپنی ذات میں پیدا کریں جو اخلاق الٰہیہ ہیں۔ گویا نیک و صالح بشر کے لئے تخلقوا باخلاق اللّٰہ ضروری ہے۔ اس منزل پر پہونچنے کے بعد اس کی آنکھ گویا خدا کی آنکھ، اس کے کان گویا خدا کے کان اس کے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور اس کے پیر خدا کے پیر بن جاتے ہیں (حدیث قدسی) اقبال نے ایسے ہی "بندۂ مولیٰ صفات" کے متعلق کہا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ | غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز

لیکن جب تک خاکی و نوری نہاد بندے میں صفات مولیٰ پیدا نہیں ہوتیں اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ نہیں بنتا۔

قہاری و غفاری، قدوسی و جبروت | یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

عناصر الٰہیہ اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے اور ذات الٰہ سے قرب و معیت حاصل کرنے کے لیے صوفیائے کرام نے "تنزلات ستہ" کا نظریہ پیش کیا ہے، جس کی رو سے سالک (بندہ) اگر تزکیہ نفس و تصفیہ قلب، عبادات بدنی اور اخلاق حسنہ میں کمال پیدا کرلے تو وہ بشریت سے منزہ ہو جاتا ہے، اس میں ایک خاص استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور روح الٰہی اس میں حلول کر جاتی ہے۔ حسین بن منصور حلاج (م ۹۲۲ء) نے اسی عقیدے کے تحت "انا الحق"

کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن علمائے دین مبین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ؎

العبدُ عبدٌ وَ اِن ترقیٰ والربُّ ربٌّ و اِن تنزل ؎[۲۸]

یعنی بندہ، بندہ ہے گو وہ لاکھ ترقی کرے اور رب رب ہے گو وہ کتنا ہی نزول کیوں نہ کرے۔ وجود ذات (رب) سے بندے کی اس طرح کی علیحدگی اسے تخلقوا باخلاق اللہ کا عامل بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یوں بھی انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا مقتضیٰ ہی یہ ہے کہ وہ ذات واجب تعالیٰ سے قرب حاصل کرے۔ لہٰذا چاہیے کہ بندہ اس کی صفاتِ عالیہ کو اپنی ذات میں پیدا کرنے کی سعی کرتا رہے اور اخلاق الٰہیہ پیدا کرکے اپنی زندگی بامراد بنائے۔

منطقیاتی زاویۂ نظر سے بھی فلسفیوں نے دلائل کی جانچ پرکھ کرکے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ کتب السیر میں امام فخر الدین رازیؒ کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ امام رازیؒ کا کسی گاؤں میں ایک بوڑھیا کے پاس سے گزر ہوا۔ وہ چرخہ اپنے سامنے رکھ کر کسی خیال میں غرق تھی۔ امام رازیؒ کے پوچھنے پر وہ بوڑھیا چونک پڑی اور کہنے لگی کہ میں غور کر رہی ہوں کہ آخر میرا چرخہ کیوں نہیں چلتا۔ امام رازیؒ نے اپنے ہاتھوں چرخہ گھمایا اور چرخہ چلنے لگا۔ اتنے میں بوڑھیا کو شرارت سوجھی اور اس نے چپکے سے چرخے کو دوسری سمت گھمایا جس کی وجہ سے چرخہ رک گیا۔ امام رازیؒ نے جو طاقت لگائی تو چرخہ ٹوٹ گیا۔ انھیں بڑا افسوس ہوا لیکن بوڑھیا کہہ اٹھی کہ چرخہ ٹوٹ گیا تو بن جائے گا، لیکن اس چرخے نے ایک پیچیدہ مسئلہ حل کر دیا ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر اس کائنات کے چرخے کو دو خدا چلاتے تو دونوں کی کشاکش میں یہ چرخہ ٹوٹ جاتا۔۔۔۔

قرآن مجید کی حسب ذیل آیت میں اس نظریہ کی وضاحت اس طرح ملتی ہے۔

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ اور اس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ کوئی

کُلُّ اِلٰہٍ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا	اور معبود نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو
بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۔	ہر معبود اپنی مخلوق کو ساتھ لے لیتا
(المومنون: ۹۱)	اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے۔

اردو شعراء نے خدا کے متعلق اس منطقیانہ نکتے کی وضاحت اپنے اشعار میں نہایت عمدگی سے کی ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کا یہ شعر بطور مثال پیش کیا جاتا ہے ؎

سخت فتنہ جہاں میں اٹھتا　　　کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا[۲۹]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شعراء نے خدا کے متعلق تمام فلسفیانہ استدلال و نظریات میں "ایمان" کا عنصر ملا کر "فلسفۂ الٰہ" کو قرآنی تصور الٰہ سے جوڑ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ہمہ جہتی پہلو نکال کر حمدیہ شاعری کو چمکایا ہے۔

مراجع

[۱] ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن (سورۃ الفاتحہ) دہلی ۱۹۳۱ء ج اول ص ۷ [۲] خواجہ میر درد: دیوانِ درد دہلی ۱۹۶۷ء ص ۳ [۳] سراج اورنگ آبادی: کلیات سراج حیدرآباد تاریخ نثر اردو ص ۳۷۰ [۳الف] اکبر الہ آبادی: کلیات اکبر امرتسر تاریخ نثر اردو ج اول ص ۷۰ [۴] کلیات نیر بشاہ نیاز بریلوی (مرتبہ ڈاکٹر انوار الحسن) دیوان نیاز لکھنؤ ۱۹۶۷ء ص ۱۰۵ [۵] James collins: God In Modern Philosophy (مشمولہ نوائے ادب) بمبئی اپریل ۱۹۸۰ء ص ۲۵ [۶] ایضاً ص ۲۵ [۷] الطاف حسین حالی (مرتبہ افتخار احمد صدیقی) "کلیاتِ نظم حالی" لاہور ۱۹۶۸ء جلد اول ص ۲۸۰ [۸] اکبر الہ آبادی: کلیات اکبر جلد اول ص ۲۱۵ [۹] جگر مراد آبادی: کلیاتِ جگر

امرتسر تاریخ ندارد ص ۱۷۱ ۱؎ احسان دانش: "نوائے کارگر" مکتبہ دانش لاہور ص ۳۵ ۱۱؎ سید حسین احمد امجد: "رباعیات امجد" طبع پنجم حیدرآباد جلد اول ص ۳۰ ۱۲؎ ایضاً ص ۳۰ ۱۳؎ میر عبدالواحد بلگرامی: سبع سنابل (مشمولہ برہان) دہلی جنوری ۱۹۸۴ء ص ۲۶ ۱۴؎ مختار: معراج نامہ (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو: حیدرآباد: ورق ۱-ب ۱۵؎ خواجہ میر درد (مرتبہ رشید حسن خاں) دیوانِ درد دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۴ ۱۶؎ ایضاً ص ۸۴ ۱۷؎ اسداللہ خاں غالب: "دیوانِ غالب" ایوان ایڈیشن: دہلی بلا مورخہ ص ۱۳۸ ۱۸؎ مولوی اسماعیل میرٹھی: کلیات اسماعیل میرٹھی: میرٹھ ۱۹۱۰ء ص ۳۱۰ ۱۹؎ میر غلام حسن حسن: غزلیات میر حسن (غالباً بمبئی) ۱۹۱۲ء ص ۳۸ ۲۰؎ خواجہ میر درد: دیوان درد دہلی ۱۹۷۹ء ص ۴۳ ۲۱؎ علامہ اقبال (مترجم: سید نذیر نیازی) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: حیدرآباد بلا مورخہ ص ۹۹ ۲۲؎ علامہ اقبال: کلیات اقبال (بالِ جبریل) دہلی تاریخ ندارد ص ۱۰۱ ۲۳؎ علامہ اقبال: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۱۲ اور ۱۱۴ ۲۴؎ ایمیوئل کانٹ (مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین) تنقید عقل محض دہلی ۱۹۴۱ء ص ۴۷ ۲۵؎ ایضاً ص ۸۷ ۲۶؎ امیر مینائی: مراۃ الغیب: نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۲ء ص ۱۴ ۲۷؎ علامہ اقبال: کلیات اقبال (بالِ جبریل) (لینن خدا کے حضور میں) ص ۸۵ ۲۸؎ شیخ اکبر محی الدین ابن العربی (مشمولہ قرآن اور تصوف، میر ولی الدین) دہلی ۱۹۶۸ء ص ۶۲ ۲۹؎ اسماعیل میرٹھی: کلیات اسمٰعیل میرٹھی: میرٹھ ۱۹۱۰ء ص ۲۴۸۔

جلد ۴۵۔ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۰ء۔ عدد ۳

اردو میں نعت گوئی

از

جناب مختار ٹونکی صاحب ٹونک راجستھان،

نعت کا لفظ سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا کے لیے مخصوص ہو گیا ہے گو نعت گوئی شاعرانہ صنفِ سخن نہیں ہے مگر اب نعتیہ شاعری نے ایک مستقل صنفِ سخن کی صورت اختیار کر لی ہے اور نعت گو شعراء نے اپنے طائرِ خیال سے اسے معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ جس مقدس ذاتِ ستودہ صفات کی ثنا و ستائش خود خالقِ کائنات نے یہ کہہ کر کی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ	بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر
عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا	درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی
عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ؁	ان پر درود بھیجو اور سلام بھیجو،

اور جس صنف کو سرکارِ دو عالمؐ نے نہ صرف پسند فرمایا ہو بلکہ اس میں شعر گوئی کی دعوت بھی دی ہو، شعراء کا کلام سنکر انھیں عزت بخشی ہو اور ترمیم و اصلاحِ سخن سے نوازا ہو۔ کفار کی مبارزت طلبی کے موقع پر شعر کا جواب شعر سے دینے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی ہو۔ اس میں کیوں نہ محبانِ رسولؐ اور عاشقانِ نبیؐ اپنے لختہائے جگر اور پارہ ہائے دل کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کریں اور عقیدت و احترام کی خوبصورت کلیاں چن کر پاکیزہ جذبات و احساسات

کے خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ بارگاہ رسالت میں نچھاور کریں دراصل مدحِ رسولؐ جذبۂ ایماں کی نشانی اور ذکرِ نبیؐ خداوند قدوس کی ہم زبانی ہے۔ علاوہ ازیں حمدِ خدا اور نعت رسولؐ سے نطق کو درجۂ قبول نصیب ہوتا ہے ؎

تکلم بود ما بہ دارِ قبول ز حمدِ خداوند نعتِ رسولؐ

دوسرے لفظوں میں حمد و نعت شاعری کا اعلیٰ علیین ہے۔ جس طرح خدائے پاک و برتر رب العٰلمین ہے اسی طرح سرکارِ دو عالمؐ رحمت اللعالمین اور خیرالبشر کے القاب سے مختص ہیں۔ بارگاہِ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والے شعراء ہر قوم، ہر فرقے اور ہر ملک میں سخن سنج رہے ہیں اور ہر عہد، ہر زبان اور شاعری کی ہر ہئیت میں نعت گوئی نے اپنے رنگا رنگ جلوے دکھائے ہیں۔ سخنورانِ عالم نے بلا تفریق مذہب و ملت مدح و ثنائے رسولؐ میں رطب اللسان ہو کر اپنی زبان و قلم کی تطہیر کی ہے اور اپنے جذبۂ صادقہ کو جلا بخشی ہے امام الانبیاء، ختم الرسل کی ذات گرامی جامع الصفات ہے اور کرۂ گیتی کی دوسری بڑی شخصیتیں اور نسل انسانی کے دیگر ممدوحین آپؐ کے سامنے بے حیثیت و کمتر ہیں جیسا کہ حسان ابن ثابت نے اپنے مرثیہ میں کہا ہے ؎

وما فقد الماضون مثل محمدؐ ولا مثلہ حتی القیامۃ یفقد

نہ تو ماضی میں محمدؐ جیسے کو دنیا نے گم کیا ہے اور نہ قیامت تک گم کرے گی

ابتدائے اسلام سے ہی نعت ایشیائی شاعری کا پسندیدہ موضوع رہی ہے اور چونکہ اس کے لیے کوئی صنف مخصوص نہیں اس لیے ہر صنفِ سخن میں نعتیہ اشعار موجود ہیں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی شاعری منتہائے کمال پر پہنچ گئی تھی۔ ظہور اسلام نے عربی شعر و ادب کے زور و شور سے بہتے ہوئے دھارے کا رُخ موڑ دیا اور قرآن شریف کی فصاحت

وبلاغت نے بلند بانگ دعوے کرنے والے شعراء کی گردنیں خم کردیں۔ موضوعاتِ شعر پر قید وبندش عائد کی گئی، شاعرانہ تعلی دبے راہ روی روک دی گئی اور شاعری کو اعلائے کلمۃ الحق اور تبلیغ دین واشاعت اسلام کا ذریعہ بنا یا گیا۔ غیر مسلم شعراء کی ہجو اور نازیبا اشعار کے جواب میں سرور کائناتؐ نے ہجو لکھنے کا حکم دیا۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے شعراء نے اپنے عظیم الشان قصیدوں میں حضورؐ پر نور کی مدح گستری اور کفار کی ہرزہ سرائی شروع کردی" یہی نعتیہ شاعری کا آغاز ہے

عربی کا سب سے پہلا نعتیہ قصیدہ میمون بن قیس سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ابو ولید انصاریؓ اور حسان بن ثابتؓ کو اپنے زمانے کے تمام شعراء میں سبقت وفوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ انھوں نے نعت گوئی کا قرار واقعی حق ادا کیا۔ حضرت حسانؓ پہلے اور آخری نعت گو شاعر ہیں جن کے لیے سرور کائناتؐ نے بار بار دعائیں کیں[۱]۔ وہ بارگاہِ رسالت اور دربار نبوت کے خاص شاعر تھے۔ انھوں نے ایک سو بیس سال تک شاعری کی۔ ساٹھ سال دور جاہلیت اور ساٹھ سال عہد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں، دونوں زمانے میں شاعری سے ناموری و شہرت حاصل کی۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت کے مطابق حضور اکرمؐ حسان ابن ثابتؓ کے لیے مسجد میں ایک منبر رکھوا دیتے تھے جس پر چڑھ کر وہ فخریہ اپنے اشعار سنایا کرتے تھے[۲]۔ ان کے نعتیہ قصیدوں میں مبالغہ اور غلو نہیں ہے۔ انھوں نے انھیں باتوں کو منظوم کیا ہے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے اور یہ قصیدے فصاحت وبلاغت کے ساتھ نہایت جامع ہیں اسی لیے فارسی اور اردو کے اچھے نعت گو شعراء کو حسان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نبی کریمؐ کے مداح شعراء کی تعداد ۱۸۰ تھی جس میں بارہ خواتین بھی شامل تھیں[۳]

۱۔ مشکوٰۃ شریف ص ۴۰۹ ۲۔ ایضاً ص ۴۱۰ ۳۔ شمع انجمن ص ۱۸۔

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ، حضرت حمزہؓ، سیدہ فاطمہ زہراؓ، حضرت زیدؓ، حضرت ضرارؓ، حضرت کعب ابن مالکؓ اور حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کے اسمائے گرامی بھی اس فہرست میں شامل ہیں، کعب بن زہیرؓ کا درج ذیل شعر نعتیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

ان الرسول لسیف یستضاء بہٖ	بے شک رسولؐ ایک ایسی تلوار ہیں جس سے
مھند من سیوف اللہ مسلول	روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ ہندی لوہے کی
	برہنہ خداوندی شمشیر ہیں۔

یہ واضح رہے کہ کعب بن زہیرؓ نے فتح مکہ سے پہلے امام الانبیاءؐ کی ہجو اور مذہب اسلام کی مخالفت میں بہت سے قصائد کہے تھے چنانچہ باغیوں کی فہرست میں ان کا نام بھی تھا باوجودیکہ ان کے بھائی جبیرؓ پہلے ہی 'دین فطرت' اختیار کر چکے تھے۔ دونوں بھائیوں میں مراسلت ہوئی۔ بالآخر کعبؓ نے طے کیا کہ "میں خود دربار رسالت میں حاضر ہوں گا اگر رسول اکرمؐ کو صحیح معنوں میں حلیم اور صاحب مروت پاؤں گا تو ایمان لے آؤں گا ورنہ موت کو ترجیح دوں گا"۔ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک پکڑ کر اس طرح کہا "اگر کعب اپنی حرکات پر اظہار ندامت کر کے معافی چاہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟" رسول اکرمؐ نے فوراً ارشاد فرمایا "سب معاف" یہ سنتے ہی کعبؓ نے کہا "میں ہی کعب ہوں" اور اپنا مشہور قصیدہ 'بانت سعاد' فی البدیہہ سنانا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت اطمینان اور دلچسپی کے ساتھ اسے سنتے رہے اور جب کعبؓ نے مندرجہ بالا شعر پڑھا تو آپؐ نے خوش ہو کر اپنی مقدس چادر ان کے کندھوں پر ڈال دی۔ علاوہ ازیں آپؐ نے اس شعر میں اصلاح بھی فرمائی۔ حضرت کعبؓ نے رسول اللہؐ کو 'سیوف ہند' سے تشبیہ دی تھی جس پر رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا سیوف کی بجائے 'نور' اور 'سیوف الہند' کی بجائے

نیسوف اللہ، کہو۔ شعر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلاح شدہ الفاظ ہی موجود ہیں۔

عربی سے نعت گوئی فارسی میں منتقل ہوئی۔ فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں ناصر خسرو اور حکیم سنائی نعت گو شعراء کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ سرورِ کائناتؐ اور دوسرے مذہبی پیشواؤں سے وابستگی ناصر خسرو کا مقصدِ حیات ہے ایک جگہ کہا ہے:

مرا گر ملکِ ماموں نیست شاید — کہ افزونم ز ماموں است ما دوں

بہ آلِ مصطفیٰ در عالمِ نطق — فزیدونم، فریدونم، فریدوں

مگر جوشِ محبت میں کبھی آدابِ نعت گوئی سے تجاوز نہیں کیا۔ ناصر نے جن اخلاقی قصیدوں کی داغ بیل ڈالی تھی سعدی شیرازیؒ نے اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ ان کا یہ نعتیہ کلام بے نظیر ہے:

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ — حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

ایجاز و اختصار اور جامعیت و معنویت شیخ سعدیؒ کی خصوصیات ہیں ذیل کے شعر میں کہتے ہیں کہ ایک ایسے یتیم بچے نے جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا، ہفت اقلیم کے سارے کتب خانوں پر پانی پھیر دیا اور خطِ نسخ کھینچ دیا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانۂ ہفت ملت بشست

مولانا جامیؒ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ نعت گویانِ عالم میں ان کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ کلام فصیح و بلیغ ہونے کے ساتھ بہت دل پذیر اور موثر ہے "فقم تم یا حبیبی کم تنامی" سے لے کر "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" تک ان کے نعتیہ اشعار عقیدت و ارادت سے معمور ہیں۔ فرماتے ہیں:

اے عربی نسبت و امی لقب — بندہ تو ہم عجم و ہم عرب

تیغ عرب زن کہ فصاحت ترا است　　صید عجم کن کہ ملاحت ترا است

اور پھر حضور اکرمؐ سے دست بستہ عرض کرتے ہیں:

یا صاحب الجمال و یا سید البشر　　من وجھک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قدسی کے کلام کی صدائے بازگشت تصوف کے حلقوں میں آج بھی گونج رہی ہے۔ ان کی نعتیں محفلوں میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور اب تک دل نوازی کی کیفیت پیدا کرتی ہیں:

مرحبا سید مکی مدنی العربی　　دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم　　اللہ اللہ چہ جمالیست بدیں بوالعجبی

چشم رحمت بکشا سوئے من انداز نظر　　اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات　　رحم فرما کہ زحد می گذرد تشنہ لبی

عاصیانیم زِ ما نیکئی اعمال مپرس　　سوئے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی

سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی　　آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

دوسرے فارسی شعراء میں حافظؔ، رومیؔ، عطارؔ، عرفیؔ، نظامیؔ، شہیدیؔ، بیدلؔ وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ چمنستان نعت میں شاداب و شگفتہ پھول کھلائے ہیں، ہندوستان میں امیر خسروؔ، مرزا غالبؔ، عزیز لکھنوی، شیخ غلام قادر گرامی اور علامہ اقبالؔ نے فارسی زبان میں ارمغان نعت پیش کیا ہے۔

فارسی کے تتبع و تقلید میں نعت گوئی اردو زبان میں بھی جلوہ گر ہوئی۔ اگرچہ ابتدا اردو میں نعتیہ اشعار کا باقاعدہ طور پر کسی شاعر نے اہتمام نہیں کیا کیونکہ نعت گوئی سے

عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے۔ حدِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرورِ کائناتؐ کی ذات ستودہ صفات کی مدحت و تحسین بازیچۂ اطفال نہیں اسی لیے تو حکیم مومن خاں مومنؔ کو کہنا پڑا تھا:

صد بار پیش بصید مضمون نعت پیغمبر امی لقب دام گستردہ ام و ہزار نوبت تگاپو بطریق توصیف محمد عربی صلوٰۃ اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ کہ تشریف وما ینطق عن الھویٰ بر بالایش راست آمدہ بردہ۔ آخر خویشتن را اسیرِ دام واماندگی یافتم و براہِ عجز و انکسار شناختہ آرے [1]

سو بار پیغمبر امی لقب کی نعت کے مضمون کو شکار کرنے کے لیے میں نے دام بچھایا اور ہزار دفعہ حضورؐ کی تعریف کی راہ میں (جنکے قدمِ مبارک پر خلعت وما ینطق عن الھویٰ موزوں ہے) صعوبت اٹھائی۔ بالآخر اپنے آپ کو واماندگی کے دام میں اسیر پایا اور عجز و انکسار کی راہ اختیار کرنا پڑی۔

نعت کہنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ شاعر عشقِ نبیؐ اور محبتِ رسولؐ کے مطہر جذبے سے سرشار ہو اور اپنی وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ دلی کی آئینہ داری اس طرح کرے کہ دامنِ احتیاط ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ کمالاتِ نبوت اور مدارجِ رسالت کی تصویرکشی کرتے وقت ذرا سی بے احتیاطی 'نعت' کو 'حمد' کی حدود میں داخل کر دیتی ہے اور 'عبد' و 'معبود' کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ کہیں یک سرِ مو انحراف سے رسول اللہؐ کے اوصاف و محاسن انسانی سطح پر آجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک دردمند اور ہوشمند شاعر ہی اس 'وادیٔ پرخار' میں قدم رکھنے کی جسارت و جرأت کر سکتا ہے عربی و فارسی کے اکثر نعت گو شعراء نے آپؐ کی بارگاہِ اقدس میں اپنی عقیدت و احترام اور محبت و رافت کے پھول پیش کرنے میں آداب و لوازم کو ملحوظ رکھا ہے ع

با خدا دیوانہ دبا مصطفیٰ ہشیار باش

اس کے باوجود اردو زبان کا ابتدائی شعری ذخیرہ نعت کے درہائے بیش بہا سے

---

[1] انشائے مومنؔ، مقدمہ حکیم احسن اللہ خاں

خالی نہیں ہے۔ قدیم شعرا کے دواوین اور مثنویوں کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا تھا اردو کی اکثر اصناف میں نعتیہ کلام کہا گیا ہے یہاں تک کہ عاشقانہ غزلوں کے مقطعوں میں بھی عموماً نعتیہ مضامین باندھے گئے ہیں ع

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو نبی کریمؐ اور حضرت علیؓ سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اپنی غزلیں بھی ان کے نام معنون کر دیتا تھا اور ظفر شاہ کے قلعۂ معلیٰ میں باقاعدہ نعتیہ محفلیں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے عہد میں ایک معراج نامہ لکھا تھا جس میں ۱۲۱۱ اشعار تھے۔ قلی قطب شاہ کہتے ہیں:

تج مکھ اجت کے جوت تھے عالم دین ہارا ہوا تج دین تھے اسلام نے مومن جگت سارا ہوا

یک لک انشی پیغمبراں اُپجے جگت میانے و لے تج پر نبوت ہے ختم سب تھے توں ہی پیارا ہوا

صدقے نبیؐ جم راج کر قطب زماں آنند سوں

قدرت تھے کہکشں کر د ندیاں کے سو آدا ہوا

وَلی دکنی کے قصیدے بھی مذہبی عقیدتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا طویل ترین قصیدہ جس کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے:

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے ہو فنا فی اللہ دایم یاد یزدانی کرے

سرور کائناتؐ کی مدح میں کہا گیا ہے اور دکن کے آخری بڑے شاعر سراج اورنگ آبادی اپنے قصیدے کے آخری شعر میں اس طرح کہتے ہیں ؎

سدا ہے صرصر غم میں سراج بے پروا لگا ہے ہاتھ اسے دامنِ رسول کریمؐ

شمالی ہند میں سودا، میر، مصحفی، انشا، نظیر، نسیم، میر حسن، ذوق، غالب، مومن، شہیدی،

حالی، ظفر، مجروح، صہبائی، امیر مینائی اور محسن کاکوروی نے نعتیہ اشعار کے جواہر پاروں سے اپنے کلام کو مالا مال کیا ہے۔ سودا نے سب سے پہلے نعتیہ قصیدوں کو فروغ دینے میں بڑی کاوشیں کیں اور اپنے فضل و کمال کا خوب جوہر دکھایا۔ مثال کے طور پر ایک قصیدے میں پیغمبر اسلامؐ کی توصیف اس طرح بیان کی ہے:

جو صورت اسکی ہے لاریب وہ ہے صورت ایزد　　جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنی ربانی

حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر　　کہ دیکھا جس نے اسکو ان نے دیکھی شکل یزدانی

قرآن وحدیث کے حوالے اور مذہبی اصطلاحیں بھی ان کے اشعار کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں خدائے سخن میر محمد تقی میرؔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو درود وسلام بھیجتے ہوئے کچھ الگ انداز سے مدح گستری کرتے ہیں:۔

السلام اے رازدار دو جہاں آفریں　　السلام اے لامکاں کے حاکم مسند نشیں

ذات تیری جوں خدا کی ذات ہے والاصفات　　بے شریک و بے عدیل و بے نظیر و بے قریں

یہ شرافت، یہ سیادت، یہ تقدس، یہ کمال　　یہ تنزہ، یہ تعلی، یہ تفوق ہے کہیں

مقصد دل آشنایاں، مدعائے عاشقاں　　آرزوئے اہل عرفاں، مطلب اہل یقیں

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ کی زبان و بیان میں بڑی پختگی اور فطری آمد ہے ایک قصیدے کے گریز میں ان کی نزاکت تخیل دیکھنے کے قابل ہے:

مجھ کو تو عروض آتی ہے نے قافیہ چنداں　　اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں

سو کیوں نہ ہوں، ہوں بھی تو میں ایسے کا ثنا خواں　　جسکے لیے مخلوق یہ سب کون و مکاں ہیں

ماہ عرب، امی لقب، اعنی کہ محمدؐ　　نت جس کی طرف دیدۂ اختر نگراں ہیں

انشاء نے نعت و منقبت میں زیادہ زور طبع صرف کیا اور مشکل ترین زمینوں میں پُر زور

قصائد لکھے نظیر اکبر آبادی نے مذہبی شاعری کے بکثرت عنوانات قائم کرکے اظہار خیال
کیا اور مومن و غالب نے بھی اپنی جولانیٔ فکر سے کرشمہ کاری کی ہے۔ انتخاب کلام اور
مثالیں طوالت سے خالی نہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ دورِ قدما، سے مومن و غالب
تک نعت کے لیے صرف قصائد مخصوص تھے لیکن مولوی غلام امام شہید نے جدت و وسعت
پیدا کی اور نعت کو قصیدے کے علاوہ غزل، مثنوی، ترجیع بند وغیرہ سے روشناس کرایا
اگرچہ شعرائے دکن نے بھی جستہ جستہ غزلوں اور مثنویوں میں نعتیہ اشعار لکھے ہیں لیکن
ان میں شعریت کم اور واقعہ نگاری زیادہ تھی مگر مولوی غلام امام شہید نے ان میں شاعرانہ
رنگ کی آمیزش کرکے تشبیہات و استعارات سے دلچسپ بنایا۔ ایک بحر طویل مسجع قصیدے
میں سے چند اشعار پیش ہیں جن سے ان کے شاعرانہ طرز بیان کا اندازہ بخوبی ہو سکے گا:

باغِ جہاں آباد ہے یاں سرو بھی آزاد ہے	قمری نہایت شاد ہے نہ صید نہ صیاد ہے
ہاں محفلِ میلاد ہے، وقتِ مبارکباد ہے	جبریلؑ کو ارشاد ہے، مشہور کردے یہ سخن
نورِ خدا پیدا ہوا، خیر الوریٰ پیدا ہوا	بحرِ عطا پیدا ہوا، ابرِ سخا پیدا ہوا
نجم الہدیٰ پیدا ہوا، بدر الدجیٰ پیدا ہوا	شمس الضحیٰ پیدا ہوا، پیدا ہوا شاہِ زمن

اسی زمانے میں لطف علی خاں لطف نے بھی نعت گوئی کو اپنا خاص موضوع بنایا چنانچہ
تذکرۂ 'مہر جہاں تاب' میں مذکور ہے "و دیوانش تمامہا در نعت"۔ لطف کا کلام بھی لطف
سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں:

خدا کے دوست پہ اے دوستو درود پڑھو	جہنمی ہو، بہشتی بنو درود پڑھو
تم ان کے موئے مبارک کا رتبہ کیا جانو	جو اس کے وصف سنو، مومنو درود پڑھو
خدا کا صاف یہ قرآں میں حکم ناطق ہے	مرے نبیؐ پہ تم اے مومنو درود پڑھو

کرامت علی شہیدی بھی اس دور کے ایک اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے میں یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ

مدینہ کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ　　کسی صحرا میں ان کے طعمہ ہوں میں دام و دد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے　　قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

خوش قسمتی سے شہیدی کی یہ آرزو پوری ہوئی مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

۱۲۵۵ھ میں فریضۂ حج ادا کر کے وہ مدینہ منورہ کو جا رہے تھے، راستہ میں بیمار پڑے اور ۳ صفر ۱۲۵۶ھ میں جب تمام منزلیں طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آتا تھا تو اس پر ایک حسرتناک نظر ڈالی اور طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔[1]

متاخرین کے دور میں دو معتبر شعراء کے نام نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں جنھوں نے نعت گوئی کے تنگ میدان کو وسیع و وقیع بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہ نامور نعت گو شعراء منشی امیر مینائی اور محسن کاکوروی ہیں۔ امیر مینائی نے قصائد، غزلیات، رباعیات، ترجیع بند، مخمس، سلام، مناجات وغیرہ پر مشتمل نعتیہ مجموعہ "محامد خاتم النبیین" لکھ کر رسول مقبول سے اپنی سچی عقیدت کا اظہار کیا یہی نہیں انھوں نے متعدد مثنویاں اور نظمیں بھی اسی موضوع پر لکھیں اور "معجزات سرور کائنات" منظوم کیے۔ کلام میں اگرچہ اہلِ زبان کی فصاحت اور تشبیہات و استعارات کی جدت ہے مگر معنی سے زیادہ الفاظ پر زور دیا گیا ہے۔ "معجزات" میں کچھ فرضی اور ضعیف روایات بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ نمونۂ کلام سے ان باتوں کی توضیح ہو سکتی ہے:۔

---

[1] شعر الہند حصہ دوم ص ۲۱۱۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ گل رعنا میں بھی یہی مذکور ہے۔ ص ۳۲۷۔

خلق کے سرور، شافعِ محشر صلی اللہ علیہ وسلم
مرسل داور، خاص پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

نورِ مجسم، نیرِ اعظم، سرورِ عالم، مونسِ آدمؑ
نوحؑ کے ہمدم، خضرؑ کے رہبر صلی اللہ علیہ وسلم

دولت دنیا خاک برابر ہاتھ کے خالی دل کے تونگر
مالک کشور، تخت نہ افسر صلی اللہ علیہ وسلم

دہر سے ملول ریشہ ریشہ نعت امیر اپنا ہے پیشہ
ورد ہمیشہ دن بھر شب بھر صلی اللہ علیہ وسلم

نامِ عاصی داخلِ فردِ شفاعت ہو گیا
خاتمہ بالخیر احمدؐ کی بدولت ہو گیا

جھونکا جو کوئی آئے مدینے کی ہوا کا
ٹھنڈا ہو کلیجہ ترے مشتاقِ لقا کا

بیمار ہوں میں الفتِ محبوبؐ خدا کا
اس درد میں ملتا ہے مزا مجھ کو دوا کا

محسنؔ کاکوروی نے نعت گوئی کو باقاعدہ فن کے طور پر اپنایا۔ انھوں نے اپنی تمام ادبی و شعری صلاحیتیں نعت کے لیے وقف کر دی تھیں۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہے تمنا کہ رہے نعت سے میری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

اور یہ بھی اعلان کیا کہ ؎

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسنؔ
کلام نعتیہ رکھا مری زباں کے لیے

محسنؔ کاکوروی کے لیے مشہور ہے کہ وہ جس وقت داہنے ہاتھ سے نعت لکھتے تھے تو دنیا کی کوئی اور چیز لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہر حال انھوں نے اپنے شاعرانہ کمال اور ندرتِ خیال سے نعت گوئی کو ایک پُر وقار اور شاندار صنفِ سخن بنانے کی مستحسن خدمات انجام دیں اور اردو کے سب سے بڑے نعت گو شاعر تسلیم کیے گئے۔ انکی شاعرانہ قوتیں ہر صنفِ سخن میں کھل کر سامنے آئی ہیں۔ "چراغِ کعبہ" اور "صبحِ تجلی" مثنویاں ان کے شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ ہیں اور قصیدہ "مدیحِ خیر المرسلین" ایک معرکتہ الآرا کارنامہ ہے

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کی تشبیب میں بڑی سحر انگیزی اور جادو اثری ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کے بقول "سرور کائناتؐ کی نعت ایک دوسرے مذہبی پیشوا کی زندگی کے پس منظر میں پیش کرنا محسن ہی کا کام تھا اور کمال یہ ہے کہ دونوں کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیت برقرار رہتی ہے[1]"

محسن کا کلام صنائع بدائع اور تلمیحات و استعارات سے پُر ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر وہ موضوع کو اتنا پیچیدہ اور گنجلک بنا دیتے ہیں کہ کم استعداد حضرات پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے مگر ان کی قدرت بیان کی داد دینا پڑتی ہے۔ سراپائے رسولؐ کی لفظی تصویر انھوں نے کچھ اس طرح کھینچی ہے :

کیوں نہ سو جان سے ہو گلزار بہار معنی	محوِ رنگینیٔ تصویر سراپائے نبیؐ
یہ وہ صورت ہے کہ دیکھی نہ سنی ایسی کبھی	تھی یہی شکل مقدس کہ ازل میں جو کھنچی

ناز سے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
بول اٹھا عارض پُر نور کہ اللہ رے میں

کیسی تصویر کہ ہے صبح بہار امکاں	کیسی تصویر کہ ہے آئینہ پر والہ جہاں
کیسی تصویر کہ ہے لوح و قلم نور افشاں	کیسی تصویر کہ ہے کلک مصور نازاں

کیسی تصویر کہ سب صلی علیٰ کہتے ہیں
کیسی تصویر کہ سب جل علیٰ کہتے ہیں

کیسی تصویر جسے کھینچ کے نقاش ازل	خود لگا کہنے کہ ہر وصف میں ہے تو افضل
تیری صورت سے کھلے ما قل و دل	انبیا شرح مفصل ہیں تو تو متن مجمل

تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں نبیؐ
تو ہے شمسیہ تصور میں تو سب ہیں قطبی

---

[1] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۷۱م۔ ڈاکٹر محمود الٰہی۔

نعت کی تراش خراش کرکے اسے "درِ یتیم" بنانا خواجہ الطاف حسین حالی کا کام ہے۔ حقائق کی سچی تصویر اور رنغضب کی تاثیر حالی کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و شمائل، اخلاق و عادات اور ہدایات و ارشادات کو نہایت صفائی اور سادگی سے شعری جامہ پہنایا ہے اگرچہ ایک قصیدے میں وہ کہتے ہیں:

بنے ہیں مدحتِ سلطان دوجہاں کے لیے — سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

حریفِ نعتِ پیمبر نہیں سخن حالی — کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لیے

مگر ان کے مشہور زمانہ "مسدس" سے زیادہ مستند، معتبر اور موثر نعتیہ نظم دیکھنے کو نہیں ملتی بقول صالحہ عابد حسین: "پیغمبر اسلام محمد مصطفٰے کی نعت میں شاعروں نے گذشتہ چودہ صدیوں میں کیا کچھ نہیں کہا لیکن مسدس جو چند نعتیہ بند ہیں وہ ایک طرف عقیدت اور ارادت کی اور دوسری طرف حقیقت اور صداقت کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں"[1]

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگذر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

---

[1] یادگار حالی ص ۱۰۷۔ صالحہ عابد حسین۔

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا | کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا | پلٹ دی بس اک آن میں اسکی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی | عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی | اک آواز میں سوتی بستی جگادی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت وجبل نامِ حق سے

مولانا حالی نے نعت گوئی کو جو نیا رنگ وآہنگ دیا اور شعرائے دورِ جدید کے لیے جو بہترین نمونہ قائم کر دیا اس کی بدولت حالی کے بعد کے شعراء کے کلام میں مذہبی عظمت اور دینی متانت کے اجزاء شامل ہو گئے اور نعت نئی فکری توانائی اور شعری دلنوازی کے ساتھ معراجِ کمال کی منزلیں طے کرنے لگی چنانچہ آگے چل کر اکبر الہ آبادی، آسی غازیپوری، جلیل مانکپوری، علامہ اقبال، اقبال سہیل، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خاں وغیرہ نے نعت کو فرش سے عرش پر پہونچا دیا ہے اور اس کے بعد بے خود بدایونی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی اور حمید صدیقی نے اپنی جولانگاہ بنا کر اسے مقبول خاص و عام بنایا ہے۔ تفصیل اور مثالوں کے لیے ایک دفتر چاہیے، اس لیے برگزیدہ شعراء کی چند چیدہ نعتوں سے خوشہ چینی کرتا ہوں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ظفر علی خاں اردو کے سب سے بڑے نعت گو شاعر ہیں کیونکہ ان کے کلام سے بڑھ کر کسی بھی شاعر کی نعت میں الفاظ کا شکوہ اور بندش کی چستی

نہیں ملتی۔ سادگی اور برجستگی ان کی نعتوں کا طرۂ امتیاز ہے جہاں وہ یہ کہتے ہیں:

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو — یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا — وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

تو وہیں بارگاہِ رسالت میں دست بستہ نغمہ سرا ہیں:

اے کہ ترا جمال ہے زینتِ محفلِ حیات — دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکوٰۃ

تیری جبیں سے آشکار پرتوِ ذات کا فروغ — اور ترے کوچہ کا غبار سرمۂ چشمِ کائنات

چہرہ کشا کرم ترا قاف سے تا بہ قیرواں — لطف ترا کرشمہ سنج کعبہ سے تا بہ سومنات

دیکھتے ہی ترا جلال کفر کی صف الٹ گئی — جھک گئی گردنِ ہبل ٹوٹ گیا طلسمِ لات

بارگہِ الست سے بخش دیے گئے تجھے — سب ملکی تصرفات، سب فلکی تجلیات

چون و چگونہ و چرا، تا بکجا و تا بکے — حل کئے ایک بات میں تو نے یہ سیندی نکات

غیر کو خویش کر دیا، نیش میں نوش بھر دیا — پل میں درست کر دیئے، بگڑے ہوئے تعلقات

تیرے سلام کے لیے گلشنِ قدس کے طیور — گھوم رہے ہیں ڈال ڈال جھوم رہے ہیں پات پات

ظفر علی خاں کے ساتھ ہی فوراً ذہن اقبال سہیل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں نے ایک ہی درس گاہ سے اپنے ذہنوں کی تطہیر و تزئین کی تھی اور ایک ہی استاد مولانا شبلی نعمانیؒ سے فیوض و برکات حاصل کی تھیں۔ دونوں کی نعتیں بھی دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستیں کلکِ فطرت کا — محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی

وہ فاتح، جس کا پرچم اطلسِ زنگاریِ گردوں — وہ امیؐ جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی

وہ رابط، عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے — وہ فارق، زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی

وہ ناطق، جس کے آگے مہر بر لب بلبل سدرہ — وہ صادق، جس کی حق گوئی کا شاہد نطق ربانی

وہ عادل، جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے — غبارِ مسکنت ہو یا وقارِ تاجِ سلطانی

وہ جامع، جس نے یکجا کر دیے بکھرے ہوئے دانے — منادی جس نے آکر بامی تفریقِ انسانی

وہ گنجورِ معارف، جسکے اک اک حرف میں پنہاں — نکاتِ فلسفی، اسرارِ نفسی، رازِ عمرانی

وہ کشافِ سرائر جس نے کھولا چند لشاروں میں — علوم اولیں و آخریں کا گنجِ پنہانی

جناب الیاس برنی نے جدید شعراء کی مذہبی اور نعتیہ شاعری کے بہ کثرت نمونے "معارفِ ملت" کی تینوں جلدوں میں جمع کر دیئے ہیں موجودہ دور کے بہت سے شعراء کے نعتیہ مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں اور نعت کو تحقیقی موضوعات میں داخل کر لیا گیا ہے جس پر بعض کتابیں بھی شایع ہو چکی ہیں، چونکہ

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

اس لیے آخر میں حفیظؔ جالندھری کے روح پرور "سلام" کے چند اشعار نذرِ قارئین کرام ہیں کیونکہ سید العرب والعجمؐ کے حضور میں سلام و درود پیش کرنا بہترین خراجِ عقیدت ہے

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی — سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی

سلام اے ظلِ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی — ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی

سلام اے سرِ وحدت اے سراجِ بزمِ ایمانی — زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی

سلام اے صاحبِ خلقِ عظیم، انساں کو سکھلا دے — یہی اعمالِ پاکیزہ، یہی اشغالِ روحانی

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ — تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

حفیظؔ بے نوا بھی ہے گدائے دامنِ دولت — عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی

ترا در ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو، ترا گھر ہو — تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے — سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

جلد ۱۴۶ ماہ صفر المظفر ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۰ء عدد ۳

قدسی الٰہ آبادی اور نعت قدسی

از

جناب کالی داس گپتا رضاؔ۔ بمبئی

قدسی الٰہ آبادی کے خاندانی حالات اور شیخ محمد افضل الٰہ آبادی

غازی پور کے قریب ایک قصبہ سید پور ہے، شیخ محمد افضل الٰہ آبادی ۱۰۳۸ھ میں ۱۰ ربیع الاول کی شب (۲۴ اکتوبر ۱۶۲۸ء) کو وہیں پیدا ہوئے تھے، شروع میں قاضی محمد آصف اور مولانا نور الدین جعفر جونپوری اور دیگر علماء سے تحصیل علم کی اور فضائل رسمی میں عالی مرتبہ حاصل کیا، پھر پچیس ۲۵ سال کی عمر میں حضرت میر سید محمد کالپوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے، اور یہ مقام پایا کہ اپنے مرشد کے خلفاء کے سرتاج کہلائے، بعد ازاں اپنے پیر کے اشارے سے مستقل طور پر الٰہ آباد میں سکونت اختیار کر لی اور "تلقینِ اصحاب و تعلیم آداب" میں مشغول ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے قبول خاص و عام عطا فرمایا، آخر کار لمبی عمر پا کر ۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ بروز جمعہ (۲ جنوری ۱۷۱۳ء) الٰہ آباد ہی میں انتقال کیا۔

شیخ کے بھتیجے اور داماد شیخ خوب اللہ

شیخ محمد افضل کے انتقال کے بعد ان کے سگے بھتیجے اور داماد شیخ خوب اللہ (جن کا اصلی نام شیخ محمد یحییٰ تھا) سجادہ نشین ہوئے، وہ "علوم شریعت و طریقت" کے بحر مواج تھے، اور بارہ ہی سال کی عمر میں چچا (شیخ محمد افضل) کی تربیت نے انھیں کندن بنا دیا تھا، اسی لیے نامور چچا کی رحلت کے بعد ان ہی کو ان کا نائب

بنایا گیا، انھوں نے بہت سی کتابیں اور رسالے تصنیف کیے، ۱۱ رجمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ کی رات (۳۱ر اکتوبر ۱۷۳۱ء) کو انتقال کیا اور اپنے عم بزرگوار شیخ محمد افضل کے پہلو میں دفن ہوئے۔

شیخ خوب اللہ کے تین بیٹے تھے (۱) شیخ محمد طاہر (۲) شیخ محمد ناصر افضلؔی اور (۳) شیخ محمد فاخر زائرؔ، علم و فضل، شریعت و طریقت میں تینوں کا رتبہ بلند تھا، تاہم جانشین پدر محمد فاخر زائر قرار پائے، زائر ۱۱۲۰ھ (۹-۱۷۰۸ء) میں پیدا ہوئے تھے، سال ولادت "خورشید" سے نکلتا ہے، ان کے دادا (دادا کے بھائی) شیخ محمد افضل نے انھیں دوسرے بھائی شیخ محمد ناصر افضلؔی کی طرح چھوٹی ہی عمر میں اپنا مرید کرلیا تھا، اور دونوں نے تعلیم اپنے والد بزرگوار شیخ خوب اللہ اور بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے پائی۔

شیخ محمد ناصر افضلی | شیخ محمد ناصر افضلؔی کا انتقال یکم جمادی الاولیٰ ۱۱۶۳ھ (۲۸ر مارچ ۱۷۵۰ء) کو ہوا، شیخ اسد اللہ غالبؔ جو شیخ محمد افضل کے نواسے اور افضلی کے خالہ زاد بھائی تھے، کا انتقال بھی اسی سال ۱۱۶۳ھ میں ہوا تھا، چنانچہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں ؎

افضلی شیخ کامل و غالبؔ　　آرمیدند در ریاض ارم
سالِ تاریخ گفت غمزدۂ　　آہ رفتند ہر دو زیں عالم
۱۱۶۳ھ

افضلی کا ذہن بہت رسا تھا، شعر بہت تیزی سے کہتے تھے، صاحب دیوان تھے، چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

صفای خاطر روشن دلاں ہمیں سخن است　　چو صبح صافی آئینہ ام زدم زدن است
زاہد از خلوت نشینی فکر صید عام کرد　　چوں نگیں در حلقۂ خود را از برائے نام کرد
سخنور چوں بمیرد شعر او مشہور تر گردد　　کہ صافی تر کند گردِ یتیمی آبِ گوہر را
لبِ گزیدۂ اغیار را چہ بوسہ زنم　　عقیق کندۂ نام دگر چہ کار آید

تذکرۂ "سروِ آزاد" (سال تالیف ۱۱۶۶ھ = ۵۳-۱۷۵۲ء) کے مصنف میر غلام علی آزاد کا اس گھرانے سے گہرا ربط تھا، اور وہ (سال ولادت ۱۱۱۶ھ) شیخ محمد فاخر زائر کے ہم عصر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے تذکرہ میں اس خاندان کے حالات، شیخ خوب اللہ کی اولاد تک، تفصیل سے دیے ہیں۔

شیخ محمد فاخر زائر | شیخ محمد فاخر زائر دو دفعہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے، تیسری بار ارادہ دکن میں اپنے دوست آزاد بلگرامی سے مل کر حرمین شریفین جانے کا تھا کہ برہان پور پہونچ کر بیمار پڑ گئے اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ (۲۰ اکتوبر ۱۷۵۱ء) کو انتقال کیا، سال ولادت "خورشید" سے نکلا تھا اور سال وفات "زوال خورشید" سے برآمد ہوا، عمر چالیس (۴۸) سال تھی، وصیت کے مطابق برہان پور ہی میں شیخ عبداللطیف کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔ زائر صاحب دیوان تھے، چند اشعار یہ ہیں:

بباغِ عاشقی از میوہ و گل نیست سامانے | کنم بادام و نرگس را فدائے چشم گریانے
آئینہ با صفائے رخت رو گرفتہ است | گل پیش آں دہن، دہنِ او گرفتہ است
دارم دلے کہ بردم تیغ ست راہِ او | مژگان چشم یار بود سیرگاہِ او
بر میان بر زدہ دامان زکجا می آئی | مرحبا گر بشکارِ دلِ ما می آئی
حبّ دنیا می فریبد خاطرِ افسردہ را | گوشمالی می دہد روباہ شیرِ مردہ را
مور را در خمِ زلف تو بہ بیند مارے | عینکِ داغِ دلم از چہ کلاں بین شدہ است
مرا از آمد و رفت نفس روشن شد ایں معنی | کہ اقبال جہاں در دم زدن ادباری گردد
دنیا عزیز کردۂ دنیا طلب بود | از التفات شوی بود قدر زن بلند
کنند گور پرستاں زیارتِ زاہد | کہ زیر گنبدِ دستار زندہ در گور است

بعد مردن تیز بارم نیست بر دوش کسے | ہمچو رنگِ گل عدم پیمایم از پرواز خویش
درگلستانی کہ ما رنگِ تماشا ریختیم | آسماں یک بال بر ہم خوردۂ طاؤس بود

رُباعی

تا پیروِ چار یار اخیار نۂ | از چار اصول دین خبردار نۂ
در طبع تو ایں چہار عنصر باہم | تا ہست باعتدال بیمار نۂ

رباعی

گر تن بہ بلاہائے قضا نتواں داد | از کف سر رشتۂ رضا نتواں داد
در ہر چہ نشد مگو چنیں بایستے | تعلیم خدائی بخدا نتواں داد[1]

می رسد یک زخم او در جملۂ اعضائے ما | تیر او چوں خوں رود در کوچہ دلہائے ما
سد مقصود است خلعتہائے سلطانی مرا[2] | دام نیدار است چوں آئینہ عریانی مرا

شیخ محمد فاخر زائر کے بڑے بیٹے غلام قطب الدین

شیخ محمد فاخر زائر کے دو[2] صاحبزادوں کی خبر ملتی ہے، بڑے شیخ غلام قطب الدین اور چھوٹے شیخ محمد اجمل، غلام قطب الدین یکم محرم ۱۱۳۸ھ[3] (مطابق ۲۹ اگست ۱۷۲۵ء) کو پیدا ہوئے، کمال اپنے والد سے حاصل کیا، اپنے والد ہی کے ہاتھ پر بیعت تھے، درسی اور ادبی استعداد زبردست تھی، تذکرۂ بے نظیر (۱۷۵۸ء) میں لکھا ہے کہ ان دنوں الٰہ آباد سے "بہ طریقِ سیر" بنگال کی طرف گئے ہیں، والد کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے ۱۱۸۶ھ کے ماہ شعبان کے عشرۂ اول میں زیارت حرمین شریفین کے لیے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر نکل پڑے، جب بیت اللہ پہونچے تو حج کے دن نہ تھے، چنانچہ

---

[1] یہاں تک کے تمام حالات مع اشعار میر غلام علی آزاد بلگرامی کے "تذکرۂ سرو آزاد" سے اخذ کیے گئے ہیں۔
[2] یہ دو شعر "تذکرۂ بے نظیر" سے لیے گئے ہیں۔ [3] تذکرہ روز روشن

مدینے چلے گئے، جب حج کا زمانہ قریب آیا تو واپس ہوئے، مگر راستے ہی میں مرض اسہال میں گرفتار ہو کر آخر ماہِ ذیقعدہ ۱۱۸۷ھ (فروری ۱۷۷۴ء) میں انتقال کیا، اور مکہ معظمہ میں دفن ہوئے، ۹۴ سال کی عمر پائی۔

شیخ غلام قطب الدین شاعر تھے اور مصیبؔ تخلص کرتے تھے، چند شعر یہ ہیں:

زبلبل باغبان بے مروت سرگراں دارد — کہ ایں بے خان ومان ماتم چرا در گلستاں دارد

گاہ در بت کدہ، گاہے بہ حرم سیر کند — یار غارت گر دین است، خدا خیر کند

شبہا بہ کوئے یار گذر می کنیم ما — از سر چو شمع قطع نظر می کنیم ما

بنشینم و بہ پای گلی نوحہ سر کنم — فرصت اگر دہد بہ چمن باغباں مرا

من از موبافئ مشاطۂ او سخت حیرانم — کہ دست آموز خود یا رب چساں کرد است بالاں را

از عسل بر خرمن زنبور برق افتد مصیبؔ — موجب تشویش دل گردید شان ما بہ ما

مردیم و ہنوز بر لبِ من — چو شمع فسردہ دود آہ است[1]

شب فراق بیادت ز دیدۂ تر ما — کدام چشمہ کہ طوفاں نہ کرد بر سر ما

تکمۂ پیراہنِ گلگوں قبائے دیدہ است — از خجالت دیدہ ام سر در گریباں غنچہ را

ندارد نکتۂ برجستہ ای چوں بیت ابرویش — با معانِ نظر دیدیم دیوانِ ہلالی را

سبو بدوش بہ بزم بت یگانہ بیا — بگو کہ بادہ فروشم بدیں بہانہ بیا

بر زباں رفت شبی نام گلستاں ما را — چنگ از ناز زدہ خار بیاباں ما را

در حلقۂ حلقۂ خود صد دل نگار دارد — یکسر ہزار سودا گیسوئے یار دارد

نہ دامنش بکف داریم و نے بر زلف او دستی — بدست بیدلی دستی بدست آرزو دستی[2]

---

[1] یہ سات شعر تذکرۂ بے نظیر سے لیے گئے۔ [2] یہ سات شعر تذکرۂ روز روشن سے لیے گئے۔

مدینے چلے گئے، جب حج کا زمانہ قریب آیا تو واپس ہوئے، مگر راستے ہی میں مرض اسہال میں گرفتار ہوکر آخر ماہِ ذیقعدہ ۱۱۸۰ھ (فروری ۱۷۶۷ء) میں انتقال کیا، اور مکہ معظمہ میں دفن ہوئے، ۴۹ سال کی عمر پائی۔

شیخ غلام قطب الدین شاعر تھے اور مصیبت تخلص کرتے تھے، چند شعر یہ ہیں:

زبلبل باغبان بے مروت سرگراں دارد ... کہ ایں بے خان و مان ماتم چرا در گلستاں دارد

گاہ در بت کدہ، گاہے بہ حرم سیر کند ... یار غارت گرِ دین است، خدا خیر کند

شبہا بہ کوئے یار گذر می کنیم ما ... از سر چو شمع قطع نظر می کنیم ما

بنشینم در بہ پای گلی نوحہ سر کنم ... فرصت اگر دہد بہ چمن باغباں مرا

من از مو بانیٔ مشاطۂ او سخت حیرانم ... کہ دست آموز خود یارب چساں کرد است مارِ را

از عسل برخرمن زنبور برق افتد مصیبت ... موجب تشویش دل گردید شان ما بہ ما

مردیم و ہنوز بر لبِ من ... چو شمع فسردہ دود آہ است[1]

شب فراق بیادت ز دیدۂ تر ما ... کدام چشمہ کہ طوفاں نہ کرد بر سر ما

تکمۂ پیراہنِ گلگوں قبائے دیدہ است ... از خجالت دیدہ ام سر در گریباں غنچہ را

ندارد نکتۂ برجستہ ای چوں بیت ابرویش ... با معانِ نظر دیدیم دیوانِ ہلالی را

سبو بدوش بہ بزم بت یگانہ بیا ... بگو کہ بادہ فروشم بدیں بہانہ بیا

بر زباں رفت شبی نام گلستاں ما را ... جنگ از ناز زدہ خار بیاباں ما را

در حلقہ حلقۂ خود صد دل نگار دارد ... یکسر ہزار سودا گیسوئے یار دارد

نہ دانش بکف دارم و نے بر زلف او دستی ... بدست بیدلی دستی بدست آرزو دستی[2]

---

[1] یہ سات شعر تذکرۂ بے نظیر سے لیے گئے۔ [2] یہ سات شعر تذکرۂ روز روشن سے لیے گئے۔

موت خواہی نہ خواہی آمدنی است اے خوش آنکہ کو کی مدنی است

کسی نے بلبلو، تم سے بہار کو دیکھا دے آنکھیں کون سی تھیں جن سے یار کو دیکھا

ہزار نہ عدے کیے ایک بھی وفا نہ کیا تمھارے قول کو دیکھا، قرار کو دیکھا

جو روتے روتے مری آنکھ لگ گئی تھی شب بہت دنوں کے اوپر خواب یار کو دیکھا

جو آنکھیں کھل گئیں بیکل دہی اکیلا تھا دہی خزاں اور اسی خار خار کو دیکھا

کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے کہتے ہیں زلف کے کوچے میں صبا جاتی ہے

سر پٹک صبح کرے ہے شب ہجراں کو مصیب کس طرح رات کو ظالم تجھے نیند آتی ہے

تیرے گلے کا ہار ہوں یوں چاہتا ہے دل اس پیرہن کا تار ہوں یوں چاہتا ہے دل

ہے مجھے شاہ نجف سیتی شفاعت کی امید سخت عصیاں سیتی گر روز قیامت ہوگا

میٹھی باتوں پہ شکر لب کے نہ دے دل کو مصیب اب تو لگتا ہے بھلا پھیر یہ آفت ہوگا[1]

سیاہ بخت کے گھر کون ہے جو لائے چراغ مرے مزار پر جلتا ہے دل بجائے چراغ

شکل کو پہونچے اس صف مژگان میں دل عیب کیونکر سپاہی جائے فرنگی کی باڑھ میں

شیخ زائر کے چھوٹے بیٹے شیخ محمد اجمل — شیخ غلام قطب الدین مصیب کے انتقال (فروری ۱۷۷۱ء) کے بعد ان کے چھوٹے بھائی محمد اجمل سجادہ نشین مقرر ہوئے، اور شاہ اجمل کے نام سے مشہور ہوئے، یہاں امراللہ مولف تذکرہ مسرت افزا کا بیان درج کیا جاتا ہے جسے اس لیے ترجیح ہے کہ وہ الہ آباد میں شاہ اجمل اور ان کے خانوادے سے بہت قریب تھے، تذکرۂ مسرت افزا میں شاہ اجمل کا ترجمہ یوں ہے :

" ابوالفضل ناصرالدین محمد سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق حضرت شاہ محمد ناصر افضلی خلف حضرت

---

[1] یہ دسُّ شعر تذکرہ مسرت افزا سے ماخوذ ہیں۔

شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی قدس سرہما، ان کا اسم شریف اجمل محمدی مشہور ہے، اجملؔ تخلص کرتے ہیں، صاحبِ فضل و کمال ہیں، اور بہت بڑے فصیح و بلیغ، خدا تعالیٰ نے ان کو شروع جوانی ہی میں ظاہری اور باطنی صفات سے آراستہ کر دیا، اور ان کے کمال کے بقدر جمال بھی عطا کی، ان کے والد بزرگوار نے ان کے بچپن ہی میں وفات پائی تھی، انھوں نے اپنے بھائی قطب العارفین شاہ غلام قطب[1] الدین الٰہ آبادی (خدا ان کی قبر کو نورانی کرے) کے زیرِ سایہ تربیت حاصل کی، علوم درسی کی کتابیں مولانا محمد فصیح جون پوری سے پڑھیں، البتہ علوم باطنی اور اشغالِ تصوف اپنے برادر بزرگوار سے حاصل کیے، جب ان کے برادر بزرگوار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا، اس وقت وہ اپنی خاندانی مسند پر بیٹھے اور سجادہ نشین ہوئے، ان کی عمر مبارک تیئس ۲۳ سال سے زیادہ نہیں، چنانچہ ایک دن ان کے ایک دوست ان کی تاریخ ولادت معلوم کر رہے تھے، بہ طریقِ انبساط فرمایا کہ "خورشیدم"[2]۔ جب حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ یہی ان کا سالِ ولادت ہے، یہ خدا کی عنایت ہے کہ علوم ظاہری و باطنی میں جس قدر ان کا مرتبہ بلند ہے، شعر و شاعری میں بھی ان کا درجہ اسی قدر بلند ہے، ان کے کہے ہوئے ریختے کے یہ چند شعر مجھے یاد تھے جو لکھے جاتے ہیں:

---

[1] شاہ اجمل کے بڑے بھائی (یا عم زادے) غلام قطب الدین، شاہ اجمل سے ۲۳ سال بڑے تھے، اس سے بھی شبہہ ہوتا ہے کہ شاہ اجمل، شیخ محمد فاخر زائرؔ کے نہیں، بلکہ ان کے بھائی شیخ محمد ناصر افضلی کے بیٹے تھے۔ [2] شیخ محمد فاخر زائرؔ کا سالِ ولادت "خورشید" سے نکلتا ہے (۱۱۲۰ھ) چنانچہ اسی پر ۴۱ اعداد یعنی ام بڑھا کر شاہ اجمل نے اپنا سالِ ولادت "خورشیدام" (خورشیدم غلط ہے) کہہ دیا۔ شاہ اجمل کا سالِ ولادت ۱۱۶۱ھ ہے۔

نہ پوچھو مجھ سے کہ تیرا کہاں بسیرا ہے تمام رات ہے اور اس گلی کا پھیرا ہے

عشق پھیرا اپنے پر لیا تو نے ہائے اے دل یہ کیا کیا تو نے

کیوں ہوتے نہیں ہو دا ہوا کیا سچ کہیو ذرا بھلا ہوا کیا

خوش لگتے تھے ہنستے بولتے تم اب رہتے ہو کیوں خفا، ہوا کیا

کچھ خیر نظر نہیں ہے آتی مائل کہیں دل ترا ہوا کیا

جس بات پہ ہم کو ہنستے تھے تم درپیش وہ ماجرا ہوا کیا

اجمل مرنے کو میرے سن کر بولا وہ سنا بھلا ہوا کیا

کس بے دلی سے ہائے کٹی یہ تمام رات ایدھر سے تھا سوال ادھر سے جواب تھا

رُباعی

معلوم نہیں دل کو ستایا کن نے اس آبلے کو ہائے دکھایا کن نے

چھوٹا تھا خیالِ عشق مدت سے پھر فتنۂ خوابیدہ جگایا کن نے

ٹک واسطے خدا کے اے خواب مت مخل ہو پائی ہے وصل کی شب ہم نے خدا خدا کر

میں دیکھ آنکھوں میں طوفان خوں ہوا حیراں مگر کہ ٹوٹ گیا میرا آبلہ دِل کا

نہ نالہ ہے، نہ فغاں ہے، نہ آہ حسرت ناک کدھر گیا نہیں معلوم قافلہ دل کا

آنسو تھمتے مرے نہیں تھمتے کس طرح کی جھڑی لگی اللہ

رباعی

کیا کیجئے اپنا حال کس سے کہیے کوئی نہیں دادرس کہ جس سے کہیے

کر قطع امید اب سبھوں سے اجمل کہلاتے ہیں جس کسی کے اس سے کہیے

رُباعی

جا کر اس دوزیۂ جبہ سائی کیجیے اور خوب سی اس سے آشنائی کیجیے
کیا بات اگر وہ اپنی باتوں پہ لگے اجملؔ واللہ پھر خدائی کیجیے

رباعی

پھرنا موہوم پر بہر سو کب تک بے ہودہ تلاش اور تگاپو کب تک
آنے کا نہیں ہاتھ وہ زنہار اجملؔ جوں فاختہ بے فائدہ کو کو کب تک

تذکرۂ نگارستانِ سخن میں اجملؔ اور فاخرہ مکین کے ایک معرکہ اور مقابلہ کا ذکر ہے لکھا ہے کہ اجملؔ نے یہ رباعی (حقیقت میں قطعہ) اسی دوران میں کہی تھی ؎

خورشید دشم بیم شبِ تار ندارم آئینۂ صبحم غمِ زنگار ندارم
آئینہ نمط درستِ کوراں منم اجملؔ غم نیست اگر گرمیٔ بازار ندارم

تذکرۂ گلزارِ ابراہیم میں لکھا ہے کہ شاہ اجمل نے ۱۱۹۶ھ (۸۲ - ۱۷۸۱ء) میں چند اشعار الٰہ آباد سے راقم تذکرہ کو بنارس بھیجے تھے، شاہ اجمل کی ولادت ۱۱ شوال ۱۱۶۱ھ کو رات میں ہوئی تھی اور وفات[1] یکم ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ کو، (یعنی ولادت مطابق ۲۳ ستمبر ۱۷۴۸ء اور وفات مطابق ۳۰ اگست ۱۸۲۱ء)

مولف گلزار ابراہیم کو بھیجے ہوئے اشعار میں سے دو شعر یہ ہیں:

شاد تھا دل سب طرف سے بر میں جب جانانہ تھا ہائے کیسی رات تھی جس رات وہ مہمانہ تھا
ہو گیا تھا کہتے کہتے ان دنوں میں ہوشیار پھر جو دیکھا کل میں اجملؔ کو وہی دیوانہ تھا

درج ذیل اشعار تذکرہ روز روشن سے ہیں۔

---

[1] تذکرۂ روز روشن۔

بود خموشی حیرت ترانۂ دلِ ما رسد چگونہ بگوشش فسانۂ دلِ ما

اقلیم دل بعشق تو ویرانہ گشتہ است آئینہ خانہ بود پری خانہ گشتہ است

آمدم از عدم بہ طرفہ تماشا دیدم روئے نادیدنی مردم دنیا دیدم

شیخ علی حزیں نے (شاید چوٹ کرتے ہوئے) یہ رباعی خود شاہ اجمل کو بھیجی ؎

دیدیم سواد ہند حیرت زار است روزے کہ دمر چو شامِ ہجران تار است

بستہ است بکار ہمہ شان سخت گرہ اینجا گرہ کشادہ در شلوار است

مگر جواب میں شاہ اجملؔ نے یہ رباعی لکھ کر شیخ کو لاجواب کر دیا ؎

صبح طرب ہند چو روئے یار است شامِ خوشِ او چو کاکل دلدار است

اینجاست کشادہ صد ہزاراں در فیض جز یک گرہے کہ بستہ در شلوار است

تذکرہ مسرت افزا کے مولف لکھتے ہیں کہ

"غلام قطب الدین مصیب کے انتقال پر ان کے چچازاد بھائی شاہ اجمل نے ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ اس طرح کہا ؎

مرشد داستاذ من شاہ غلام قطب الدین رفت بکہ از وطن سوئے خدائے خود شتافت

سالِ وفات او طلب اجمل خستہ دل نمود ہاتف غیب من بگفت قطب زماں وفات یافت

۱۱۸۷ھ

دیگر متفرق اشعار جو مختلف تذکروں میں پائے گئے یہ ہیں ؎

ہو گیا خونِ ناب آنکھوں میں تھا جہاں تک کہ آب آنکھوں میں

شب فرقت میں تیری اے ظالم ہو گیا خواب خواب آنکھوں میں

ہنوز آں سوزشِ عشق است در زیر غبار من کہ دود سینہ باشد سایہ گستر بر مزار من

گہے سر بر سر زانو گہے سنگے بسر دارم بہ شبہائے فراقش نیست دیگر کار و بار من

بسیر آں جہاں من ہم سر و برگ سفر دارم | عزیزاں اند کہ باید کشیدن انتظار من
زبس در زندگی دامن کشاں رفتی زمن یارے | گرفت آخر ز بعد مرگ داما نت غبار من

به ایں امید در کویش نشسته عمرہا اجمل
که شاید ہمرہِ طفلاں برآید نے سوارِ من

شاہ اجمل کے صاحبزادے شاہ ابوالمعالی

شاہ اجمل کی وفات (۳۰ اگست ۱۸۲۱ء) کے بعد غالباً ان کے صاحبزادے شاہ ابوالمعالی عالیؔ سجادہ نشین ہوئے، یہ بھی ارباب فضل و کمال و اصحاب حال و قال میں سے تھے، ۱۱۹۶ھ (۸۲ - ۱۷۸۱ء) میں پیدا ہوئے تھے، درسی کتابیں آخوند محمد سلطان پوری سے پڑھیں، اصلاح سخن فارسی میں اپنے والد شاہ اجمل سے اور اردو میں میر تقی میر سے لی، ۱۸ ربیع الآخر ۱۲۵۲ھ (۲ اگست ۱۸۳۶ء) کو انتقال کیا، تذکرۂ شوکت نادری میں لکھا ہے کہ "شاعروں کے علامہ ہیں اور غزل گو شعراء کے امام، ذیل کے اشعار تذکرہ روز روشن سے ہیں ؎

رفتی ز پہلوئے من و غم شد قریں مرا | دشمن بجائے دوست بود ہمنشیں مرا
خط سبز تو غارت می کند جان جہانی را | عجب دارم کہ گرد خضر رہزن کاروانی را
تو غافل ماندہ ای افتادہ بر ساحل چہ می دانی | کہ دارد در بغل ہر قطرہ بحر بیکرانی را
برنگ غنچہ من امشب گرفتہ دل بودم | نسیم وعدۂ فردا شگفتہ کرد مرا
بیا و رویت از کون و مکاں بر داشتم دل را | ز من بر داشتی دل از جہاں بر داشتم دل را
بوقت خیر بادت دل ز ہوش افتاد و میدیدی | کہ چون تابوت بر دوش فغاں بر داشتم دل را
بہ ابروئے تو دل من مقابل افتادست | چہ خون گرفتہ بشمشیر مائل افتادست
رقیب دشمن و دل دشمن و فلک دشمن | بکوی دوست مرا سخت مشکل افتادست

دولت فقر ست سلیمانیم ننگ بود شاہی و سلطانیم

بہر لباسم بمقتام فنا بس بود ایں جامۂ عریانیم

میروم از دیر بعزم حرم کافرم در گرم مسلمانیم

بردہ ای از دلم قرار عشوہ گرا تو کیستی راست بگو جفا شعار بہر خدا تو کیستی

چوں نہ کنم ز رشک تو جامۂ خویش را قبا برکمرش گرہ زدی بندِ قبا تو کیستی

تو چہ دانی ای بت بی خبر چہ بود ترا خبر کسی کہ بیا و زلف و رخ کسی شدہ شام غم سحر کسی

من و آہ و نالۂ جان گزا تو و ناز عشوہ گری مرا نہ خیال چشم تر کسی نہ خبر زدود سرِ کسی

تذکرۂ نادر سے اشعار ؎

صبح کز خون جگر باشد لبالب جام ما درگرفت از دست ساقی عشق خوں آشام ما

طفلی تا بہ پیری در جہاں یکساں گزشت ہیچ فرقے نیست از آغاز تا انجام ما

دام از بخت بد امواج دریا می شود گر بیفتد از قضا یک ماہئ در دامِ ما

دورِ گردوں کے تواند گشت ما را با مراد چرخ گوید الاماں از گردشِ ایام ما

غالبا از تلخئ ناکامی ما نیست غم

از درد مصطفےٰ گردید شیریں کام ما

تذکرۂ شوکت نادری سے ؎

طاقِ حرم چوں خمِ ابروئے تست مصحف ناطق صحف روئے تست

خالِ سیہ دانہ پے صیدِ دل دام بلا حلقۂ گیسوئے تست

عنبر اشہب خطِ مشکیں رقم مشک ختن زلف سمن بوئے تست

قامتِ تو کرد قیامت بپا فتنۂ محشر قدِ دلجوئے تست

عالی مژدہ بے احباب خویش   منتظر لعل سخن گوئے تست

غلام اعظم پسر شاہ ابوالمعالی | شاہ ابوالمعالی کے ایک صاحبزادے کی خبر ملتی ہے، ان کا نام غلام اعظم (یا محمد افضل) تھا، تذکرۂ روز روشن میں قاضی اختر کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاہ غلام اعظم کی، جن کا تخلص افضل تھا، ولادت ۲۴ ذی القعدہ ۱۲۲۵ھ (۲۲ دسمبر ۱۸۱۰ئ) کو ہوئی تھی، افضل نے فیض باطنی اپنے خاندان سے پایا، اور علوم عربیہ مولوی سید زین العابدین سے حاصل کیے، نہایت خوبصورت آدمی تھے، تذکرۂ صبح گلشن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور (پنجاب) میں بس گئے تھے، لکھا ہے کہ "از اکمل اولیائے لاہور است" یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ ناصر علی سرہندی افضل کو معنی آفریں شاعروں میں شمار کرتے تھے، اور یہ شعر انھیں بہت پسند تھا ؎

نوشتم نامہ از فریاد دل برپا قیامت شد   نمی دانم قلم یا صور محشر بود در دستم

ناسخ کے شاگرد تھے، یہ دو شعر تذکرہ روز روشن سے ماخوذ ہیں:

خون گرمی ست از رخت امشب شراب لا   گویا فشردہ اند بجام آفتاب را

ہست مطلوب تو موجود عجب جائے ہست   در دل خویش نظر کن کہ تماشائی ہست

اور یہ دو شعر تذکرۂ شوکت نادری سے ؎

جلوہ در باغ چو آں خوش قد و بالا می کرد   قمری از شاخچۂ سرو تماشا می کرد

گرچہ سودائے سر زلف تو می پوشیدم   لیکن ایں نامۂ زنجیر تو رسوا می کرد

تذکرۂ نادر اور دوسرے تذکروں سے یہ شعر اردو ملاحظہ کیجئے:

جینے نہیں دیتی ہے ذرا چاہ کسی کی   آئے مجھے آئی ہو جو اللہ کسی کی

فرقت میں اگر نالے رہیں گے یوں ہی ہر دم   جی لے گی مرا الفت جانکاہ کسی کی

عالی مژدہ بے احباب خویش　　　منتظر لعل سخن گوئے تست

غلام اعظم پسر شاہ ابوالمعالی | شاہ ابوالمعالی کے ایک صاحبزادے کی خبر ملتی ہے، ان کا نام غلام اعظم (یا محمد افضل) تھا، تذکرۂ روز روشن میں قاضی اختر کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاہ غلام اعظم کی، جن کا تخلص افضل تھا' ولادت ۲۴ ذی القعدہ ۱۲۲۵ھ (۲۲ دسمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوئی تھی، افضل نے فیض باطنی اپنے خاندان سے پایا، اور علوم عربیہ مولوی سید زین العابدین سے حاصل کیے، نہایت خوبصورت آدمی تھے، تذکرۂ صبح گلشن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور (پنجاب) میں بس گئے تھے، لکھا ہے کہ" از اکمل اولیائے لاہور است" یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ ناصر علی سرہندی افضل کو معنی آفریں شاعروں میں شمار کرتے تھے، اور یہ شعر انھیں بہت پسند تھا ؎

نوشتم نامہ از زیاد دل برپا قیامت شد　　　نمی دانم قلم یا صور محشر بود در دستم

ناسخ کے شاگرد تھے، یہ دو شعر تذکرہ روز روشن سے ماخوذ ہیں:

خون گرمی ست از رخت امشب شراب را　　　گویا فشردہ اند بجام آفتاب را

ہست مطلب تو موجود عجب جائے ہست　　　در دل خویش نظر کن کہ تماشائی ہست

اور یہ دو شعر تذکرۂ شوکت نادری سے ؎

جلوہ در باغ چو آں خوش قد و بالا می کرد　　　قمری از شاخچۂ سرو تماشا می کرد

گرچہ سودائے سر زلف تو می پوشیدم　　　لیکن ایں نالۂ زنجیر تو رسوا می کرد

تذکرۂ نادر اور دوسرے تذکروں سے یہ شعر اردو ملاحظہ کیجئے:

جینے نہیں دیتی ہے زرا چاہ کسی کی　　　آئے مجھے آئی ہو جو اللہ کسی کی

فرقت میں اگر نالے رہیں گے یہی ہر دم　　　جی لے گی مرا الفت جانکاہ کسی کی

پھوٹیں مری آنکھیں جو کسی اور کو دیکھوں | ناحق نہ سنا کیجیے افواہ کسی کی
جی جائے جگر ٹکڑے ہو پھٹ جائے کلیجہ | کیا تجھ کو خبر اے بت گمراہ کسی کی
جب سے کہ تہے نورِ رخِ صاف کو دیکھا | خواہش نہیں اے رشکِ دہ ماہ کسی کی
افضل تو غلامی میں ہے یا سید کونین | پروا اسے ہرگز نہیں یا شاہ کسی کی

ہے یقیں نورِ بصارت ہو زیادہ افضل | سرمۂ خاکِ مدینہ لگے گر آنکھوں میں

معلوم ہوتا ہے تکمیل تذکرۂ روزِ روشن (۱۲۹۶ھ = ۷۹-۱۸۷۸ء) تک بقید حیات تھے[1]

شاہ علی جعفر | شاہ ابوالمعالی عالیؔ (متوفی ۱۸۳۶ء) کی ایک ہمشیرہ (شاہ اجملؔ کی بڑی صاحبزادی) شاہ علی جعفر (نبیرۂ شاہ غلام قطب الدین، خلف شاہ علی رضا) کے عقد میں تھیں، جعفرؔ حضرت ارباب عرفان و کمال میں سے تھے، بلکہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، انھوں نے ۱۲۴۹ھ (۳۴-۱۸۳۳ء) میں انتقال کیا۔

تذکرۂ شوکت نادری میں درج ہے کہ "پہلے اچھی طرح فکر شعر کیا کرتے تھے، لیکن اب (۱۸۳۱ء) کاموں کی زیادتی سے بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔"

یہ تین شعر تذکرۂ روزِ روشن سے ہیں:

بوصف رخسار و قامت از نوک کلکم چہ نقش بزد | خدنگ یا ورد احمرست این قدست یا سر گلشن آرا
وصال ممکن بزندگی کو؟ دلے یقین شد کہ بعد مردن | صبا رساند بکوئے آں ماہ مشت خاکی ز تربت ما
در جمال تو چہا اے بت زیبا دیدم | روئے گل بوئے سمن خوئے مسیحا دیدم

یہ پانچ شعر تذکرۂ نادر سے ہیں:

---

[1] درج بالا کے علاوہ قدسی کی ننہیال میں اور بھی شعرا تھے جیسے شاہ علیم اللہ (محمد علیم) حیرتؔ دہلوی، مہتابؔ، پسند احمد خاں کامل، غلام حیدر حیدر وغیرہ اس موضوع کا براہ راست ان سے کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے میں نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔

لبانت آتشے زد خرمن جانہائے محزوں را	دہانت تنگ کردہ غنچۂ دلہائے پرخوں را
دہد از کوئے او بر باد خاکم گرد باد آسا	نمی دانم چرا با ما عداوت ہاست گردوں را
بیا از پیش من بردار ایں کحل صفاہانی	ز خاک پائے لیلا سرمہ باشد چشم مجنوں را
بیاد زخمی آں تیر مژگاں را تماشا کن	کہ می آرد چساں بیروں ز دل فوارۂ خوں را
ز کلکت چوں جرس در دہر جعفر شور افتادست	نمک سود از تبسم کردۂ ہر لفظ و مضموں را

اور یہ ۵ شعر تذکرہ شوکت نادری سے:

خوشتر آندم کہ ترا صحبت من عار نبود	میل خاطر زینت جانب اغیار نبود
ایں زماں مدعی عشق تو ہستند بسے	پیش ازیں کس چو منت عاشق غمخوار نبود
پیش ازیں غیر من اے عشوہ فروش عالم	عشوہ و ناز ترا ہیچ خریدار نبود
باعث شہرۂ حسن تو شدم من ورنہ	ایں قدر حسن ترا گرمی بازار نبود
دوش در بزم طرب چوں نہ رسیدم جعفر	ہمہ بودند دراں مجمع بے یار نبود

شاہ علی جعفر کے کم از کم دو بیٹوں کا پتہ چلتا ہے، ایک شاہ علی کبیر[۱] عرف میرن جان سید

---

[۱] تذکرہ روز روشن اور شوکت نادری۔ مگر تذکرۃ المعاصرین از نساخ میں درج ہے "سید علی اکبر شاہ میرن جان بن سید علی جعفر، شاہ محمد اجمل الہ آبادی کے نواسے ہیں"۔ لیکن یہ سہو ہے، کیونکہ سید علی اکبر قدسی کے بیٹے اور سید علی جعفر کے پوتے تھے، چند اور تذکروں میں اس سید کا ترجمہ دیکھا گیا ہے، تذکرۂ نادر سے مزید چار اشعار دیے جاتے ہیں:

گذار ایں شیوۂ جور و جفا را	بکن یک دم بمن مہر و وفا را
دل عشاق پامال الم شد	کہ کرد آشفتہ گیسوئے دوتا را
گرفتار غم برمن نظر کن	خدا را اے جفاگستر خدا را

بقیہ ص ۱۸۰ پر

اور دوسرے شاہ محمد اکبر عرف محمد جان قدسی، جب سید پیدا ہوئے تو ان کے والد شاہ جعفر نے ان کا عرف میرن جان رکھا تھا، اس طرح جب قدسی پیدا ہوئے تو ان کا عرف محمد جان رکھا گیا جب قدسی (محمد اکبر) بڑے ہوئے اور انھیں شاعری کا شوق ہوا تو انھوں نے محمد جان کی مناسبت سے اپنا تخلص قدسی رکھا، سید کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ (تذکرہ روز روشن) ہے، اس طرح قدسی کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ قیاس کیا جا سکتا ہے، گویا سید، قدسی سے دو ایک برس بڑے ہوں گے۔

(۲)

قدسی کے حالات میں بعض غلطیوں کی تصحیح | ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا ایک تحقیقی (مگر حقیقتاً غیر تحقیقی) مضمون "قدسی کی نعت" نیا دور لکھنؤ کے ستمبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے (اس کا تفصیلی جائزہ اس مضمون کے آخری حصہ "نعت قدسی" میں لیا جائے گا) اس میں ڈاکٹر صاحب نے قدسی الٰہ آبادی کے ابتدائی حالات اس طرح لکھے ہیں:

> "اس قدسی کے نہ تو زیادہ حالات کا علم ہے اور نہ اس کے کلام کے بارے میں ہی تفصیلات دستیاب ہیں، اتنی بات البتہ ظاہر ہے کہ اس شاعر کو قدسی شہدی کی شخصیت اور شاعری سے کسی نہ کسی درجہ میں دلچسپی ضرور تھی، اغلب ہے کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹):

صنم سر مستِ عشقِ نوجوانی   چہ دانم حکم پیرِ پارسا را

دو شعر تذکرہ شوکتِ نادری سے ماخوذ ہیں جو معلوم ہوتا ہے نادر (مولف تذکرہ) کی فرمائش پر کہے گئے تھے:

نرگسِ مستش بہ یک گردش مرا بیمار کرد   در شبِ تنہائیم خواب آمدن دشوار کرد
دل اگرچہ مبتلا بود است با تشویشہا   سید از فرمان نادر فکر ایں اشعار کرد

اس دلچسپی اور تخلص کی یکسانیت کے سبب اس شاعر کو بھی عام طور سے سید محمد جان کہا جانے لگا تھا۔ شاعروں کے معاملے بھی بہت دلچسپ ہوتے ہیں، وہ جس نام سے مشہور ہو جاتے ہیں وہی باقی رہ جاتا ہے اور ان کا اصل نام عموماً فراموش ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس قدسی کا ایک ہم عصر شاعر اپنے تخلص مظلوم کی رعایت سے شاہ مظلوم کرکے مشہور ہو گیا تھا بیشتر تذکروں نے اس کے اصل نام کا خیال بھی نہیں کیا اور لکھا کہ "نامش شاہ مظلوم" یا "مظلوم شاہ"[1] ٹھیک یہی معاملہ اس قدسی کے ساتھ بھی ہوا۔ لکھنے والوں نے عموماً اس کو "سید محمد جان قدسی" لکھا ہے اور نتیجہ کے طور پر ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے اسے "قدسی مشہدی" خیال کر لیا ہے۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کے قدسی تذکور کے ساتھ اچھے روابط معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں اس کا بیٹا پیدا ہوا تو نادر نے تاریخ کہی جو ان کے "رسالۂ نو" (قلمی) میں ذیل کے عنوان سے درج ہے:

"قطعۂ تاریخ تہنیت ولادت سید علی اکبر فرزند ارجمند سید محمد جان قدسی"

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ نادر نے اپنے تذکرہ "شوکتِ نادری" میں قدسی کے والد سید شاہ علی جعفر کا ذکر کیا ہے۔ مگر قدسی کا ذکر نہیں کیا۔ تذکرہ ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں تالیف ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ اس لیے ہے کہ اس وقت تک "شاعر کی حیثیت سے قدسی متعارف نہیں ہوا تھا۔ اغلب ہے کہ اس وقت تک اس کی عمر پندرہ سولہ برس (یعنی سال ولادت ۲۲-۱۲۳۱ھ) کے قریب رہی ہوگی ـــ"

---

[1] تذکرہ شوکت نادری میں مظلوم کا ترجمہ یوں شروع ہوتا ہے "مظلوم۔ انکا نام غلام حسن ہے، لقب و عرف مظلوم شاہ ...."

آگے چل کر تذکرہ سراپا سخن کے حوالے سے قدسی کا ترجمہ درج کیا ہے (ڈاکٹر صاحب نے ۵ اشعار جو درج تذکرہ ہیں، نہیں دیئے تھے۔ اب میں نے اضافہ کر دیئے ہیں)

"سید محمد اکبر عرف شاہ محمد خاں قدسی ولد شاہ علی جعفر دختر زادۂ حضرت شاہ اجمل علیہ الرحمہ اجمل باشندۂ الہ آباد دائرۂ شاہ اجمل، واسطے سیر کے لکھنؤ میں آئے تھے۔ اصلاح شعر کی خواجہ حیدر علی آتش سے لی۔ صاحب دیوان ہے

لگایا میں نے جو شب زلف پُر شکن میں ہاتھ — شمیم مشک لگی گلشن ختن میں ہاتھ

یہ شاخ نور ہے یا شمع ہے تہِ فانوس — نہاں ہیں یار کے دلبر کے پیرہن میں ہاتھ

تمام عمر تو جامہ دری میں گذری ہے — قرار سے رہیں کیونکر مرے کفن میں ہاتھ

تری بلائیں نہ لیں پاؤں بھی نہیں وا ہے — یہ ہم سمجھتے ہیں بے کار ہیں بدن میں ہاتھ

تسلی دل بلبل ہوئی ہے اے قدسی — ہوئے ہیں قطع جو صیاد کے چمن میں ہاتھ"

مزید معلومات کے لیے اب چند دیگر تذکروں سے قدسی کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔

سخن شعرا (سال تالیف تقریباً ۱۸۷۴ء)

"قدسی تخلص سید محمد اکبر عرف محمد جان ولد شاہ علی جعفر، دختر زادہ حضرت شاہ اجمل الہ آبادی سیر لکھنؤ میں جا کر آتش کے شاگرد ہوئے تھے۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔ (۲ شعر) ہے

یاد آتی ہیں کا فرجو ملاقات کی راتیں — کٹتیں کسی عنوان نہیں برسات کی راتیں

(دوسرا شعر "سراپا سخن" کے تحت درج ہو چکا ہے)"

-تذکرۂ نادر (دیوان غریب۔ سال تالیف تقریباً ۱۸۶۶ء)

"قدسی۔ سید محمد جان دختر زادہ شاہ محمد اجمل، باشندۂ دائرۂ الہ آباد۔ صاحب دیوان شاگرد حضرت آتش ہے

(۵ شعر۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ وہی ہیں جو سراپا سخن میں درج ہیں)"

شمیم سخن (سال تالیف تقریباً ۱۸۷۲ء)

"قدسی تخلص، سید محمد اکبر عرف سید محمد جان الہ آبادی شاگرد خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی

صاحب دیوان۔ سید شاہ علی جعفر کے لڑکے اور شاہ محمد اجمل مرحوم کے نواسے تھے۔

(۲ شعر، وہی ہیں جو "سخن شعراء" میں درج ہیں)۔"

روز روشن۔ (سال تالیف تقریباً ۱۸۷۹ء)

"قدسی۔ محمد کبیر (اکبر) الہ آبادی معروف بہ سید محمد جان خلف سید علی جعفر محمدی

ابن البنت شاہ محمد اجمل الہ آبادی ست۔ طبع بلند و فکر ارجمند داشت و قاضی

اختر را با دے سلسلۂ دوستی مستحکم بود:

تا کہ با نرگس مست تو مرا کار نہ بود	دل بیمار من دل شدہ بیمار نہ بود
بغاوت بردہ از من دل پریزادے جفا کارے	ستمگارے دل آزارے طرفہ طرارے
اگر در دل خیال تیر مژگانش نمی باشد	چرا ہر دم درون سینۂ من می خلد خارے
بہمبرش روز من تاریک تر شد از شب یلدا	نشد آں ماہ یک شب روشنی بخش شب تارے

ڈاکٹر محمد انصار اللہ کے مضمون کے اقتباسات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

(ا) قدسی الہ آبادی کو قدسی مشہدی کی شخصیت اور شاعری سے کسی نہ کسی درجے

میں دلچسپی ضرور تھی۔"

(ب) "اغلب ہے کہ اس دلچسپی اور تخلص کی نسبت کے سبب اس شاعر (قدسی الہ آبادی)

کو بھی عام طور سے سید محمد جان کہا جانے لگا تھا۔"

(ج) تذکرۂ شوکت نادری میں قدسی کے والد شاہ علی جعفر کا ذکر تو ہے مگر قدسی کا

نہیں کیونکہ اس کی تالیف ۱۲۴۴ھ کے وقت قدسی پندرہ سولہ سال کے ہوں گے اور وہ شاعر کی حیثیت سے ابھی متعارف نہ ہونگے (گویا قدسی کا سال ولادت ۳۲-۱۲۳۱ھ قرار دیا جا سکتا ہے) میں عرض کرتا ہوں کہ (۱) (ب) اور (ج) تینوں قطعی غلط ہیں کیونکہ قدسی کی ولادت سے پہلے انکے والدین نے ان کے بڑے بھائی سید کی عرفیت میرن جان قرار دی تھی اسی طرح صاف ظاہر ہے کہ دوسرے بیٹے کی ولادت پر عرفیت محمد جان قرار دے دی گئی۔ جب طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہوئی تو "محمد جان" کی عرفیت اور مشہور شاعر حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے نام اور تخلص کے سبب اس کا تخلص بھی قدسی ٹھہر گیا۔ اس لیے کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ قدسی الہ آبادی کو قدسی مشہدی کی شخصیت اور شاعری سے کسی درجے میں کوئی دلچسپی بھی رہی تھی یا لوگوں نے قدسی تخلص کی بنا پر اسے محمد جان کا نام دے دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ تذکرۂ شوکت نادری میں قدسی کا ترجمہ نہیں ہے، میرے پیش نظر تذکرۂ شوکت نادری از مرزا کلب حسین خاں بہادر نادر مرتبہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ (ستمبر ۱۹۸۴ء) اصل فارسی متن سے اردو میں ترجمہ بھی ڈاکٹر شاہ عبدالسلام ہی نے کیا ہے۔ اس تذکرے کے صفحہ ۲۳ پر قدسی کا ترجمہ موجود ہے ملاحظہ کیجئے:

"قدسی"

آپ کا نام نامی سید محمد جان ہے اور حضرت شاہ محمد اجمل مرحوم کے پوتے [نواسے] ہیں۔ جناب خواجہ حیدر علی آتش کے شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ آپکی طبع رسا اس فن کے نہایت مناسب واقع ہوئی ہے اور آج کل اپنی فکر بلند کے ذریعے داد سخن

دے رہے ہیں اور جواہر معانی کے عمدہ پرونے والوں میں آپ کا شمار رہے۔

اس شہر (الٰہ آباد) میں نظم اردو کے اندر بہت کم اپنی نظیر رکھتے ہیں اور ہمیشہ مضامین کی پری کو اپنے سینۂ خیال میں مسخر رکھتے ہیں۔ آپ کی بلند طبیعت کے کچھ نتائج یہ ہیں ؎

[مطلع سخن شعرا کے تحت درج ہو چکا ہے]

تم چاندنی راتوں کے مزے لو تو حریفو — آجائیں گی اپنی بھی کبھی گھات کی راتیں

گر برق کا صدمہ ہے کہیں رعد فلک کا — برسات کی راتیں ہیں کہ آفات کی راتیں

اس ترجمے میں نادر نے جس احترام سے قدسی کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قدسی نادر سے عمر میں (اور مرتبے میں بھی) بڑے تھے۔ نادر کا سال ولادت ۱۲۲۰ھ ہے۔ اس طرح قدسی کا ۱۲۱۴ھ کا قیاسی سال ولادت حقیقت سے کچھ زیادہ دور نہ ہوگا۔ اس روشنی میں تذکرہ شوکت نادری کی تالیف کے وقت قدسی، ڈاکٹر صاحب کے مقرر کیے ہوئے پندرہ سولہ سال کی عمر کے نہیں بلکہ تینتیس [۳۳] سال کی پختہ عمر کے تھے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس وقت قدسی، "اس شہر (الٰہ آباد) میں نظم اردو کے اندر [نظم فارسی کے اندر نہیں] بہت کم اپنی نظیر رکھتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے قیاس کیا ہے۔ قدسی الٰہ آبادی کی ولادت ۳۲-۱۲۳۱ھ تو قرار دی ہی نہیں جا سکتی۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ۱۲۱۴ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے۔ قدسی کے والد شاہ علی جعفر کا انتقال (ولادت کم از کم ۱۱۹۲ھ) ۱۲۴۹ھ میں ہوا تھا۔ اس طرح باپ کی وفات کے وقت قدسی ۳۵ سال کے ہوئے اور ماموں شاہ ابوالمعالی عالی کے انتقال (۱۲۵۲ھ) کے وقت ۳۸ سال کے۔ نانا شاہ اجمل (کہ اپنے عہد کی ایک برگزیدہ ہستی تھے) کا انتقال ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں ہوا تھا اس وقت قدسی کی عمر ۲۲ سال کی ہو گی۔ عین ممکن ہے کہ سید اور قدسی کا حرفیت میرن جان اور محمد جان انکے نانا ہی کی عطا ہو۔ (باقی)

جلد ۱۴۶ ماہ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۰ء عدد ۴

قدسی الہ آبادی اور نعت قدسی

از

جناب کالی داس گپتا رضا، بمبئی

(۲)

نعت قدسی | نعتِ قدسی (غزلِ قدسی، غزل قدسی در نعت سرورؐ) سے

مرحبا سید کی مدنی العربی ۔ دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

نے نعت ہونے کی برکت سے مقبولیت عام کا وہ خلعت پہنا کہ سینکڑوں شاعروں نے اس پر تضمینیں کہہ ڈالیں مگر تعجب کا مقام ہے کہ آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کلام کس شاعر کا نتیجۂ فکر ہے۔ سید وزیر الحسن (آج کل، دہلی، ۱۵ فروری، ۱۹۸۴ء)، شیخ اکرام الحق (شعر العجم فی الہند۔ ۱۹۶۱ء) خواجہ حامد مرحوم، اپنے مقالہ امام بخش صہبائی ص ۱۵۳ پہ اسے قدسی مشہدی کی زائیدہ فکر قرار دے چکے ہیں اور ان کے حوالے سے بغیر تحقیق کے میں نے بھی اس طرف اشارہ کیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہی ہے کہ میں نے کبھی اسے قدسی مشہدی کا کلام ہونے پر اصرار نہیں کیا۔ کیونکہ میرے مضمون میں یہ بات ثانوی حیثیت کی تھی کہ یہ نعت کس کی طبع زاد ہے۔ میں نے تو یہ ثابت کیا تھا کہ "حدیث قدسی" (جو خمسوں کی کتاب ہے) کا اصل جامع کون ہے۔ یہ میرا موقف ضرور تھا اور ہے کہ جو دلیلیں اسے قدسی مشہدی کی نعت نہ ہونے کے حق میں دی جاتی ہیں، میں ان سے مطمئن نہیں۔ اس ضمن میں بہت سی

بحث اس سے پہلے ہو چکی ہے مگر تازہ ترین مقالہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا ہے جو درج بالا عنوان سے نیا دور، لکھنؤ (ستمبر ۱۹۸۹ء) میں شایع ہوا ہے۔ اس مقالے میں ان کا زور بیان اس بات پر صرف ہوا ہے کہ اس نعت کے مصنف فقط سید محمد اکبر عرف شاہ محمد جان قدسی الہ آبادی ہیں، آیئے دیکھیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں۔
(۱) ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں

"ڈپٹی کلب حسین نادر کے قدسی (الہ آبادی) کے ساتھ اچھے روابط معلوم ہوتے ہیں .... نادر نے اپنے دیوان غریب کا آغاز قدسی الہ آبادی) کی مشہور نعت کی تضمین سے کیا ہے ...."

مجھے اس بات سے قطعی انکار نہیں کہ نادر کے قدسی الہ آبادی کے ساتھ "اچھے روابط" تھے۔ مگر یہی بات ڈاکٹر صاحب کے موقف کے خلاف جاتی ہے۔ ان "اچھے روابط" کے باوجود کیا وجہ ہے کہ نادر نے ایک جگہ بھی نعت قدسی کا ذکر نہ کیا حالانکہ دیوان غریب از نادر کی تالیف (۱۸۶۶ء) تک کم از کم اڑھائی سو خمسے اس نعت پر کیے جا چکے تھے جن میں سے ایک خمسہ خود نادر کا تھا، ؟ ظاہر ہے کہ یہ نعت قدسی الہ آبادی کی فکر کردہ نہ تھی ورنہ نادر اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس کے برعکس نادر نے تذکرۂ شوکت نادری (مقدمے) میں قدسی کو فارسی شعرا میں رکھا ہی نہیں حالانکہ ان کے والد جعفر، ماموں عالی، بڑے بھائی سید سب فارسی گویوں کے زمرے میں شامل ہیں، قدسی کو خصوصیت کے ساتھ دیباچے اور ترجمے میں صرف اردو کا مشاق شاعر تسلیم کیا ہے اور وہ بھی شہر الہ آباد کا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"قدسی کی اس نعت پر میر علی اوسط رشک نے بھی تضمین کی ہے۔ ان کے مخمس میں یہ نعت کا متن اس طرح ہے ...."

" میر رشک کے اس خمسہ پر عنوان اس طرح مندرج ہے۔

مخمس جناب سید علی اوسط رشک کہ مصارع

بر غزل حاجی محمد جان قدسی (گفتند)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدسی نے حج بیت اللہ سے بھی شرف پایا تھا۔ گمان غالب ہے کہ یہ نعت اس نے وہیں کہی ہوگی شعر ہے

ذاتِ پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور	زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبان عربی

میں 'دریں ملکِ عرب' اور مقطع میں 'آمدہ' کے کلمات اس پر دلالت کرتے ہیں۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ قدسی کی اس نعت کے لیے شاید قدیم ترین ماخذ میر رشک کے دیوانِ سوم کا یہ خمسہ ہے۔ اس میں پہلی بار اسے حاجی کہا گیا ہے۔ ظاہراً میر رشک بھی اس قدسی سے براہِ راست واقف تھے اور انھوں نے اس وقت کا جو متن اختیار کیا ہے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔۔"

" عبداللہ خاں علوی تخلص۔۔۔۔۔ نے بھی قدسی کی نعت پر خمسہ کہا تھا۔۔۔۔۔۔

انھوں نے ۱۲۶۳ھ م ۱۸۴۷ء میں وفات پائی تھی۔۔۔۔۔۔۔ یہ نعت ۱۲۶۳ھ سے پہلے وہاں (شمس آباد جہاں علوی فوت ہوئے) پہنچ گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

" نعت کی تخمیس انھوں (رشک) نے ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) یا اس سنہ کے بعد ۱۲۶۷ھ م ۱۸۵۱ء سے پیشتر کسی وقت کی ہوگی۔۔۔۔ تقریباً وہی زمانہ اس نعت کے نظم کیے جانے کا بھی ہوگا۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

میں عرض کرتا ہوں کہ عبداللہ خاں علوی (استاد امام بخش صہبائی) کا انتقال ۱۲۶۲ھ میں ہوا۔ ۱۲۶۳ھ میں نہیں۔ صہبائی کی رباعی کے اس مادے سے تاریخ نکلتی ہے۔

ہاتف گفتا۔ فتاد بنیادِ سخن۔
۱۲۶۲ھ

گلستانِ سخن میں درج ہے کہ کئی مہینے کی طویل بیماری کے بعد انتقال کیا۔ ۱۲۶۲ھ ۳۱ دسمبر ۱۸۴۵ء سے شروع ہوکر ۲۰ دسمبر ۱۸۴۶ء کو ختم ہوتا ہے۔ اس لیے خمسہ زیادہ سے زیادہ ۱۸۴۶ء میں کہا ہوگا، جبکہ رشک کے خمسے کا زمانۂ فکر ۱۸۴۵ء تا ۱۸۵۱ء کی مدت میں کوئی سال ہو سکتا ہے۔ اس طرح اب تک کے معلوم شدہ خمسوں میں اولیت علویؔ کے خمسے کو حاصل ہوگی کیونکہ علویؔ کے خمسہ کہنے کا زمانہ ۲۰ دسمبر ۱۸۴۶ء کے بعد کا نہیں ہو سکتا[۱]

---

[۱] جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی لکھا ہے، حدیثِ قدسی میں علویؔ کا خمسہ ذیل کے عنوان سے درج ہے،

"مولانا مولوی حکیم محمد عبداللہ صاحب رئیس پورہ مفتی ضلع الہ آباد، واردِ حال دہلی، تخلص علویؔ"۔

ڈاکٹر صاحب نے الہ آباد کے نام سے قدسیؔ اور علویؔ میں ربط پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی ہے حالانکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مطلب نکلتا ہے کہ علویؔ رئیس پورہ مفتی ضلع الہ آباد (جہاں کبھی رہے ہونگے)، سے دہلی آئے ہیں اور اب یعنی اس خمسہ کے کہنے کے وقت، وہ دہلی میں موجود ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ علویؔ نے یہ خمسہ شمس آباد میں نہیں بلکہ دہلی میں کہا تھا جس سے زمانۂ فکر ۱۸۴۶ء سے دو تین برس پہلے مراد لیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بقول صاحب آثار الصنادید (پہلا ایڈیشن، ۱۸۴۷ء)

"ایک مدت گزرتی ہے کہ شاہجہاں آباد سے باصید تلاش معاش دل برداشتہ ہو کر پورب کی طرف تشریف لے گئے .... (وہیں) ۱۲۶۲ھ میں عالم باقی کی طرف راہی ہوئے...

.... ہاتف گفتا۔ فتاد بنیادِ سخن ...."
۱۲۶۲

گویا اب علوی کے خمسۂ نعت کا زمانۂ فکر گھٹ کر لگ بھگ ۴۴-۱۸۴۳ء تک آگیا اور نعت اس سے پہلے ہی کہی گئی ہوگی، اسوقت قدسیؔ الہ آبادی کی عمر تقریباً ۵۴ برس کی تھی۔

اب اگر بقول ڈاکٹر صاحب نعت کے نظم کیے جانے کا زمانہ بھی یہی ۱۸۴۶ء ہے

اور نعت قدسی الہ آبادی ہی کی تکرکردہ ہے اور رشک اور علوی دونوں ہی قدسی الہ آبادی

سے براہ راست واقف تھے تو پھر ان دونوں کے خمسوں میں نعت کے متن کا فرق کیوں

ہے؟ رشک نے دس شعروں کو تضمین کیا ہے؟ اور علوی نے نو شعروں کو۔ اس کے علاوہ

اشعار کے متن میں بھی فرق ہے۔ دیکھئے۔

(۱) مرحبا سید مکی مدنی وعربی   دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

رشک نے مدنی وعربی لکھا ہے مگر علوی نے مدنی العربی لکھا ہے۔

(۲) نسبتِ نیست بذاتِ تو بنی آدم را   برتر از عالم وآدم، تو چہ عالی نسبی

رشک کے یہاں یہ دوسرا شعر ہے اور علوی کے یہاں تیسرا۔ نیز رشک نے

نسبتِ لکھا ہے اور علوی نے نسبتے

(۳) نسبت خود بہ سگت کردم وبس منفعلم   زانکہ نسبت بہ سگ کوے تو بس بے ادبی

رشک = چوتھا شعر، علوی = ساتواں شعر۔ نیز رشک = بس بے ادبی، علوی = شد بے ادبی

(۴) روزِ معراج عروج تو از افلاک گذشت   بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

رشک = ساتواں شعر، علوی = چھٹا شعر۔ نیز رشک = روز معراج، علوی = شب معراج

اس کے علاوہ سوائے مطلع اور مقطع کے باقی تمام اشعار کی ترتیب میں زمین آسمان

کا فرق ہے۔ ترتیب ملاحظہ کیجئے۔

رشک کا دوسرا شعر	=	علوی کا تیسرا شعر
〃 〃 تیسرا 〃	=	〃 〃 دوسرا 〃
〃 〃 چوتھا 〃	=	〃 〃 ساتواں 〃

رشک کا پانچواں شعر	=	علوی کا آٹھواں شعر
" " چھٹا "	=	" " چوتھا "
" " ساتواں "	=	" " چھٹا "
" " آٹھواں "	=	" " پانچواں "
" " دسواں (مقطع)	=	" " نواں (مقطع)

اگر رشک نے عنوان میں 'غزل حاجی محمد جان قدسی' لکھا ہے، تو اس کے معنی زیادہ سے زیادہ یہ لیے جاسکتے ہیں کہ انھوں نے بھی دوسروں کی طرح اس نعت کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کا مذکر کردہ کلام سمجھا لیکن اس سے قدسی الٰہ آبادی کے حج کرنے کی فرضی داستان منسلک کر دینا صرف ڈاکٹر صاحب کے زرخیز دماغ ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ قدسی کا حج کرنا شعر کے ان الفاظ "در یں ملک عرب" سے ثابت ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قدسی ۴۵-۱۸۴۴ء میں الٰہ آباد سے حج کے لیے روانہ ہوئے اور حج کرنے کے بعد یا کچھ پہلے انھوں نے ملک عرب میں یہ نعت کہی جو وہاں سے ہندوستان پلٹتے ہی بہت مشہور بھی ہو گئی۔ جبھی تو ۱۸۴۶ء کے آس پاس رشک اور علوی نے اس پر تضمینیں بھی کہہ لیں۔ اس وقت آتش، رشک، علوی، غالب، مومن، صہبائی، شاہ ظفر، آغا جان عیش، احسان، مجروح سب مشاہیر زندہ تھے۔ آتش کو چھوڑ کر جو قدسی الٰہ آبادی کے استاد تھے، دوسرے سب مشاہیر نے اس پر خمسے بھی کہہ ڈالے اور بیار دو کا مشاق شاعر قدسی الٰہ آبادی جو ادبی دنیا میں اپنی فارسی نعت کی وجہ سے اتنی زبردست ہلچل پیدا کرنے کا باعث ہوا، گمنام رہا۔ اب اگر اس سب کے بعد ڈاکٹر صاحب کو یہ بتا دیا جائے کہ خمسہائے غزل قدسی از تحسین کے شعراء کی بڑی

تعدادنے "دریں ملک عرب" لکھا ہی نہیں اور لکھا ہے ؎

ذات پاک تو چو (کہ) در ملکِ عرب کرد ظہور زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

تو قدسی الہ آبادی کے حج کی داستان کا، جو ڈاکٹر صاحب کی اختراع ہے، کیا حشر ہوگا؟ کیونکہ اس کی کمزور بنیاد تو لفظ دریں پر ہی قائم تھی جو اب ڈھے گئی۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"لکھنؤ اور الہ آباد کے آس پاس کے مقاموں میں اس نعت کو نسبتاً پہلے رواج ملا ہوگا۔"

ڈاکٹر صاحب کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ خمسہائے غزلِ قدسی، حدیثِ قدسی، حدیث قدسی مع ملحقات اور صحیفۂ قدسی میں کسی الہ آبادی شاعر کا خمسہ موجود نہیں حالانکہ خود الہ آباد میں قدسی الہ آبادی کے بھائی شاہ سید اور خاندان کے دوسرے شعرا مثل شاہ افضل، زندہ اور فعال تھے۔ خود لکھنؤ اور اس کے آس پاس کے مقاموں کے شعرا کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں کہ

"پروفیسر اسلم فرخی نے راقم کو لکھا ہے۔

'اس نعت کے بعض اشعار خالص ہندی طرز کی غمازی کرتے ہیں۔ ایرانی شاعر اس قسم کا انداز اختیار نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے ؎

ذاتِ پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور زیں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

دوسرے مصرعے میں 'زیں سبب' کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ یہ ہندی سبک ہے جس کا ایران سے کوئی تعلق نہیں۔'"

میں نے یہ اقتباس پڑھ کر پروفیسر اسلم فرخی کو لکھا اور دریافت کیا کہ کن وجوہ کی بنا پر آپ 'زیں سبب' کو سبک ہندی کہتے ہیں اور اہلِ زبان کا محاورہ قرار نہیں دیتے جبکہ

اہلِ زبان نے اسے بے دریغ استعمال کیا ہے؟ انھوں نے کمال مہربانی سے مجھے ۱۹۹۰-۲-۱۶ء کے کرم نامے میں مطلع کیا۔

"قدسی کی نعت میں 'زیں سبب' کے الفاظ میرے نزدیک کسی طور بھی قابلِ اعتراض نہیں ہیں انھیں سبکِ ہندی قرار نہیں دیتا، کیونکہ یہ تو خالص ایرانی محاورہ ہے مجھے اس شعر میں سبکِ ہندی 'دریں' اور 'زیں سبب' کے استعمال میں محسوس ہوتا ہے

اگر آپ غور فرمائیں تو پہلے مصرعے میں دریں کا لفظ خواہ مخواہ ہی استعمال ہوا ہے"۔

لیجئے معاملہ صاف ہو گیا۔ مجھے پروفیسر صاحب کے اس بیان سے قطعی اتفاق ہے کہ "پہلے مصرعے میں دریں کا لفظ خواہ مخواہ ہی استعمال ہوا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت میں بہت سی تحریف ہوئی ہے جس کی ایک مثال یہ دریں ملک بھی ہے جو اصل میں چو در ملک تھا۔

اب نعت میں تحریف کی بات چلی ہے تو دیکھئے کہ تحریف کس کثرت سے ہوئی ہے لیکن پہلے میں یہ اقرار کر لینا چاہتا ہوں کہ میں ایسا فارسی داں نہیں ہوں کہ ایرانی فارسی اور سبکِ ہندی میں حتمی امتیاز کر سکوں۔ بس میرا خیال ہے کہ یہ نعت علوی کے خمسے (۹ شعر) سے بہت پہلے کی کہی ہوئی ہے اور اس کے کل شعر ۱۲ کہے جا سکتے ہیں۔ یعنی وہ جو اس نعت کے خمسوں کی اولین کتاب خمسہائے غزلِ قدسی (چمن مدح نبیؐ) میں شامل ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اصل ترتیب اشعار کیا ہے۔ اس لیے اشعار جس حال میں بھی دستیاب ہوئے اسی ترتیب سے درج کر دیے گئے ہیں۔ تجزیے سے معلوم ہوا کہ صرف تین شعر ایسے ہیں جن میں تحریف نہیں ہوئی اور وہ یہ ہیں۔

من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم — اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

ماہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات — لطف فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی

نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سر سبز مدام　　زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیرین رطبی

باقی نو اشعار مع تحریف درج ذیل ہیں۔ خیال رہے کہ یہ مواد وہ ہے جو صرف خمسہائے غزل قدسی یعنی اولین مجموعے سے حاصل کیا گیا ہے۔ دوسرے مجموعوں میں نہ جانے کیا گل کھلا ہوا ہوگا ؎

(۱) مرحبا سید مکی مدنی العربی!　　مدنی و عربی

(۲) دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی　　دل و جان باد فدائے تو، عجب خوش لقبی .... کہ ....

(۳) نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را　　نسبتِ نیست

(۴) برتر از عالم و آدم، تو چہ عالی نسبی

(۵) نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم　　نسبتِ خود بہ سگت کردہ ام و منفعلم

(۶) زانکہ نسبت بہ سگِ کوے تو شد بے ادبی　　........ بس ....

(۷) شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گذشت　　روزِ معراج ..../

شبِ معراج عروجِ تو گذشت از افلاک　　تو ہمانی کہ شدہ عرش تماپا انداز

(۸) بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

(۹) ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور　　ذاتِ پاکِ تو چو در ملکِ عرب کردہ ظہور

..، کہ در ملک...../.... دراں ملک/　　ذاتِ والائے تو در ملکِ عرب کردہ ظہور

زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی　　....... بلسانِ عربی

(۱۰) چشمِ رحمت بکشا سوے من انداز نظر

بفگن سوے غریباں بنگر.... سوے غریبے بنگر　　بکشا سوے من زار بسیحا.... بکشا سوے من انداز نظر

اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی　　القریشی لقبی ....

(۱۱) عاصیانیم زمانیکی اعمال مپرس .... مخواہ

(۱۲) سوے ما روے شفاعت بکن از بے سببی ....

(۱۳) بر در فیض تو استادہ بصد عجز و نیاز بدیہ

(۱۴) رومی و زنگی و طوسی یمنی و حلبی

رومی، طوسی و زنگی یمنی و حلبی زنگیاد و رومی و طوسی، یمنی و حلبی

(۱۵) سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی یا طبیب الفقرا انت شفاء القلوب

(۱۶) آمدہ سوے تو قدسی پۓ درماں طلبی زاں سبب آمدہ قدسی.....

محمد حسین خاں تحسینؔ، شاگردِ ذوقؔ یعنی مہتمم مطبع مصطفائی دہلی کے

"مدت سے یہ خیال.... دامن گیر تھا کہ کوئی کتاب...... آنحضرتؐ کی نعت میں

تالیف ہو....... ایک روز عالمِ قدس سے (اس کو) یہ الہام ہوا کہ — قدسیؔ کی

غزل جو نعت سرور میں مقبولِ خاص و عام ہے (وہ) تضمین کرائے..... جس وقت

یہ حرفِ آشنا سنا اس کی سعی میں مصروف ہوا۔ سو بفضل خدا دو سال کے عرصے

میں نامی گرامی شعرائے ہند سے....... مخمسے تضمین کرا کر بہم پہونچائے....

...... نام چمنِ مدح نبی رکھا۔ اب ہزار ہزار شکر ہے کہ ۱۲۷۱ھ میں تیسری

تاریخ صفر المظفر (۲۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء) کو طبع ہو کر نزہت بخش خواطر اہل بصر

ہوا..........—.........."

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "قدسی وہی ہے جس کا مفصل تعارف محسن نے اپنے تذکرے

میں کرایا ہے"۔ اگر ایسا ہے تو محسن نے اس نعت کا جو اس وقت تک مشہور زمانہ ہو چکی تھی

کا ذکر کیوں نہ کیا؟ نعت کا تو کیا ذکر، تمام تذکرے مل کر اس معمولی شاعر کے بارہ

اشعار (آٹھ اردو کے اور چار فارسی کے) سے زیادہ کا ذکر نہ کر سکے۔ ۲۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو نعت کے مفروضہ موجد سید محمد اکبر عرف محمد جان قدسی ۵۵ برس کے تھے، زندہ تھے، جوان تھے، فعال تھے، گھر کے کھاتے پیتے تھے۔ تاہم جب خمسوں کا مجموعہ شایع ہوا تو اس نعت کے اشعار میں اس قدر تحریف نکلی کہ خدا کی پناہ۔ اب نہ جانے کتنے شعر الحاقی ہیں، کتنے محرف اور کتنے اصلی۔ کیا کوئی شاعر اپنی ذہنی کاوش کی یوں مٹی پلید ہوتے دیکھ سکتا ہے؟ مگر اس زبردست تحریف کو دیکھ کر بھی قدسی الہ آبادی کے کان پر جوں تک نہ رینگی کیونکہ یہ ذہنی کاوش اس کی نہ تھی۔ تحریف ہمیشہ قدیم کلام میں ہوا کرتی ہے جو سینہ بسینہ محفوظ چلا آ رہا ہو یا نقل بہ نقل کاغذ پر اترتا آ رہا ہو۔ تازہ کلام میں تحریف اور وہ بھی اس مقدار میں، ناممکن۔

استدراک

اس نعت کے قدیم ترین مطبوعہ آثار تا حال مولوی غلام امام شہید کے مشہور رسالہ مولد نامہ شریف کے ترجیع بند میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں، جس کی معین بیت ہے ؎ مرحبا سید مکی مدنی العربی - دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی تذکرہ شمع انجمن میں درج ہے کہ شہید کی عمر اس وقت ۷۵ سال ہے۔ تذکرہ ۱۲۹۳ھ (مطابق ۱۸۷۶ء) میں طبع ہوا اور یہی شہید کا سال وفات بھی ہے۔ گویا شہید کا ترجمہ طباعت سے دو ایک سال پہلے داخل تذکرہ کیا گیا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ شہید نے ۷۷ سال عمر پائی اور ان کا سال ولادت (۱۲۹۳ - ۷۷) ۱۲۱۶ھ مطابق ۲-۱۸۰۱ء ہے۔ رسالہ مولد نامہ شریف (مولود شریف) پہلی بار ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں چھپا۔ ظاہر ہے ترجیع بند زیادہ سے زیادہ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء

تک کہا جا چکا ہوگا۔

مولد نامہ شریف میں چار مخمسات ہیں پہلا امیر خسرو کی غزل پر، دوسرا بابا فغانی کی غزل پر، تیسرا جامی کی غزل پر اور چوتھا بے عنوان ہے یعنی وہاں صرف "مخمس چہارم" لکھ دیا گیا ہے اور یہ وہی متنازعہ غزل قدسی ہے۔

کلیات شہید میں کئی مخمسات ہیں۔ ان کا احوال یہ ہے (۱) بر غزل بابا فغانی تین مخمسات۔ (۲) مولانا معین الدین نسبل۔ تین مخمسات۔ (۳) مرزا محمد حسن قتیل تین مخمسات (۴) واقف لاہوری۔ دو مخمسات۔ (۵) میر نجات۔ (۶) حضرت امیر خسرو۔ (۷) ملا جامی تین مخمسات۔ (۸) نظیری۔ (۹) خواجہ حافظ۔ دو مخمسات۔ (۱۰) عرفی۔ (۱۱) احمد جام (۱۲) سلیم طہرانی۔ (۱۳) حزیں۔ ہر مخمس پر پورا عنوان دیا گیا ہے جیسے مخمس بر غزل ملا جامی علیہ الرحمۃ، مخمس بر غزل حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ، مخمس بر غزل مرزا محمد حسن قتیل" وغیرہ۔

مگر مندرجہ بالا مخمسات کے علاوہ ان کے وسط میں دو مخمس ایسے ہیں جن کا عنوان صرف "مخمس" ہے۔ ایک تو شہید کی اپنی غزل پر ہے اور دوسرا قدسی کی اسی متنازعہ غزل پر۔ دونوں کے آخری بند ملاحظہ فرمائیں ؎

شہید من آتش نفس از گردش گردوں پریشانم غریبم مفلسم بے خانمانم سخت حیرانم
زدرد بے نوائی چوں جرس ہر لحظہ نالانم شہید تیغ یا سم کشتۂ شمشیر حیرانم
تو بخشی درد حرماں را دوا یا شیخ عبدالحق

قدسی دوش سے خواند شہیدی بہ نیاز قلبی کای گدای تو چہ سلطاں و چہ دحیہ کلبی
دمی شفا خانۂ تو موجب زحمت سلبی سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوی تو قدسی پی درماں طلبی

ایسا کیوں کیا گیا؟ شہید کئی سال الہٰ آباد میں رہے تھے اور ان برسوں میں بھی وہ وہیں تھے جب محمد اکبر عرف محمد جان قدسی الہٰ آبادی (نعت کے مفروضہ شاعر) نے یہ غزل کہی تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ انھوں نے قدسی الہٰ آبادی کا نام نہیں لیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ یہ غزل قدسی الہٰ آبادی کی فکر کردہ نہیں ہے۔

پہلے مخمس بے عنوان پر عنوان اس لیے نہیں کہ یہ شہید کی اپنی غزل پر ہے۔ کیا دوسرا مخمس بے عنوان مع غزل قدسی بھی شہیدی کا فکر کردہ ہے[1]؟ کیا آخری شعر میں 'قدسی' بطور تخلص نہیں، لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے؟ یا پھر کہنا پڑے گا کہ شہر شہر، قریہ قریہ محفلوں میں نعتیں، منقبتیں اور سلام پڑھنے والا مشہور شاعر شہید بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ غزل کونسے قدسی کی ہے۔

بہر حال، شہید کے اس خمسے میں بارہ اشعار کو تضمین کیا گیا ہے اور قدامت کے پیش نظر شاید انھیں بارہ اشعار کو 'غزل قدسی' کا متن تسلیم کر لینا مناسب ہوگا۔

ذیل میں شہید کی ترتیب اشعار اور اختلاف متن کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

---

[1] کلیات شہید میں شہید کی ایک، شعر کی غزل اسی زمین میں ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ ہو بہو وہی اسلوب ہے جو غزل قدسی کا ہے ؎

رنگ اندام تو برگشت در آغوش خیال ۔۔۔ اے گل اندام بنازم کہ چہ نازک بدنی

جاں پی سوختن خویش تقاضا دارد ۔۔۔ من بایں وجہ نسوزم کہ تو در جان منی

برجراحت نمکی از لب شیریں بفشاں ۔۔۔ اے کہ در تلخی دشنام شکر می شکنی

سینہ از داغ تو گلزار ارم کرد شہید ۔۔۔ پردہ بکشا کہ تو ہم رشک بہار چمنی

ترتیب اشعار (شہید)	غزل قدسی	متن (شہید)
(۱)	مرحبا سید مکی مدنی العربی !	
	دل و جاں باد فدایت کہ عجب خوش لقبی...	دل و جاں باد فدای تو عجب خوش لقبی
(۴)	نسبتے نیست بذات تو بنی آدم را	
	برتر از عالم و آدم، تو چہ عالی نسبی.....	زانکہ از عالم و آدم، تو چہ عالی نسبی
(۲)	من بیدل بجمال تو عجب حیرانم	
	اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی	
(۵)	نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم	
	زانکہ نسبت بہ سگ کوے تو شد بے ادبی	
(۹)	ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات	
	لطف فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی......	رحم فرما کہ ز حد مے گزرد تشنہ لبی
(۸)	نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام	
	زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی	
(۷)	شب معراج عروج تو از افلاک گذشت	
	بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی	
(۶)	ذات پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور	ذات پاک تو کہ در ملک عرب کردہ ظہور
	زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبان عربی	
(۳)	چشم رحمت بکشا سوے غریباں بنگر...	چشم رحمت بکشا سوی من انداز نظر
	اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی	

ترتیب اشعار (شہید)	غزل قدسی	متن (شہید)
(۱۱)	عاصیانیم زمانیکہ اعمال مپرس سوئے ما رو دسے شفاعت کن از بہ بلبی	
(۱۰)	بر درِ فیض تو استادہ بصد عجز و نیاز رومی و زنگی و طوسی یمنی و حلبی.....	رومی و طوسی و ہندی، یمنی و حلبی
(۱۲)	سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی	

دار المصنفین کی بعض مطبوعات کے جدید اڈیشن

۱۔ **مقالات شبلی جلد ہفتم**:۔ مولانا شبلی نعمانیؒ کے فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت:۔ ۲۰ روپے۔

۲۔ **اسوۂ صحابہؓ حصہ دوم**:۔ از مولانا عبد السلام ندویؒ حضرات صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی سیاسی۔ مذہبی اور علمی خدمات کا مرقع:۔ قیمت:۔ ۴۵ روپیے

۳۔ **گل رعنا**:۔ از مولانا حکیم سید عبد الحئیؒ۔ اردو زبان کی ابتدائی تاریخ۔ اردو شاعری کا آغاز و دور عہد بعہد کے باکمال اردو شعراء کا تذکرہ۔ ابتدا میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا پیش لفظ بھی ہے۔ قیمت:۔ ۶۰ روپیے۔

۴۔ **دین رحمت**:۔ از شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام سارے انسانی طبقوں بلکہ پوری کائنات کے لیے سراسر عدل و رحمت ہے۔ قیمت:۔ ۴۰ روپیے۔

۵۔ **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک**:۔ تیموری عہد سے پہلے کے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی کہانی، ہندو مسلمان مورخین کی زبانی۔ قیمت:۔ ۵۵ روپیے

جلد ۱۴۸ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۱ء عدد ۲

اُردو کی مناجاتی شاعری

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط۔

"دعاء" دراصل رفع احتیاج کے لیے خدائے برتر کے آگے نہایت بیچارگی کی حالت میں ہاتھ پھیلا کر طالب استعانت ہونا ہے۔ انسان بالطبع عبدیت و عبودیت کا خوگر ہے۔ وہ جب مشکلات اور پریشانیوں میں گھر جاتا ہے اور ان سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی تو اپنے دل وافتقار کا اعتراف کرتے ہوئے خالق حقیقی سے مدد و نصرت کی درخواست کرتا ہے۔ وہ مالک کائنات کی بندگی کر کے اپنے بندہ و غلام ہونے کا عملاً اقرار کرتا ہے۔ عبدیت کے اس شعور کو انسانیت کی تاریخ کی ابتدا سے لیکر آج کے متمدن دور تک علم و حکمت کے مختلف النوع اکتشافات اور حیاتیات و علم الاجسام کے حیرت ناک تجربات بھی انسان کے اذہان سے مٹا نہیں سکے۔ اس لیے جب بھی لاینحل و لاحل مسائل درپیش آتے ہیں تو عالم وارفتگی میں غایت آہ و زاری کے ساتھ بندہ اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندے کی تضرع وزاری کی یہ حالت دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تضرع کی ایسی حالت ہی بندے کے انبساط و سرور کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ سکینہ سے اس کا قلب معمور ہو جاتا ہے افکار و آلام و وساوس سے وہ مستغنی ہو جاتا ہے اور اللہ کی ذات اس کے لیے معین

ومعاون اور محافظ و مستجیب بن جاتی ہے۔ گویا اللہ کے مائل بہ کرم ہونے کے لیے بندے کی عاجزی وانکساری اور اضطرار واضطراب شرط ہے۔

دعا کی تاکید "دعاء" اللہ کا حکم بھی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا	اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے
وَّخُفْيَةً (الاعراف ۵۵)	ہوئے اور چپکے چپکے۔

ایک جگہ اللہ رب العزت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے عام لوگوں کو متنبہ کر رہے ہیں۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا	(کہہ دو (اے محمدؐ) میرے رب کو
دُعَاؤُكُمْ (الفرقان آیت ۷۷)	تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم
	اس کو نہ پکارو۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے۔

اُدْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ	مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں
(المومن آیت ۶۰)	قبول کروں گا۔

دعا کی اس اہمیت کے پیش نظر ہی آنحضورؐ نے بھی اس کی بار بار رغبت دلائی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

ان الدعاء ینفع مما	یعنی دعا ہر حال نافع ہے ان
نزل ومما لم ینزل فعلیکم	بلاؤں کے معاملے میں جو نازل ہو چکی
عباد اللہ بالدعاء (ترمذی	ہیں اور انکے معاملے میں بھی جو نازل
مسند احمد)	نہیں ہوئیں پس اے بندگان خدا!

تم ضرور دعا مانگا کرو۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

یسأل احدکم ربه حاجة	تم میں سے ہر شخص کو اپنی حاجت
کله حتی یسأل شسع نعله اذا	خدا سے مانگنی چاہیے حتیٰ کہ اگر
انقطع (ترمذی)	اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے
	تو خدا سے دعا کرے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کی نگاہ میں مکرم یا باوقعت نہیں ہے۔ ایک بار آپؐ نے متنبہ فرمایا کہ جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔ (ترمذی) کبھی تو ترغیبی انداز میں آپؐ نے فرمایا کہ "دعا عین عبادت ہے"۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی) نیز دعا عبادت کا مغز ہے (ترمذی) ایک جگہ ترہیبی انداز میں آپؐ نے فرمایا۔" قضا کو بجز دعا کوئی چیز نہیں ٹال سکتی۔ (ترمذی)

اس طرح قرآن مجید کے نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ سے صراحتاً دعا کی اہمیت، سودمندی اور اللہ کے نزدیک اس کی وقعت و رفعت واضح ہوتی ہے۔ پس بندے کو چاہیے کہ بارگاہِ ایزدی میں وہ اپنے احتیاجات کو رفع کرنے کے لیے دعا مانگا کرے کہ یہی عمل اللہ کی آقائی کا اعتراف اور بندے کی درماندگی کا اقرار ہے۔ بندے کی انابت و رجوع الی اللہ والی کیفیت اللہ کو مطلوب ہے۔ یہ عمل اگرچہ بظاہر غایت تذلل کا مظہر ہے لیکن الحمد للہ

عزت نفس مومن کے عین مطابق ہے۔ یہی عمل اللہ جل شانہٗ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر کتب مقدسہ و صحائف متبرکہ کی ابتدا دعا ہی سے ہوتی ہے یا ان میں دعاؤں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم، اویستا اور وید و اپنشد کی ابتدا میں دعاؤں کا التزام ہے۔ قرآن کی ابتدا سورۃ الفاتحہ سے ہوتی ہے جسے "سبع المثانی" (یعنی سات دہرائی جانے والی) کہا جاتا ہے۔ احادیث میں اسی سورت کو "ام القرآن"، "اساس القرآن"، "الکافیۃ" اور "الکنز" وغیرہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے[1]۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسے "دعاء" کہا ہے (تفہیم القرآن جلد اول ص ۴۲) سورۃ الفاتحہ کے اعجاز و ایجاز نیز عدیم المثال اور غیر مبہم معنویت کے متعلق انسائیکلوپیڈیا یا برٹانیکا کا مرتب یوں گوہر افشانی کرتا ہے :۔

"سورۂ فاتحہ حمد باری ہے۔ یہ زبردست مناجات ہے سلیس اتنی کہ مزید تشریح سے بے نیاز مگر اس پر بھی معنویت سے لبریز۔"[2]

ایک اور آسمانی کتاب "زبور" میں بھی حضرت داؤد علیہ السلام کی دعا و مناجات بڑی پُر اثر اور رقت انگیز ہے۔ اس کے کئی منثور و منظوم تراجم عربی۔ فارسی۔ اردو میں ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں وید و اپنشد میں بھی ابتداءً دعائیہ کلمات "سوکت" کی شکل میں ملتے ہیں۔ ان کتابوں کی دعاؤں میں بندے کے احساس عجز کے ساتھ آقائے رب السمٰوٰت والارض کی شان قدرت کا

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن، دہلی ۰ ۵ ۱۳ ھ جلد اول ص ۲ [2] بحوالہ ریاض ڈیلی اشاعت اردو، ریاض عرب امارات مورخہ ۱۲ جون ۱۹۹۰ء

بر ملا اظہار ہوا ہے۔ غالباً ان ہی نمونوں کو سامنے رکھ کر ادب عالیہ پر مشتمل بیشتر کتابوں کی ابتدا حمد و مناجات سے کی گئی ہے۔ چنانچہ عربی ادب میں کئی بہترین مناجاتوں کا سراغ ملتا ہے۔

عربی شاعری میں دعا و مناجات | حضرت حسان بن ثابت الانصاریؓ نعت رسولؐ میں ہمیشہ رطب اللسان رہتے تھے۔ حمد و مناجات میں ان کی عقیدت کی گہرائی اور دل سوزی کی کیفیت مومنانہ شان کی حامل ہے۔ ان کی نعتوں میں برمحل مناجاتی اشعار بھی آجاتے ہیں۔ دیکھیے ایک شعر میں "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کی توضیح کتنے سلیقہ سے کی گئی ہے۔

لک الخلق والنعماء والامر کلہ فایاک نستھدی وایاک نعبد [عـــہ]

(مفہوم) حیات بخشی اور نفع رسانی اور ساری حکمرانی صرف تیری (اللہ کی) ہے۔ ہم تجھ سے ہدایت کے طالب ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

ایک اور مناجات خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے منسوب ہے۔ اسمیں بندے کے احساس عجز کو گویا الفاظ کی شکل دے دی گئی ہے۔ اللہ کی مدد و نصرت کے بغیر بندہ باوجود با اختیار ہونے کے کتنا بے اختیار دکھائی دیتا ہے۔ ذیل کی مناجات میں انہی کیفیات کی عکاسی ہوئی ہے۔

خذ بلطفک یا الٰہی من لہ زاد قلیل مفلس بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل

کیف حالی یا الٰہی لیس لی خیر العمل سوء اعمالی کثیر زاد طاعاتی قلیل

طال یا ربی ذنوبی مثل رمل لا تعد فاعف عنی کل ذنب فاصفح الجمیل

رب ھب لی کنز فضل انت وھاب کریم اعطنی مانی ضمیری دلنی خیر الدلیل

عـــہ ماخوذ از عربی میں نعتیہ کلام: عبداللہ عباس ندوی لکھنؤ، ۱۹۷۵ء ص ۶۶۔

(ترجمہ) اے خدائے پاک! جس کے پاس توشۂ آخرت بہت کم ہے اپنے لطف و کرم سے اسے نواز۔ اے مولائے جلیل! مفلس سجائی کے ساتھ تیرے در پر آ رہا ہے، بار الٰہا! میرا کیا حال ہوگا؟ میرے پاس تو عمل کی پونجی نہیں۔ برے اعمال زیادہ ہیں، عبادت کا توشہ بہت کم ہے۔ اے میرے رب میرے گناہ ریت کی طرح بے شمار ہیں۔ ہر گنہ معاف کیجئے اور خوشگوار طریقہ سے درگذر فرمایئے۔ اے میرے رب! مجھے اپنے فضل کا خزانہ عطا کیجئے آپ بڑے داتا اور کریم ہیں۔ جو میرے دل میں ہے عنایت کیجئے اور بہترین رہنمائی فرمایئے۔

مناجات میں رقت انگیزی اور تضرع کی ایسی کیفیات ہمیں جدید عربی شعرا کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ تحریک "العصبۃ الاندلسیۃ" کے شعراء کا نصب العین اگرچہ فطرت و حیات کے حسن و جمال سے ادب کو حسین و جمیل بنانا ہے، لیکن بارگاہِ الٰہی میں دعا کے وقت احساس حسن و جمال سراسر احساس بیچارگی میں بدل جاتا ہے ایلیا ابو ماضی کے یہ مناجاتی اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ولیس حالی یا رب داء		ولا احتیاجی الی الدواء
لکن امنیتی بنفسی		یسترها الخوف والحیاء
نقلت! یا رب فصل صیف		فی أرض لبنان او شتاء
فانی ها هنا غریب		ولیس فی غربة هناء[1]

(ترجمہ) اے میرے رب! نہ مجھے کوئی مرض ہے اور نہ مجھے دوا کی ضرورت ہے۔

---

[1] جدید عربی ادب کے رجحانات۔ لکھنؤ ۱۹۷۲ء ص ۹۷۔

لیکن میری آرزو میرے جی میں ہے جس کو خوف و شرم چھپائے ہوئے ہے،
تب میں نے کہا اے رب! لبنان میں جاڑا یا گرمی کا موسم چاہتا ہوں۔ اس لیے
کہ میں یہاں اجنبی ہوں اور اجنبیت میں لطف کہاں؟

فارسی میں مناجات | فارسی شاعری میں مناجات کی عام فضا ہے۔ فردوسی اور عطار سے پہلے بھی فارسی شاعری میں مناجاتوں کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً ویسا ادر اس قبیل کی قدیم کتابوں میں مناجاتوں کا بحسن و خوبی التزام کیا گیا ہے لیکن بحیثیت جزو مثنوی مناجات سب سے پہلے شیخ فریدالدین عطار (م ۱۲۳۰ء) کے یہاں ملتی ہے، چنانچہ ان کی مشہور تصنیف "منطق الطیر" کی ابتدا حمد و مناجات ہی سے کی گئی ہے، فردوسی کے شاہنامے میں بھی مناجاتی عنصر مل جاتے ہیں۔ مولانا رومی کی مثنوی میں تو مناجاتی اشعار جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ حکایتوں کے ضمن میں بھی ان کے یہاں مناجاتی اشعار ملتے ہیں۔ ایک جگہ رومی بارگاہ الٰہی میں حمد و مناجات پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خودثنا گفتن ز من ترک ثنا ست | کیں دلیل ہستی و ہستی خطا ست
اے خدا از فضل تو حاجت روا | با تو یاد ہیچ کس نبود روا [1]

شیخ سعدی کی "بوستان" کا باب دہم تو مناجات ہی کے لیے وقف ہے۔ ان کی مشہور و معروف مناجات "کریما"، تو زبان بر عام و خاص ہے۔

کریما بہ بخشائے بر حال ما | کہ ہستم اسیر کمند ہوا
نداریم غیر از تو فریاد رس | توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

---

[1] مولانا رومی (مرتبہ تلمذ حسین) مرآۃ المثنوی حیدرآباد ۱۹۳۳ء ص ۵۴۳۔

نگہدار مارا ز راہ خطا　　خطا در گذار و صوابم نما[1]

"بوستاں" میں سعدی نے اپنی ذات و کائنات کے احتیاجات کی رفع رسانی دنیاوی پریشانیوں اور دکھوں کے دائمی مداوا کے لیے خدا سے رجوع کیا ہے اور آخر میں اپنی لاج رکھ لینے کی دعا کی ہے۔ عزت نفس کے لیے بارگاہِ الٰہی میں عجز اور تضرع کی ایسی کیفیت کسی دوسری مناجات میں بہ مشکل ہی مل سکے گی۔

مرا شرمساری بہ روئے تو بس　　دگر شرمساری مکن پیش کس

خسرو، نظامی، خاقانی، قدسی وغیرہ نے بھی جو مناجاتیں لکھی ہیں ان میں حد درجہ نیازمندی و انکساری دکھائی دیتی ہے، لیکن اثر آفرینی کے لحاظ سے عراقی کی مناجات بے مثال ہیں۔ ایسا موثر اور لطیف پیرایۂ بیان رسمی مناجاتوں میں اکثر مفقود ہوتا ہے۔

راہ باریک ست و شب تاریک و مرکب لنگ و پیر　　اے سعادت رخ نمائی و اے عنایت دستگیر

زآفتاب مہر خود حمد مرا نورے ببخش　　تا چو ذرہ در فضائے حمد تو یابم مسیر

کے بود کز نور تو روشن شود تیرہ دلم　　کے برو نآید شب بیچارۂ خوار حقیر

از ہوائے خود بفریادم، اغثنی یا مغیث　　در پناہِ لطف افتادم، اجرنی یا مجیر[2]

عنایت الٰہی سے دستگیری کے لیے کی ہوئی عراقی کی دعا کے ان اشعار میں بلا کی عاجزی و دردمندی ہے، معنویت پر شاعر کا عجز بیان چھا گیا ہے۔

سرزمین ہند میں ایرانی شعری روایات کو فروغ دینے میں غالب انیسویں صدی میں یکہ و تنہا نظر آتے ہیں لیکن اپنی افتادِ طبع، شوخیانہ طبیعت اور قلندرانہ

---

[1] شیخ سعدی (مرتبہ محمد علی بن محمد علی) "کریما" دیوبند ص ۲　[2] عراقی (مرتبہ سعید نفیسی) "کلیات عراقی" تہران ۱۳۳۸ ش ص ۸۲۔

مزاج سے انھوں نے "مناجات" میں بھی "ہنگامہ" کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور شوخی کا
کا رس مناجاتوں میں ایسا گھولا ہے کہ وہ ذل و افتقار کے اظہار کے بجائے جرأت
و افتخار کا دفتر نظر آتی ہیں۔ اسی لیے غالب کی بیشتر مناجاتیں بے جان جسم بن کر
رہ گئی ہیں۔ مناجات کی اصل خصوصیت تو اس کا عاجزانہ و گدایانہ انداز ہے۔
ہنگامہ خیزی اور احتجاج پروری اس کا شیوہ نہیں۔ عاجزی مناجات کی روح
ہوتی ہے اور تحیر و درماندگی اس کا حسن۔ عجز و درماندگی سے معرا دعا، دعا ہی نہیں
ہوتی۔ ایسی دعا کو ہم "شکوہ" کہہ سکتے ہیں۔ "دعا" اور "شکوہ" دو علحدہ الفاظ ہی نہیں
ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پس جس دعا میں "شکوہ"، "تکرار" اور "احتجاج" ہو وہ بھلا
دعا کیسے ہو گی۔ ایسے مناجاتی اشعار میں چاہے کتنا ہی طمطراق اور شعری حسن و
جمال ہو مناجاتی شاعری میں، وہ بے قیمت ہیں۔ البتہ قصائد میں بادشاہوں
(ممدوحین) سے "مانگنے" کے لیے یہ طریقہ مستحسن ہو سکتا ہے، شاہوں کے "داتا" کی
بارگاہ میں ایسی جرأت مندی ناروا اور موجب خسران ہے۔ بہرکیف! فارسی
شاعری میں اثر آفرینی کے لحاظ سے نہایت عمدہ مناجاتیں ہیں۔ انکے علاوہ
غزلیات کے بعض اشعار بھی مناجات کے دائرے میں آتے ہیں، جن میں شعرا
خدا سے مخاطب ہو کر اپنی داستان غم سناتے ہیں اور "اس" درد لاعلاج کے لیے
خدائے برتر سے رجوع ہوتے ہیں۔ ایسے مناجاتی اشعار میں بالعموم معشوق کی
بے پروائی اور اوروں کے ستم ڈھانے کا تذکرہ ہوتا ہے۔

اردو میں دعا و مناجات | مناجات کا یہ عربی۔ فارسی انداز اردو شعرا نے
بعینہ اپنایا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں مقامی اثرات اور اردو کا اپنا

مخصوص انداز بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے اردو کی بعض مناجاتیں حدودِ شریعت کے اندر نہیں رہ گئی ہیں۔

اردو کی مناجاتی شاعری میدان تحقیق و تنقید میں قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے تاحال اس پہ غور و فکر کے دروازے بند ہی رہے۔ بر سبیل تذکرہ کہیں کہیں اس کا ذکر ہو جاتا ہے، جس میں نہ دلائل کی تفصیل ہوتی ہے نہ گہرائی فکر۔ اس مضمون میں اس کی تلافی کی ایک حقیر کوشش کی گئی ہے اور اردو ادب کی ابتدا سے موجودہ دور تک کی مناجاتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو میں مناجات بحیثیت صنف بہت کم برتی گئی ہے، لیکن مثنوی کے ترکیبی عنصر کے لحاظ سے اردو مثنوی میں اس کا استعمال عام ہے۔ بعض ایسی مناجاتیں بھی اردو میں ملتی ہیں جو مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً شمالی ہند کے شعرائے متقدمین میں فائز دہلوی کی مناجات اور شعرائے متوسطین میں قائم چاند پوری کی مثنوی مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات وغیرہ اسی قبیل کی مناجاتیں ہیں۔ فائز کی مناجات کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدایا! فضل کر تو بے کساں پر　　کرم یا رحم کر تو عاجزاں پر
خدایا! تو حقیقی بادشا ہے　　مجازی بادشہ تیرا گدا ہے
نہیں ہم کو وسیلہ دوجا اے حق!　　سبھوں کا ہے توہی رزاق مطلق
کہ میں غرق گنہ سرتاپا ہوں　　اسیر نفس کا فرماجرا ہوں
ولیکن تو ہے غفار اے خداوند　　کرم میں تجھ نہیں ہے مثل و مانند[1]

---

[1] فائز دہلوی (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی) "دیوان فائز"، دہلی ۱۹۶۵ء ص ۲۵-۲۴-۲۲۳-

مندرجہ بالا اشعار ایک عاجز بندے کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ گنہ کا اعتراف اور ذاتِ باری سے رحم و ستاری کی امید، بندۂ مضطر کی ایسی بے کسی کو دیکھ کر ہی اللہ رب العزت کا دریائے رحمت جوش میں آتا ہے اور پھر وہ ساری عنایات اس بندے پر نچھاور کر دی جاتی ہیں جن کی اس کو توقع ہوتی ہے۔ وسائل و اسباب پر بندے کا بھروسہ اللہ کو ناراض کرنے کا سبب بن جاتا ہے، ایسے بندے کی صدا بارگاہِ ایزدی میں سنی نہیں جاتی۔ اس کا اللہ کے ساتھ حسن ظن ہی موجب استجابتِ دعا بن جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ بندے کے حق میں اس دعا کا اثر مناسب موقع پر ہی ظاہر کرے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "اللہ بندے کی دعا سُن کر یا تو اسی وقت شرف قبولیت بخشتا ہے یا پھر بجائے اس کے بندے کے حسب حال کوئی دوسری چیز عطا کر دیتا ہے یا نہیں تو آخرت میں اس دعا کا اجر دیا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں مانگی ہوئی بندے کی دعا کا اجر بندہ جب آخرت میں دیکھے گا تو حسرت کرے گا کہ کاش میری ساری دعاؤں کا اجر آخرت ہی میں ملتا۔" فائز نے اس مناجات میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے درگذر کا معاملہ فرمانے کی التجا کی ہے، کیونکہ خدا کا مواخذہ نہایت سخت ہوگا۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ، پس بندے کی یہی امید و بیم والی کیفیت اللہ کو مطلوب ہے۔ "اسیر نفس" اور "سرتا پا غرق گنہ" ہونے پر خوف خدا لیکن ساتھ ہی مولائے کریم کے رحم و کرم کی امید یہی تو مناجات کے موضوعات ہیں۔ اس سے ہٹ کر باغیانہ روش، گستاخانہ لب و لہجہ، شکوہ و شکایت، بے جا ہٹ دھرمی نیز طنز و استہزا مناجات کے مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ اس قسم کی

مناجات بندے کی بے غیرتی پر محمول کی جائے گی۔ کیونکہ مناجات کے لیے سلیقۂ شعاری تضرع و انکساری ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر غالب اور اقبال کے وہ اشعار جن میں بے باکانہ انداز میں "اپنے ناکردہ گناہوں کی حسرت پر داد خواہی کی گئی ہے" اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں "تو بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کرنے" کا دعویٰ کیا گیا ہے مناجات کے دائرے میں نہیں لیے جا سکتے۔ مناجات میں تو بندے کی زاری بارگاہِ قدس میں توجہ کا ذریعہ بن سکتی ہے اور یہ بھی اس وقت ممکن ہے جب بندہ ناکردہ گناہوں کی حسرت کے بجائے اپنے کردہ گناہوں پر منفعل ہو اور اپنی سیہ کاری کی بدولت "کعبہ جانے میں بھی اسے شرم محسوس ہو تو ایسی ندامت پر "شان کریمی" بندے کے "قطرۂ انفعالی" "موتی سمجھ کر چن لے گی"۔

مثنوی کے علاوہ اردو قصائد کی تشبیب میں بھی مناجاتی عنصر دکھائی دیتا ہے فرمانروائے بیجاپور علی عادل شاہ ثانی شاہی (م ۱۶۷۲ء) نے تو حمدیہ قصیدے کے دعائیہ حصہ کو مناجات کے لیے وقف کر دیا ہے۔ قصائد میں اکثر ممدوح کی ستائش کرنے میں "صلہ کی تمنا" چھپی ہوتی ہے اور آخر میں شاعر دعا دے کر اس تمنا کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ اس قسم کی دعائیں دنیا کے شاہوں کو تو "دی" جا سکتی ہیں، لیکن شاہوں کے شاہ مالک الملک الٰہ العٰلمین کی ثنا خوانی کے بعد اس کی بارگاہ میں دعا "مانگی" جاتی ہے۔ دعا دونوں قصائد میں موجود ہے۔ دونوں جگہوں پر دعا کا مقام بھی وہی ہے۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ شاہی قصائد میں شاعر بادشاہ کو "دعا" دیتا ہے۔ اور حمدیہ قصائد میں شاعر "دعا مانگتا ہے"۔ شاہی کے حمدیہ قصیدے میں دعا مانگی گئی ہے۔ یہاں مناجات کی خصوصیت یہ ہے کہ 'تشبیب' کے بعد 'گریز' اور

پھر ثنائے خداوندی۔ اس کے بعد شاعر نے مدح سے دعا کی طرف آنے کے لیے دوبارہ گریز کا ایک شعر استعمال کیا ہے۔

شاہیؔ عاشق آیا بول مناجات کہ ــــــــ تا کرم تج پر ہوئے بہر حسین و حسن[1]

گریز کے اس شعر کے بعد شاہیؔ بارگاہِ ایزدی میں یوں دعا گو ہوتے ہیں۔

کار جہاں کے سگل فکر تے بھاری اچھے ــــــــ سائیں کرے لو بہ جب دور ہو جائے محن

آہ و افسوس کے قبح تے محفوظ دھر ــــــــ سایہ کرم کا دکھا ذوق سوں رکھ مج بدن[2]

اسبابِ دنیا حاصل ہونے کے باوجود شاہی کا مالک الملک کی بارگاہ میں دنیاوی آفات و آلام اور رنج و محن سے خلاصی کی طلب یہ ثابت کرتی ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کو بھی خدائے عزوجل کے در کی گدائی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ سلاطین کے ذکر کی تقریب کی وجہ سے تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر دو۔ ایک مثالیں اور دی جاتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ سلطان گولکنڈہ بڑا مذہبی اور رعایا پرور شخص تھا۔ شاہی تزک و احتشام، عیش کوشی اور تعیش پسندی نے اسے ملک و رعایا کے حالات سے کبھی بھی غافل نہیں رکھا۔ وہ بارگاہ ایزدی میں ملتجی ہے کہ "خدایا! میرے ملک کو رعایا سے معمور رکھ اور مجھے رنج و غم اور انکار و آلام سے مستغنی کر دے۔

مناجات میرا تو سن یا سمیع ــــــــ منجے خوش توں رکھ رات دن یا سمیع

میرا شہر لوگاں سوں معمور رکھ ــــــــ رکھیا جوں توں دریا میں مِن یا سمیع

مرادات کا جم ترنگ سار قطب ــــــــ اوسے سار ہمت دے اجن یا سمیع[3]

---

[1] ۔ [2] شاہیؔ (مرتبہ زینت ساجدہ) "کلیات شاہیؔ"؛ حیدر آباد ۱۹۶۲ء ص ۴۴ [3] قلی قطب شاہ (مرتبہ زور مرحوم) "کلیات قلی قطب شاہ" حیدر آباد ۱۹۴۰ء حصہ اول ص ۲۔

شاعر یہ بھی کہہ رہا ہے کہ جس طرح دریاؤں میں مچھلیاں خوش و خرم محو خرام ہوتی ہیں اسی طرح میرے ملک میں رعایا کو رکھ۔ لدے ہوئے گھوڑے کی مانند قطب بھی مرادوں سے لدا ہوا ہے۔ اس لیے اُجنؔ (اور بھی) اسے ہمت و استقلال نصیب کر اے خدا۔ قدیم مناجاتوں میں فکر ذات کے ساتھ فکر کائنات کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں لیکن قلی قطب شاہ اپنی مناجات میں اپنے ساتھ اپنی رعایا کے لیے بھی دست دعا دراز کرتے ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (جگت گرو) کے دواوین میں بھی مناجاتیں ملتی ہیں۔ آخرالذکر کی کتاب "نورس" کی مناجاتوں میں دیومالا اور صنمیاتی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ سلاطین ہند میں سب سے بدنصیب یاس و حرماں میں گھرا ہوا بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہے۔ اس کی نوا میں سوز اور ناامیدی کا گہرا رنگ ہے۔ حزن و ملال سے پُر دہ اپنی آہیں جب بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہے تو دعا میں افسردگی اور یاسیت کی جھلک صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کیلئے گرچہ بنایا ہوتا کاش خاک درجانانہ بنایا ہوتا[1]

اسطرح اردو کی مناجاتی شاعری میں وقت کے سلطان بھی کشکول تمنا لیے ہوئے درالٰہ پر فقیرانہ صدا لگاتے ہیں۔

امراء و سلاطین کے دربار جس طرح مناجات کی دھنوں سے گونجتے ہیں، اسی طرح خانقاہوں کے در و دیوار سے بھی بے نوا فقیروں کی صدائے مناجات بلند ہوتی ہے۔

---

[1] بہادر شاہ ظفر (مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی) "نوائے ظفر" علی گڑھ ۱۹۵۸ء ص ۶۴۔

قدیم اردو ادب کو پروان چڑھانے والے صوفیائے کرام میں میرانجی شمس العشاق (م ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء) نے جہاں رشد و ہدایت کا کام سنبھال کر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے کام کو آگے بڑھایا وہاں اردو کی نشو و نما کے لیے عوامی زبان میں دعوت دین عوام تک پہنچائی۔ انھوں نے تصوف کے رموز و اسرار اور شرعی احکام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے سیدھی سادی شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اسی لیے انکے انداز بیان، اسلوب و طرز میں عامیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بات کو شعر میں بیان کرنے کی بس ایک کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ قادر مطلق رب العٰلمین سے بے علت نفس اپنی نسبت استوار کرنے اور خدائے عز و جل کی معیت بلاعلاقہ حاصل کرنے کے لیے جہاں اپنے مریدوں اور عامۂ خلائق کو شعری پیرائے میں درس دیا ہے وہاں بارگاہِ ایزدی میں تقرب و معیت اللہ العٰلمین کے لیے مناجات بھی کی ہے۔ "خوش نامہ" جو ان کی تصنیف ہے، اس میں "خوش" نامی لڑکی کے ذریعہ اللہ کی حمد و ثنا کے علاوہ مناجات برائے قرب و معیتِ پروردگار بھی کی گئی ہے۔ اردو ادب کی مناجاتی شاعری میں "خوش نامہ" کو ہم پہلی مستقل کوشش کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ رسالہ مکمل طور پر مناجات ہی پر مشتمل نہیں ہے پھر بھی اس کے زیادہ اشعار مناجاتی انداز کے ہیں۔ میرانجی نے نہایت رقت انگیز انداز میں "خوش" کی زبان سے مناجات کہلوائی ہے۔ یہ مناجات خالصتاً ذاتی نوعیت کی ہے، اس میں "خوش" اپنے مولائے حقیقی سے ملنے کی مشتاق ہے۔ اسی کے اضطراب میں وہ بار بار بارگاہ ایزدی میں آہ و فغاں کرتی ہے کہ "اب تو لوگ مجھے طعنہ دے رہے ہیں، مجھے تیری آس لگی ہوئی ہے اس لیے اے بار الٰہ جلد سے جلد

پیغام بھجواؤ۔ دعا قبول ہوتی ہے۔ فرشتۂ اجل آکر اس کی روح قبض کر لیتا ہے اور خوش "اپنے مولائے حقیقی سے جا ملتی ہے۔ میرانجی کی نظم مناجاتی لب و لہجے میں نہایت موثر اور پُر سوز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تو رحمٰن رحیما میرا مہر محبت بھریا	میں تو باندی بروا تیری تیں منجہ یا توں دھریا
نا میں کیتی بندگی تیری نادھر کیتی یاد	دائم کیتی اگل تیرے سانگوں تجھ فریاد
تیں بھی میرا لاڑ چلایا کبھو نہ ہوا اداس	آپ منڈسیا تو ڑ گسائیں تیری منجہ کو آس[1]

خوش نامہ اردو کی مناجاتی شاعری کا اولین رسالہ ہے جس میں مناجات کے تمام لوازم بحسن و خوبی برتے گئے ہیں۔

دکنی مثنویوں میں مناجات کے مضامین بھی بالعموم نفس مثنوی کے مطابق ہی لیے جاتے ہیں۔ مثلاً ملا وجہی کی "قطب مشتری" عشقیہ داستان ہے۔ اس لیے وجہی مناجات میں عشق و محبت کی باتیں کرتے ہیں۔

نصرتی (م ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) کی "گلشن عشق" میں بلاغت و فصاحت کے جوہر خوب دکھائے گئے ہیں۔ اسی مناسبت سے معنیٰ و بلاغت کے دھنی نصرتی نے مناجات میں سخن دانی اور معنی آفرینی میں سحر حلال کی سی تاثیر عطا کیے جانے کی دعا کی ہے۔

معانی کی کھن کی مجھے دے دوات	جو ہر میں کئی رتن آئیں ہات
دکھاؤں جو تج فیض تے جی خیال	کر اس شعر کوں عین سحر حلال
ہر اک حرف میں کر دکھا جام جم	معانی میں تس بھر مسیحا کا دم[2]

---

[1] بحوالہ، اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام؛ عبدالحق علی گڑھ ۱۹۶۸ء ص ۴۹ [2] ملا نصرتی (مرتبہ شیخ محمد) گلشن عشق۔ حیدرآباد ص ۱۲-۱۳۔

اس کے علی الرغم "علی نامہ" ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ نصرتی نے اس میں دربار بادشاہی کا پُرشکوہ ماحول، جنگ و جدل کے واقعات وغیرہ کی عکاسی کی ہے۔ اسی مناسبت سے مناجات میں نصرتی نے ویسا ہی طنطنہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ شجاعت و جوانمردی اور بامردی جیسی صفات اور ویسا ہی اثر اپنے اشعار کو عطا کرنے کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے۔

میرے جیب کو سیف کر آبدار — عنایت کی رک دم سوں نت تیز دھار[1]
کھڑا جال ہور رن کھانپ دے مجھ قلم — مرا نام نصرت سوں کرواں علم
مرا شعر کر دے زمانے کو برد — یو ہر بیت اچھو شیر مرداں کو ورد
معانی تے تس قرب مرداں کو دے — سکت جنگ جوئی کا گرداں کو دے[1]

دکن کے ایک غیر معروف شاعر مولانا اسحاق کی "ریاض العارفین" خالص صوفیانہ طرز کی مثنوی ہے۔ مثنوی کے موضوعات کی مناسبت سے شاعر نے مناجات میں 'عرفان و حکمت' ہی کے لیے دعا کی ہے۔

سرمۂ عرفاں سوں اپنے مجھ نین — کر منور جوں چراغ انجمن
بخش مجھ کوں گنج عرفاں کی کلید — شکر دے اول بزاں نعمت مزید
مجھ درخت علم کوں شاخ عمل — بخش ہور تس کوں قبولیت کا پھل
دام میں حرص و ہوس کے ہوں اسیر — کر مجھے ملک قناعت کا امیر
دل مرا تجھ یاد سوں آباد رکھ — جز ترے سب سوں مجھے آزاد رکھ[2]

---

[1] نصرتی: مرتبہ عبدالمجید صدیقی، علی نامہ حیدرآباد ۱۹۵۹ء ص ۱۰۔ [2] مولانا اسحٰق: ریاض العارفین دیلوری ۱۲۰۷ھ ص ۵۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم دکنی اردو میں شعرا مثنوی کے موضوعات کی مناسبت سے مناجاتوں کے مضامین باندھا کرتے تھے۔ ان قدیم شعرا میں بعضے ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے مروجہ شعری اصناف کے علاوہ مناجاتوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شاہ ابوالحسن قربیؔ، سید جمال الدین جمالیؔ، سید ابراہیم سید علی زحمتیؔ، نقیرو ناقصؔ وغیرہم اسی قبیل کے شعرا ہیں۔

شاہ ابوالحسن قربیؔ (م ۱۰۸۳ھ) کا مولد بیجاپور ہے۔ اردو کی نشو ونما اور ترقی و ترویج میں بیجاپور اور گولکنڈہ مرکزی حیثیت کے حامل رہے ہیں امراء و سلاطین کے علاوہ ارباب باطن بھی ان شہروں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ چنانچہ رشد و ہدایات کے سلسلوں کو بھی ان میں فروغ حاصل ہوا۔ قربیؔ صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ تصوف و سلوک میں بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ انکے فیوض باطن سے مستفیض ہونے والوں کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ ان کے بعد ان کے اخلاف نے اس سند سلوک کی جانشینی کی ہے۔ قربیؔ کی مناجات میں سچے مومن کا خلوص ٹپکتا ہے اور بندے کا عجز و انکسار مناجات کے ہر لفظ سے عیاں ہوتا ہے۔ شاعر نے اس مناجات میں اللہ رب العزت سے دارین میں کامیابی چاہی ہے اور احکام الٰہی و سنن رسولؐ پر ثابت قدم رکھنے کی دعا کی ہے۔

الٰہی بھکاری ہوں تجہ دار کا — کھڑا ہوں ترے در پولے بار کا
شریعت میں دے استقامت مجے — حقیقت منے رکھ سلامت مجے
ترے ذکر و طاعت کا لذت چکا — علوم لدنی مجے سب سِکا
جہاں کے تمامی یو ذرات سوں — دکھا مجہ کوں تیری حقیقت کا موں[۱]

---

[۱] ابوالحسن قربیؔ "مناجات قربیؔ" (قلمی) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد مختلف اوراق۔

سید جمال الدین جمالؔ (م ۱۱۶۲ھ) نے رشد و ہدایت کے علاوہ اپنی زندگی اللہ کی حمد و مناجات میں گذاری ہے۔ یہ دکن کے مشہور صوفی صاحبِ بصیرت شاہ کمال الدین کمال کے مرید تھے، جن کا مزار گرم کنڈہ ضلع چنور میں مرجع خاص و عام ہے۔ سید جمال الدین کے فیوض و برکات بھی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جمالؔ تصور الٰہ اور ذکر خدا میں رات کو صبح اور صبح کو شام کرتے رہے ہیں۔ افکار و اشغال کی لذت انھیں کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔

رات دن مجہ کوں سو تیرا دھیان یا اللہ   کہ تج بن ایک تل نہ ہوئے اطمینان یا اللہ

سدا تجہ عشق کے دریا میں مجہ کوں کر شناور توں   کہ جیوں غواص ہو نیاؤں گہر عرفان یا اللہ

بحق شہ کمال الدین د لی مرشد کامل   جمال پاک توں اپنا مجھے دے دان یا اللہ[1]

سیدؔ تخلص کے کئی شاعر اردو میں گزرے ہیں، لیکن ایک مناجات (مترجم) میں سیدؔ تخلص کے شاعر نے اپنا پورا نام سید ابراہیم بھی لکھ دیا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد میں موجود یہ مناجات" دعائے داؤد سریانی" کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں جو دعا کی تھی، اس دعا کا وہی درجہ ہے جو قرآن مجید میں سورۂ رحمٰن کا۔ اسرائیلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر یہی دعا تلاوت کرتے تھے۔ اس کا عربی ترجمہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ تصوف کے خانوادہ شہروردیہ میں اس دعا کے ورد کی مداومت کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ ضیاء الدین بخشی

[1] جمال الدین جمالؔ: " مناجات جمال" (قلمی) سالار جنگ میوزیم حیدر آباد ورق ۱ ب ۲: لف۔

سرہ العزیز نے اپنے مریدین کی آسانی کے لیے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ سید ابراہیم نے عربی۔ فارسی تراجم کو سامنے رکھ کر اس دعا کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

انا الموجود لا تقصد سوائی کثیر الخلق فاطلبنی تجد نی

تمہارا یا عبادی میں ہوں مقصود نہ بوجو مجھ بنا کوئی اور معبود

میں سرجن ہار ہوں یہ سب خلق کا جیسے چاہوں کروں اک پل میں نابود[1]

سید تخلص کے کسی اور شاعر کی ایک طویل مناجات بھی ادارے میں محفوظ ہے۔ دراصل یہ مناجات بجائے خدا کے محبوب سبحانی سے کی گئی ہے، جو از روئے شریعت نہ صرف بدعت بلکہ "شرک" کے دائرے میں آجاتی ہے۔ ایسا ہی ایک اور مخطوطہ غفار نامی کسی شاعر کا ہے۔ اس میں شاعر نے حضورؐ سے التجا کی ہے۔ ان دونوں مناجاتوں کے تعارف ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دکنی کے شاعر علی زحمتی کی مناجات بھی بڑی موثر اور پُر درد ہے۔ تضرع اور الحاح کی کیفیت ہر شعر سے عیاں ہے۔ شاعر گریاں کناں ہے کہ ؎

تیرا نام قاضی جو حاجات ہے کلیاں سب کے دل کی ترے ہات ہے

ترے فیض رحمت سوائے کردگار علی زحمتی کو (ہے) تیرا ادھار[2]

زحمتی کوئی کہنہ مشق شاعر دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی دکنی زبان میں مراٹھی کے اثرات بہت ہیں ہو سکتا ہے کہ شاعر مراٹھی علاقے کے قریب کا رہا ہو۔

---

[1] مجموعہ دنیا لٹف کراچی بلا مورخہ ص ۵، ۷ [2] علی زحمتی: "مثنوی مناجات" (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد۔ ورق ۱-۲۔

اب رہے فقیر و ناقص۔ تو ان کی مناجاتوں کا ایک مجموعہ ادارے میں موجود ہے۔ فقیر کی مناجاتوں میں تخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس لیے یہاں چنداں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ البتہ ناقص کی مناجاتوں میں بڑا سوز ہے۔ خواجہ محمد ناقص (م ۱۲۹۳ھ) ملکاپور (برار) کے قاضی تھے۔ محبوب الزمن کے مرتب صوفی عبدالجبار خاں مرحوم و مغفور ملکاپوری نے ناقص کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ایک مناجات میں ناقص اللہ سے ہدایت اور نیک اعمال کے لیے ملتجی ہیں۔ انداز بڑا موثر ہے اور جگہ جگہ اپنی کوتاہ دستی اور مجبوری کا اعتراف ہے۔

رضا کتب خانہ رامپور میں "وظائف فتحیہ" نام کا ایک مخطوطہ ہے، جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ نواب فتح علی خاں قزلباش لاہوری نے اسے مرتب کیا تھا۔ اس میں وہ تمام دعائیں درج کر دی گئی ہیں جو مختلف انبیاء و رسل سے منسوب ہیں۔ مثلاً دعائے آدمؑ، دعائے داؤدؑ، دعائے ابراہیمی وغیرہ۔ اس میں ایک منظوم مناجات بھی ہے جو کسی نامعلوم شاعر کی ہے۔ دعائیں بڑی رقت اور کسک سے ہے۔ مناجات کے ایسے ہی مجموعے "نظم الہدایت" اور "کنز المصلیٰ" بالترتیب مولانا غلام جیلانی اور کسی نامعلوم شاعر کے نیشنل میوزیم دہلی کے مخطوطات میں ہیں۔ یہ دونوں مجموعے منظوم مناجات پر مشتمل ہیں۔ اثر آفرینی اور سوز و گداز سے پر یہ دعائیں فنی لحاظ سے نہایت کمزور ہیں۔ ان میں شعراء نے اپنی اکثر دعاؤں میں اللہ رب العزت سے دنیا میں سرفرازی اور تنگ دستی و بدحالی سے نجات چاہی ہے۔ یہ شعراء اپنی ذات کے ساتھ کائنات کی بات بھی مناجات کے ذریعہ قاضی الحاجات کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔

(باقی)

جلد ۱۴۸ ماہ صفر المظفر سنہ ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۹۱ء عدد ۳

اُردو کی مناجاتی شاعری

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

(۲)

پچھلے صفحات میں کہا گیا ہے کہ محلوں اور درباروں کے علاوہ تصوف اور خانقاہی نظام بھی شاعری کی پرورش و پرداخت کے لیے بڑا مفید رہا ہے، اس کی بدولت اردو شاعری کے قالب میں مذہب کی روح داخل ہوگئی، خواجہ میر درؔد (م ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء) کی شاعری صوفیانہ تھی۔ اگرچہ دردؔ کے دیوان میں سبھی کچھ ہے۔ مادی عشق کی سرشاری و سرمستی بھی اور خالق یکتا و حقیقی سے انسیت و محبت کی فراوانی بھی، لیکن بشری کمزوریوں کے حامل اشعار چھانٹ لیے جائیں تو خالص تصوف و مذہبیت ان کے دیوان کی اصل خصوصیت معلوم ہونے لگے گی۔ دراصل تصوف کی چاشنی اور اس کی لطافت و سرمستی نے درد کی شاعری کو جو آہنگ بخشا اور ان کی حسرت زدگی کے انداز نے شاعری میں جو رنگ پیدا کر دیا اس سے انکے عہد کی شاعری بہ استثنائے میرؔ بے رنگ ہو کر رہ گئی۔ درد کی شاعری ایسی تاثیر سے معمور ہے جس میں مجاز و حقیقت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس میں حیرت و استغراق کا اظہار بھی ہے اور حسرت و یاس سے مملو افکار بھی۔ وہ ربّ العٰلمین پر کس حسرت و یاس اور سرمستی کے عالم میں نالۂ آہ سر کرتے ہیں۔

مجھے در سے اپنے تو ٹالے ہے، یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں ؏ کوئی اور بھی ہے ترے سوا؟ تو اگر نہیں تو جہاں نہیں [۱]

---

[۱] خواجہ میر درد (مرتبہ رشید حسن خاں) "دیوان درد" دہلی ص ۶۰۔

یہ شعر ان کے دل کی انتہائی گہرائی سے نکلا ہوا ہے جو تاثیر کے لحاظ سے بڑی بڑی مناجاتوں پر بھاری ہے۔

دردؔ کے کم و بیش سو سال بعد اسد اللہ خاں غالبؔ اپنے آدھے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ باوجود "موحد" ہونے اور "کیش ترک رسوم" کا دعویٰ کرنے کے نہایت تشکک انداز میں خدا سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں ع کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ اور ع پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

غالبؔ کے حمدیہ اشعار کا تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ چونکہ وہ اپنی زندگی میں ناکامیوں اور پریشانیوں کا سامنا کرتے رہے تھے، اس لیے ان کے یہاں تشکیک، تلخی، شکست خوردگی اور نامرادی پیدا ہو گئی تھی۔ یاس اور ناکامی کی اس کیفیت کے زیر اثر غالبؔ خدا کو بھی طنزیہ انداز میں مخاطب کرتے ہیں، لیکن جہاں خدا سے مانگنے کی نوبت آجاتی ہے تو وہی جری غالبؔ خدا کے سامنے مجسم مغلوب اور سراپا عجز بن جاتے ہیں۔

غدر کے بعد دہلی کے اجڑتے ہوئے ماحول سے گھبرا کر استادان فن وہاں سے رخت سفر باندھتے ہیں۔ پورب (لکھنؤ) کے ساکنین ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چنانچہ دہلی کی ساری رعنائیاں و رنگینیاں اب لکھنؤ میں عود کر آتی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اس دور کے لکھنؤ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"ہر لب پہ گل کا افسانہ، ہر زبان پہ بلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینے میں جوش تمنا ..... ضلع جگت اور تالیاں۔ قہقہہ اور گلے بازیاں۔ ہر طرف رندی و مستی کا جوش و خروش۔ ہر گوشہ بساطِ دامان باغبان و گل فروش"[1]

---

[1] عبدالماجد دریاآبادی اردو کا ایک بدنام شاعر" مشمولہ کلیات مرزا شوق (مرتبہ عبدالسلام) ۱۹۷۱ء ص ۳۵۔

اس "جنت نظر" اور "فردوس گوش" فضا میں اگرچہ آسودگی اور تعیش پسندی کا دور دورہ تھا لیکن مذہبی رواداری بھی باقی تھی۔ چنانچہ اثنا عشری عقائد کے تحت میر انیس (م ۱۸۷۴ء) اور مرزا دبیر فریضۂ مذہبی کی بجا آوری کے لیے مجلس تولا و تبرا سجاتے ہیں۔ وہ مناقبِ حسنین و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ ہی حمد و مناجات کی زمزمہ خوانی میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ لکھنؤ اس دور میں چونکہ شاعری کا مرکز تھا، گھر گھر شاعری کے چرچے تھے۔ مناسبتِ لفظی، ضلع جگت، ایہام گوئی اور حاضر جوابی کے ماحول میں انیسؔ بھی اللہ رب العزت سے "اعجاز بیانی" کا مطالبہ کرتے ہیں۔

یارب! چمنِ نظم کو گلزار ارم کر	اے ابرِ کرم! خشک زراعت پہ کرم کر
توفیض کا مبدا ہے، توجہ کوئی دم کر	گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے[1]

آخری شعر میں "مناسبت لفظی" کے تحت "اقلیم سخن" کے ساتھ "قلمرو" آیا ہے قلم اور سخن میں لفظی مناسبت ہے، جس کے برجستہ استعمال سے شعر میں لفظی حسن پیدا ہو گیا ہے۔ دراصل انیسؔ جس ماحول میں سانس لے رہے تھے اس میں لذت کوشی اور عیش پروری کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں شاعری میں بھی داخلیت کے بجائے خارجیت اور معنویت کے بجائے الفاظ کی صورت گری ہی کی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے لکھنوی شعراء کی اکثریت معنویت کے علی الرغم پرشکوہ الفاظ کی صورت گری کرتی ہے لیکن انیسؔ نے صوری حسن کے ساتھ ہی معنوی صداقت کا

---

[1] مرزا انیسؔ (مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری) "باقیات انیسؔ" لکھنؤ جلد اول ص ۱۔

بھی خیال رکھا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اردو تہذیب "مد" سے "جزر" کی طرف لوٹنے لگی تھی۔ میر کی پرکاری غالب کا طلسم گنجینۂ معنی اور مومن کا سحر حلال کوئی بھی انگریزوں کے کالے جادو پر اثر انداز نہ ہو سکا تو مولانا الطاف حسین حالی (م ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) "میر کا درد، شیفتہ کی سادگی اور غالب کا انداز بیان" اپنا کر سرسید کی ہمنوائی میں اصلاح قوم کی خاطر بارگاہِ ایزدی میں فریاد کناں ہوتے ہیں۔

انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے
کمیں گاہ بازئ دوراں دکھا دے جو ہونا ہے کل، آج ان کو سجھا دے

چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے[1]

دراصل حالی نے مناجاتی شاعری کی تجدید کی ہے، ان کی "مناجات بیوہ" سے اردو کی مناجاتی شاعری کو گویا مہمیز ملی ہے۔ شعرائے متوسطین نے جس صنف کو پس پشت ڈال دیا تھا اور جدید شعرائے نے جسے لائق التفات نہیں سمجھا تھا حالی نے اسے دوبارہ قوت بخشی اور نئے انداز میں اسے متعارف کرایا۔ "مناجات بیوہ" جو مثنوی کی شکل میں ہے شیفتہ کے فطری انداز، میر کی دل گدازی، سرسید کی سادگی اور ظفر کی آہ وزاری کا گویا مرقع ہے اور جیسا کہ حالی نے اپنے مقدمہ میں شعر کی اثر آفرینی پر زور دیا ہے، مناجات لکھ کر اس کی مثال پیش کر دی ہے۔

---

[1] الطاف حسین حالی (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) کلیات نظم حالی لاہور ۱۹۷۰ء جلد دوم ص ۱۷۶۔

ہندوستان میں مسلمان غالب قوم کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے، لیکن یہاں کی تہذیب نے انہیں مغلوب کر دیا۔ مقامی معاشرت کی کئی رسمیں مسلم معاشرے میں ایسی درآئیں کہ اصلاح کی کوششوں کے باوجود وہ ختم نہیں ہوئیں۔ بیوہ کے نکاح ثانی کا عدم تصور بھی ایسی ہی ایک جاہلانہ رسم تھی۔ حالانکہ اسلام میں خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے علاوہ باقی تمام ازواج مطہرات سے بیوگی کی حالت میں نکاح کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ غلط رسم مسلم معاشرے میں بھی پوری طرح موجود تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۷۶۲ء) کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھانے والوں میں سید احمد بریلویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسرے علمائے کرام نے اس قبیح رسم کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ سرسید احمد خاں نے اصلاح قوم کیلئے "تہذیب الاخلاق" رسالہ جاری کیا۔ حالیؔ نے جو سرسید کے مشن سے بخوبی واقف تھے اور مذہبی جذبہ بھی بدرجہ اتم رکھتے تھے، ولی اللہی تحریک اور سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوکر "بیوہ کے نکاح ثانی" کا خیال دلوں میں مضبوط بٹھانے کے لیے نہایت موثر انداز میں ایک مناجات لکھی، جس میں بیوہ کی تمام کیفیات اس کے نسوانی جذبات وخواہشات اور ظاہری وباطنی درد والم کا برملا اظہار نہایت رقت خیز انداز میں کیا گیا ہے۔ اس مناجات کی اثرآفرینی کا یہ حال تھا کہ اس کے ترجمے ہندی اور سنسکرت[۱] کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی ہوئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ باوجود مرد ہونے کے حالیؔ نے کمسن بیوہ کے صحیح جذبات واحساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ

---

[۱] الطاف حسین حالیؔ (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)، کلیات نظم حالیؔ لاہور ۱۹۷۰ء، جلد اول ص ۵۹۔

سب کچھ ان پر بیت چکا ہو۔ شعرائے جدید میں تنہا حالی نے طبقۂ نسواں کی ہمدردی اور دل سوزی میں طویل نظمیں لکھیں اور ان کے مسائل پر صدق دل سے عام لوگوں کو غور و فکر کرنے کے لیے ابھارا۔ ایک اور نظم "چپ کی داد" میں بھی حالی نے نسوانی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان دونوں نظموں میں مظلوم طبقۂ نسواں کی وکالت موثر انداز میں کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اپنانے کی دعوت دی گئی ہے۔

جس طرح "مناجات بیوہ" کی ادبی حیثیت مسلم ہے، اسی طرح مناجاتی شاعری میں بھی وہ بے نظیر ہے۔ بارگاہ ایزدی میں دعا کے جو آداب ہیں۔ حالی نے ان کا اہتمام اس مناجات میں پابندی کے ساتھ کیا ہے، تضرع، عجز، خاکساری اور رجوع الی اللہ والی کیفیت دعا میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ اس معیار پر بھی "مناجات بیوہ" پوری اترتی ہے۔ مناجات کی ابتدا حمد سے ہونا لازمی ہے۔ حالی نے اپنی مناجات میں اس کا بھی اہتمام کیا ہے۔

اے سب سے اول اور آخر — جہاں تہاں حاضر اور ناظر
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں، جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
آبادی جنگل کا نمونا — دنیا سونی اور گھر سونا[۱]

مندرجۂ بالا اشعار میں حالی نے معاشرے میں تڑپتی ہوئی بیوہ کی تمام

۱؎ الطاف حسین حالی (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) کلیات نظم حالی لاہور، ۱۹۷۰ء جلد دوم صفحات ۱۵-۱۳۵

سب کچھ ان پر بیت چکا ہو۔ شعرائے جدید میں تنہا حالی نے طبقۂ نسواں کی ہمدردی اور دل سوزی میں طویل نظمیں لکھیں اور ان کے مسائل پر صدق دل سے عام لوگوں کو غور و فکر کرنے کے لیے ابھارا۔ ایک اور نظم "چپ کی داد" میں بھی حالی نے نسوانی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان دونوں نظموں میں مظلوم طبقۂ نسواں کی وکالت موثر انداز میں کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اپنانے کی دعوت دی گئی ہے۔

جس طرح "مناجات بیوہ" کی ادبی حیثیت مسلم ہے، اسی طرح مناجاتی شاعری میں بھی وہ بے نظیر ہے۔ بارگاہ ایزدی میں دعا کے جو آداب ہیں۔ حالی نے ان سب کا اہتمام اس مناجات میں پابندی کے ساتھ کیا ہے، تضرع، عجز، خاکساری اور رجوع الی اللہ والی کیفیت دعا میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ اس معیار پر بھی "مناجات بیوہ" پوری اترتی ہے۔ مناجات کی ابتدا حمد سے ہونا لازمی ہے۔ حالی نے اپنی مناجات میں اس کا بھی اہتمام کیا ہے۔

اے سب سے اول اور آخر — جہاں تہاں حاضر اور ناظر
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں، جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
آبادی جنگل کا نمونا — دنیا سونی اور گھر سونا[1]

مندرجۂ بالا اشعار میں حالی نے معاشرے میں تڑپتی ہوئی بیوہ کی تمام

[1] الطاف حسین حالی (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) کلیات نظم حالی لاہور، ۱۹۷۰ء جلد دوم صفحات ۵-۱۴-۱۵۔

نفسانی اور جذباتی کیفیات کو پیش کر دیا ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے سماج میں بیوہ کس طرح کس مپرسی اور بد ترین حالت میں زندگی گذارنے کے لیے مجبور کر دی جاتی تھی۔ ایسے سفاک اور ظالم سماج میں بیوہ کے لیے امید کی آخری کرن اور سہارا درِ الہٰ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حالیؔ نے "مناجات بیوہ" لکھ کر دراصل ساری بیواؤں کو یہی در کھٹکھٹانے کے لیے اکسایا ہے اور اپنی رام کہانی اسی کی بارگاہ میں سنانے کی تلقین کی ہے۔ اس طرح حالیؔ کی یہ مناجات اردو کی مناجاتی شاعری کا گل سرسبد ہے۔

حالیؔ کے معاصرین میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی (م ۱۹۱۷ء) نے بھی مناجاتیں لکھی ہیں۔ ان کا کلام سادگی کا عمدہ نمونہ اور پاکیزہ جذبات سے مملو ہے۔ گو یہ "ادب الاطفال" کے زمرے میں آتا ہے، لیکن یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی شاعری اپنی سلاست و سادگی اور لطافت و شیرینی کی وجہ سے قاری کے قلب و ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ مناجاتوں میں اسمٰعیل میرٹھی حمدیہ اشعار اکثر بڑی تعداد میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنا مدعا اللہ العٰلمین کی بارگاہ میں صرف چند لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی مناجاتیں لفظی و معنوی صنعت و آرایش سے خالی ہونے کے باوجود موثر اور دلآویز ہیں۔

خدایا مری خواہشوں پر نہ جا ۔۔۔ جو تیری رضا ہے وہی ہے بجا

تقاضا مرا سخت معیوب ہے ۔۔۔ جو مرضی ہے تیری وہی خوب ہے[۱]

حالیؔ اور شبلیؔ کے صحبت یافتہ سید وحید الدین سلیمؔ (م ۱۹۲۸ء) کی شاعری بھی اعلیٰ مقاصد اور مفید خیالات کا مجموعہ ہے۔ "افکار سلیم" میں درج دعا ان کے افکار عالیہ کا

---

[۱] اسمٰعیل میرٹھی: "کلیات اسمٰعیل میرٹھی"، میرٹھ ۱۹۱۰ء ص ۲۴۹۔

پتہ دیتی ہے۔ اس میں شاعر نے اپنی ذات کی اصلاح کے ساتھ ہی اپنے احباب کی اصلاح کے لیے کتنی سادگی و پرکاری سے دعا مانگی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

ڈال دے میری صدا سے کھلبلی احباب میں ۔۔۔ بھر دے برقِ زندگی انکے دلِ بیتاب میں
زندگی کے ساغروں میں منتقل کر دے انہیں ۔۔۔ گردشیں طوفان نے دیکھی ہیں جو گرداب میں[1]

سلیم، اقبال کی طرح اضطراب کے قائل ہیں۔ اقبال نے جس طرح قوم کے نوجوانوں کو "طوفان سے آشنا" کرا دینے کی دعا کی تھی، تاکہ بحرِ حیات میں اضطرار و تموج رہے، اسی طرح سلیم نے بھی دعا کی ہے کہ خدایا! میرے احباب کے زندگی کے ساغروں میں گردشیں اور طوفان منتقل کر دے۔

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) کا فلسفۂ دعا بڑا عجیب و غریب ہے انکے نظریہ کے مطابق دعا کے ذریعہ خدا سے مانگنے کے بعد آدمی کو اپنی جگہ جامد و خاموش نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے حصول کے لیے پوری مستعدی سے کوشاں ہونا چاہیے انکے نزدیک دعا کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ اسی کلیہ کے تحت اقبال نے "بچے کی دعا"[2] بھی لکھی ہے جس میں "غریبوں کی حمایت"، "دردمندوں سے محبت" اور "وطن کی زینت" کا ولولہ نصیب کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ اقبال جن کا نفس آہ میں مستور اور سینۂ سوزاں فریاد سے معمور رہے، بعض جگہ سوئی ہوئی قوم کی بے حسی اور جمود سے پریشان ہو کر دنیا کی انجمن سے الگ تھلگ فاطر السمٰوٰت والارض کی محفل فطرت میں جانشینی کی آرزو رکھتے ہیں۔ جہاں نہ دنیا کے رنج و غم کا کانٹا دل میں رہے نہ شورشِ افکار

---

[1] مولوی وحید الدین سلیم (مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)، افکارِ سلیم: پانی پت ۱۹۳۸ء ص ۱۰۴

[2] علامہ اقبال: بانگ درا۔ دہلی ص ۲۵۔

وآلام۔ وہ قوم کے بے محل و بے موقع "ذوق گویائی" سے پیدا شدہ پراگندہ و شوریدہ تر ماحول سے ہٹ کر پُر سکوت جگہ کے متلاشی ہیں جہاں دیر و حرم سے اٹھنے والی ناقوس و اذان کی آواز کا بار احساں کانوں کو نہ اٹھانا پڑے اس لیے بارگاہِ ایزدی میں وہ اپنی آرزو کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم — امیدان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے انکو کٹیا مری دکھا دے — جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے — بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے[1]

بانگِ درا کی درج ذیل دعا دیکھئے آج کے حالات پر کتنی صادق آتی ہے۔

یا رب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا — امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے[2]

موجودہ دور میں مسلم "خوابیدہ" ہی نہیں، بے حسی اور تعطل کا بھی شکار رہا ہے، جمود کی اس کیفیت نے متاعِ دین و ملت کے لٹ جانے کا غم اس کے دل سے نہ صرف یہ کہ چھین لیا ہے بلکہ "احساس زیاں" سے بھی اسے محروم کر دیا ہے۔ افراد کی ایسی حالت ہی قوم کے ناکارہ اور ذلیل ہو جانے کی دلیل ہے۔ اس لیے اقبال التجا کرتے ہیں ؎

پیدا دلِ ویراں میں، پھر شورشِ محشر کر — اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلےٰ دے[3]

"بانگ درا" میں اقبال کا مناجاتی اسلوب بڑا ہی متلون دکھائی دیتا ہے۔ کبھی تو

---

[1] علامہ اقبال: "بانگ درا" (ایک آرزو) دہلی ص ۳۶ [2] ، [3] بانگ درا ص ۱۶۰۔

وہ مناجات میں شکایات کے دفتر کھول دیتے ہیں اور آہ و زاری کی جگہ زود رو شکوہ سے کام لیتے ہیں کبھی اولیائے عظام کے آستانے پر کھڑے ہو کر ان سے ہی التجا کرتے ہیں کبھی حضور رسالت مآبؐ میں اپنا دکھڑا سناتے ہیں۔ دعاؤں میں اقبال کی یہ متلون مزاجی "آداب دعا" کے منافی ہے۔ اس کے علی الرغم "بال جبریل" کی دعاؤں سے اقبال نے "حریم ذات میں شور" اور "بتکدۂ صفات" میں "غلغلہ ہائے الاماں" بلند کر دیا ہے۔ اقبال کی آہ و فغاں سے پُر دعا کی زود اثری سے "کعبہ و سومنات" میں رستخیزی کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ لیکن اقبال اسی پہ قناعت نہیں کرتے بلکہ بارگاہِ ایزدی میں "گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کرنے" کی درخواست کرتے ہیں۔

خدائے ذوالجلال کے آگے اپنی بے حیثیتی کا اقرار کرتے ہوئے اقبال یوں دعا گو ہوتے ہیں۔

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر[1]

اقبال ہمیشہ عمل پیہم اور جہد مسلسل کے طرفدار رہے ہیں۔ خانقاہی نظام میں "اللہ ہو" کے ورد سے "نان جویں" تو خدا کی طرف سے حاصل ہو جائے گی لیکن عمل پیہم کے لیے بازوے حیدرؓ بھی مومن کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے وہ درگاہ پہ دعا کرتے ہیں۔

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر

جسے نان جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر[2]

---

[1] علامہ اقبال: "بال جبریل" دہلی ص ۹ [2] ایضاً ص ۷۔

اقبالؔ بارگاہِ قدس میں بندے کے تقاضاہائے بیجا کی حرمت کے قائل ہیں ، کیونکہ اس طرح کی ضد تو صرف پیغمبروں کو روا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کی ضد "ارنی" کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی ضد قوم لوط کے لیے (یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ) (سورۂ ہود ۷۴) عام لوگ چونکہ پیغمبرانہ شان نہیں رکھتے اس لیے درالٰہ پہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی خلافِ بندگی ٹھہرے گی۔ البتہ بندے کی عبدیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ آستانۂ الٰہ کو نہ چھوڑے۔ اس کے در کی جبہہ سائی ہی بندے کو مستغنی کرسکتی ہے۔ مسجد قرطبہ میں اقبالؔ نے جو دعا مانگی تھی اس میں ان تمام چیزوں کا اعتراف ہے۔ کہتے ہیں۔

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر — میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ — تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام — تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو[1]

اقبال نے چند تاریخی مناجاتیں بھی نظم کی ہیں۔ اسلامی جغرافیہ میں اندلس تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اندلس مسلمانوں کے قبضہ میں ۷۱۱ء میں آگیا تھا۔ بنوامیہ کے خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کے عہد حکومت (۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) میں اندلس کی شان و شوکت انتہائی عروج پہ پہنچ چکی تھی۔ اس بلندی کا راز مسلمانوں کی سرفروشی کی تمنا، طارقؒ کی سالاری اور ان کے تعلق باللہ میں مضمر تھا۔ میدان جنگ میں طارقؒ اپنے سپاہیوں کو لے کر پہنچتے ہیں تو صف بندی کے بعد خدا سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں ؎

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں

---

[1] علامہ اقبال: بالِ جبریل دہلی: دعا (مسجد قرطبہ میں) ص ۱۷۔

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے [1]

زور جنوں میں اپنی آشفتہ سری سے مسلمانوں کا دکھڑا رونے والے اقبالؔ بارگاہ ایزدی میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتے۔ آستانۂ الٰہ پہ جب بھی دعا کے لیے ان کے ہاتھ اٹھتے ہیں تو زبان پر قوم مسلم کی زبوں حالی، بے کسی اور بے بسی آجاتی ہے اور وہ نہایت تضرع کی حالت میں کہہ اٹھتے ہیں ؂

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد [2]

لیکن یہی اقبالؔ جب شکوہ پہ اتر آتے ہیں تو کہتے ہیں۔

یارب! یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند [3]

اپنے شکوہ پہ اقبالؔ نادم ہوتے ہیں تو خود ہی کہتے ہیں۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند [4]

صوفی شعرا میں حضرت امجدؔ حیدرآبادی، بے نظیرؔ وارثی اور صفیؔ اورنگ آبادی کا مرتبہ بلند ہے۔ امجدؔ کی رباعیات تو کلی طور پر تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بے نظیرؔ کی مثنویوں میں اقبال کا لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔ صفیؔ کو تصوف کی تعلیمات نے صابر و شاکر اور متوکل بنا دیا تھا۔ ان کے دیوان "پراگندہ" میں توکل کے حامل اشعار کثیر تعداد میں ہیں۔ ذات اقدس پر ان کا یقین اور اعتماد اس درجہ ہے کہ وہ ہر عمل میں اسی سے استعانت و اعانت کے طالب رہتے ہیں۔

---

[1] علامہ اقبالؔ: بال جبریل دہلی: دعا .... (طارق کی دعا) ص ۸۲ [2] ایضاً ص ۱۴
[3] ایضاً ص ۱۳ [4] ایضاً ص ۱۳۔

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے | غافل ہزار کام کا یہ ایک نام ہے[1]

وہ خود بھی خلاق اکبر کی بارگاہ میں یوں دعا گو ہیں ۔

تو وہ ہے جو ہر ایک کی بگڑی سنوار دے | میری مراد بھی مرے پروردگار دے
کونین میں ذلیل نہ کر سب کے روبرو | ایمان و عیش و دولت و عزو وقار دے
تیرا یہ حکم مانگ ہر اک چیز مجھ سے مانگ | میری دعا کہ دے مرے پروردگار دے[2]

حفیظؔ جالندھری (م ۱۹۸۱ء) نے ایک طرف عظمت اللہ خاں کے بحور و قوافی کو اپنایا ہے تو دوسری طرف علامہ اقبالؔ کے اسلامی افکار کو قبول کیا ہے انکے "شاہنامۂ اسلام" "نغمۂ زار" اور "سوز و ساز" وغیرہ میں اسلامی افکار و اقدار کی فراوانی ہے ۔ ایمان کی چاشنی نے ان کی عقیدت مندانہ شاعری میں نکھار پیدا کر دیا ہے ۔ خدا کا یقین ، اس کی معبودیت کا اقرار اور اس کی ذات یکتا سے والہانہ محبت ان سارے مومنانہ جذبات کا سرچشمہ حفیظؔ کا ایمانی قلب رہا ہے ، جس میں روحانیت کے سوتے بھی آکر ملتے ہیں اور عقل و فکر کی موجیں بھی اٹھتی ہیں ۔ حفیظؔ کے یہاں بھی صفی کا سا توکل ہے ۔

کشتی خدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہوں مطمئن | دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں[3]

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے ۔ حفیظؔ بھی اس کلیہ کے تحت خدا کو مصیبت کے وقت یاد کر لیتے ہیں ؎

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظؔ | ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں[4]

---

[1] صفی اورنگ آبادی : "پراگندہ" : حیدرآباد ۱۹۷۵ء ص ۱۰۶ [2] ایضاً ص ۱۸ [3] حفیظ جالندھری "سوز و ساز" لاہور ص ۲۲۴ [4] ایضاً ص ۲۳۱ ۔

طوفان میں گھری ہوئی کشتی میں اسی عادت کے مطابق وہ خدا کو یوں یاد کرتے ہیں

اے نوحؑ کے کھویا لگ جائے پار نیّا
بندوں کا تو خدا ہے اور تو ہی ناخدا ہے

تیرا ہی آسرا ہے[1]

حامد اللہ افسر میرٹھی کی شاعری میں حفیظ کا رنگ غالب ہے۔ "رموز توحید" کے کاشف، افسر بارگاہِ وحدہٗ لاشریک میں "عرض نیاز" کرتے ہیں تو اللہ کی بڑائی اور اپنی عاجزی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں تاکہ بندۂ گستاخ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکلے جو شانِ کریمی میں پکڑ کا موجب بن جائے۔

تابکے چشمک زنی اے برقِ حسنِ بے پناہ یا تو اک دم پھونک دے یا نور سے بھر دے مجھے
میں ترے گھر آؤں جس در سے نہیں اسکی طلب تو مرے گھر آئے جس در سے وہی در دے مجھے
ہے اگر کچھ رحمتوں کے صرف بیجا کا خیال اپنی اس دنیا کو تو جنت بنا کر دے مجھے[2]

آگے جدید مناجاتی شاعری پر بحث و گفتگو کر کے اس میں سماجی مسائل و عناصر کی نشاندہی کی کوشش کی جائے گی۔

علامہ اقبال کے بعد کارل مارکس کے نظریات کے زیر اثر اردو شاعری میں زندگی کی شدتوں اور تلخیوں کا ذکر اور سماج کے ابتر حالات و مسائل کا چرچا بہت نمایاں نظر آتا ہے، ترقی پسند شعرا کے یہاں یہ اثر زیادہ دکھائی دیتا ہے ان کے بعد کے شعرا نے روایات کے بند کاٹ کر اردو شاعری کے سیل تند تیز کو

---

[1] حفیظ جالندھری: "نغمہ زار" (طوفانی کشتی) لاہور ص ۹۱ [2] افسر میرٹھی (مرتبہ ذکی کاکوری) "نظم انسائیکلوپیڈیا" دہلی، ۱۹۷۰ء ص ۲۳۰-۲۳۱۔

"جدیدیت" کی آب جو سے ملانے کی کوشش کی ہے، بعض ترقی پسند شعرا بھی ان کے ہم نوا بن گئے۔ اس طرح اردو شاعری میں جدیدیت کا قافلہ اپنی نامعلوم منزل کی طرف "بے مقصد" بڑھتا رہا اور آج بھی وہ محو خرام ہے۔

جدیدیت کے اس قافلہ کی ابتدائی منزل میں سیاسی و اجتماعی زندگی کے مسائل کا اظہار شاعری میں حرام قرار دیا گیا تھا لیکن بدلتے حالات کے تقاضوں کی وجہ سے پہلے انہیں ممنوعات اور پھر مکروہات کے درجہ میں رکھا گیا ہے اور اب تو کراہت بھی جاتی رہی اور انہیں مرغوبات میں شمار کیا جانے لگا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ آئندہ ان کو حلال اور فرض تصور کر لیا جائے۔

رنج و مسرت، تکلیف و راحت، پریشانی و شادمانی، ناکامی و کامرانی، تنگی و تونگری، فقر و فراغ، اضطرار و قرار اور سود و زیاں راہ حیات کے ناگزیر مراحل ہیں۔ اس پر مستزاد عصر جدید کی پیچیدہ اور تشویش ناک صورت حال نے آدمی کی نفسیات اور ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے تشدد پسندی بربریت، گھبراہٹ، شکست و محرومی اور یاس انگیزی جیسے Complexes آدمی کا مقدر بن گئے ہیں۔ ان تمام جھمیلوں سے آدمی جب بے بس ہو جاتا ہے تو بالآخر اعانت کے لیے خدا کو پکارتا ہے، اسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، اسی کے آگے جھکتا ہے، اسی کے قدموں پر اپنا سر ٹیکتا ہے۔ اس طرح کی آہ و زاری میں بندہ کبھی اپنے عجز کا اقرار اور خود سپردگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی ذاتی کا دکھڑا سنانے لگتا ہے اور کبھی سماجی مسائل و اجتماعی معاملات کا رونا روتا ہے۔ وہ انسانیت کو درندگی کے مقابلے میں پامال اور صدق و خیر کو کذب و شر کے

بالمقابل پسپا دیکھتا ہے تو بے چین ہو جاتا ہے اور جب اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں پست و کم قوت سمجھتا ہے تو بارگاہِ ایزدی میں گریاں کناں ہوتا ہے۔ اس طرح کی آہ وزاری اصطلاحاً "مناجات" کہلاتی ہے۔ عصری مناجاتی شاعری میں انابت و رجوع الی اللہ کی کیفیات کی فراوانی ہے۔

جدید مناجاتی شاعری میں سماجی زندگی کے احساس کے تین ابعاد دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جدید شعرا اپنی مناجاتوں میں سماجی ماحول اور معاشرتی اقدار کو جوں کا توں پیش کر دیتے ہیں نہ تو سماجی مسائل کی دشواریوں سے انہیں کوئی کام اور نہ ہی ان مسائل کے سدباب کی انہیں کوئی فکر ہوتی ہے بلکہ نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں وہ اچھائیوں اور برائیوں کو بے کم و کاست بارگاہ ایزدی میں پیش کر دیتے ہیں اور اللہ سے صاف صاف کہدیتے ہیں کہ یہ تیرے بندوں کی دنیا کے احوال ہیں۔ دوسرا پہلو مناجاتی شاعری کا یہ ہے کہ اس میں سماج کی اصلاح کی فکر کی جاتی ہے، ایسے شعرا سماجی اصلاح کے متمنی ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ اس کام کے لیے مجبور و بے بس ہوتے ہیں اس لیے اللہ کی مدد و نصرت کے طالب رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان مناجاتوں کی ہے جن میں اصلاح کے لیے انقلابی اور احتجاجی انداز بیان کو ترجیح دی گئی ہے۔ ایسی مناجاتوں میں شاعر بالآخر یہ کہدیتا ہے کہ بارِ الٰہ اس دنیا کو اجاڑ کر نئی دنیا آباد کر دے۔ اس طرح مناجات کے ان تینوں پہلوؤں میں عصر حاضر کے بڑے۔ چھوٹے سماجی مسائل کو نہایت واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مناجاتیں قاری کے دل پر ایسا تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہر پڑھنے والا اس میں پیش کیے گئے مسئلہ کو اپنی زندگی ہی کا مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔

گویا کائناتی مسائل ذاتی بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس طرح شعرائے جدید نے مناجاتیں لکھ کر اپنے باایمان ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور سماج کی صحیح و حقیقی تصویر اپنی مناجاتوں میں بیان کر کے بارگاہِ رب العزت میں پیش کر دی ہے، اس سے سماج سے ان کے تعلق اور اسکی پُر آشوب حالت پر ان کے ذہنی کرب کا اندازہ ہوتا ہے اس نوع کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں فسادات کا مسئلہ درد لا علاج بن گیا ہے۔ مفاد پرست عناصر مذہب کے نام پر سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کرتے اور ان کو آپس میں لڑا کر ان کی جانیں ضایع کراتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وحشت و بربریت اور خوف و دہشت کی فضا ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ عمیق حنفی کو سماج کے اس کرب نے بستر مرگ پر بھی ستایا ہے۔ ان کی بے چینی جب شدت اختیار کر لیتی ہے تو وہ بارگاہِ ایزدی میں یوں التجا کرتے ہیں۔

بھلا یہ بھی کیا بات ہے۔

....

ترے نام کے کتنے ہجے بتاتے ہیں لوگ

....

کہ تو لا مکاں لا زماں بیکراں ہے

مگر تجھ کو شبدوں کے اندر دھنساتے ہیں لوگ

ترے نام پر بھائیوں کے لہو میں نہاتے ہیں لوگ

مگر وہ نہیں تو، جو تجھ کو بتاتے ہیں لوگ

مجھے نام۔ گن، چنب نہیں

صرف پہچان دے

....

مجھ کو وہ دھیان دے
جڑیں جس کی تیری حقیقت کے اندر جمی ہوں۔
وہ ایمان دے۔ (دعا۔ عمیق حنفی: بستر مرگ پہ لکھی گئی)

مہدی پرتاپ گڈھی اپنے شہر کی گلیوں اور شاہراہوں پہ مقتل سجے ہوئے اور صلیبیں گڑی ہوئی دیکھتے ہیں تو اشک سحر گاہی سے وضو کر کے "نئی سحر کی دعا" کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں (ملاحظہ ہو نئی سحر کی دعا: مہدی پرتاپ گڈھی)

ایک شاعر نے ہابیل قابیل کے واقعہ کو بطور استعارہ اپنی دعا میں استعمال کیا ہے۔ آج بھی قابیل کے اوصاف کے حامل افراد اپنے بھائیوں کا خون بہاتے ہیں۔

مناجات سے قطع نظر جدید شعرا نے اپنی دیگر منظومات میں بھی "فسادات" کے سخت ترین مسئلہ کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا ہے اور اس سے ہونے والی بربادیوں کی نہایت موثر منظوم تصویریں کھینچی ہیں۔

اللہ کے گھر پر غاصبانہ قبضہ کر کے اسے "ڈھانے" کے ناپاک ارادے کی وجہ سے جب اس میں سجدہ ریز ہونے والا اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو وہ اپنے مولیٰ و آقا اور اس گھر کے مالک کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔

مالکِ دو جہاں! خالقِ کل جہاں!!	تو ہی معبود ہے! تو ہی مسجود ہے
تیرا گھر چھن گیا، ہم نہ کچھ کر سکے	ہم ہیں بے بس سبھی، ہم ہیں بیکس سبھی
بھیج دے اے خدا! اس دلِ کی دعا	ابرہہ کے لیے غول ابابیلوں کے

(غول ابابیلوں کے: غلام محمد فیض آبادی)

اس نظم میں تلمیح کا استعمال کر کے شاعر نے جو رقت اور اثر آفرینی پیدا کی ہے وہ

لاجواب ہے۔ دل کی ایسی کسک اور سانس کی ایسی گھٹن ہی انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اسی لیے تو فیض احمد فیضؔ بھی کہہ اٹھتے ہیں ؎

جو دل دکھا ہے بہت زیادہ　　تجھے پکارا ہے بے ارادہ
(شامِ شہرِ یاراں)

لیکن یہ دکھا دل بندہ جب اللہ کی مدد و نصرت کے انتظار کی تاب نہیں لاتا تو نا امید ہو جاتا ہے اور یاس کے جال میں پھنس کر "نقش فریادی" بن جاتا ہے۔

بند ہیں مدتوں سے بابِ قبول　　ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بے نیازِ دعا ہے ربِ کریم　　(نقش فریادی)

دوسرا بڑا مسئلہ غربت اور افلاس کا ہے۔ اس کی شدت بین الاقوامی سطح پر محسوس کی جا رہی ہے۔ دنیا کی کم از کم تین چوتھائی آبادی افلاس و ناداری کے آزار میں تڑپ رہی ہے، جدید شعرا سے یہ صورت حال مخفی نہیں، چنانچہ محمد علوی بارگاہِ ایزدی میں اپنی معصوم تمنا کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

نئے نئے کپڑوں کی بو سے سارا گھر بھر جائے　　ایسا ہو بچوں کے بدن پر میل نظر نہ آئے
اب کے عید کا دن آسے تو دودھ سوئیاں کھائے　　(دعا: محمد علوی)

اس مختصر سی دعا میں اگرچہ شاعر کا اپنا کرب و افلاس عیاں ہے لیکن دنیا کے سارے مفلوک الحال لوگوں کی معصوم تمنائیں اور موہوم خواہشات اس میں مضمر ہیں۔ وحید اختر کی مناجات "آگہی کی دعا" میں بھی مفلسوں کے لیے گریہ وزاری کی گئی ہے۔

جدیدیت مذہب بیزاری ہی نہیں ہے، بلکہ وہ مذہب کو جامد رسوم سے آزاد کرنے اور اس کی صحیح روح کو آشکارا کرنے کی کوشش سے بھی عبارت ہے۔

ن۔م۔راشد جیسا خدا بیزار شاعر بھی بالآخر "انسان" کے دکھ درد کا شکوہ ذات باری ہی میں کرتا ہے۔

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بیکسوں اور لاچاروں کی دنیا ہے ہم اپنی بے بسی پہ رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی (انسان)

منصور اعجاز نے بارگاہ ایزدی میں رنجور انسانوں کا دکھڑا ایک اور پیرایہ میں پیش کیا ہے جو ایک نرالا انداز ہے۔

سماجی انتشار اور بدامنی کی ایک وجہ اختیارات کی غیر مساوی تقسیم بھی رہی ہے۔ صاحب اقتدار زعم باطل میں اکثر و بیشتر من مانی کرکے جبر و تشدد پر اتر آتے ہیں، جس کی وجہ سے بے اثر طبقہ یا سادہ لوح لوگ ہمیشہ ناانصافی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ جدید شعرا نے اس کے حل کے لیے بھی بارگاہ رب العزت میں دعا کی ہے، فرحت احساس نہایت عاجزی سے کہہ رہے ہیں۔

تو بڑے لوگوں کو اتنی ڈھیل مت دے اے خدا کوئی تیرا نام لیوا تو یہاں باقی رہے (دعا)

جدید شعرا کی اس قسم کی "بے چینی" انفرادی نہیں ہے بلکہ اس میں اجتماعی پہلو بھی نمایاں ہے۔ فرحت احساس کے یاس انگیز اور حزنیہ رجحان کے بالمقابل قتیل شفائی کا نشاطیہ اور پُر امید آہنگ بھی ملاحظہ ہو۔

آخر بڑا نہ بن بیٹھے وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں میں جسکو رتبہ دیا ہے تو نے ظرف بھی اسکو عالی دے (دعا)

جب حضرت نوح، لوط اور شیث علیہم السلام قوم کی بے جا حرکتوں سے تنگ آگئے تھے تو بارگاہ ایزدی میں انھوں نے اس کے حق میں بددعا کردی تھی، جس سے وہ

قومیں اللہ کے عذاب کی زد میں آ گئیں۔ حضرت یوسفؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ پر قوم کا جبر و تشدد بڑھتا گیا تو ان پیغمبروں نے بجائے بد دعا کرنے کے اللہ سے ان کے لیے ہدایت مانگی۔ فرحت احساس اور قتیل شفائی کی دعاؤں میں یہی فرق ہے، ہوا کا رخ دیکھ کر چلنے والے لوگوں کی منزل نہیں ہوتی۔ یہ 'ابن الوقت' صرف اپنا نفع تلاش کرتے ہیں۔ ذاتی مفاد کی خاطر آئے دن نت نئے رنگ بدلتے ہیں۔ یہ منافقانہ طرز زندگی آج کل کے اکثر و بیشتر نام نہاد رہنماؤں کا شیوہ ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے انتخاب میں عموماً لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ "اچھے" کا انتخاب مشکل ترین مسئلہ بنا ہوا ہے، کیونکہ "اچھے" کی آج کوئی پہچان نہیں رہی۔ ہر آدمی شرافت کا 'پوستین' اوڑھے ہوئے ہے اس مسئلہ کے حل کے لیے حامد اقبال صدیقی یوں دعا گو ہیں۔

تری زمین پہ چہرے بدلنا عام ہوا	تو مری روح پہ کوئی نشان دے اللہ
(غزل کا ایک شعر)

قول و فعل میں تفاوت و تضاد بھی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے جو چہرے بدلنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ قولاً "خیر" کی ترغیب دینے والے عملاً "شر" سے رغبت رکھتے ہیں۔ اسی لیے شوکت نظمی کہتے ہیں۔

قول و فعل پہ ثابت رکھ	ہر جذبہ ایمانی دے
تلخی کی جو کاٹ کرے	ایسی مجھ کو بانی دے (حمد)

لیکن اس کے برخلاف عبد الرحیم نشترؔ کی دعا بڑی انقلابی ہے وہ برائیوں سے نبٹنے کے لیے خدائے عز و جل سے ہمت و جرأت اور استقامت و استقلال کے خواہاں ہیں۔ ان کے ارادوں میں صلابت کا یہ عالم ہے کہ وہ تقدیر کی بنیاد پر مانع

اور سدباب بنے حصاروں کو توڑنے پھوڑنے کے لیے اللہ ہی سے قوت وطاقت کے طالب ہیں۔ وہ صاف طور پر کہتے ہیں۔

بچایا ہے رستے میں دریا جو تو نے تو پھر میرے ہاتھوں میں کوئی عصا دے
اگر دل دیا ہے تو ہمت عطا کر نہیں تو اٹھا اپنا دیپک بجھا دے

مندرجہ بالا اشعار میں تلمیح ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لمبے چوڑے قصے کو شاعر نے دو شعروں میں بیان کر کے لطیف پیرائے میں اللہ سے یہ دعا کی ہے کہ ویسی ہی ہمت مجھے بھی عطا کر اور راہ حیات میں مشکلات و آفات و بلیات کے بچھے ہوئے دریا سے راستہ نکالنے کے لیے ہمت و استقلال اور ہوش و دانشمندی کا عصا عطا کر۔

پینے کا پانی اپنے پاس رہنے کی وجہ سے جس طرح ایک مسافر سمندر کے بیچ میں رہتے ہوئے بھی پانی کو ترستا ہے، ٹھیک اسی طرح کی کیفیت مکانوں کی کثرت والے شہروں میں بے گھروں کی ہے۔ بلراج کومل نے "سائے کے ناخن" میں اس کیفیت کی عکاسی کی ہے اور اس کے لیے پاکستان کے جدید شاعر افتخار عارف بارگاہِ ایزدی میں اس طرح فریاد کناں ہوئے ہیں۔

مرے خدا! مجھے اتنا تو معتبر کر دے میں جس مکان میں رہتا ہوں اسکو گھر کر دے
(مہر دونیم)

اس دور میں عورت کی پامالی اور اس کی عفت و عصمت کو داغدار کرنے کے واقعات روزانہ ہو رہے ہیں۔ عورت کی اس مجبور زندگی میں سماج کے سارے دروازے اس کی مدد کے لیے بند دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے رعنا حیدری خدا سے ہمت و جرات کی بھیک مانگ رہی ہیں۔

عطا ہو مجھ کو وہ اثر کہ دل کے واہموں کو روند کر
بلا جھجھک میں جب بڑھوں تو اے خدا اسی گھڑی
تو حوصلوں کو بخش دے جراتیں کہ پھر مجھے نہ حشر تک حاجت دعا رہے
(رعنا حیدری: دعا)

بے چین و بے کیف زندگی کی یہ کشتی دنیا کے متلاطم سمندر میں ہچکولے کھاتی ہوئی چل رہی ہے۔ ڈوبنے کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔ خوف ہر حالت میں پیچھا نہیں چھوڑتا۔ دنیا کی ایسی مایوس زندگی سے تنگ آکر بالآخر ہمارے حساس شاعر دنیا کی تباہی کے لیے بد دعا کرتے ہیں۔ ظلم و استبداد کی موجیں جب زندگی کی کشتی کو ناکارہ بنانے کے لیے کوشاں دکھائی دیتی ہیں تو شکست خوردگی کے عالم میں جھنجھلاہٹ کے دباؤ سے نہایت جذباتی ہو کر شاعر کہتا ہے۔

اے مرے رب! مٹا دے تو
اس بے وفا، سنگدل اور بے انس دنیا کو
حرفِ غلط کی طرح (خالد شفائی: انوکھی دعا)
اور اندر سے روپ ناداں پکار اٹھتے ہیں سے
دعا کرو
کہ خدا آسمان سے بھیجے / اک ایسا ہاتھ
کہ جس کا اشارہ پاتے ہی
فنا کی گود میں سو جائے یہ حریف بقا۔
اور اس ہجوم ستم دیدہ کو امان ملے۔
جو نامرادیوں کی آندھیوں میں زندہ ہے۔ (غیبی ہاتھ)

غرضکہ اردو کی جدید مناجاتی شاعری میں بھی سماجی جھلک کی کیفیت دکھائی دیتی ہے، اس کے متعلق اس طرح کا منفی رجحان اگرچہ جدید شعرا کے یہاں بڑی حد تک پایا جاتا ہے اور شعرا کی یہ برگشتگی ان کے عہد کے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی شکست کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے، لیکن مناجاتوں میں یہ منفی رجحان شعوری طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ تہذیبی و معاشرتی اقدار کی شکست سے متصادم شاعر جب اپنی زندگی میں مایوسی اور پراگندگی کو محسوس کرنے لگتا ہے تو لامحالہ وہ پھر بجائے اپنے سماج کے، اپنے دوست واقربا کے، اپنے یار و غمخوار کے اس ماوراء الوراء ہستی ہی کو مدد و نصرت کے لیے پکارتا ہے،

ماہنامہ "معارف" اپریل ۱۹۹۶ء

بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم

از
(پروفیسر) جگن ناتھ آزاد۔ جموں

برصغیر میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلم شعراء کا نعت گوئی کی طرف متوجہ ہونا ایک بہت ہی پرانی روایت ہے۔

یہاں میں مختصراً بھی اس نعتیہ کلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو ہندو شعراء کے قلم بلکہ دل سے نکلا اور صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کر رہا ہوں، ایک زمانے میں درگا سہائے سرور کی ایک نعت مدتوں مولود شریف کے جلسوں میں پڑھی جاتی رہی، مجھے وہ زمانہ آج بھی یاد ہے جب لاہور میں دو نعتیں بچے بچے کی زبان پر تھیں، ایک پنڈت ہری چند اختر کی نعت

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

اور دوسری مولانا ظفر علی خاں کی:

وہ شمع جالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

تصویر کا یہ رخ منشی کنہیالال شاد کے رسالہ علم تصوف، منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں اور بالخصوص ناول "کربلا" اور بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے آیات کلام پاک کے ترجموں کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔

منشی روپ چند ناتی اردو کے ایک بہت اچھا کہنے والے شاعر تھے۔ عشرت لکھنوی نے ان کا ذکر اپنے تذکرے "ہند د شعرا" میں کیا ہے۔ عشرت لکھنوی لکھتے ہیں کہ ان کی ہر غزل میں ایک نعتیہ شعر ضرور ہوتا تھا۔ ایک شعر انہوں نے درج کیا ہے:

آیا جو نام پاک محمدؐ زبان پر   صلی اللہ کا شور اٹھا آسمان پر

ان کے علاوہ مشہور اور معروف شعراء میں مرزا ہرگوپال تفتہ، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، پیارے لال رونق، چندی پرشاد شیدا، دوارکا پرشاد افق اور مہاراج بہادر برق دہلوی ایسے نام ہیں، جن کے کہے ہوئے سلام اور مرثیے آج بھی اردو ادب کی زینت ہیں۔

پرانی بات ہے میں کراچی کے ایک نعتیہ مشاعرے میں شریک ہوا۔ آخر میں میری باری آئی اور میں نے اپنی طویل نعت "ولادت باسعادت" وہاں سنائی۔ ایم۔ کیو۔ ایم کے قائد جناب الطاف حسین اس مشاعرے کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ اس مشاعرے میں پاکستان کے شعراء نے جو سب کے سب مسلمان ہیں، حضورؐ کی شان میں اپنا کلام پیش کیا ہے اور ہندوستان سے آئے ہوئے شاعر جگن ناتھ آزاد نے بھی جن کا مذہب اسلام نہیں ہے۔ اب ان دونوں کے رسول اکرمؐ کے لیے اظہار عقیدت میں یہ فرق ہے کہ مسلمان شاعروں کے لیے تو یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ انہیں تو یہ فرض ادا کرنا ہی ہے لیکن جب ایک ہندو شاعر یا کوئی غیر مسلم شاعر حضورؐ کی شان میں نعتیہ کلام کہتا ہے تو وہ اپنا کوئی بندھا ٹکا مذہبی فریضہ ادا نہیں کرتا، ہاں اس بات کا اظہار اس سے

ضرور ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے مذہب کا پابند ہوتے ہوئے بھی پیغمبر اسلام کی شان میں نعت کہہ رہا ہے تو گویا وہ اس نکتے کی وضاحت کر رہا ہے کہ اپنے مذہب کے ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے مذاہب اور بانیان مذاہب کا احترام بھی ضروری ہے اور آج دنیا کو اسی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت ہے، دنیا اس وقت تنگ نظری، تنگ خیالی اور تعصب کے پھندے میں گرفتار ہے، عملی طور پر لوگ مذہب سے بیگانہ ہو رہے ہیں اور مذہب کے نام پر فتنہ و فساد برپا کرنے پر ہر لمحہ تیار رہتے ہیں اس لیے اس بات کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ شعراء اور دوسرے اہل قلم حضرات سامنے آئیں اور دوسرے مذاہب کے بارے میں اور ان کے بانیوں کے بارے میں وسیع المشربی کے ساتھ نظم و نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

یہ جناب الطاف حسین کی تقریر کا ایک مختصر سا اقتباس ہے۔ انکی ساری تقریر اگر ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ ہو تو اس کی مختلف میڈیا کے ذریعہ سے نشر و اشاعت کی اشد ضرورت ہے۔

میں الطاف حسین صاحب کی تقریر میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا اور اگر خود میں نے نعتیہ کلام کہا ہے تو اس کے بارے میں اس کے سوا کوئی تجزیہ نہیں کر سکتا کہ لڑکپن میں مجھے ماں باپ نے جو تعلیم دی اسی تعلیم نے مجھ سے عمر کے مختلف حصوں میں شری رام چندر جی اور شری کرشن جی کی مدح میں نظمیں کہلوائیں اور رسول مقبولؐ کی شان میں بھی۔ میری تعلیم شروع سے کچھ ایسی رہی ہے کہ اسلامیات سے متعلق کتابیں پڑھنے کا موقع مجھے زیادہ ملا بعض مسائل میرے

مطالعے کی راہ میں ایسے آئے کہ مختلف مذاہب کی کتابوں کا اور مختلف بانیان مذاہب کے اقوال زریں کا مطالعہ میرے لیے ناگزیر ہو گیا' مثلاً مسئلۂ خیر و شر، مسئلۂ عقل و عشق مسئلۂ زمان و مکاں ایسے مسائل ہیں جن کو سمجھنے کے لیے یا جن کو سمجھنے کی کوشش میں اکثر مذاہب کا مطالعہ میرے لیے ضروری ہو گیا اور میں نے اس سفر میں ہر قدم پر یہ محسوس کیا کہ ہر مذہب کا مطالعہ میرے علم میں اضافہ کر رہا ہے اور مجھ پر فکر و نظر کے نئے نئے دروازے کھول رہا ہے۔ میں اسی مطالعے کے دوران میں گائتری منتر اور سورۂ فاتحہ میں مماثلت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ عمل اور نتیجۂ عمل یا زندگی اور موت کے متعلق سری کرشن اور رسول اکرمؐ کے افکار کی باہمی قربت میرے لیے ایک ایسا انکشاف تھا جس سے دونوں مذاہب کا مطالعہ کیے بغیر میں آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اقبال نے اسرار خودی کے دیباچے میں اس موضوع پر کھل روشنی ڈالی ہے اور سری کرشن کی تعلیم کو اسلامی تعلیم کہہ کر اور شیخ محی الدین اکبر کی تعلیم کو غیر اسلامی قرار دے کر اس عقدے کو وا کیا ہے کہ :

اختلافات مذاہب جملہ اوہام است و بس ۔۔۔ یک حقیقت جلوہ گر در کفر و اسلام است و بس
از تعصب ساغر شیخ و برہمن شد جدا ۔۔۔ ورنہ در میخانہ یک ساقی و یک جام است و بس

اقبال کا ذکر آ گیا ہے تو کفر و اسلام کے موضوع پر ان کے چند اشعار بھی سن لیجیے اور دیکھیے کہ مشرق کے اس عظیم مفکر شاعر نے مشرق کی سوئی ہوئی روح کو کس طرح سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے :

حرف بد را بر لب آوردن خطا ست ۔۔۔ کافر و مومن ہمہ خلق خدا ست
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق ۔۔۔ می شود بر کافر و مومن شفیق

کفر و دیں در گیر در پنہائے دل دل اگر بگریزد از دل وائے دل

کافرے بیدار دل پیش صنم

بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی

پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا؟ گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمہ دانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی

اقبال کے یہاں اردو اور فارسی کلام میں اور اردو اور انگریزی نثر میں ایسی مثالیں بیسوں مل جائیں گی لیکن مندرجہ بالا تحریر سے میں قاری کا انتقال ذہنی "وحدت ادیان" کی تھیوری کی جانب کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ میں "وحدت ادیان" کی تھیوری کا قائل نہیں ہوں بلکہ اس بات کا آرزو مند ہوں کہ اپنے اپنے مذاہب پر قائم رہتے ہوئے ہم دوسرے مذاہب اور بانیانِ مذاہب کا احترام کریں اور یہی وہ جذبہ ہے جو ایک غیر مسلم شاعر سے نعتیہ کلام کہلواتا ہے۔

آج کی فتنہ و فساد میں گھری ہوئی دنیا کے لوگوں کے دلوں میں اگر یہ جذبہ عام ہو جائے تو بانیان مذاہب کے بارے میں گستاخانہ لب و لہجہ والی کتابوں کا منظر عام پر آنا خود بخود ختم ہو جائے گا۔

"بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم" سے پہلے بھی نعتیہ کلام کے متعدد مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ان مجموعوں نے بین المذاہب یک جہتی کے راستے پر چراغ روشن کیے ہوں گے اور یقیناً ان چراغوں کی روشنی سے دنیا کے مختلف حصوں میں دلوں کی دنیا روشن ہوئی ہوگی۔

نعتیہ کلام کے محاسن نے ہماری اردو اور فارسی شاعری کے معیار کو بلندی میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اس وقت چند اشعار مجھے یاد آرہے ہیں، جنھیں مثال کے طور پر میں پیش کر رہا ہوں:

اے مدنی برقع و مکی نقاب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب (نظامی گنجوی)

کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی غاور دمد از شبم بہ ایں تیرہ شبی

اے دوست ادب کہ در حریم دل ما شاہنشہ انبیا رسول عربی (غلام قادر گرامی)

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است (غالب)

آں تاجدار ملک و دیں دارائے اقلیم یقیں دانائے علم اولیں فرماں بر ش روح الامین

عالم شد ش زیر نگیں چرخ ش ہمی بوسد زمیں

آدم ہماں در ماء و طیں او گشتہ میر انجمن (شبلی نعمانی)

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے ؎ غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر ؎ وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم ؎ وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری (اقبال)

بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرور عاشقانہ

چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام کشاید پر بہ فکر آشیانہ (اقبال)

دو آں دریا کہ او را ساحلے نیست دلیل عاشقاں غیر از دلے نیست

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم دگر نہ جز تو ما را منزلے نیست

ہمارے ایک محترم، معتبر اور مستند نقاد نے ایک جگہ لکھا تھا کہ نعتیہ کلام شاعری نہیں ہے، اس لیے میں نے انتہائی بلند پایہ نعتیہ شاعری کی مثالیں دینے کے لیے ان چند اشعار کا درج کرنا ضروری خیال کیا۔

کہ شاہین شہِ لولاک ہے تو

از جناب محمد بدیع الزماں صاحب☆

اس مضمون کا عنوان "بالِ جبریل" کی درج ذیل رباعی کا ایک مصرعہ ہے جس میں "لولاک" موضوعِ گفتگو ہے:۔

ترا جوہر ہے نوری ، پاک ہے تو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو

ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہین شہِ لولاک ہے تو

"لولاک" کی اصطلاح سے اقبال کی مراد ذاتِ محمدیؐ ہے، یہ اصطلاح درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے، فرمایا رسول اللہؐ نے کہ فرمایا خدائے تعالیٰ نے کہ:۔

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ

(اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا)

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کارخانۂ عالم کو حضور اقدسؐ کے تصدق میں پیدا کیا ہے۔

"لولاک" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں جن میں ایک شعر اوپر رباعی میں ہے، باقی دو درج ذیل ہیں:۔

قصۂ قسطنطنیہ ، یعنی قیصر کا دیار مہدیٔ امت کی سطوت کا نشانِ پایدار

صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے آستانِ مسند آرائے شہِ لولاکؐ ہے

نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا

اے مسلماں ! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

("بانگِ درا" - "بلادِ اسلامیہ" - چوتھا بند)

☆ سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ، ہارون نگر ، فرسٹ سیکٹر ، پھلواری شریف ، پٹنہ۔

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی ‏ ‏ ‏ میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

(''بال جبریل''۔غزل ۴۶)

''لولاک'' کی اصطلاح سے پہلے شعر میں جو اس مضمون کا عنوان ہے، اقبال مسلمانوں کو یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ تو اپنے آپ کو عناصر اربعہ کے امتزاج کا نتیجہ مت سمجھ، بیشک تیرا جسم مادی ہے لیکن تیرا جوہر تو نوری ہے اور وہ کثافت مادی سے بالکل پاک ہے، تو اشرف المخلوقات اور نائب خدا ہے، فرشتے اور دوسری نوری مخلوقات سب تیرے خادم ہیں، بلکہ تو اگر کوشش کرے تو تو ان کو صرف مسخر ہی نہیں کرسکتا بلکہ انہیں اپنا تابع فرمان بنا سکتا ہے، کیوں کہ تو سرکارِ دوعالمؐ کا غلام اور دست پروردہ اور فیض یافتہ ہے۔

اقبال اس سلسلہ میں ''شاہین'' کی مثال لاکر یہ بات بھی ذہن نشیں کراتے ہیں کہ جب ناقص انسانوں کا تربیت یافتہ شاہین بڑے بڑے پرندوں کا شکار کرسکتا ہے تو جس انسان کی تربیت حضورؐ خود فرمائیں، اگر وہ فرشتوں اور حوروں کا شکار کرے تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

اقبال کے کلام میں ''شاہین'' ایک اصطلاح ہے جس سے کلام میں کئی اشعار ہیں بلکہ ''بال جبریل'' میں ایک خصوصی نظم ''شاہین'' ہے، اقبال کو اس پرندے میں ''مردمومن'' کی بہت سی صفات نظر آتی ہیں جنہیں انہوں نے اس نظم میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور نظم کے آخر میں اسے ''پرندوں کی دنیا کا درویش'' کے لقب سے نوازا ہے، اقبال نے ''شاہین'' سے ایک اصطلاح ''شاہینی'' بھی وضع کی ہے جس سے ان کی مراد ''شاہین'' کی سارے صفات سے متصف ہونا ہے، اس اصطلاح سے کلام میں صرف ایک ہی شعر ہے جو آگے آرہا ہے اور جس سے مراد حکمرانی ہے۔

''لولاک'' سے تربیت دیئے گئے باقی دو اشعار میں پہلا شعر ''بانگ درا'' کی نظم ''بلادِ اسلامیہ'' کے چوتھے بند کا ہے جس بند کو اقبال نے ''قصۂ قسطنطنیہ'' سے شروع کیا ہے جس میں ایک طویل داستان ہے، اس شہر پر ۶۰۰ ق م میں یونانیوں نے قبضہ کرلیا اور اس کا نام Byzantium رکھا، مگر جب رومیوں نے ۱۴۶ ق م میں اس پر قبضہ کرلیا تو اس وقت کے قیصرِ روم Constantine نے اس شہر کا نام Constantinople کردیا، مسلمانوں نے اس شہر کو قبضہ کرنے کے لیے صدیوں جنگ

کی، مسلمانوں کا پہلا حملہ ۶۷۰ء میں ہوا تھا اور آخری حملہ ۱۴۵۳ء میں ہوا جب مسلمانوں نے اسے فتح کرلیا اور یہ شہر سلطنت عثمانیہ ترکیہ کا دارالخلافہ ۱۴۵۳ء سے پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے خاتمہ تک رہا، جس جنگ میں سلطنت عثمانیہ ترکیہ کی پوری سلطنت پر مغربی سامراجیوں نے جن میں برطانیہ اور فرانس پیش پیش تھے، قبضہ کرلیا حتیٰ کہ ترکی پر بھی قبضہ کرلیا جہاں یہ شہر قسطنطنیہ واقع تھا، مگر ترکی فوج کے ایک افسر غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی شکست خوردہ فوج کی ٹکڑیوں کو جمع کر کے کم از کم ترکی کو بچانے کے لیے ان سامراجیوں کے خلاف جنگ کی اور انہیں شکست دی اور ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزاں کے تحت ان سامراجیوں نے جن میں اس وقت صرف برطانیہ اور یونان پیش پیش تھے، ترکی کی موجودہ سرحدوں کو تسلیم کرلیا، اسی سال غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی میں خلافت، جس کا سلسلے حضرت ابوبکرؓ کے وقت سے چلا آرہا تھا، ختم کردی اور ترکی کو جمہوریہ اعلان کردیا اور خود اس ملک سے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۸ء میں اپنے انتقال تک صدر رہے اور اپنے دورِ اقتدار میں قسطنطنیہ کا نام بدل کر استنبول کردیا جو آج تک ترکی کا دارالخلافہ ہے۔

اقبال اسی لیے اس شہر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اسے صرف ''مہدیٔ امت کی سطوت کا نشانِ پایدار'' ہی نہیں کہتے بلکہ ''آستانِ مسند آرائے شہِ لولاکؐ'' سے تعبیر کرتے ہیں، چونکہ مسلمان کم وبیش آٹھ سو سال تک اس شہر کو قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہے اور آخرش ۱۴۵۳ء میں فتح پائی، اس لیے اقبال اس بند میں یہ دادِ تحسین بھی پیش کرتے ہیں ؎

سینکڑوں صدیوں کی کِشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

اقبال کو اس شہر کی ہوا گلاب کی خوشبو کی طرح پاکیزہ محسوس ہوئی کیوں کہ اس شہر میں مشہور صحابی حضرت ایوب انصاریؓ کا مدفن ہے۔

''لولاک'' سے دوسرے یعنی آخری شعر پر، جو ''بال جبریل'' کی ایک رباعی کا ہے، اس مضمون کے آخر میں ''صاحبِ لولاک'' سے ترتیب دیے گئے شعر کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، چوں کہ دونوں اشعار کا پہلا مصرعہ ہم معنی ہیں۔

اقبال نے ''لولاک'' سے ایک اصطلاح ''لولاکی'' بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں ایک ہی شعر ''بال جبریل'' کی درج ذیل رباعی میں ہے:۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے ‏ تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری ‏ تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

اس رباعی میں ''اندیشہ''، ''افلاکی''، ''پرواز''، ''لولاکی''، ''شاہینی'' اور ''بیباکی'' الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں اور جب تک ان اصطلاحات کے معنیٔ پنہاں گرفت میں نہ لایا جائے، اردو زبان کے اوسط درجہ کے قاری کے لیے اس رباعی کو گرفت میں لانا مشکل ہے۔

''اندیشہ'' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی فکر یا سوچ کے ہیں، اس سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں، دو اشعار ''بال جبریل'' کی دو رباعیوں میں ہیں جن میں ایک شعر متذکرہ بالا رباعی میں ہے اور تیسرا شعر ''ضرب کلیم'' کی نظم ''مدنیتِ اسلام'' میں ہے، تینوں اشعار میں اس سے مراد فکر اور سوچ ہے۔

اقبال کے کلام میں ''افلاک'' اور ''افلاکی'' دونوں الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں جن میں موخر الذکر سے مراد وہ مسلمان ہے جس کے طرزِ فکر و عمل میں اسلام کو سر بلند کرنے کی حوصلگی ہو، جو اونچے عزائم رکھتا ہو، جس میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ موجزن ہو اور جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دینے کا اہل ہو، کیوں کہ یہی تخلیقِ آدم اور تخلیقِ کائنات کا مقصد ہے، اس ''عزمِ بلند'' پر ''بال جبریل'' کی غزل ۲۲ میں یہ شعر ہے ؎

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر ‏ یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کُلاہ

اقبال کے کلام میں ''افلاکی''، ''خاکی'' کی ضد ہے، ''کلیاتِ اقبال'' میں ''خاک'' اور ''خاکی'' دونوں الفاظ سے مشتق الگ الگ اصطلاحیں ہیں جن دونوں سے کئی اشعار ہیں، ''خاکی'' یا ''جذبِ خاک'' سے اقبال کی مراد وہ شخص ہے جس کا طرزِ فکر و عمل مادیت پرستانہ ہو اور جس کا مقصدِ حیات صرف دنیا حاصل کرنا ہو' افلاکی' اور ''خاکی'' کے اس تضاد پر اس رباعی میں یہ مصرعہ ہے ''ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے'' یعنی خاکی ہے۔

ایسے انسان کو جس کا طرزِ حیات مادہ پرستانہ ہے، اقبال ''محکوم'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اس کے برعکس '' آزاد'' یا ' بندۂ آزاد' جو اقبال کے نزدیک مردِ مومن کے مترادف ہیں، دونوں کے طرزِ فکر کا تقابلی جائزہ ''ارمغانِ حجاز'' کی نظم ''ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' کے دسویں

بند کے درج ذیل شعر میں ''افلاک'' کی اصطلاح لاکر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش   وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک

''خاکی'' کی اصطلاح اقبال نے درج ذیل آیات سے اخذ کی ہے:۔

''اور اے نبی، ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا، آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا، یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا، اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف رہ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا، لہذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے، یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید یہ کچھ غور و فکر کریں'' (الاعراف: ۱۷۵۔۱۷۶)۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہوگیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کرلیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں تھوڑا نکلے گا'' (التوبہ: ۳۸)۔

''پرواز'' بھی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تو اڑنا ہے مگر اقبال کے یہاں اس کے اصطلاحی معنی مادیت سے بے تعلق ہو کر روحانیت کی منزلیں طے کرنا ہے، چنانچہ اس کی تشریح ''بال جبریل'' کی نظم ''پرواز'' کے درج ذیل شعر میں ملتی ہے ؎

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا   وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

اقبال کے کلام میں اس اصطلاح سے ترتیب دیے گئے کل آٹھ اشعار انہی معنوں میں ہیں، متذکرہ بالا شعر کے علاوہ باقی سات اشعار میں پہلا ''بانگ درا'' کی نظم ''ایک مکالمہ'' میں ہے، دوسرا اور تیسرا شعر ''بال جبریل'' کی نظمیں ''آزادیِ افکار'' اور ''ساقی نامہ'' کے پانچویں بند میں ہے اور باقی چار اشعار ''ضرب کلیم'' کی نظمیں ''معراج''، ''اسرارِ پیدا''، ''صبح چمن'' اور ''محراب گل افغان کے افکار'' کے آٹھویں بند میں ہیں۔

''لولاکی'' کی اصطلاح سے مراد رسول اللہؐ کے ''اسوۂ حسنہ'' کی پیروی ہے، فرمایا گیا ہے:۔

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے'' (الاحزاب:۲۱)۔

اب ''اندیشہ''، ''افلاکی''، ''خاکی''، ''پرواز'' اور ''لولاکی'' کی اصطلاحیں گرفت میں آچکنے پر زیر تجزیہ رباعی کے پہلے شعر کو قرآنی آیات کے ساتھ پڑھیں تو اس رباعی کا پہلا شعر پوری گرفت میں آجاتا ہے۔

اس رباعی کی دوسری نظمیں ''شاہینی'' اور ''بیباکی'' بھی الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں ''شاہینی'' کی اصطلاح پر اس مضمون میں اس سے قبل روشنی ڈالی جاچکی ہے جس سے مراد حکمرانی ہے، اقبال کے کلام میں ''بیباک'' اور ''بیباکی'' دونوں الفاظ سے مشتق اصطلاحیں ہیں جو مرد مومن کی صفات میں شامل ہیں اور جو صرف شانِ فقر کی یہ دولت پیدا ہوتی ہیں جیسے ''بانگ درا'' کی نظم ''سید کی لوح تربت'' کے تیسرے بند کا یہ شعر:۔

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے　　　قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

''بیباکی'' سے زیر تجزیہ رباعی کے شعر کے علاوہ ''بال جبریل'' کی غزلیات ۱۸ اور ۳۵ میں بھی اصطلاح ان ہی معنوں میں آتی ہے جن میں پہلے شعر ''بیباک'' اور ''بیباکی'' دونوں اصطلاحیں آتی ہیں، دونوں اشعار علی الترتیب درج ذیل ہیں:۔

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی　　　ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی　　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اب ان ساری اصطلاحوں کو گرفت میں لاچکنے پر ہم زیر تجزیہ رباعی پر نظر ڈالیں جس میں اقبال نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی موجودہ حالتِ زار پر تبصرہ کیا ہے وہ اس رباعی میں مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ بات تو درست ہے کہ تیری اصل شاہینی ہے یعنی اللہ نے تجھے حکمرانی کے لیے پیدا کیا ہے لیکن تو اپنی حقیقت سے بیگانہ ہوگیا ہے اور اپنی ساری صفات بھی ضائع کردی ہیں، نتیجتاً نہ تیرے اندر ترقی کا جذبہ پایا جاتا ہے اور نہ تجھ میں تسخیرِ کائنات کے حوصلے ہی نظر آتے ہیں، نہ تو تیرے اندر سرفروشی کا مادہ باقی ہے اور نہ اعلائے کلمۃ اللہ کا ولولہ ہی کارفرما ہے، بالفاظ دیگر تجھ میں نہ

جہاد کا جذبہ ہے اور نہ رسول اللہؐ کے ایمان کا رنگ، روشن ضمیری یا روحانیت کی شان ہی باقی ہے، اس لیے کہ تیرا اندیشہ افلاکی نہیں بلکہ "خاکی" یعنی دنیوی ہے، یعنی تیرے لیے دنیوی جاہ وجلال اور دولت کا حصول ہی سب کچھ ہے۔

اقبال نے "لالوک" سے ایک اصطلاح "صاحب لولاک" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بال جبریل" کی غزل ۱۰ (دوم) کا ہے ؎

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اسی معنی میں "بال جبریل" کی ایک رباعی کا شعر "لولاک" کی اصطلاح کے تحت شروع میں گزر چکا ہے۔

ان دونوں اشعار کے پہلے مصرعہ کی تشریح میں شارحِ اقبال نے غلطی کی ہے اور دونوں اشعار کے پہلے مصرعہ کو سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۵ اور سورۃ الزمر کی آیات ۳۹ اور ۴۰ کا ترجمان بتایا ہے، چوں کہ ان آیات میں زمین کی وراثت کا ذکر آیا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی مراد جنت ہے، جب کہ اقبال نے ان دونوں اشعار کو ایک میں "جہاں" اور دوسرے میں "عالم" سے شروع کیا ہے جس سے مراد اس دنیا کی وراثت یعنی "نیابتِ الٰہی" ہے، "صاحبِ لولاک" سے اقبال ایسا انسان مراد لیتے ہیں، جس نے بہ مصداق سورۃ آل عمران، آیات ۳۱ اور ۳۲ رسول اللہؐ کی پیروی اختیار کر لی ہے اور اس پیروی میں فنافی الرسولؐ ہو گیا ہو۔

جب اقبال "بال جبریل" کی رباعی میں کہتے ہیں کہ "میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ "لولاک" تو وہ مسلمانوں کو اپنے سارے کلام میں رسول اللہؐ کی پیروی اختیار کرنے کی تلقین کی یاد دلاتے ہیں، اس لیے کہ مسلمان کی فلاح، دنیا اور آخرت دونوں میں اسی پیروی پر منحصر ہے، ارشاد باری ہے:-

"(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی امی (ﷺ) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں" (الاعراف: ۱۵۷)۔

محسنؔ کاکوروی کا شہرۂ آفاق قصیدۂ لامیہ

(سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل)

ڈاکٹر حبیب الرحمان رحیمی[*]

نعتیہ ادب کی تاریخ میں محسن کاکوروی ایک زندۂ جاوید نام ہے اور جو تعارف کا محتاج نہیں ہے، دراصل محسن نے پوری زندگی نعت سے شغف رکھا، نعت کے سوا کچھ نہ کہا اور نعت ہی کو اپنے لیے وسیلۂ نجات و سرخ روئی سمجھا، انہوں نے متعدد اصناف ادب کی ہیئتوں میں نعتیہ کلام کہا ہے، مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ اور غزل وغیرہ، محسن چوں کہ دبستان لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے کلام میں اس دبستان کی تمام خصوصیات جلوہ گر ہیں، لکھنؤ میں قصیدے اور مثنویاں زیادہ لکھی گئی ہیں، اس لیے ان کے یہاں بھی قصیدے اور مثنوی کی ہیئت کا نعتیہ کلام ہی زیادہ ملتا ہے۔

ان کے پورے نعتیہ کلام میں قصیدہ ''مدیح خیر المرسلین'' کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اسے قصیدہ لامیہ بھی کہا جاتا ہے، ایک عرصۂ دراز تک یہ قصیدہ زبان زد خلائق رہا ہے، اس کی مقبولیت عام کا تذکرہ محمد حسن عسکری نے اس طرح کیا ہے:

> ''محسن نے کچھ زیادہ تو نہیں لکھا مگر دو ڈھائی سو صفحے کا مجموعہ تو بن ہی گیا، پھر اس مجموعہ میں تین چار چیزیں ایسی موجود ہیں جو نہ صرف نعتیہ شاعری میں بلکہ پوری اردو شاعری میں ایک امتیازی درجہ کی مستحق ہیں، مثلاً دو مثنویاں ''چراغ کعبہ'' اور ''صبح تجلی'' ایک سراپائے رسولِ اکرم اور وہ لمبی غزل جس کا مطلع ہے:
>
> مٹانا لوحِ دل سے نقشِ ناموس اب وجد کا دبستانِ محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا

---

[*] جامعہ ہدایت، جے پور۔

مگر لے دے کے جس چیز کو قبول عام حاصل ہوا، وہ ہے ان کا قصیدۂ لامیہ یعنی ''سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل''، محسن کی ساری شہرت اسی ایک قصیدے پر موقوف ہے''۔(۱)

یہ قصیدہ محسن نے ۱۲۹۳ھ میں لکھا، اس میں ایک سو تینتالیس (۱۴۳) اشعار ہیں، قصیدے کے درمیان میں دو غزلیں بھی شامل ہیں، اس قصیدے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا موضوع ہے، اس کا موضوعاتی مطالعہ علمائے ادب میں مسلسل موضوع بحث رہا ہے، دراصل قصیدہ تو نعتیہ ہے لیکن اس کی فضا ہندوانہ ہے، اس سے قبل نعت میں اس طرح کا موضوع نہیں برتا گیا تھا، تشبیہ و استعارہ اور پس منظر کے طور پر اسلامی مقامات یا اسلامی تہذیب و تمدن سے تعلق رکھنے والی چیزوں کا ذکر کیا جاتا تھا، مثلاً اگر کسی دریا کا ذکر کرنا ہو تو دجلہ و فرات کا ذکر کیا جاتا تھا لیکن محسن نے ان سب سے ہٹ کر ایک نئی روایت کا آغاز کرتے ہوئے گنگا جمنا اور کاشی و متھرا کا ذکر کیا ہے، یہی اس قصیدہ کا امتیازی وصف ہے کہ اس کی تشبیب ہندوانہ رسم و رواج سے تعلق رکھتی ہے، ہندوانی فضا کے باوجود اس کا مطلع زبان زد خاص و عام ہوگیا، قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل — برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل — جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی — کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی — ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن — سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بکل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں — تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا — نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے — نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

تشبیب کافی طویل ہے، درمیان میں غزل کے اشعار ہیں، چند اشعار دیکھیے:

سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل — برج میں آج سری کشن ہے کالا بادل

بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں | وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل
جوش پر رحمتِ باری ہے چڑھاؤ خُم مے | چشمک برق سے کرتا ہے اشارا بادل
دیکھتا گر کہیں محسنؔ کی فغاں و زاری | نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

مدح کے چند اشعار دیکھیے:

سجدۂ شکر میں ہے ناصیۂ عرشِ بریں | خاک سے پائے مقدس کی لگا کر صندل
افضلیت پہ تری مشتمل آثار و کتب | اولویّت پہ تری متفق ادیان و ملل
لطف سے تیرے ہوئے شوکت ایمان محکم | قہر سے سلطنتِ کفر ہوئی مستاصل
جس طرف ہاتھ بڑھیں کفر کے ہٹ جائیں قدم | جس جگہ پاؤں رکھے سجدہ کریں لات وہبل

دوسری غزل کے مطلع اور مقطع کو بھی دیکھیے:

کیا جھکا کعبے کی جانب کو ہے قبلا بادل | سجدے کرتا ہے سوے یثرب وبطحا بادل
محسنؔ اب کیجیے گلزارِ مناجات کی سیر | کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل

اخیر میں چند دعائیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل | میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی | نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح | ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریل اشارہ سے کہ ہاں بسم اللہ | سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل(۲)

اس قصیدے پر بے شمار اعتراضات کیے گئے ہیں جیسا کہ فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

"محسن نے اپنی بہاریہ تشبیب میں ایسے مقامی رنگوں سے کام لیا ہے جو اس سے پہلے اردو کے نعتیہ قصائد میں نظر نہیں آتے، محسن نے اس قصیدے میں برسات کے موسم، اس کے اثرات، ہندوانہ ماحول، مقامی رسم و رواج، تقریبات اور تہوار، ہندی الفاظ و تلمیحات اور ہندوؤں کی بعض تہذیبی و مذہبی روایات کو اس خوش اسلوبی اور فن کاری سے برتا ہے کہ ان کے قصیدے کا کچھ اور ہی عالم ہو گیا ہے...... عام طور پر قصیدے کی تشبیب میں جس مقامی رنگ سے

کام لیا تھا اسے بعض مشروع حلقوں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور
طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے گئے''۔(۳)

ایک اعتراض یہ اٹھایا گیا کہ اس کی تشبیب میں (جو اس قصیدے کی روح ہے) غیر مشروع موضوعات کو جگہ دی گئی ہے لیکن یہ اعتراض زیادہ قوی نہیں ہے کیوں کہ تشبیب کی روایت اردو میں عربی شاعری سے آئی ہے اور عربی روایات کے مطابق تشبیب میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے، ہر طرح کے مضامین کو نظم کیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عربی کے بہترین نعتیہ قصائد میں مختلف موضوعات پر مشتمل تشبیب ملتی ہے، قصیدۂ بردہ (بانت سعاد) کو آپؐ نے پسند ہی نہیں فرمایا بلکہ اس میں اصلاح بھی فرمائی جب کہ اس کی تشبیب میں محبوبہ سعاد کا ذکر کیا گیا ہے، اللہ کے رسول کے مقابلہ سعاد کی کیا حقیقت ہوسکتی ہے، ایسا ہی اس قصیدے کی تشبیب میں کیا گیا ہے کہ کفر و اسلام دو متضاد چیزوں کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے، دراصل یہاں کفر کی نفی کر کے اسلام و ایمان کی ترغیب دی گئی ہے، امیرؔ مینائی نے اس اعتراض کا جواب بہت مناسب طریقہ سے دیا ہے۔

''بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ قصیدۂ نعت میں متھرا، گوکل و کنہیا کا ذکر بے محل ہے، لہذا دفعِ دخل کیا جاتا ہے کہ نعت میں تشبیب کے معنی ہیں ذکر ایام شباب کرنا اور اصطلاح شعر میں مضامین عشقیہ کا بیان کرنا، اساتذہ نے تخصیص مضامین عاشقانہ کی قید بھی نہیں رکھی، کوئی شکایت زمانہ کرتا ہے، کوئی متفرق مضامین کی غزل لکھتا ہے، کوئی غزل میں کسی طرح کا خاص تلازم ملحوظ رکھتا ہے۔

الغرض متبعان کلام اساتذہ حقیقت شناسانِ تشبیب و قصیدہ پر پوشیدہ نہیں کہ مضامین تشبیب کے محصور نہیں ہیں اور نہ کچھ مناسبت کی قید ہے کہ حمد و نعت و منقبت میں قصیدہ ہو تو تشبیب میں بھی اس کی رعایت رہے، مرزا اسد اللہ غالبؔ دہلوی نے منقبت میں قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

صبح کہ در ہوائے پرستاریٔ وثن
جنبد کلید بتکدہ ، در دستِ برہمن

اور اس قصیدے کی تشبیب میں بھی ایسے ہی مضامین لکھے ہیں، عمدہ تر سند اس کے جواز کی یہ ہے کہ حضرت سرور کائنات خواجہ ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں قصیدۂ بانت سعاد جس کی تشبیب مشروع نہیں ہے پڑھا گیا اور حضرت رسول اللہؐ نے زبان مبارک سے اس کی

تحسین فرمائی ۔(۴)

خود محسن نے بھی زبانِ شاعری ہی میں اس اعتراض کا جواب بڑے مدلل اور عالمانہ انداز میں دیا ہے:

گو قصیدے سے جدا ابر بہار تشبیب | فکر کے تازہ و تر کرنے کو ہے مستعمل
مختلف ہوتے ہیں مضمون کہیں عشق کہیں حسن | کہیں نغمہ ہے کہیں مے کہیں پھول اور کہیں پھل
تاہم ایک اک لطف ہے خاص اس میں جو سمجھے دانا | کہ سخن اور سخن گو کو ہے نازش کا محل
پڑھ کے تشبیب مسلمان مع تمہید و گریز | رجعت کفر بایمان کا کرے مسئلہ حل
کفر کا خاتمہ بالخیر ہو ایمان پر | شب کا خورشید کے اشراق سے قصۂ فیصل
چشم انصاف سے دیکھو تو قصیدے کی شبیہ | نیم رخ تھی اسی رنگت سے ہوئی مستقبل
ظلمت اور اس کے مکارہ میں ہوا طول سخن | مگر ایمان کی کہیے تو اسی کا تھا محل
کفر و ظلمت کو کہا کس نے کہ ہے دینِ خدا | مے و نغمہ کو لکھا کس نے کہ ہے حسن عمل(۵)

ایک اعتراض محمد حسن عسکری نے جلال الدین سحر لکھنوی کے درج ذیل نمونۂ کلام کے حوالہ سے کیا ہے:

اے ہوا جا کے بنارس سے اُڑا لا بادل | چاہیے ہندوی سوسن کے لیے گنگا جل
قمریاں کہتی ہیں مستی میں جو چلتی ہے ہوا | ٹوٹ جائے نہ کہیں سرو چمن کی بوتل
روشیں صاف ہیں ایسی کہ پھسلتی ہے ہوا | پھول ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں سنبھل دیکھ سنبھل
آج تو خوب سی جی کھول کے پی لو یارو | فکر فردا نہ کرو دیکھ لیا جائے گا کل
آن کر پیڑوں کے ٹھالوں میں نہاتے ہیں لال | سوکھتے سوکھتے ہوجاتے ہیں بالکل ہریل
کس قدر کیاریوں میں جمع ہیں گلہائے فرنگ | یہ بڑے دن کے لیے ہوتی ہے شاید کونسل

اس قصیدے کے بارے میں جلال الدین جعفری نے اپنی تصنیف ''تاریخ قصائد اردو'' میں رائے ظاہر کی ہے کہ ''سحر لکھنوی کی زبان متانتِ قصائد کے لیے موزوں نہیں'' اس رائے کے حوالے سے محمد حسن عسکری نے یہ اعتراض کیا ہے:

''زمین بھی محسنؔ کے قصیدۂ لامیہ کی ہے اور زبان بھی لیکن محسن کا قصور معاف ہوگیا،

بلکہ حبیب ہنر ٹھہرا، حالاں کہ وہ نعت لکھ رہے تھے جس میں ادب ولحاظ اور بھی ضروری تھا تو اس قصیدہ میں وہ کیا چیز تھی جو لوگوں کے لاشعور میں اترتی چلی گئی اور جس نے لوگوں سے بے ساختہ سبحان اللہ کہلوایا؟'' (۶)

پروفیسر شفقت رضوی کو بھی قصیدہ لامیہ پر چند اشکالات اور اعتراضات ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، موصوف رقم طراز ہیں:

''بلاشبہ تشبیب میں ہر قسم کے دل خوش مضامین کو جگہ دی جاسکتی ہے، اگر محسن نے ہندوستانی روایات اور کیفیات کو جگہ دی تو برا نہیں کیا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعر کس کے لیے کہا جاتا ہے، شاعر کی شعر گوئی اس کی اپنی ذات کے لیے ہے تو وہ جو چاہے کہہ لے، اگر شاعری ذریعۂ ابلاغ ہے، اگر شاعر قاری اور سامع سے کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے حدود ادراک میں وہ رہ کر کہے، عمومی ذہنی سطح سے بلند ہو کر کہنے سے ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوتا، دوسری بات یہ ہے کہ شعر کسی خاص زمانہ کے لیے ہو تو اس کی قدر وقتی اور عارضی ہوتی ہے، اچھی اور بڑی شاعری وہ ہے جس کی قدر ہر زمانہ اور ہر جگہ ہو جو اسی وقت ممکن ہے جب وہ ہر زمانہ میں شوق اور ذوق سے پڑھی جائے اور وسیع پیمانے پر سمجھی جائے، محسن کاکوروی کے قصیدے کی تشبیب کا وہ حصہ جو ہندو روایات کی تلمیحات اور اشاروں پر مبنی ہے، نعت سے شغف رکھنے والوں کے ایک محدود طبقہ کے لیے نیا نہیں ہوگا، برصغیر جنوبی ایشیا کے خاص علاقوں میں اس کے سمجھنے والے ملیں گے، مسلم معاشرہ کے بیشتر افراد اس سے ناواقف ہیں، بالخصوص برصغیر کی تقسیم کے بعد وہ قطعات زمین جو ہندو تہذیب، معاشرت اور مذہب سے دور ہوگئے ہیں، ان کے لیے صنمیات والا حصہ بالکل اجنبی ہوگا گویا قصیدوں کی تشبیب کی دائمی قدر باقی نہیں رہی اور پھر جس رومانی انداز سے اس تشبیب کی تشکیل وتعمیر ہوئی ہے، اس کے سحر سے نکلنا آسان نہیں، جب تشبیب قاری وسامع کے ذہن کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لے، اس سے گزر کر متضاد نوعیت کی مدح کی طرف رجوع کرنا آسان نہیں، ذہن کو تشبیب کے سحر سے آزاد کرنے کے لیے جو پراثر گریز ہونا چاہیے تھا، وہ موجود نہیں ہے۔ (۷)

پروفیسر رضوی کا یہ غیر جانب دارانہ اور مخلصانہ تجزیہ وتبصرہ ہے، یہ اعتراضات ایسے

ہیں جو ہر غیر جانب دار نقاد کے ذہن میں اُبھر سکتے ہیں، موصوف کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ عمومی ذہنی سطح سے بلند ہوکر کہنے سے ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوتا، جہاں تک نعت گوئی کے محرک یا مقصد کی بات ہے تو منبع نعت سے گہری عقیدت اور شدت محبت ہی شاعر کو نعت کہنے پر مجبور کرتی ہے، گویا شاعر نعت کے ذریعہ اللہ کے رسولؐ سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کا دوسرا اعظیم مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ سامع اور قاری کو بھی آنحضرتؐ سے یک گونہ محبت ہوجائے، یوں ابلاغ وترسیل نعت میں مقصود و مطلوب ہوتا ہے لیکن قصیدۂ لامیہ کو عمومی ذہن سے بلند و بالا قرار دیا گیا ہے، قابل غور بات یہ ہے کہ اگر یہ عمومی سطح سے زیادہ ہی بلند ہوتا تو پھر اس طرح مقبول خاص و عام کیوں ہوتا؟ ایک زمانہ میں تو ہر کسی کی زبان پر اس قصیدے کے اشعار ہوا کرتے تھے، محسن کو صف اول کے شعرا میں شمار کرانے میں اس قصیدے کا اہم رول رہا ہے، تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ قصیدہ صرف خواص کے لیے ہے یا پھر خود اپنے لیے کہا گیا ہے، کیا اشعار میں تلمیحات یا مشکل الفاظ اور صنائع و بدائع کا استعمال بالکل ناجائز ہے؟ کیا علامہ اقبالؔ اور مرزا غالبؔ کے تمام اشعار عوام الناس کو برجستہ سمجھ میں آجاتے ہیں؟ اگر محسن اپنے وقت کی مروجہ زبان و بیان استعمال نہیں کرتے تو شاید اس قصیدے کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ ان کی دوسری مثنویوں کے ساتھ ہوا ہے کہ ان کی وہی مثنویاں زیادہ مقبول ہوئی ہیں جن میں صنائع و بدائع کا استعمال ہوا، دراصل کھانے والے کی ان ہی اشیاء سے ضیافت کی جاتی ہے جو اسے مرغوب ہوں، یہی وجہ ہے کہ جب زمانہ کی رفتار کے ساتھ زبان و بیان کا معیار بدلا تو اس قصیدے کی مقبولیت بھی ماند پڑنے لگی لیکن اس وجہ سے نعت گوئی کی تاریخ میں اس قصیدے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک اس کی تشبیب میں ہندوانہ ماحول و فضا یا ہندوصنمیات کی تلمیحات کے استعمال کی بات ہے تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ قصیدہ اس وقت کہا گیا ہے جب برصغیر متحد تھا، اس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی ظاہر ہے اس وقت اس متحد ملک میں ہندو اور مسلمان سب ایک ساتھ رہتے تھے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں مذاہب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہیں، اس وجہ سے مسلمان ہندوؤں کی مذہبی شخصیات اور مقامات سے بخوبی واقف تھے

اور ہندو بھی مسلم معاشرہ میں گھل مل گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ متعدد غیر مسلم شعرا نے بھی نعت گوئی کا شرف حاصل کیا، اس ماحول و معاشرے میں محسن نے یہ قصیدہ کہا اور اس میں پہلی بار ہندو صنمیات کی تلمیحات کا استعمال کیا، اس وقت ان تلمیحات سے سب لوگ واقف تھے، اس لیے اس قصیدہ کو فوراً قبول عام حاصل ہوگیا، بلکہ یہ نرالا، اچھوتا اور انوکھا انداز سب کو پسند آیا (نیز کمال یہ تھا کہ اس کے اخیر میں ہندو مذہب سے مسلم مذہب کی طرف مائل ہونے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لیے مسلم معاشرہ میں تو اس کی کوئی مخالفت ہی نہیں ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ نعت کے موضوع پر پورا اترتا ہے) لیکن سوئے اتفاق کہ بعد میں ملک کی تقسیم ہوگئی اور اس میں مستعمل تلمیحات بعض لوگوں کے لیے مشکل ہوگئیں لیکن اس میں شاعر کی کوئی خطا نہیں ہے، دراصل یہ نعت میں ہندوانہ تہذیب پیش کرنے کی پہلی کوشش تھی اور پہلی کوشش پر کچھ زیادہ ہی اعتراضات کیے جاتے ہیں لیکن پروفیسر رضوی کا یہ اعتراض بالکل بجا اور درست معلوم ہوتا ہے کہ ''جس رومانی انداز سے اس کی تشبیب کی تشکیل و تعمیر ہوئی ہے، اس کے سحر سے نکلنا آسان نہیں ہے'' محسن نے جس شوق اور لگن سے اس کی تشبیب لکھی ہے اسی معیار و مرتبہ کی گریز یہاں مفقود ہے، نیز مدح کے اشعار میں بھی اتنا زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس پر زیادہ اعتراضات کیے گئے، یہ اس قصیدے کی کمی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر رضوی نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ محسن کاکوروی کا لامیہ قصیدہ عام قاری یا سامع کے لیے نہیں بلکہ یا تو خود ان کے لیے یا خواص کے لیے لکھا گیا ہے، پروفیسر صاحب نے یہی حکم مولانا احمد رضاؔ خان فاضل بریلوی کے دو ایک قصیدوں پر اور عبدالعزیز خالدؔ کے تمام تر کلام پر لگایا ہے، ان تینوں کے کلام کے لیے ''ماہرانہ'' اور ''استادانہ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے، نیز لکھا ہے کہ ''یہ تینوں شاعر محسنؔ، فاضل بریلوی اور خالدؔ یا تو اپنے لیے شعر کہتے ہیں یا خاص حلقے کے لیے''۔(۸)

محسن کے قصیدے کا موازنہ ان دونوں شاعروں سے کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ فاضل بریلوی کی دو ایک نعتیں واقعی مشکل ہیں، انہوں نے جس ذہنی سطح پر فائز رہ کر شعر کہے ہیں وہاں تک رسائی عام پڑھے لکھے افراد کے بس کی بات نہیں ہے، اس لیے ان کی چند نعتیں

جس زمانہ میں لکھی گئیں تب بھی اور آج بھی مشکل ہی سمجھی جاتی ہیں، یہی حال عبدالعزیز خالد کے کلام کا ہے لیکن محسن کا کلام اپنے زمانہ کے مطابق تھا اور تھوڑی بہت ہندو مذہب کی معلومات رکھنے والے کے لیے یہ قصیدہ بہت زیادہ مشکل نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ عوام الناس نے اسے اپنی ذہنی سطح سے قریب تر سمجھا، یہ الگ بات ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جو لوگ ہندو تہذیب و معاشرت سے دور ہوگئے ان کے لیے صنمیات والا حصہ یقیناً مشکل اور اجنبی ہو گیا ہے۔

ان اعتراضات کے باوجود ڈاکٹر اعجاز حسین اس قصیدے کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، وہ رقم طراز ہیں:

> ''محسن نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ مذہبی و نیم مذہبی امور کو قصیدہ میں جگہ دے کر نہ صرف وسیع النظری کا ثبوت دیا بلکہ ادب کو ایک نئے میدان کی طرف بڑھانے کی کوشش کی، سودا اور میر کی طرح محسن کا بھی قصیدہ پر احسان رہے گا کہ ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے کی فکر کی، ایک نئے عنوان کا اضافہ کیا، قصیدہ کو بھی دل چسپ بنایا اور ادب کے بڑے فرض کو ادا کرنے کی کوشش کی ...... ، اس جرأت رندانہ کی قدر ہماری نگاہوں میں اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نعتیہ قصیدہ میں وہ کاشی، متھرا، برج، کنہیا، برہمن اور گوپیوں کو جگہ دے کر تشبیب کو دل کش بنا دیتے ہیں، ہندوؤں کی رسوم نظم کرکے اپنی جدت پسندی کا اور واقفیت کا مسلسل ثبوت دیتے ہیں''۔(۹)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی تشبیب کی اس جدت پسندی کو سراہا ہے اور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے، انہوں نے لکھا ہے:

> ''ایسی نرالی تشبیب آپ کو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملے گی، ذوق و سودا قصیدے کے بادشاہ ہیں لیکن ان کی کسی تشبیب میں ایسی جدت اور زور نہیں، یہ مضامین تشبیہات، استعارات اور خیالات جو خالص ہندوستانی فضا کی پیداوار ہیں، محسن ہی کا حصہ ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن کی پاکیزہ طبیعت عوام کی پامال شاہراہ سے بچ کر اپنا راستہ الگ بنانا چاہتی

تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سرزمین نعت میں اپنی جدت پسندی سے رنگ
رنگ کے پھولوں کا ایک گلزار دکھلا دیا ہے"۔ (۱۰)

اردو میں قصیدہ نگاری کے مصنف ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی اس کی تشبیب میں برسات کے موسم اور ہندوستانی رنگ کے بیان کو اس کی مقبولیت کا راز بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ان کے قصیدے "مدیح خیرالمرسلین" کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ قصیدہ اردو قصائد میں ایک منفرد اور امتیازی مقام کا مالک ہے، اس کی تشبیب جس پر اس قصیدے کی مقبولیت کی بنیاد ہے، یوں تو بہاریہ تشبیب ہے لیکن محسن نے اس کو برسات کے موسم سے ہم آہنگ کر کے مقامی رنگ، ہندوستانی تلمیحات، ہندوستانی رسوم و رواج اور ہندی الفاظ کی آمیزش اتنی فنکاری سے کی ہے کہ کچھ اور ہی عالم پیدا ہو گیا ہے"۔ (۱۱)

محسن نے دبستان لکھنؤ کی تمام اہم خصوصیات کو اپنایا ہے لیکن اس طور پر کہ یہ تمام کلام کی خوبی بن کر ابھری ہیں نہ کہ کلام کے فہم یا روانی میں رخنہ انداز ہوئی ہیں اور نہ اس سے کلام کی اثر انگیزی میں کمی آئی ہے اور نہ ان کا اکثر کلام ایک معمہ اور چیستاں معلوم ہوتا ہے جیسا کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے:

"متاخرین کے دور میں محسن کاکوروی نے نعت گوئی کو جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن
کلام نعتیہ رکھا مری زباں کے لیے

اپنا خاص فن بنالیا اور اس حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اس مقدس موضوع کے متعلق لکھنؤ کی برخود غلط شاعری کا استعمال اور بھی غلط طریقے سے کیا"۔ (۱۲)

انہوں نے مزید لکھا ہے:

"......اور ان تمام خصوصیات کے اجتماع نے ان کے کلام کو اس قدر

بے اثر کر دیا ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں کسی مذہبی جذبے سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں، غرض انہوں نے جو نعتیہ قصائد اور نعتیہ مثنویاں لکھی ہیں ان کا بیشتر حصہ ایک معمہ اور چیستاں ہے نعت نہیں ہے"۔(۱۳)

مولانا عبدالسلام ندوی کی رائے نعت محسن کے بارے میں کچھ زیادہ شدت اختیار کیے ہوئے ہے، ان کی رائے قصیدے کے صرف ایک رخ پر مبنی ہے، دراصل مولانا لکھنوی شاعری سے نالاں ہیں، چوں کہ محسنؔ بھی لکھنوی طرز کے حامل ہیں اس لیے مولانا کو ان کی شاعری میں وہ ساری برائیاں نظر آئیں جو اس دبستان کے شعرا میں عام طور سے ہوا کرتی ہیں[1] ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محسن نے نعت گوئی کا حق ادا کر دیا، محسن کے آنحضورؐ سے سچے عشق و محبت اور خلوص کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے تا عمر نعت گوئی کو ہی اپنا شعار بنایا، ابتدا بھی نعت سے کی اور انتہا بھی نعت پر کی، ڈاکٹر سید شمیم گوہر کے نزدیک محسن کی نعتیہ شاعری کی حقیقت یہ ہے کہ نعت اگرچہ ایک موضوعاتی شاعری ہے مگر اس کو فن اور حتمی جستجو کی دولتوں سے نواز دیا جائے تو بڑی سے بڑی غیر موضوعاتی شاعری بھی سر جھکانے پر مجبور ہو سکتی ہے"۔(۱۴)

محسن کی اس کامیابی کی وجہ جلال الدین احمد جعفری نے کچھ اس طرح بیان کی ہے:

"محسن کاکوروی نے نعت گوئی کو فن شریف بنا دیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کا عشق رسول اوروں سے زیادہ صادق تھا یا انہوں نے حقیقت محمدی کو اوروں سے زیادہ سمجھا تھا، نعت گوئی میں ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ نہ تو انہوں نے اپنی صلاحیتوں کی حد سے آگے جانے کی کوشش کی اور نہ اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے شرمائے"۔(۱۵)

غرض بحیثیت مجموعی محسن کے کلام میں مشکل پسندی، تلمیحات اور دبستانِ لکھنؤ کی دیگر خصوصیات صنائع و بدائع اور اپنے احساسات کا اظہار پر تکلف اور پر تصنع انداز میں ہونے کے باوجود

---

[1] معارف: لیکن مولانا ندوی کا یہ اعتراف بھی نقل کرنا چاہیے کہ استعارات کی جدت، تشبیہات کی لطافت، بندش کی چستی اور الفاظ کی متانت اور جزالت میں کلام نہیں اور صفائی و سادگی جہاں ہے وہاں لطف بھی ہے۔

محسن ایک کامیاب نعت گو شاعر ہیں، محسن نے نعت کو بام عروج پر پہنچایا، ان سے متاثر ہو کر کتنے ہی شعرا نعت گوئی کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوئے، محسن نے دبستان لکھنؤ کو بھی نئی راہ دکھائی، اس کی ایک وجہ ان کی فنی مہارت اور ان کی شاعری کا وقتی تقاضوں پر پورا اترنا ہے تو دوسری بڑی وجہ ان کا جذب صادق، عشق حقیقی اور حضور سے عقیدت و محبت میں اخلاص و استقامت ہے۔

نعتیہ قصائد میں محسنؔ کا نام بلند و بالا مقام پر فائز ہے، نعت گوئی کی تاریخ محسنؔ کا نام لیے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوسکتی۔

مراجع

(۱) ستارہ یا بادباں از محمد حسن عسکری، ص ۲۹۸، مطبع سعدی، قرآن محل، مولوی مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی، ۱۹۶۳ء، ناشر مطبع سات رنگ، کراچی۔ (۲) کلیات نعت محسنؔ، ص ۹۵ تا ۹۷، ۱۰۴ تا ۱۰۸، ۱۱۵ تا ۱۱۶، ۱۱۸ تا ۱۲۳۔ (۳) اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۶۰، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۷۴ء۔ (۴) کلیات نعت محسنؔ مرتبہ محمد نور الحسن، ص ۹۳، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲۔ (۵) ایضاً ص ۹۴۔ (۶) ستارہ یا بادبان، ص ۳۰۰۔ (۷) نعت رنگ، ص ۶۰ و ۶۱، مضمون ''اردو نعت پر تاریخی تحقیقی اور تنقیدی کتب-تعارف و تجزیہ''۔ (۸) نعت رنگ، ص ۶۱، سہ ماہی کتابی سلسلہ، مدیر صبیح رحمانی، کراچی۔ (۹) مذہب و شاعری از ڈاکٹر اعجاز حسین، ص ۱۹۶ تا ۱۹۸۔ (۱۰) لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۷۔ (۱۱) اردو میں قصیدہ نگاری از ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ، ناشر تخلیق کار پبلی شرز، لکشمی نگر، دہلی۔ (۱۲) شعر الہند حصہ دوم از مولانا عبد السلام ندوی، ص ۲۱۱، مطبع معارف اعظم گڈھ، طبع پنجم، ۱۹۸۱/ ۱۴۰۱۔ (۱۳) شعر الہند جلد دوم، ص ۲۱۳۔ (۱۴) نعت کے چند شعرائے متقدمین از ڈاکٹر سید شمیم گوہر، ص ۶۷، سید ابو طاہر، خانقاہ حلیمہ ابو العلائی، نیا حجرہ، ۱۲۷، چک الہ آباد۔ (۱۵) ستارہ یا بادباں از محمد حسن عسکری، ص ۳۱۱۔

کھوار حمد نگاری کی روایت

جناب اکبر علی غازی

پاکستان کے خوب صورت ترین خطوں میں سے ایک خوب صورت خطہ چترال ہے جسے ”مشرقی سویٹزرلینڈ“ کا نام دیا جاتا ہے (۱) کھوار اس زبان کا نسبتی نام ہے جو یہاں کی کھو قوم کی نسبت سے پڑا۔(۲) چترال کی مناسبت سے اس زبان کو چترالی بھی کہا جاتا ہے۔ جسے علاقائی لہجے میں مقامی لوگ چھترا ری پکارتے ہیں۔ چترال سے باہر اس زبان کو چتراری، چترالی، کھوہ وار، کھوار قشقاری اور آرینہ بھی کہا جاتا رہا ہے۔(۳) یہ زبان چترال کے ساتھ ساتھ شمالی علاقہ جات کے ضلع غذر میں بھی بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سوات، کالام، واخان، پامیر اور نورستان کے افغان اضلاع میں بھی مادری زبان کے طور پر کھوار بولنے والوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہیں۔(۴) دیگر زبانوں کی طرح کھوار ادب کی ابتدا بھی لوک ادب سے ہوئی البتہ کھوار ادب میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں۔ جن سے اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کھوار میں نثر قدیم ہے یا نظم۔ البتہ لوک گیتوں کی قدامت کے شواہد زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موزوں ضرب الامثال اور پہیلیوں کو آسانی سے نظم میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ”کھوار لوک ادب میں تین ہزار سال پرانی داستانوں، پہیلیوں، ضرب الامثال اور قصے کہانیوں کا سراغ ملتا ہے اور یہ لوک ادب زیادہ تر لوک گیتوں پر مشتمل ہے“(۵) کھوار میں لوک گیتوں کو ”باشونو“ کہا جاتا ہے۔(۶) اس زبان کے لوک ادب کو اپنے معیار اور مقدار کے حوالے سے دیگر پاکستانی زبانوں کے لوک ادب کے سامنے برابری کی سطح پر رکھا جاسکتا ہے۔ گو اس میں خالص حمد و نعت کے موضوعات بہت کم ہیں البتہ کہیں کہیں مناجات کا رنگ ضرور جھلکتا ہے جس کی مثال رحمت عزیز چترالی کی کھوار لوری سے دی جاسکتی ہے۔ یعنی کھوار لوری میں ہمیں اللہ کی طرف رحمت و برکت کی طلب بھری باتیں ملتی ہیں۔

---

akbaralighazi@gmail.com

قدیم کھوار ادب میں ہمیں تین سو سال قدیم شعری نمونے ملتے ہیں مگر ان کو حمدیہ شاعری کے طور پر زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ البتہ ان اشعار میں حمدیہ عناصر سے انکار کرنا بھی مشکل ہے۔ کھوار ادب کے حوالے سے پہلا نام اتالیق محمد شکور غریب (۱۶۹۵ء تا ۱۷۷۲ء) کا ہے۔ بنیادی طور پر ان کو فارسی کا شاعر مانا جاتا ہے البتہ ان کے فارسی دیوان کے آخری باب ''بلغت چترار ی'' کو کھوار ادب میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ (۷) اتالیق محمد شکور غریب بیک وقت مصاحب شاہ، جنگجو، شمشیرزن اور اہل قلم تھے۔ ان کا کلام عشقیہ مضامین سے پر ہے۔ اس میں عربی فارسی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ متصوفانہ رنگ بھی موجود ہے۔ انہیں کھوار غزل کے حوالے سے اولیت کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کے ہاں حمد کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں البتہ نقش بندی اولیاء کی منقبتیں ملتی ہیں۔ جن میں جزوی طور پر حمدیہ عناصر تو مل جاتے ہیں مگر مکمل حمدیہ اشعار نہیں۔

مرزا محمد سیر جنہیں پروفیسر اسرارالدین نے مولانا محمد سیئر (۸) لکھا ہے چترال میں مہسیار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کو چترال کا سب سے عظیم (عظیم ترین) شاعر خیال کیا ہے۔ ان کا زیادہ تر کلام فارسی میں ہے البتہ ان کا کھوار رومان ''یار من ہمیں'' ایک عظیم کھوار دستاویز ہے جو چترال میں زبان زد خاص و عام ہے۔ ان کے فارسی کلام میں حمد کے اعلی نمونے ملتے ہیں۔ مگر ان کے کھوار رومان کے دستیاب اشعار میں بھی حمدیہ اشعار نہیں مل سکے۔ ان کے کھوار کلام میں تصوف، معرفت اور عشق مجازی کے بے شمار رنگ ملتے ہیں جو کہ مجازی سے بڑھ کر حقیقی کی طرف نشان دہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فتح محمد ملک ان کی شاعری کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شاعری کو شیراز، خراسان اور ہند کی صوفیانہ شاعری کا حسین امتزاج قرار دیتے ہیں۔ (۹) شہزادہ تجمل شاہ محوی ابن کٹور مہتر چترال کھوار ادب کے نامور ادیب اور بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۳ء میں شہید ہوئے۔ ان کے فارسی دیوان کے علاوہ کھوار کی کچھ غزلیات اور قطعات بھی محفوظ ہیں۔ ان کے کلام میں معرفت اور عشق و مستی کا خاص رنگ ملتا ہے۔ ان کے ہاں دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی فکر عام ہے۔ کلاسیکی دور کے شعراء میں جبین، آمان، زیارت خان زیرک، گل اعظم خان، حسیب اللہ، باچہ خان ہما، مرزا فردوس فردوسی، بابا ایوب، مہر گل اور عزیز الرحمان بیغش جیسے نام شامل ہیں ان میں سے اکثر شعراء کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

متاخرین کلاسیکی شعراء میں باچہ خان ہما خصوصی اہمیت کے حامل شاعر ہیں۔ان کے کلام میں صنائع، بدائع، لطافت اور ظرافت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔وہ عالم باعمل اور صاحب دل بزرگ بھی تھے۔شگفتہ مزاجی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔البتہ وہ ایک مشکل پسند شاعر تھے۔ان کے کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کا بھاری پن ہے۔وہ اپنے گاؤں کے ایک مجذوب مجید کا ذکر اپنے کلام میں جابجا کرتے ہیں۔جس کی مدد سے انہوں نے تصوف اور سلوک کی منازل کی نشان دہی کی ہے۔یاد رہے وہ کھوار زبان کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر بھی ہیں۔(۱۰) انہوں نے حمدیہ شاعری تو نہیں کی ہے تاہم ان کے کلام میں متعدد جگہوں پر حمدیہ مضامین ملتے ہیں۔ ان کے دو اشعار کا ترجمہ پیش ہے:

ترجمہ: اے محبوب تم اپنے حجاب اور پردے کو ہٹا کر کیا کمال کرتے ہو کہ افلاطون جیسا عاقل بھی مجید جیسا فاتر العقل بن جاتا ہے۔اے محبوب اپنے حسن کی بہار دکھادے جو زندگی کا سرچشمہ ہے۔اس بہار کی مسکراہٹیں بکھیر کر مجھ جیسے لاکھوں عاقلوں کو مجید جیسا دیوانہ بنادے۔(۱۱)

۱۶؍دسمبر ۱۹۸۹ء کو سول ہسپتال دروش میں ان کا انتقال ہوا۔

کلاسیکی شاعری کا ایک اہم نام امیر گل خان ہیں ان کے کلام میں بھی تصوف اور معرفت کی چاشنی بھرپور موجود ہے۔انہیں کو چترال میں موسیقی کے حوالے سے خصوصی مقام حاصل ہے۔وہ جتنے اچھے گیت نگار ہیں اتنے ہی اچھے موسیقار بھی ہیں۔انہوں نے عشقیہ اشعار کے علاوہ حمد، نعت، مرثیے اور قومی ترانے بھی لکھے۔(۱۲) پروفیسر اسرار الدین کے مطابق وہ پہلے کھوار شاعر ہیں جنہوں نے باقاعدہ طور پر حمد لکھی۔تلاش بسیار کے باوجود ان کا حمدیہ کلام نہ مل سکا، ایک بند جس کا اردو ترجمہ رحمت عزیز چترالی نے کیا ہے اور جو صوفیانہ رنگ بھی لیے ہوئے ہے۔حاضر ہے:

ترجمہ: خدا تعالیٰ طرح طرح سے اپنا جلوہ ظاہر کرتا ہے کہیں صلیب کے اوپر منصور کی مستی میں جلوہ گر ہوتا ہے اور (اس سب کے باوجود) اللہ تعالیٰ لاشریک بادشاہ ہے اور اس کی ہستی واحد اور بلند ہے۔(۱۳)

قدیم دور کے مقابلے میں جدید دور میں کھوار ادب میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔قدیم ادوار میں حکمرانوں کی زبان فارسی تھی اس لیے کھوار ادب ترقی نہیں کرسکا۔مگر قیام پاکستان کے بعد اس جانب اہل ادب کا التفات بڑھا اور کھوار ادب میں نئے نئے تجربے ہوئے اور شعراء نے دیگر اصناف ادب کے

ساتھ ساتھ حمد اور نعت پر بھی توجہ مبذول کی ہے۔ کھوار ادب میں نعتیہ شاعری کا اچھا ذخیرہ ہے البتہ حمد کے حوالے سے یہ ادب اتنا مالا مال نہیں۔ جدید شعراء کے کلام میں حمدیہ اشعار ملتے ہیں مگر ان کا ابتدا میں ہونا ضروری نہیں۔ جدید دور کے شعراء کے ہاں کوشش کی جا رہی ہے کہ تمام شعری کتب حمد و نعت سے شروع ہوں البتہ بسم اللہ سے دیوان کی ابتدا کرنے کا رجحان قدیم سے ہے۔ حمد کو صنف شاعری کے طور پر رواج دینے والے شعراء میں قاضی ملفت خان بڑے اہم شاعر ہیں۔ یہ تورکھو سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کا کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔ ان کے بعد بابا فردوسی، بابا ایوب خان ایوب، ناجی خان ناجی، محمد چنگیز خان طریقی، مولانا پیر محمد چشتی، مولانا نقیب اللہ رازی، گل نواز خان خاکی، اقبال حیات، محمد جاوید حیات، جاوید حیات کاکاخیل، فداء الرحمان فدا، عبدالولی خان، پروفیسر اسرار الدین، رحمت عزیز چترالی، نورالہادی، عنایت الرحمان پرواز وغیرہ حمد لکھنے والے شعراء میں شامل ہیں۔ مراز فردوس فردوسی کو سبقت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعہ کلام میں حمدیہ اشعار شامل کیے۔ ان کے بعد رحمت عزیز چترالی نے اپنے مجموعہ کلام ''گلدستہ رحمت'' میں کئی حمدیں شامل کیں جو ایک نیا رجحان ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی ایک نظم کا ترجمہ پیش ہے، جس میں حمدیہ عناصر پورے طور پر موجود ہے:

ترجمہ: اے اللہ! اے میرے خدا! یہ زمین بھی تیری، یہ آسماں بھی تیرا، یہ پتھر، یہ مٹی، یہ ریت اور پتے بھی تیرے۔ یہ پودے، یہ فصلیں، گاجر اور آلو، سیب، خوبانی اور آڑو کے یہ درخت بھی تیرے۔ تیری رحمتوں کا شکر میں ادا نہیں کرسکتا (یعنی تیری رحمتیں بے کنار ہیں) میری سانسیں بھی تیری عطا ہیں۔ میری حرکت اور جان بھی تیری ہے۔ میں گنہگار بندہ ہوں مگر پھر بھی تیری رحمت سے نا اُمید نہیں ہوں۔ تو ہی مجھ جیسے گنہگار پر رحم کر کیونکہ تو رحیم ہے۔ تو غفور بھی ہے، تو غفار بھی ہے۔ اے اللہ سب مسلمانوں کے گناہ معاف فرما کیونکہ یہ سب تیرے ہی بندے ہیں۔ (۱۴)

کھوار ادب میں اب ایک تحریک کی صورت میں حمد نگاری کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اور اس تحریک کو فروغ دینے میں ''جمہور الاسلام''، ''ماہنامہ شندور''، ''ماہنامہ ژنگ''، ''صدائے چترال''، ''ہندوکش''، ''ھمکلام''، ''بزم کھوار'' اور ''چترال وژن'' رسائل نامی جیسے پیش پیش ہیں۔ بعض مجموعے حمد سے خالی بھی دستیاب ہیں۔ (۱۵) کھوار ادب میں بھی حمد سے زیادہ قدیم روایت مناجات کی ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مناجات بھی حمد ہی کی ایک قسم ہے مگر ایسی مناجات بہت کم

ہیں جن میں شاعر نے تعریف وتوصیف کے بعد دعا مانگی ہے۔تعریف وتوصیف اور بڑائی کے بغیر مانگی گئی دعا یا مناجات التجا، درخواست، منت اور زاری تو ہو سکتی ہے حمد نہیں۔کھوار ادب میں ابھی تک کوئی حمد یہ مجموعہ شائع نہیں ہوا بعض مجموعوں میں حمد ومناجات کو روایت سے ہٹ کر زیادہ صفحات دیے گئے ہیں۔اس ضمن میں رحمت عزیز چترالی کو اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''گلدستۂ رحمت'' میں پہلی دفعہ تیرہ حمدیں شامل کی ہیں۔پروفیسر اسرار الدین کے مجموعہ ''درون ہنو'' میں ۲۹ سے ۶۶ صفحہ تک حمد ومناجات کو جگہ دی گئی ہے۔پروفیسر اسرار الدین کی حمد کے بعض اشعار جس کا اردو میں ترجمہ رحمت عزیز چترالی نے کیا ہے پیش ہے۔

اللہ ہو اللہ ہو تو ہی تو لا شریک وحدہ
لا الہ الا ھو اللہ ہو اللہ ہو تو ہی تو
ارد گرد بھی تو درمیان میں بھی تو
ادہر بھی تو اُدہر بھی تو
غائب بھی تو حاضر بھی تو
اللہ ہو اللہ ہو تو ہی تو (۱۶)

موجودہ دور میں تاج محمد فگار، امین چغتائی، مولانا نقیب اللہ رازی اور پیر محمد چشتی نے حمد کو اپنے دواوین میں شامل کیا ہے۔ان کے علاوہ حمد کو اپنے مجموعے میں اولیت دینے والے شعراء میں پروفیسر اسرار الدین، رحمت عزیز چترالی، ناجی خان ناجی، امین چغتائی، پیر محمد چشتی، ولی زار خان ولی، ولی الرحمان ولی اور تاج محمد فگار وغیرہ شامل ہیں۔۱۹۷۸ء میں جب انجمن ترقی کھوار اور ۱۹۹۶ء میں کھوار اکیڈمی کراچی کا قیام عمل میں آیا تو کھوار ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور اس کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوا، کراچی شاخ کے ڈائرکٹر اور صدر رحمت عزیز چترالی ایک ایثار پسند، ملن سار اور علمی کام میں ہر وقت مدد کے لیے تیار رہنے والے شخص ہیں۔ان کی وجہ سے کھوار ادب میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ان کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں اور ''کھوار اور حمد ونعت کی مختصر تاریخ'' اور خالص حمد یہ اشعار پر مشتمل مجموعہ ''حمد وثنائے رب جلیل'' نامی دو کتابیں منتظر اشاعت ہیں۔یہ دونوں کتابیں بلاشبہ کھوار ادب میں ایک نیا اور صحت مند اضافہ ہوں گی اور کھوار حمد ونعت کو اردو، سندھی اور پنجابی حمد نگاری کی صف میں لا کھڑا کرنے میں

معاون ثابت ہوں گی۔

عہد حاضر کے شعراء میں جاوید حیات کا کاخیل ایک اہم شاعر ہیں۔ان کی ایک حمدیہ نظم جس کو رحمت عزیز چترالی نے اردو کا قالب عطا کیا ہے پیش ہے:

ترجمہ: اے میرے پروردگار! تو کیڑے مکوڑوں سے لے کر انسانوں تک سب کا رازق ہے تو سب کے لیے رحم کرنے والا ہے تو مہربان ہے۔اے میرے پاک اللہ صرف ایک لفظ ''کن'' سے تو نے اس حکمت سے بھرپور کائنات کو بنایا۔تیری قدرت کی کوئی انتہا نہیں (بلکہ وہ لامحدود ہے) تیری قدرت عظیم الشان ہے، اے میرے پاک اللہ! (۱۷)۔

عہد حاضر کے شعراء میں صفدر ساجد کا نام بھی نمایاں ہے۔وہ نظم اور غزل پر یکساں دسترس رکھتا ہے۔ان کا کلام قلمی صورت میں انجمن ترقی کھوار کراچی اور کھوار اکیڈمی کراچی کی لائبریریوں میں محفوظ ہے۔حمد ونعت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔اس کی حمد کا اردو ترجمہ رحمت عزیز چترال نے کیا ہے۔وہ اللہ جل شانہ کے حضور یوں عرض گزار ہیں:

ترجمہ: اے میرے خدا! اے میرے پروردگار، تیرا یہ بندا بڑا گنہگار ہے۔میری زندگی نافرمانیوں میں گزری ہے، اے اللہ! تو اس گناہ کے ملبے کو ختم کرکے میرے دل کو صاف کیجیو۔(۱۸)

کھوار ادب میں حمد نگاری کا مستقبل بڑا روشن ہے، اردو اور پنجابی کی طرح اس ادب میں حمد نگاری کا رجحان فروغ پا رہا ہے ایک نعتیہ مجموعہ ''آقائے نامدار'' منظر عام پر آ گیا ہے۔ مولانا محمد نقیب اللہ رازی کا تخلیق کردہ ہے (۱۹) جسے کھوار ادب میں ایک خوش آیند اضافہ قرار دیا جا رہا ہے۔انجمن کھوار چترال کی کوششوں سے ''ققنوز'' کے نام سے دو شعری انتخاب شائع ہوئے تھے جن میں حمد ونعت کے نمونے بھی تھے۔ان کا ترجمہ باوجود کوشش کے فراہم نہیں ہوسکا اس لیے اس میں صرف دو تین حمد اس مقالے میں شامل ہوسکی ہیں جن کا ترجمہ ایک چترالی دوست محمد انور کی کوشش سے ہوسکا۔بہرحال یہ انتخاب کھوار ادب کا ایک مکمل اور متوازن منظر نامہ ہے جس میں حمد ونعت کا پہلو اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔

کھوار حمد کے چند مضامین: پاکستانی زبانوں میں کھوار ایک اہم زبان ہے، اس کے بولنے والے سب کے سب مسلمان ہیں۔اس لیے اس پر اسلام کی چھاپ بھی گہری ہے۔دوران

تحقیق کسی بھی غیر مسلم شاعر کا کلام نظر سے نہیں گزرا۔ اسلامی تعلیمات کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی رنگ بھی اچھے تناسب کے ساتھ اس ادب میں موجود ہیں۔ جیسے غزل سے جڑے ہوئے تمام روایتی مضامین، حسن و عشق، تصوف، فلسفہ (۲۰) اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف بلند کی گئی صدائے احتجاج وغیرہ۔

مذہب اسلام میں عقیدہ توحید کو مرکزیت حاصل ہے۔ کھوار ادب اور معاشرے کی شناخت بھی یہی ہے۔ اور اس عقیدہ کا پہلا تقاضا اللہ جلّ شانہ کو ایک، اکیلا اور ہر شئے کا پیدا کرنے والا ماننا ہے۔ اور توحید کا سب سے بڑا مظہر اللہ علیم و بصیر کی تعریف و توصیف اور ثناء ہے جسے ادبی اصطلاح میں حمد کہا جاتا ہے۔ کھوار ادب میں بطور اصطلاح حمد کا وجود گو قدیم نہیں مگر حمد یہ عناصر کی قدامت سے انکار ممکن نہیں۔ خالص حمد کی تخلیق سے پہلے اس ادب میں تبلیغ و اصلاح کے لیے فنا اور بقا کا مسئلہ بیان کر کے لوگوں کو لالچ اور خود غرضی سے باز رکھنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے براہ راست اللہ پاک کے احکام بیان کیے جاتے تھے۔ اور لوگوں کو آخرت کا خوف اور دنیا کی بے ثباتی کا احساس دلا کر دین اور فلاح کی طرف راغب کیا جاتا تھا۔ شہزادہ تجمل شاہ محوی لکھتے ہیں:۔

ترجمہ: اے محوی آخرت اتنی دور نہیں جتنی تم سمجھتے ہو۔ اور دنیاوی دھندوں میں مگن پاگل بنے ہوئے ہو۔ آخر کب تک یہاں رہو گے؟ کوئی ہمیشہ تو تم نے یہاں رہنا نہیں۔ پھر بھی تم ماتم کرنے کی بجائے خوشیاں منا رہے ہو۔ کاش تم سنتے مگر تمہارے کان نہیں ہیں (۲۱)

اللہ تعالیٰ کے نام ہر حوالے سے باعث رحمت و برکت ہیں۔ ان کا پڑھنا، سننا اور لکھنا باعث ثواب اور ذریعہ نجات ہے۔ اسی وجہ سے شعراء کرام بھی اللہ کے پیارے پیارے ناموں کو اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے رحمت اور برکت کے طالب ہوتے ہیں۔ پنجابی، سندھی اور اسرائیلی زبانوں میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ سندھی ادب میں تو ایک حمد میں اللہ تعالیٰ کے ۱۷۴ نام ذکر کیے گئے ہیں۔ کھوار ادب میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کو کسی ایک شعری تخلیق میں شامل کرنے کا سراغ نہیں ملا البتہ متفرق انداز میں اللہ عز و جل کے مخصوص ناموں کو برتنے کا پتہ چلتا ہے۔ رحمت عزیز چترالی کی ایک حمد جس میں خدائے واحد کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے پیش ہے:

اللہ مہ خدائے تہ نام رحمان دی رحیم دی
تو غفار دی غفو ر الرحیم دی
کرم کوس اسپہ سورا تو رب کریم دی

ترجمہ:

اے میرے اللہ! اے میرے خدا! تیرا نام رحمان بھی ہے
اور رحیم بھی ہے۔
تو غفار بھی ہے اور غفو ر الرحیم بھی ہے۔
کرم کرے گا تو ہم پر کیونکہ تو رب کریم بھی ہے (۲۲)

بلاشبہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات ہیں اسی وجہ سے یہ کائنات اس قدر خوش نما اور دلکش ہے۔اس حفیظ ونصیر کی وجہ سے رات کو سونے والے اس یقین کے ساتھ سوتے ہیں کہ کوئی ہڑپ نہ کر جائے گا۔اس کے بے پایاں احسانات کا حسب توفیق شمار کرنا حمد کے قرینوں میں سے ایک قرینہ ہے۔احسانات کا شمار کرنا ایک تو اس لیے ہوتا ہے کہ تو نے ہم پر یہ احسان کیے ہیں تیرا شکر ہے، اس کا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تو نے دوسروں پر یہ احسان کیے ہیں ہم پر بھی یہ احسان فرما۔ایک کھوار شاعر رحمت عزیز چترالی اللہ کے احسانات کا شکر اس طرح ادا کرتا ہے:

ترجمہ: اے میرے اللہ! اے میرے خدا! یہ زمین بھی تیری، یہ آسمان بھی تیرا، یہ پتھر، یہ مٹی، یہ ریت اور پتے بھی تیرے، یہ پودے، یہ فصلیں، گاجر اور آلو، سیب، خوبانی اور آڑو کے یہ درخت بھی تیرے ہیں۔تیری نعمتیں بے حد وحساب ہیں۔ان کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا حتّیٰ کہ میری سانس بھی تیری دین ہے اور حرکت جسم بھی (۲۳)۔

اللہ سب سے بڑا ہے۔وہ ہر چیز پر قادر ہے۔بلاشبہ تمام تر کبریائی کی مستحق وہی ذات ہے۔ کھوار شاعر تاج محمد فگار اللہ کی بڑائی اور اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کچھ اس ڈھنگ سے کرتا ہے:

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی حاجت پوری کرنے والا نہیں۔اگر وہ رحم کرنے پر آمادہ ہو تو اس کے رحم کے آگے کچھ مشکل نہیں۔اے غفور الرحیم! میں بڑا گنہگار ہوں مگر تیری رحمت سے نا امید نہیں ہوں تو اکیلا ہے تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔تیری ذات تنہا ہے اور تیری صفات میں بھی کوئی شریک نہیں۔اگر وہ رحم کرنے پر آمادہ ہو تو اس کے رحم کے آگے کچھ مشکل نہیں۔(۲۴)

عاجزی اور انکساری اللہ کو از حد پسند ہے، امین الاسلام ثاقب نے اپنے احساس کو اپنی حمد کے ایک بند میں یوں پیش کیا ہے:

ترجمہ: اپنے گناہوں کے بارے میں سوچ کر ہمیشہ پریشان رہتا ہوں۔ پھر بھی ناامید نہیں ہوں کیونکہ تو غفور الرحیم ہے۔ اگر میں لاکھ خطا بھی کروں تو تو معاف کرنے والا ہے۔ یہ اچھی صحت، یہ دولت، یہ ساری نعمتیں میرے لیے تیری عطا ہیں۔ مگر میں نافرمان انسان ان کے باوجود تجھے یاد کرنے میں سستی سے کام لے رہا ہوں (۲۵)

تمام مسائل اور مشکلات کا حل فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے ہر وہ انسان جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ اسی مجیب الدعوات کے آگے گڑگڑاتا ہے، اپنے مسائل بیان کرتا ہے اور اپنے مشکلات کے حل کی استدعا کرتا ہے۔ شخصی وملی مسائل کو کھوار حمدیہ ادب میں شامل کرنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر پھر بھی مناجات میں کہیں کہیں یہ رنگ نظر آہی جاتا ہے۔ صفدر ساجد کی حمد کے بعض اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

ترجمہ: آج عبادت خانے ویران ہوگئے ہیں، مسلمان دین سے بیگانہ ہوگئے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مسلمان صرف نماز عصر کے لیے مساجد میں تشریف لاتے ہیں (۲۶)

ہر شاعر خواہ وہ غزل لکھ رہا ہو یا نظم یا کسی دوسری نئی یا پرانی صنف میں طبع آزمائی کر رہا ہو کسی نہ کسی حوالے سے تصوف کی جھلک اس کے کلام میں ضرور نظر آتی ہے۔ کھوار ادب میں بھی تصوف کی روایت بڑی قدیم ہے۔ اور اکثر شعرا نے اس روایت کو برتا ہے۔ کھوار ادب کے مشہور شاعر پروفیسر اسرار الدین کے بعض اشعار کا درج ذیل اردو ترجمہ مسئلہ وحدت الشہود کی بہترین مثال ہے۔

ترجمہ: ہر رنگ میں ہر چمن میں، ہر پہاڑ میں ہر زمان میں، ہر پھول کی خوشبو میں، ہر کلی اور ہر کونپل میں، ہر پہاڑی اور اس کی چوٹی میں، پانی کے بلند آبشاروں میں، تیری بڑائی کا کھلا ثبوت ہے۔ تو ہی تو اللہ اللہ، ہر سردی میں ہر ہوا میں، نظروں کے سامنے نظروں سے اوجھل، مکان میں اور لامکان میں، ہر شاخ میں اور ہر پتے میں، تیرے دیدار کی جستجو ہے (۲۷)

امیر گل خان تصوف کے مکتبہ فکر وحدت الوجود کے رنگ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

ترجمہ: وہ کبھی مجنوں کے بھیس میں صحرانوردی کرتے ہوئے پایا جاتا ہے اور کبھی ایاز کی خوبصورتی کے ساتھ محمود کے عشق کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اور کبھی چاہ کنعاں میں یوسف کے جلوے میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ خداوند تعالی طرح طرح سے اپنا جلوہ ظاہر کرتا ہے۔ کہیں صلیب کے اوپر منصور کی مستی میں جلوہ نما ہوتا ہے اور ان سب کے باوجود اللہ تعالی لاشریک بادشاہ ہے اور اس کی ہستی واحد اور بلند ہے۔ (۲۸)

مناجات حمد کی طرح قدیم ترین صنف شاعری ہے کیونکہ کلمہ طیبہ کو اگر حمد کا پہلا نمونہ قرار دیا جائے تو اسی کلمہ کے وسیلے سے حضرت آدمؑ صفی اللہ کی توبہ سب سے اول مناجات قرار پاتی ہے کیونکہ مناجات میں خدائے لم یزل سے کچھ نہ کچھ مانگا جاتا ہے وہ مغفرت ہو، دین ہو یا دنیا ہو یا دیدار الٰہی کی تڑپ ہو۔ صفدر ساجد کی کھوار حمد کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

ترجمہ: اگرچہ مسلمانوں کی فہرست میں میرا نام شامل ہے لیکن میرا ایمان بہت کمزور ہے۔ اے خدا! تجھ سے التجا ہے کہ میری مدد کیجیو، میں نے آج تک حلال اور حرام میں تمیز نہیں کی، ایسا لگ رہا ہے کہ تیرے کلام پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اے اللہ عز وجل! مجھ جیسے گنہگار پر رحم کیجیو، مجھے دوبارہ توفیق دیجیو۔ اے اللہ عز وجل! مجھ جیسے گنہگار پر رحم کیجیو، اور مجھے اپنے راستے پر چلا دیجیو، تیرے اک اشارے سے میری قسمت بدل جائے گی۔ میدان حشر جیسے بڑے میدان میں یہ دیوانہ کہیں فیل نہ ہو جائے۔ ساجد کی کشتی کو پار لگا دیجیو (۲۹)۔

اس کے علاوہ بابا ایوب ایوب کا نام بھی اس سلسلہ میں بڑا اہم ہے۔

نہ میں بہشت کا طلبگار ہوں
نہ حوروں کا سوال کرتا ہوں
نہ دوزخ سے ڈرتا ہوں
نہ جنت کے لیے تڑپتا ہوں
نہ دوزخیوں کا ہمسفر ہوں
میں تو بس تیرے حکم کا منتظر ہوں (۳۰)

سب سے خالص اور بہتر حمد وہ کہی جاتی ہے جس میں شاعر اللہ سے کچھ بھی نہیں مانگتا بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے حصول کے لیے تعریف و ستائش کے ترانے گاتا ہے، اس کی پاکی بیان کرتا ہے اور عظمتوں کے گن گاتا ہے۔ اس رنگ کو تسبیح و تہلیل کا

رنگ بھی کہا جاسکتا ہے۔کھوار ادب میں بھی خالص تسبیح وتہلیل کا رنگ بھرپور انداز میں موجود ہے۔ جاوید حیات کاکاخیل کی حمد کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ: دونوں جہان تونے بنائے ،اے میرے پروردگار! تیری یہ شاہی بڑی وسیع ہے۔تو کائنات کے ذرے ذرے میں پنہاں ہے۔اے میرے پاک اللہ! کیڑے مکوڑوں سے لے کر انسانوں تک تو سب کا رازق ہے۔تو سب کے لیے رحم کرنے والا ہے تو مہربان ہے،اے میرے پاک اللہ۔تو نے صرف ایک لفظ ''کن'' سے حکمت سے بھرپور یہ کائنات بنائی۔تیری قدرت لامحدود ہے تیری قدرت عظیم ہے اے میرے پاک اللہ (۳۱)

حمد کا یہ آسمانی ارمغان سورہ فاتحہ ہے جس میں آغاز حمد وثنا سے ہے اور بتدریج اسلوب مناجات کی طرف بڑھتا ہے۔حمد ونعت کے اختلاط کی یہ ایک مثالی صورت ہے۔اس قسم کی حمد اس زبان کے فلسفی شاعر عزیز الرحمٰن بیغش کے ہاں ملتی ہے۔ان کی حمد کا اردو ترجمہ رحمت عزیز چترالی نے کیا ہے،ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ:اے خداوند قدوس! تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں۔اے خدائے ذوالجلال تیری ذات پاک ہے،انسانوں کی منزل مقصود تیری خوشی میں ہے۔بنا دیکھے تجھ پر ایمان لائے اور تیرا دیدار کیے بغیر دنیا دیوانی ہوگئی۔اے اللہ! صاف کیجیو ہماری زبان کو،شیریں کیجیو،سلیس کیجیو ہمارے بیان کو۔اے اللہ! ہمیں دونوں جہان میں بھلا چنگا نہ بنائیو خیر ہے لیکن اپنے ذکر میں ہمیں دیوانہ بنائیو (۳۲)۔

کھوار حمد نگاری کی چند اصناف: کھوار ایک قدیم زبان ہے مگر اس کے تحریری ادب کی نسبت لوک ادب کی قدامت کہیں زیادہ ہے۔کھوار لوک ادب زیادہ تر گیتوں پر مشتمل ہے۔ آشور جان کھوار لوک صنف کی ایک مقبول صنف ہے جو نہ صرف ہر لعزیز ہے بلکہ ہر عمر کے فرد کو کچھ نہ کچھ یاد ہے (۳۳) لوک گیت کو کھوار زبان میں ''باشونو'' کہا جاتا ہے (۳۴)۔باشونو کو آگے کئی سابقوں کے ساتھ اہم موقعوں کی مناسبت سے گائے جانے والے گیتوں کو الگ الگ نام دیا جاتا ہے۔اس ادب میں ماں سے متعلق تمام گیتوں کو مہرو باشونو (۳۵) کہا جاتا ہے اس میں ذیلی طور پر رحمت عزیز چترالی کی لوری (ہوویئنی) شامل ہے جسے مائیں بچوں کو سلانے یا بہلانے کے لیے گاتی ہیں۔اس میں بچوں کے لیے نیک تمنائیں اور کامیابی کی دعائیں مانگی جاتی

ہیں۔کھوار لوری میں حمد یہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں:

ترجمہ: دم دار ستارہ آسمان کی ایک سمت سے چل کے دوسری طرف جائے گا میرا بیٹا بہت ہی اچھا ہے۔یہ بالکل روئے گا نہیں بلکہ سوئے گا۔اللہ بہت بڑا ہے اس نے چاند کو پیدا کیا ہے اور ستاروں کو چاند کے ساتھ بطور پہرہ دار بنایا ہے اور چاند کی روشنی ہر جگہ پہنچے گی میرا بیٹا بہت ہی اچھا ہے۔یہ بالکل روئے گا نہیں بلکہ سوئے گا(۳۶)۔

کھوار ادب میں اردو میں مروجہ تمام اصناف ادب موجود ہیں البتہ کھوار گیتوں کی صنف قدیم شاعری میں سب سے نمایاں اور کثرت سے ہے۔مگر جدید شاعری میں اب نئے نئے تجربات ہورہے ہیں اور نئی نئی اصناف کا اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔کھوار ادب کی معلوم تاریخ کا پہلا شاعر غزل گو ہے اور اس کی غزل کا معیار فارسی غزل گوئی کے برابر نظر آتا ہے۔اتالیق محمد شکور غریب نے اپنے دیوان کے آخر پر جو 'کھوار ادب' کا باب شامل کیا ہے اس میں غزل زیادہ ہے۔وہ نہ صرف فارسی کے استاد شاعر تھے بلکہ فارسی غزل کے نامور شاعر تھے۔اس لیے جب وہ اپنی مادری زبان کی طرف رجوع ہوئے تو ان کی کھوار غزل میں فارسی غزل کا سارا تجربہ اور فن منتقل ہوگیا۔مگر یہ کام فارسی زدہ سا لگتا ہے۔ان کے بعد مولانا محمد سیئر اور باچہ خان ہما نے غزل کو بلند مقام عطا کیا۔بعد میں تجمل شاہ محوی، حبیب اللہ فدا برنسوی، مرزا فردوس فردوسی، بابا ایوب ایوب اور عزیزالرحمٰن بیغش نے کھوار غزل گوئی میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔جدید ادب میں بھی غزل کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے البتہ روایتی مضامین کی جگہ جدید مضامین نے لے لی ہے۔جدید غزل لکھنے والوں میں امین الرحمٰن چغتائی کا مقام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی غزل میں تنوع، جدت، نازک خیالی، ندرت اور چابک دستی کا حسین امتزاج ہے۔ ذاکر محمد زخمی، پروفیسر اسرارلدین، فضل الرحمٰن شاہد، سعادت حسین مخفی، جمشید حسین عارف اور محمد چنگیز خان طریقی جدید غزل کے اہم شعرا ہیں ان کی غزل بلاشبہ اردو اور فارسی غزل کی ہمسری کا دعوی کرسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ان قابل ذکر شعراء کی غزلوں میں حمد یہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔موجودہ دور میں بھی غزل کا سفر جاری ہے جس میں بے شمار نئے لکھنے والوں کا اضافہ ہورہا ہے۔ان میں سے چند نام یہ ہیں: پروفیسر اسرارالدین، جاوید حیات کاکاخیل، جاوید حیات، رحمت عزیز چترالی، امین اللہ

امین،سبحان عالم سبحان،انورالدین انور،محمد شریف شکیب رب نواز خان نوازاور عطاحسین اظہر شامل ہیں۔سبحان عالم ساغر کی غزل کے حمد یہ عناصر پر مشتمل اشعار کا اردو ترجمہ پیش ہے:

ترجمہ: ہر دور میں ہر زمانے میں تیرا جلوہ نمایاں ہے،کوہ طور میں، چاہ کنعان میں تیرا جلوہ نمایاں ہے۔پھول کی خاموشی میں،اس کے رنگ اور خوشبو میں اور بلبل کے ترانے میں تیرا جلوہ نمایاں ہے۔زندہ کر کے مارے گا بھی تو ہی اور مار کر زندہ بھی تو ہی کرے گا،بہار اور خزاں میں تیرا جلوہ نمایاں ہے(۳۷)

نظم پر بھی کھوار ادب میں کافی کام ہوا ہے اور اس کام کو نثر سے زیادہ وقیع کہا جا سکتا ہے۔اس میں اگر غزل کے علاوہ تمام قسم کی شاعری کو شامل کر لیا جائے تو یہ کام قابل فخر ہے۔ مثنوی کی صنف قدیم ہے۔اس صنف شاعری میں اتالیق محمد شکور غریب کا نام سر فہرست ہے۔ قطعات کے حوالے سے بھی اتالیق کا نام لیا جا سکتا ہے۔مرزا محمد سیئر کو بھی مثنوی اور نظم کے میدان میں اہم مقام حاصل ہے جبین،آمان،زیارت خان زیرک گل اعظم خان وغیرہ کو گیتوں کے شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی،گل نواز خاکی،سلطان علی،صالح نظام،مبارک خان،عبدالولی خان عابد،محمد عرفان عرفان،محمد جناح الدین پروانہ،امتیاز احمد امتیاز،صمصام علی رضا اور سیلم الٰہی وغیرہ کو جدید نظم نگاری میں شہرت حاصل ہے۔رحمت عزیز چترالی کی حمد یہ نظم کا ترجمہ پیش ہے:

ترجمہ: اے میرے پرودگار! یہ زمین تیری تخلیق ہے اور آسمان بھی تیری ہی تخلیق ہے۔یہ چرند،پرند،حیوان اور انسان بھی تیری تخلیق ہیں۔تمام روحوں کو بھی تو نے ہی پیدا کیا ہے۔ہمارے جسموں میں یہ جانیں بھی تیری ہی تخلیق ہیں یہ ناشکرا انسان پھر بھی اس آیت کا مطب نہیں سمجھتا اور تیرا شکر ادا نہیں کرتا کہ تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"(۳۸)

مثنوی پر کھوار ادب میں کافی ذخیرہ ہے۔تقریباً سارے رومان مثنوی میں ہیں البتہ مثنوی میں حمد یہ عناصر کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ "یار من ہمیں" ایک رومان ہے مگر اس کے اشعار میں حمد کا وجود نہیں ملتا البتہ تصوف کی گنجاش ہے۔کیونکہ رومان یا مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے تو شاید اس رومان کی ابتدا بھی حمد سے ہوئی ہو مگر تمام اشعار دستیاب نہیں ہو سکے۔مختلف محققین نے اس کے مختلف اشعار درج کیے ہیں اور ابتدائی اشعار بھی طے نہیں ہو سکے۔تاج محمد فگار کی ایک

مثنوی نما حمد کے تیرہ میں سے دو شعر پیش ہیں:

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی حاجتیں پوری کرنے والا نہیں اگر وہ رحم کرے تو اس کے لیے رحم کرنا مشکل نہیں۔ تو ایک اللہ ہے تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تیرا کوئی شریک نہیں نہ ذات میں اور نہ صفات میں (۳۹) مترجم (محمد انور چترالی)

سی حرفی کو کھوار ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا جو ہند میں ہے البتہ رحمت عزیز چترالی کی شاعری میں اس کی چند ایک مثالیں ضرور مل جاتی ہیں مگر حمد کے حوالے سے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ چاربیتہ کی صنف کھوار ادب میں پشتو ادب سے آئی اور اس نے یہاں خوب ترقی کی اور اس پر کھوار ادب میں قابل ذکر کام ہوا ہے۔ رحمت عزیز چترالی کی ایک چاربیتہ حاضر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ترجمہ: پرندے تیری حمد وثنا میں مصروف ہیں اور بلبل بھی ان کا ہمنوا ہے۔ کانٹے بھی تیری حمد وثنا سے خالی نہیں اور پھول بھی ان کے ساتھ ہیں۔ رحمت عزیز تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے۔ معافی کی التجا میں وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کا بڑا بھائی رحمت گل بھی ساتھ ہے۔ (۴۰)

حوالہ جات

(۱) حمید الرحمٰن، سفر، کالم "چترال وژن" (پندرہ روزہ) ایڈیٹر رحمت عزیز چترالی، کراچی، ۱۶/جون تا ۲۳/جون ۲۰۰۷ء۔ (۲) عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر، کھوار زبان وادب، مضمون مشمولہ "شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب" علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۵۔ (۳) عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر، کھوار زبان وادب، مضمون مشمولہ " شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب" اسلام آباد، ص ۱۰۵۔ (۴) ایضاً، ص ۱۰۵۔ (۵) ایضاً، ص ۱۵۸۔ (۶) اسرار الدین، پروفیسر، کھوار ادب مقالہ مشمولہ " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد ۱۴، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ص ۱۱۳۔ (۷) فیضی، عنایت اللہ، ڈاکٹر، کھوار زبان وادب، مضمون مشمولہ "شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب" اسلام آباد، ص ۱۵۹ تا ۱۶۰۔ (۸) اسرار الدین، پروفیسر، کھوار ادب، مقالہ مشمولہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" چودھویں، جلد، لاہور، ص ۱۱۹۔ (۹) فیضی، عنایت اللہ، ڈاکٹر، کھوار زبان وادب، مضمون مشمولہ "شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب" اسلام آباد، ص ۱۶۱۔ (۱۰) فیضی، عنایت اللہ، ڈاکٹر، کھوار کے صاحب طرز شاعر، باچہ خان ہما، مضمون مشمولہ "سہ ماہی ادبیات" جلد ۱۴ شمارہ ۵۷، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸۲۔ (۱۱) فیضی، عنایت اللہ، ڈاکٹر، کھوار کے صاحب طرز شاعر، باچہ خان ہما، مضمون مشمولہ "سہ ماہی ادبیات" جلد ۱۴،

شمارہ ۵۷، اسلام آباد، ص ۱۸۱۔ (۱۲) اسرارالدین، پروفیسر، کھوار ادب، مقالہ مشمولہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد ۱۴، لاہور، ص ۱۲۸ (۱۳) چترالی، رحمت عزیز، مکتوب، بنام راقم۔ (۱۴) رحمت عزیز چترالی ''ماڑا ماڑا مایوں'' (کھوار زبان میں بچوں کی شاعری) اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کھوار اکیڈمی، کراچی (زیر تدوین)۔ (۱۵) رحمت عزیز چترالی، کھوار حمد نگاری، مقالہ مشمولہ ''چترال وژن'' کراچی، ۱۶/جون تا ۳۰/جون ۲۰۰۷ء، کھوار اکیڈمی، کراچی۔ (۱۶) اسرارالدین پرویز ''درون ہنو'' پشاور، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۹ تا ۳۰ کھوار، اکیڈمی لائبریری، کراچی۔ (۱۷) چترالی، رحمت عزیز، مکتوب، بنام راقم۔ (۱۸) چترالی، رحمت عزیز، مکتوب، بنام راقم۔ (۱۹) رحمت عزیز چترالی، کھوار حمد نگاری، مقالہ مشمولہ ''چترال وژن'' کراچی، ۱۶/جون تا ۳۰/جون ۲۰۰۷ء، کھوار اکیڈمی، کراچی۔ (۲۰) فیضی، عنایت اللہ، ڈاکٹر بیغش، کھوار فلسفی شاعر، مضمون مشمولہ ''سہ ماہی ادبیات'' جلد ۱۵، شمارہ ۶۱، اسلام اباد، ص ۴۵۔ (۲۱) اسرارالدین، پروفیسر، کھوار ادب، مضمون مشمولہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد ۱۴، لاہور، ص ۲۱۔ (۲۲) چترالی، رحمت عزیز، مکتوب بنام راقم۔ (۲۳) چترالی، رحمت عزیز، مکتوب بنام راقم۔ (۲۴) فگار، تاج محمد خان، حمد باری تعالیٰ، مشمولہ ''ققنوز'' حصہ اول، چھترار، انجمن ترقی کھوار چھترار، ۱۹۸۸ء، ص ۴۴۔ (۲۵) ثاقب، امین الاسلام، حمد باری تعالیٰ، مشمولہ ''پندرہ روزہ چترال وژن'' ۱۶/تا ۳۰/اپریل ء، کراچی، کھوار اکیڈمی، ۲۰۰۷۔ (۲۶) صفدر ساجد، حمد، مشمولہ ''پندرہ روزہ چترال وژن'' ۱۶/تا ۳۰/دسمبر، کراچی، کھوار اکیڈمی، ۲۰۰۶ء۔ (۲۷) اسرارالدین، پروفیسر ''درون ہنو'' پشاور، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۔ (۲۸) اسرارالدین، پروفیسر، کھوار ادب، مقالہ مشمولہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد ۱۴، لاہور، ص ۱۲۸۔ (۲۹) صفدر، ساجد، بحوالہ، رحمت عزیز چترالی، مکتوب بنام راقم۔ (۳۰) ایوب، بابا ایوب، حمد، مشمولہ ''ققنوز'' حصہ اول، چھترار، انجمن ترقی کھوار چھترار، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۔ (۳۱) کاکاخیل، محمد جاوید حیات، حمد باری تعالیٰ، مشمولہ ''ماہنامہ شندور'' شمارہ ۱۷ تا ۲۷ جولائی اگست، جلد ۴، ۲۰۰۳ء، ص ۴۱ کھوار اکیڈمی، کراچی۔ (۳۲) بیغش، عزیز الرحمان، حمد ''گداز'' چترال، انجمن ترقی کھوار، ۲۰۰۱ء کھوار اکیڈمی لائبریری، کراچی۔ (۳۳) فیضی، عنایت اللہ، اشور جان، مضمون مشمولہ ''سہ ماہی ادبیات'' جلد ۱ شمارہ ۲/ اکتوبر تا دسمبر، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۳۱۱۔ (۳۴) اسرار الدین، پروفیسر، کھوار ادب، مقالہ مشمولہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' چودھویں جلد، لاہور۔ (۳۵) اسرارالدین، پروفیسر، کھوار ادب، مقالہ مشمولہ ''تاریخ ادبیات مسمانان پاکستان و ہند'' چودھویں جلد، لاہور، ص ۱۱۳۔ (۳۶) احسن، عبد الشکور (مرتب) ''پاکستانی ادب'' لاہور، دانشگاہ پنجاب، دوم ۱۹۹۲ء، ص ۶۲۔ (۳۷) ساغر، سبحان عالم، حمد باری تعالیٰ، مشمولہ، کھوار حمد

نگاری، مکتوب، رحمت عزیز چترالی، بنام، راقم، کھوار اکیڈمی، کراچی۔ (۳۸) چترالی، رحمت عزیز، حمد وثنائے رب جلیل، مکتوب، رحمت عزیز چترالی، بنام، راقم، کھوار اکیڈمی، کراچی۔ (۳۹) فگار، تاج محمد خان، حمد باری تعالیٰ، مشمولہ ''ققنوز'' چھترار، انجمن ترقی کھوار چھترار، ۱۹۸۸ء، ص ۴۴۔ (۴۰) چترالی، رحمت عزیز، حمد وثنائے رب جلیل، مکتوب، رحمت عزیز چترالی، بنام، راقم، کھوار اکیڈمی، کراچی۔

کتابیات

(۱) احسن عبدالشکور (مرتب) ''پاکستانی ادب'' لاہور، دانشگاہ پنجاب، دوم ۱۹۹۲ء۔

(۲) اسرارلدین پروفیسر ''درون ہنو'' پشاور، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء۔

(۳) اکادمی ادبیات پاکستان ''سہ ماہی ادبیات'' جلد ۱۴، شمارہ ۵۷، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء۔

(۴) اکادمی ادبیات پاکستان ''سہ ماہی ادبیات'' جلد ۱۴ شمارہ ۵۷، اسلام آباد۔

(۵) اکادمی ادبیات پاکستان ''سہ ماہی ادبیات'' جلد ا شمارہ ۱۲ اکتوبر تا دسمبر، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

(۶) اکادمی ادبیات پاکستان ''''سہ ماہی ادبیات'' جلد ۱۵، شمارہ ۶۱، اسلام اباد۔

(۷) انجمن ترقی کھوار چھترار ''''ققنوز'' حصہ اول، چھترار، ۱۹۸۸ء۔

(۸) انجمن ترقی کھوار، ''گنداز'' چترال، ۲۰۰۱ء۔

(۹) چترالی، رحمت عزیز، مکتوبات بنام راقم۔

(۱۰) دانشگاہ پنجاب ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد ۱۴، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱ء۔

(۱۱) رحمت عزیز چترالی، (ایڈیٹر) ''چترال وژن'' (پندرہ روزہ) کراچی، ۱۶ جون تا ۲۳ جون ۲۰۰۷ء۔

(۱۲) رحمت عزیز چترالی، (ایڈیٹر) ''پندرہ روزہ چترال اژن'' ۱۶ تا ۳۰ اپریل ء، کراچی، کھوار اکیڈمی، ۲۰۰۷ء۔

(۱۳) رحمت عزیز چترالی'' ماژا ماژا مایون'' (کھوار زبان میں بچوں کی شاعری) اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کھوار اکیڈمی، کراچی (زیرتدوین)۔

(۱۴) صفدر ساجد، حمد، مشمولہ ''پندرہ روزہ چترال اژن'' ۱۶ تا ۳۰ دسمبر، کراچی، کھوار اکیڈمی، ۲۰۰۶ء۔

(۱۵) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ''شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب'' اسلام آباد، ۲۰۰۴ء۔

(۱۶) محمد علی مجاہد، رحمت عزیز چترالی (ایڈیٹرز) '' ماہنامہ شندور'' شمارہ ۱۷ تا ۲۷ جولائی اگست، جلد ۴، ۲۰۰۳ء کھوار اکیڈمی، کراچی۔

(۱۷) انٹرویو، رحمت عزیز چترالی۔

وفات نبویؐ پر بعض صحابہ کرامؓ کے مراثی،
انساب الاشراف کے حوالے سے

کلیم صفات اصلاحی

آنحضورؐ کی وفات کا سب سے الم ناک اور سخت ترین واقعہ ربیع الاول ۱۱ھ رمئی ۶۳۲ء میں پیش آیا لیکن یہ رب العالمین کی مرضی اور اس کے نظام تکوینی کے فطری اصول کا مظہر بھی ہے، قرآن کریم نے آیت ''کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ'' میں اسی اصول کا اعلان کیا اور ایک جگہ آپؐ ہی کو مخاطب کر کے فرمایا اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ (زمر ۳۹:۳۰) لیکن دنیاوی زندگی کی ایک اٹل حقیقت پر یقین کے باوجود آپؐ کی وفات کا صدمہ جس شدت کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے دل ودماغ کو ہوا، وہ بھی فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کو اول وہلہ میں اس واقعہ کا یقین نہیں آیا اور اس خبر کو سن کر فرط غم سے ان کے ہوش جاتے رہے، ایسے واقعات سے سیرت کے صفحات خالی نہیں، اشعار جہاں مسرت اور حیرت کے اظہار کا ذریعہ ہیں وہیں کرب وحسرت کے جذبات، حقیقی بیان کا بھی وسیلہ ہیں، یہ بات مخفی نہیں کہ صحابہ کرامؓ میں بہت سے ایسے تھے جن کو مذاق شعری ودیعت ہوا تھا، زندگی کے تجربات وحوادث خواہ ان کا تعلق زندہ دلی سے ہو یا ویرانی دل سے ہو شعر کے ذریعہ یہ حضرات صحابہ کرامؓ بھی حدیث دل کی روایت کرنے میں توقف نہیں فرماتے تھے۔ صاحب ادب المفرد لکھتے ہیں:

لم یکن اصحاب رسول اللّٰہ	صحابہ کرام خشک مزاج اور مردہ دل نہ تھے وہ
صلی اللّٰہ علیہ وسلم متحزقین	باہم مجلسوں میں باہم شعر پڑھتے پڑھواتے تھے
ولا متماوتین وکانوا یتناشدون	سخن آرائی وسخن سنجی میں شریک نظر آتے تھے۔
الشعر فی مجالسھم ۔(۱)	

صاحب شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی نے آداب اللغۃ العربیۃ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کوئی صحابی ایسے نہ تھے، جنھوں نے کوئی نہ کوئی شعر کہا یا پڑھا نہ ہو(۲)، **ولم یبق من الصحابة من لم یقل او یتمثل به** ۔لیکن چونکہ شاعری صحابہ کرامؓ کے نزدیک چنداں لائق وقعت نہ تھی، اس لیے اس سے اسی حد تک تعلق رہا، تاہم جو کچھ ہے وہ تاریخ و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور و مستند مورخ و سیرت نگار علامہ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری کی فتوح البلدان سے تاریخ اسلام کا ہر طالب واقف ہے، انساب پر ان کی گراں قدر اہم تصنیف انساب الاشراف ہے، یہ ۱۳ جلدوں میں ہے، اس کے بعض اجزاء شلوسنگر اور گوٹین نے بیت المقدس سے تحقیق اور تعلیق کے ساتھ ۱۹۳۶-۱۹۳۸ء میں اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کی پہلی جلد علمی لوازم کے ساتھ قاہرہ سے ۱۹۵۹ء میں شائع کی (۳)، ۱۹۹۶ء/۱۴۱۷ھ میں اس کا محقق ایڈیشن ڈاکٹر سہیل زکار اور ڈاکٹر ریاض زرکلی کی تحقیق و مراجعت کے ساتھ مکتب البحوث والدراسات کے زیر نگرانی دارالفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع بیروت لبنان سے شائع ہوا۔ انساب کے متعلق معلوم ہے کہ یہ عربوں کی ایک جامع تاریخ ہے جس کی ترتیب ان کے نامور خاندانوں کے ذکر پر رکھی گئی ہے، بنوہاشم کے ذکر میں سیرت نبویؐ کے بیشتر گوشے اور روایتیں ہیں جو دوسرے ابتدائی مورخین اور سیرت نگاروں نے اپنی سندوں کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن بہت سی ایسی بھی ہیں جو دوسری کتب سیر میں نہیں ملتیں (۴)۔ مثلاً بلاذری نے جلد اول کے آخر میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ سے منسوب مراثی نبویؐ کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ تاریخ و سیر کی دوسری کتابوں جیسے طبقات ابن سعد، اصابہ، استیعاب یا ابن رشیق کی کتاب العمدہ میں مذکور نہیں، یہ بلاذری کی انفرادیت ہے گو انھوں نے ان اشعار کو بلاسند نقل کیا ہے تاہم ان اشعار پر کوئی تنقیدی تحریر نظر نہیں آتی اور نہ ہی اس کے محقق ایڈیشن میں ان کو غلط کہا گیا، اس لیے انہیں صحیح نہ ماننے کی بھی کسی توجیہ کی ضرورت نہیں۔

ابن سعد، بلاذری کے استاد ہیں، انہوں نے طبقات جزء ثانی قسم ثانی ''ذکر من رثی النبیؐ'' کے نام سے جو باب باندھا ہے، اس میں حضرت ابوبکرؓ، عبداللہ بن انیسؓ، حسان بن ثابتؓ، اروی بنت عبدالمطلب، عاتکہ بنت عبدالمطلب، حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب، ہند بنت اثاثہؓ اور ام ایمنؓ کے اشعار سنداً نقل کیے ہیں، بلاذری نے حضرت ابوبکرؓ کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ

ابن سعد کے نقل کردہ اشعار سے مختلف ہیں، اسی طرح حضرت حسانؓ کے اشعار ابن سعد کے یہاں بلاذری کے بالمقابل زیادہ ہیں اور طبقات میں حضرت اروی بنت عبدالمطلب کے جو اشعار ہیں بلاذری نے ان کو حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب سے منسوب کیا ہے۔(۵)

بلاذری نے حضرت ابوبکرؓ کے چھ، حضرت عمرؓ کے چار، حضرت علیؓ کے چھ، حضرت حسانؓ کے پندرہ اور حضرت صفیہ بنت عبدالمطلبؓ کے ۱۹ اشعار نقل کیے ہیں۔اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ درمیان میں کچھ اشعار بلاذری کو نہیں مل سکے ہیں، جو ملے ان کو بلا کم و کاست کتاب کا حصہ بنالیا، بعد کے محققین نے بھی اس پہلو کو اپنی تحقیق میں شامل نہیں کیا۔ڈاکٹر حمیداللہ صاحب مرحوم نے ان اشعار میں جو الفاظ نہیں پڑھے جاسکے تھے ان کے متعلق حاشیے میں کہیں "کذا فی اصل العبارۃ" لکھ دیا اور کہیں "خ" (یعنی جس مخطوطہ پر ان کے اس مطبوعہ نسخہ کی بنیاد ہے) کی علامت سے حاشیہ میں بتایا کہ مخطوطہ میں یہ لفظ اس طرح ہے، کہیں یہ حاشیہ لکھا کہ "لیس فی دیوانه المطبوع" یا کسی مشکل لفظ کے معنی کی وضاحت حاشیہ میں کردی۔(ص۵۹۲-۵۹۴)

حضرت عمرؓ کے قصیدہ کے آخری شعر میں ایک جگہ "نتوجع" ہے، ڈاکٹر صاحب نے حاشیہ میں لکھا کہ مخطوطہ میں "یتوجع" تھا، حضرت علیؓ کے قصیدہ کے پانچویں شعر میں لفظ "ضاریا" ہے، ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ مخطوطہ میں "ضاربا" تھا اور حضرت حسانؓ کے پہلے شعر میں "مؤاقیها" ہے، مخطوطہ میں یہ "مطاقیها" ہے۔

نئے محقق ایڈیشن میں ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کی تصحیح نتوجع اور ضاریا کو صحیح قرار دیا گیا ہے، البتہ مؤاقیها کا املا "مآقیها اور حضرت عمرؓ کے قصیدہ کے دوسرے شعر کے آخری لفظ "التفجع" کی جگہ "المتفجع" اور حضرت صفیہؓ کے قصیدہ کے تیسرے شعر میں دوسرے لفظ "بکائک" کی جگہ "بکاک" لکھا گیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ نوٹ "کذا فی اصل العبارۃ" کو بھی حذف کردیا گیا ہے۔یعنی ڈاکٹر صاحب کے مطبوعہ نسخہ کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن ان کی تحقیقات میں اضافہ نہیں ہوسکا۔

ابن رشیق قیروانی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ خلفائے راشدین میں کوئی ایسا نہیں جس نے کچھ نہ کچھ اشعار نہ کہے ہوں۔ فهولاء الخلفاء الاربعة رضوان الله عليهم

اجمعین ما منهم الا من قال من الشعر ۔(۶)

حضرت ابوبکرؓ کا شعری ذوق اور ان کا مرثیہ: حضرت ابوبکرؓ کو فن شعر سے بہرہ وافر ملا تھا لیکن صدیق اکبرؓ کے مصنف مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے استیعاب کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

ان ابا بکر ما قال بیت شعر فی الاسلام حتی مات ۔(۷)	بلاشبہ (حضرت) ابوبکرؓ نے قبول اسلام کے بعد اپنی وفات تک ایک شعر نہیں کہا۔

البتہ کبھی کبھی شعر پڑھنا ثابت ہے، ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ جیسے سیرت نگاروں نے ان کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں، مسند احمد کی ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت حسینؓ کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو رسول اللہؐ کی یاد تازہ ہوگئی اور انہیں گود میں اٹھا کر یہ شعر پڑھا:

بابی شبہ النبیؐ — لیس شبیھًا بعلی (۸)

میرے باپ قربان، یہ نبیؐ کے مشابہ ہیں علیؓ کے مشابہ نہیں ہیں۔

ابن رشیق قیروانی نے ابن اسحاق کی روایت سے حضرت ابوبکرؓ کے ۱۵ اشعار نقل کیے ہیں، جن کے مضمون و اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زمانہ اسلام میں کہے گئے (۹)۔ بلاذری نے جو مرثیہ نقل کیا ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے وفات نبویؐ پر اپنے بے پناہ غم کو الفاظ میں منتقل کر کے سوز دروں کے اظہار سے تسکین قلب کی کوشش کی، اشعار مع ترجمہ درج ذیل ہیں:

۱ – فجعنا بالنبی و کان فینا — امام کرامة و نعم الامام

آنحضورؐ کی وفات سے ہم کو شدید تکلیف ہے، آپؐ ہمارے درمیان شرافت و بزرگی کے امام تھے اور کیا ہی خوب امام تھے۔

۲ – و کان قوامنا و الرأس منا — فنحن الیوم لیس لنا قوام

آپؐ ہمارے امیر اور سردار تھے (آپؐ کی وفات سے) ہم آج بے امیر کارواں کے ہو گئے۔

۳– نموج و نشتکی ما قد لقینا — ویشکو فقده البلد الحرام

جو کچھ ہم پر پڑی ہے ہم اسی کے سبب مضطرب و شکوہ سنج ہیں، ہم ہی کیا بلد الحرام بھی آپؐ کے غم فراق سے فغاں ریز ہے۔

۴– فلا تبعد فکل کریم قوم — سید رکه ولو کره الحمام

لیکن یہ بات بعید نہیں کیوں کہ ہر شریف قوم کو موت آنی ہی ہے، خواہ قوم کو یہ بات کتنی ہی ناگوار ہو۔

۵- فقد نا الوحی اذ ولیت عنا　و ودعنا من اللہ الکلام

ہم سے آپؐ نے منھ کیا پھیرا کہ اللہ سے وحی وتکلم کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔

۶- لقد اورثتنا میراث صدق　علیک بہ التحیۃ والسلام (۱۰)

آپؐ نے (اپنے بعد) ہم کو صدق و دیانت کا وارث بنایا ہے، اس نعمت کے بدلے درود و سلام کا نذرانہ قبول ہو۔

حضرت عمرؓ کا شعری ذوق اوران کا مرثیہ: حضرت عمرؓ کا اعلیٰ شعری وادبی ذوق مسلم ہے، امرؤالقیس، زہیر اور نابغہ ذبیانی جیسے شعراء کا کلام ان کی زبان پر تھا اور اس کے محاسن ومثالب پر ناقدانہ نظر بھی تھی، اغانی، کتاب العمدہ اور کتاب البیان والتبیین وغیرہ میں اس قسم کی روایتیں موجود ہیں، جاحظ نے لکھا کہ:

کان عمر بن الخطاب اعلم　حضرت عمرؓ اپنے عہد کے سب سے بڑے
الناس بالشعر (۱۱)　سخن شناس تھے۔

اچھے شعر کی وضاحت حضرت عمرؓ کے الفاظ میں یہ ہے:

فانہ یدل علی معالی الاخلاق ۔(۱۲)　اچھے اشعار بلند اخلاق کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔

ابن رشیق نے حضرت عمرؓ کے آٹھ اشعار نقل کیے ہیں (۱۳)، آنحضورؐ کے فراق حسرت انگیز پر چار اشعار درج ذیل ہیں:

۱- مازلت مذوضع الفراش لجثۃ　وثوی، مریضاً خایفاً اتوقع

آپؐ کا جسد مبارک جب سے فرش اور خاک طیبہ سے ہم آغوش ہوا، اس وقت سے میں مریض ناتواں ہو گیا ہوں جو خوف کا شکار ہو۔

۲- شفقاعلیہ ان یزول مکانہ　عنا فیبقی بعدہ التفجع

اندیشہ تھا کہ آپؐ ہم سے جدا ہونے والے ہیں اور آپؐ کے بعد ہمارے لیے درد و کرب ہی رہ جائے گا۔

۳- فلیبکہ اھل المدینۃ کلھم　والمسلمون بکل ارض تجزع

مدینہ والوں کو رونا ہی ہے، ہر خطہ کے مسلمانوں ہی کے لیے یہ مقام جزع وفزع ہے۔

۴- نفسی فداؤک من لنا فی امرنا　ام من نشاورہ اذا نتوجع (۱۴)

میری جان آپؐ پر قربان، اب کون ہماری چارہ گری کرے گا، مشکلات میں ہم کس سے شکوہ ومشورہ کریں گے۔

حضرت علیؓ کا شعری مذاق اور ان کا مرثیہ: حضرت علیؓ کے بلند ذوق شعری اور قدرت کلام کا ذکر احادیث اور تاریخ و سیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ ان سے منسوب متعدد اشعار محدثین نے نقل کیے ہیں، مثلاً خیبر کے موقع کا یہ شعر صحیح مسلم اور طبری میں ہے۔

انا الذی سمتنی امی حیدره کلیث غابات کریه المنظره (۱۵)

حاکم نے المستدرک میں حضرت فاطمہؓ کی وفات پر حضرت علیؓ کے دو شعر نقل کیے ہیں۔

(۱۶) رسول اکرمؐ کی رحلت کے موقع پر حضرت علیؓ کے جذبات اس طرح لفظوں میں ظاہر ہوئے:

۱- الا طرق الناعی بلیل فراعنی وارقنی لما استقل منادیا

اے وحشت انگیز خبر دینے والے سن! تو نے میرے دروازے پر دستک دے کر ایسی خبر دی جس نے مجھے بے چین کر دیا۔

۲- فقلت له لما رأیت الذی اتی لغیر رسول الله ان کنت نادیا

خبر لانے والے سے میں نے کہا، کاش تو نے رسول اللہ کے علاوہ کسی اور کی خبر دی ہوتی۔

۳- فوالله لا انساک احمد ما مشت بی العیس او جاوزت فی الارض وادیا

اے رسول پاکؐ میں آپؐ کو بہ خدا کبھی بھول نہیں سکتا، خواہ میں سفر میں رہوں یا روئے زمین کی کوئی وادی میری راہگذر ہو۔

۴- وکنت متی اهبط من الارض تلعة اریٰ اثرا منه جدیدا وعافیا

میں جب بھی مکہ کے کسی ٹیلہ پر اترتا ہوں تو آپؐ کے قدم ہی میرے لیے سرمایہ عافیت ہوتے ہیں۔

۵- جواد تشظی الخیل عنه کانما یرین به لیثا علیهن ضاریا

(تیز رفتاری میں) آپؐ کی مثال ایسے صبا رفتار اشہب کی ہے جس کو دیکھ کر اس کے دوسرے ہم جنس منتشر ہو جاتے ہیں گویا وہ آپؐ میں ایسا شیر دیکھ رہے ہوں جو ان پر حملہ کرنے والا ہے۔

۶- لبیک رسول الله خیل کثیرة تثیر غبارا کالضبابة عالیا (۱۷)

اے رسول اللہؐ حقیقت ہے کہ آپؐ نے ایسی جماعت چھوڑی ہے کہ جب وہ موج زن ہوتی ہے تو پس منظر میں بادلوں کے مانند گرد و غبار چھوڑ جاتی ہے۔

حضرت حسانؓ اور ان کا مرثیہ: حضرت حسانؓ کا شمار مخضرمین شعراء میں ہوتا ہے، ان کو شعر گوئی میں سبقت و فضیلت حاصل ہے، وہ اپنی بامقصد اور پاکیزہ شاعری کی وجہ سے مختصر ترین شعرائے رسولؐ

میں نمایاں مقام کے حامل ہیں، بہ قول مولانا عبدالسلام ندویؒ ان کا اصلی شرف یہ ہے کہ ان کو خود رسول اللہؐ نے اپنا شاعر منتخب فرمایا (۱۸)۔ آنحضورؐ کی صحبت و سند تحسین و آفرین نے ان کے حوصلوں کو مہمیز کیا اور ان کا شاعرانہ ذوق اسلامی تعلیمات و ہدایات کے اثر سے مجلی و مصفی ہوگیا تھا، آپؐ کی نگہ جمال آفرین نے حضرت حسانؓ کے اشعار کو وہ مقام بلند عطا کردیا تھا جو شعری پاکیزگی کا نقطۂ عروج ہے، وفات نبویؐ پر حضرت حسانؓ کے دیدۂ پرآب سے جو قطرے اشک بن کر ٹپکے، بلاذری نے ان کو چن کر یوں پیش کیا:

۱ - ما بال عینک لا تنام کانما کحلت مؤاقیها بکحل الارمد

تمہاری آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے کہ ان سے نیند ہی غائب ہوگئی ایسا لگتا ہے کہ آنکھوں کی تیلیوں میں سرمہ کی کری سما گئی ہے۔

۲- جزعا علی المهدی اصبح ثاویا یا خیر من وطئی الحصی لا تبعد

اس ہدایت یافتہ (رسول اللہؐ) پر بلکنے کی وجہ سے نیند اڑ گئی ہے جو اب زمین کی آغوش میں ہے، اے وہ سب سے بہتر ذات جو کنکروں کے درمیان ہے ہم سے دور نہ ہوتی۔

۳- یاویح انصار النبی ورهطه بعد المغیب فی سواء المسجد (۱۹)

افسوس! اب نبیؐ کے انصار اور جماعت کا کیا ہوگا جب کہ آپؐ مسجد کے زیر سایہ چھپ گئے۔

۴- جنبی یقیک الترب لهفی لیتنی غیبت قبلک فی بقیع الغرقد (۲۰)

میرا پہلو آپؐ کو مٹی سے بچاتا، اے کاش کہ آپؐ سے پہلے بقیع الغرقد میں خود چلا گیا ہوتا۔

۵- أأقیم بعدک فی المدینة بینهم یاویح نفسی لیتنی لم اولد

کیا آپؐ کے بعد میں مدینہ میں رہ سکوں گا وائے حسرت، کاش کہ میں پیدا ہی نہیں ہوا ہوتا۔

۶- بابی و امی من شهدت وفاته فی یوم الاثنین النبی المهتدی

میرے ماں باپ اس نبی مہتدی پر قربان جن کے یوم وفات دوشنبہ کو میں حاضر تھا۔

۷- فظللت بعد وفاته متلددا یا لیتنی جرعت سم الاسود (۲۱)

آپؐ کی وفات سے میں ششدر و حیران رہ گیا کاش کہ میں نے مار اسود کا زہر پی لیا ہوتا۔

۸- واللہ اسمع ما بقیت بهالک (۲۲) **الا بکیت علی النبی محمدؐ**

بخدا میں زندگی بھر جب کسی مرنے والے کی خبر مرگ سنوں گا تو آنحضورؐ پر ہی گریہ کروں گا۔

۹- ضاقت بالانصار البلاد فاصبحوا سودا وجوههم کلون الاثمد

انصار کے لیے شہروں کی وسعت تنگ ہوگئی اور سرمہ کے رنگ کی طرح ان کے چہرے سیاہ ہوگئے۔

۱۰ – ولقد ولدنا وفینا قبره وفضول نعمته بنا لم نجحد [۲۳]

ہمارے درمیان آپؐ کی پیدائش ہوئی اور ہمارے یہاں آپؐ کی قبر ہے، آپؐ کے احسانوں کا ہم انکار نہیں کرسکتے۔

۱۱ – والله اهداه لنا وهدیٰ به انصاره فی کل ساعة مشهد [۲۴]

اللہ نے آپؐ کی شکل میں ہم کو سوغات دی اور آپؐ ہی کے ذریعہ آپؐ کے مددگاروں کو ہدایت حاصل ہوئی۔

۱۲ – صلی الا له ومن یحف بعرشه والطیبون علی المبارک احمد

اللہ تعالیٰ اور اس کے عرش کے جلو میں تمام نفوس مطہرہ کا درود وسلام ہو آپؐ کی ذات بابرکات پر۔

۱۳ – فرحت نصاری یثرب و یهودها لما تواری الضریح الملحد [۲۵]

جب آپؐ خاک کے پردوں میں نہاں ہوئے تو یہ یثرب کے یہود ونصاری تھے جو اپنی خوشی ظاہر کررہے تھے۔

اس کے بعد مزید دو شعر اور نقل کیا ہے:

۱ – یا لهف نفسی علیه حین ضمنه بطن الضریح علیؓ و ابن عباسؓ

افسوس جب حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ نے آپؐ کو قبر میں لٹایا، کیا کہوں کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی۔

۲ – مادت بی الارض حتی کدت ادخلها بعد النبی رسول الله والآسی [۲۶]

کہ جیسے زمین مجھ کو لے کر گھوم گئی ہے اور آنحضورؐ کے بعد اب میں بھی زمین کے اندر داخل ہونے والا ہوں۔

حضرت صفیہؓ اور ان کا ذوق شعری: حضرت صفیہ بنت عبدالمطلبؓ آنحضرتؐ کی پھوپھی تھیں اور حضرت آمنہ کی رضاعی بہن ہونے کے سبب آپؐ کی خالہ بھی تھیں، ان کے شعری ذوق کے شاہد وہ اشعار ہیں جو تاریخ وسیر کی کتابوں میں موجود ہیں، غزوۂ احد میں حضرت حمزہؓ کی شہادت پر ان کے متعدد اشعار صاحب اصابہ نے نقل کیے ہیں۔ ایک شعر میں آنحضرتؐ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

ان یوما اتی علیک لیوم کورت شمسه وکان مضیاء [۲۷]

صاحب انساب الاشراف نے بھی رحلت نبویؐ پر ان کے مراثی نقل کیے ہیں۔

بلاذری نے جو اشعار حضرت صفیہؓ کے نام سے دیے ہیں ابن سعد نے ان کو آنحضرتؐ کی دوسری پھوپھی اروی بنت عبدالمطلب سے منسوب کیا ہے، ہمارے نزدیک بلاذری کا قول زیادہ صحیح نظر آتا ہے کیونکہ اروی بنت عبدالمطلب کا ایمان لانا مشکوک ہے، جیسا کہ اسد الغابہ میں

حضرت صفیہؓ کے تذکرہ میں آیا ہے کہ "والصحیح انه لم یسلم غیرها" (۲۸) یعنی حضرت صفیہؓ کے علاوہ آنحضورؐ کی پھوپھیوں میں کسی اور کو قبول اسلام کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت صفیہؓ کے قبول اسلام اور غزوات میں شرکت سے تاریخ اسلام کا ہر شخص واقف ہے۔ بلاذری نے آپؐ کی وفات پر ان کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

۱- یا عین جودی بدمع منک منحدر و لا تملی و بکی سید البشر

اے آنسوانڈیلنے والی آنکھ اپنے تمام آنسوانڈیل دے تنگ دل نہ ہو اور سید البشر پر روتی جا۔

۲- بکی رسول الله فقد هدت مصیبته جمیع قومی و اهل البدو و الحضر

تو اس رسول اللہ کے غم میں اشکبار ہو جن کے فراق کے درد سے پوری قوم خواہ وہ دیہات میں ہو یا شہر میں ہونڈ ھال ہے۔

۳- ولا تملی بکاءک الدهر معولة علیه ما غرد القمری بالسحر (۲۹)

اے صفیہ تو اپنی اشکباری مت روک، اس لیے کہ تو ایسی شخصیت پر آنسو بہا رہی ہے جن پر زمانہ کو ناز ہے اور فاختہ نے تو ان پر روتے ہوئے صبح کی ہے۔

یہ اشعار بھی ہیں:

۴- الا یا رسول الله کنت رجائیا و کنت بنا برا ولم تک جافیا

اے رسول پاکؐ، آپؐ ہمارے مرکز ناامید تھے، ہمارے ساتھ آپؐ نیکی کرتے تھے، جفا خو نہیں تھے۔

۵- کان علی قلبی لذکر محمد وما خفت من بعد النبی المکاویا

میرے دل میں محمدؐ کی یاد اس طرح نقش ہے کہ اب آپؐ کے بعد کسی بڑے سے بڑے حادثے سے ڈر نہیں لگتا۔

۶- افاطم حییّ (۳۰) الله رب محمد علی جدث امسی بیثرب ثاویا

اللہ نے جب تک زندگی بخشی ہے میں مدینہ میں محمدؐ کی قبر پر رہوں گی۔

۷- فدی لرسول الله نفسی و خالتی وامی (۳۱) و عمی، قصرةً و عیالیا (۳۲)

میری ماں، خالہ، چچا، میرے عیال اور خود میری جان آپؐ پر قربان۔

۸- فلو ان رب الناس ابقاک بیننا سعدنا ولکن امره (۳۳) کان ماضیا

اگر رب کائنات آپؐ کو ہمارے درمیان باقی رکھتا تو یہ ہمارے لیے خوش بختی تھی لیکن اس کا فیصلہ ہو کر رہتا ہے۔

۹- علیک من الله السلام تحیةً وادخلت جنات من العدن راضیا

باغ عدن میں خوش خوش مسرور داخل ہونے والے پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے سلام کے ذریعہ خوش آمدید۔

خلاصہ: آنحضورؐ سے عقیدت و محبت جزو ایمان ہے لیکن محبت الٰہی اور حب رسولؐ کے درمیان جو باریک فرق ہے اظہار عقیدت میں اس کو نگاہوں کے سامنے نہ رکھنا عقیدۂ توحید اور اسلام کی مذہبی روح کے منافی ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعر اپنے اوپر طاری جذبات کے اظہار کے لیے جس قسم کے لفظوں کا سہارا لیتا ہے، وہی اس کے فکر و احساس کے حقیقی رخ اور منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ بھی اپنی اسی انسانی فطرت پر پیدا ہوئے تھے، ان کے یہاں بھی جوش و جذبہ، حوصلہ و ہمت، شجاعت و بہادری، زبان و بیان پر قدرت اور شعر و ادب سے دلچسپی بدرجۂ اتم موجود تھی، مگر جوش کے ساتھ ہوش، حوصلہ و ہمت کے ساتھ ہوش کا شعور، شجاعت و جواں مردی کے ساتھ خود پر قابو پانے کی اہلیت اور سخن گوئی پر قدرت کے ساتھ اظہار جذبات میں متانت و سنجیدگی کا جو سلیقہ ان کی زندگی میں نظر آتا ہے وہ یقیناً رسول پاکؐ کے فیض صحت کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ بالا اشعار مراثی رسولؐ کے فنی اور شعری محاسن و اوصاف بیان کے محتاج نہیں، زبان کی فصاحت، مضمون کی صداقت، روانی، بے ساختگی غرض اثر آفریں کلام کے جس قدر اوصاف گنائے جاتے ہیں سب ان میں موجود ہیں، بعض نعت گو شعراء کے برعکس آنحضورؐ سے حد درجہ عقیدت کے باوجود کہیں غلو نہیں، اس کی وجہ الوہیت اور نبوت کے مقامات کا صحیح عرفان ہے اور اس کے لیے جماعت صحابہ کرامؓ کے گل سر سبد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جذبات ایک بار پھر یاد کرنے کے لائق ہیں جو عین شدید ترین کرب و اضطراب کے عالم میں اس طرح ظاہر ہوئے جیسے باد سحر گاہی کا نم۔

''آپؐ کے چلے جانے سے ہم کو شدید تکلیف ہے، اس لیے کہ آپؐ ہمارے پیشوا تھے اور ہم آپؐ کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے مگر فیصلۂ الٰہی کو کون ٹال سکتا ہے، آپؐ کے جانے سے ہمارا سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا کہ وحی اور اللہ سے ہم کلامی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، مگر کوئی بات نہیں آپؐ نے میراث میں ہمارے لیے جو صدق وصفا (یعنی قرآن وسنت) چھوڑی ہے، ہم اپنی آیندہ زندگیوں میں اسی شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے آپؐ پر ہزار ہا درود و سلام کی بارش کر دے''۔

حوالہ جات

(۱) ادب المفرد، باب الکبر ص ۱۰۹، امام بخاری، مطبع معارف نظارت مصر ۱۳۰۹ھ/ر۔ (۲) اسوۂ صحابہ، ج ۲، ص

۳۶۶، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ (۳) تاریخ علوم اسلامیہ (تاریخ وثقافت)، ج ۲، مصنفہ فؤاد محمد سزگین، شیخ نذیر حسین ۱۰۱۔ ایچ وائی پرنٹر لاہور، نومبر ۱۹۹۷ء، ونقوش ''رسول نمبر'' ج ا، ش ۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۱۵ے، ادارہ فروغ اردو لاہور۔ (۴) طبقات ابن سعد، جز ثانی، قسم ثانی، ص ۹۱ تا ۹۸، مطبعہ بریل لیڈن ۱۳۳۰ھ۔ (۵) کتاب انساب الاشراف، ج ا، ص ۵۹۴، بلاذری، تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس، دارالمعارف للطباعۃ والنشر، ۱۹۵۹ء، مصر وطبقات ابن سعد حوالہ مذکور، ص ۹۳۔ (۶) کتاب العمدہ لابن رشیق، ج ا، ص ۱۵، مطبعۃ السعادہ، مصر طبع اول، ۱۹۰۷ء۔ (۷) صدیق اکبرؓ، ص ۴۲۶، ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ (۸) مسند احمد ذکر مسند ابی بکرؓ، ج ا، ص ۸، مطبعہ میمنیہ مصر، ۱۳۱۳ھ۔ (۹) کتاب العمدہ، جز اول، ص ۱۳۔ (۱۰) حضرت ابوبکرؓ کے یہ اشعار ابن سعد کے نقل کردہ مراثی میں نہیں ہیں، ابن سعد نے اس کے برعکس دوسرے اشعار نقل کیے ہیں، دیکھیے طبقات ابن سعد ذکر من رثی النبیؐ، حوالہ مذکور، ص ۹۰-۸۹، وانساب الاشراف، ص ۵۹۲ حوالہ مذکور۔ (۱۱) کتاب البیان والتبیین، ج ا، ص ۷۷ مطبعۃ العلمیہ ۱۳۱۱ھ، طبع اول۔ (۱۲) بحوالہ الفاروق حصہ دوم، ص ۲۰۴، طبع جدید، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ (۱۳) کتاب العمدہ، ج ا، ص ۱۴-۱۵۔ (۱۴) انساب الاشراف، ص ۵۹۲، ابن سعد نے حضرت عمرؓ کا کوئی شعر ہی اس باب کے تحت نقل نہیں کیا ہے۔ طبقات حوالہ مذکور۔ (۱۵) صحیح مسلم غزوۂ ذی قرد، ج ۲، ص ۱۰۲، مطبعۃ دار الکتب العربیہ الکبری، طبری ج ۳، ص ۱۵۸۰، لیکن دوسرا مصرع طبری میں اس طرح ہے ''اکیلکم بالسیف کیل السندرہ''، واقعات ۷ھ، مطبوعہ بریل لیڈن۔ (۱۶) بحوالہ خلفائے راشدینؓ، ص ۳۴۶، طبع جدید، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ (۱۷) انساب الاشراف ۵۹۲-۵۹۳۔ یہ اشعار بھی ابن سعد میں نہیں ہیں، حوالہ مذکور۔ (۱۸) اسوۂ صحابہ، ج ۲، ص ۳۶۸۔ (۱۹) ابن سعد میں ''المسجد'' کی جگہ ''الملحد'' ہے، ص ۹۱ وسیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۷۴۴ میں بھی ''الملحد'' ہے، مطبعہ محمد علی صبیح مصر۔ (۲۰) ابن سعد میں یہ مصرع اس طرح ہے، کنت المغیب فی الضریح الملحد ص ۹۱۔ (۲۱) ابن سعد میں ''جرعت'' کے بجائے ''صبحت'' ہے، ص ۹۱۔ (۲۲) ''ما بقیت'' کی جگہ ''ماحییت''، ص ۹۱۔ (۲۳) لم نجحد کی جگہ ''لم تجحد''، ص ۹۲۔ (۲۴) مشھد کی جگہ ''مسھد'' ص ۹۲ ہے۔ (۲۵) یہ شعر ابن سعد میں ''ذکر من رثی النبیؐ'' کے تحت درج نہیں ہے، ص ۹۱-۹۲۔ (۲۶) اخیر کے دونوں شعر بھی ابن سعد میں نہیں ہیں، حالانکہ ابن سعد نے حضرت حسانؓ کے کل ۱۳۸ اشعار نقل کیے ہیں، ص ۹۱-۹۲۔ (۲۷) الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ج ۸، حرف صاد ذکر صفیہؓ، ص ۱۲۸، مطبعہ شرفیہ مصر، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء۔ (۲۸) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ج ۵، ص ۴۹۲، مطبعہ وہبیہ مصر، ۱۲۸۰ھ۔ (۲۹) یہ اشعار ابن سعد اور ابن ہشام میں نہیں ہیں۔ (۳۰) ابن سعد میں حسی کی جگہ صلی، ص ۹۳۔ (۳۱) ''امی'' کی جگہ ''عمی''، ص ۹۳۔ (۳۲) وعیالیا کی جگہ ثم خالیا، ص ۹۳۔ (۳۳) امرہ کی جگہ ''امرنا''، ص ۹۳ ہے۔

”معارف کی ایک نعت“

پوسٹ بکس نمبر۱۴
علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲
۲۰۱۳/۶/۳ء

مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپریل کے ”معارف“ میں ص۳۱۳ پر درج شدہ نظم، اس مصرع سے شروع ہوتی ہے:

”چل بسا دنیا سے اک تلمیذ رب مہرباں“

دنیا کے جو بڑے بڑے رائج جھوٹ ہیں ان میں سے یہ ”الشعراء تلامیذ الرحمان“ کا مقولہ بھی ہے۔ خدا جانے اہل علم کی عقل ایسے مقولوں کو پڑھتے اور ان پر یقین کرتے وقت کہاں چلی جاتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی تلمیذ رب نہیں ہوتا، یہ خدا کی ذات پر اتہام ہے۔ خدا تو یہ کہتا ہے ”الشعراء یتبعهم الغاوون“ اور یہ علم وعقل کا دعوی کرنے والے ”الشعراء تلامیذ الرحمن“ کی رٹ لگاتے ہیں۔ کیا یہ خدا کی کھلی ہوئی بغاوت اور خدا کے کلام کا بالواسطہ یا بلاواسطہ انکار نہیں ہے؟

پھر یہاں جس شاعر کو ”تلمیذ رب مہرباں“ کہا گیا ہے، اس کے مجموعۂ کلام (قفس رنگ) کے ص ۱۱۲ اور ص۱۴۱ پر ”منقبت“ اور ”سلام“ کے عنوان سے جو اشعار ہیں ان میں ”شرک جلی“ کے سوا کیا ہے؟

مئی کے شمارے میں ص۳۹۳ پر جو نعت چھپی ہے اس کی بنیاد ”لولاک لما خلقت الافلاک“ کے من گھڑنت فرضی نظریے پر جو قرآن سے متصادم ہے۔ اس کو ”معارف“ میں چھاپنے کی بجائے آپ کو چاہیے تھا کہ شاعرہ کو خدا سے معافی مانگنے اور اپنے عقیدے کو درست کرنے کا مشورہ دیتے، ایک آدھ شعر کو چھوڑ کر باقی سب اشعار اہل غلو کے فرضی تصورات پر مبنی ہیں۔

اگر میں نے آپ کو ”قطعہ تاریخ وفات پروفیسر ولی الحق انصاری“ کبھی بھیجا ہے تو اس کے آخری شعر کو کاٹ کر اس طرح لکھ لیجیے:

سال فوتش نوشت کلک رئیس بی سرا شک ”تیز شد بہ بہشت“

(چالیس سال کی مدت میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی مادۂ تاریخ کے اعداد میں ایک عدد کا فرق ہو گیا اور شعر میں ترمیم کی ضرورت پیش آئی)

جویائے خیر
رئیس احمد نعمانی

اقبال سہیلؔ کا ایک نعتیہ قصیدہ
(تقابلی مطالعے کی روشنی میں)

ظفر احمد صدیقی

اقبال سہیلؔ (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۵ء) علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد، ایم۔اے، ایل۔ایل۔ بی (علیگ) اور سید سلیمان ندوی کے نامور معاصر تھے۔ وہ غیر معمولی ذہانت وفطانت اور بے نظیر قوت یادداشت کے مالک تھے۔ عربی زبان وادب اور علوم اسلامیہ سے بہ خوبی واقف اور اردو و فارسی دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ سید سلیمان ندوی نے بہ حیثیت شاعر ان کی دو خوبیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ایک ان کا شاعرِ طبعی وفطری ہونا، دوسرے صنفِ قصیدہ وغزل دونوں پر بہ یک وقت قدرت رکھنا۔ چنانچہ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

> ''شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑھ لکھ کر قابلیت کے زور سے شاعر بنتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتے ہیں، وہ کچھ بھی نہ پڑھتے تو بھی شاعر ہی ہوتے۔ پہلے لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں اور دوسرے فطری شاعر ہوتے ہیں، البتہ تعلیم ان کی شاعری کو جلا دیتی ہے۔ ہمارے دوست اقبال سہیلؔ صاحب دوسری قسم کے شعرا میں ہیں یعنی فطری وطبعی شاعر ہیں''۔(۱)

آگے رقم طراز ہیں:

> ''پرانے شعرا میں قصیدہ گو اور غزل گو شعرا الگ الگ ہوتے تھے۔ قصیدہ گو غزل میں اور غزل گو قصیدہ میں کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ دونوں

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کی زبانیں الگ ہوتی ہیں۔ مگر مستثنیٰ اشخاص بھی ہیں جو دونوں مملکتوں پر ایک ساتھ حکمراں ہیں۔ جیسے قدماء میں سعدیؔ، متوسطین میں عرفیؔ اور اخیر دور میں مولانا شبلی مرحوم۔ سہیلؔ صاحب بھی انہیں مستثنیٰ قابلیت کے لوگوں میں ہیں جو قصیدہ اور غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں''۔(۲)

سہیلؔ کی غزل گوئی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم سردست ان کی قصیدہ گوئی کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری پر قدرت کاملہ کے باوجود سہیلؔ نے شعر گوئی کو ہمہ وقتی مشغلہ نہیں بنایا، پھر جو کچھ کہا اسے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بلکہ بہ قولِ خود: ''دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمائے کو بھی ضائع کردیا''۔(۳) یہی وجہ ہے کہ ''کلیات سہیل'' میں غزلیات کی طرح قصائد بھی محدود تعداد میں ملتے ہیں، پھر بھی ان کی شاعرانہ عظمت کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ کے ''انتخاب قصائد اردو'' میں ان کا بھی ایک قصیدہ شامل ہے، بلکہ یوں کہیے کہ انہیں کے قصیدے پر اس انتخاب کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ نعتیہ قصیدہ ہے اور اس کا مطلع حسبِ ذیل ہے:

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیِ امکانی رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی

سہیلؔ کا یہ قصیدہ ان کی قصیدہ گوئی اور نعت گوئی دونوں کا شاہکار ہے۔ لیکن اس پر تفصیلی گفتگو سے پہلے یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ قصیدہ سوداؔ کے نعتیہ قصیدے کی زمین میں ان کا تتبع کرتے ہوئے کہا ہے۔ سوداؔ کا مطلع درج ذیل ہے:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی نہ ٹوٹی شیخ سے زنّارِ تسبیحِ سلیمانی

اب جہاں تک سوداؔ کا تعلق ہے تو یہ زمین انہوں نے خود نہیں نکالی، بلکہ اس باب میں فارسی کے مشہور قصیدہ نگار خاقانیؔ شروانی کا تتبع کیا ہے۔ البتہ خاقانیؔ کا قصیدہ نعتیہ نہیں بلکہ حکیمانہ اور رثائیہ ہے۔ اس کا مطلع یوں ہے:

نثارِ اشکِ من ہر شب شکر ریز است پنہانی که همت را زناشوئیست با زانو و پیشانی(۴)

(ہر رات میرے دانہ ہائے اشک کا بکھرنا سرِ عروس پر رسم شکر ریزی کے مشابہ ہے۔ اس لیے کہ بلند ہمتی کا زانو و پیشانی سے تعلق زن وشوہر کے تعلق کی مانند ہے)

لیکن خاقانی کا یہ قصیدہ نہایت ادق ہے۔ اس کے بیشتر اشعار مجھ پر کھل نہ سکے۔ بعض نسبتاً آسان شعر ترجمے کے ساتھ نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

دل از تعلیم غم پیچد معاذ اللہ کہ بگذارم کہ غم پیر دبستانست و دل طفل شبستانی

(دل غم کی تعلیم سے پیچ وتاب کھا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ پناہ بہ خدا کہ میں اسے چھوڑ دوں یعنی نہیں چھوڑوں گا۔ دل کے بھاگنے کی وجہ یہ ہے کہ غم پیرِ دبستاں ہے اور دل طفلِ شبستاں ہے)

ببستم حرص را چشم و شکستم آز را دنداں چوں میم اندر خطِ کاتب چوں سیں در حرفِ دیوانی

(جس طرح کاتب کی تحریر میں میم کی آنکھ بند ہوتی ہے، اسی طرح میں نے حرص کی آنکھیں بند کردی ہیں اور جس طرح خطِ دیوانی میں سین کے دندانے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں، اسی طرح میں نے لالچ کے دانت توڑ دیے ہیں)

مرا آئینۂ وحدت نماید صورتِ عنقا مرا پروانۂ عُزلت دہد ملک سلیمانی

(گوشۂ تنہائی کے آئینے میں مجھے عنقا کی صورت دکھائی دیتی ہے اور کنجِ عُزلت کا پروانہ مجھے ملک سلیمانی عطا کرتا ہے)

چہ آزادند درویشاں از آسیب گراں باری چہ محتاجند سلطاناں بہ اسباب جہاں بانی

(درویش لوگ آسیب گراں باری سے کس قدر آزاد ہیں اور بادشاہ لوگ سامانِ جہاں بانی کے کس قدر محتاج ہیں؟)

بدا سلطانیا کورا بود رنج دل آشوبی خوشا درویشیا کورا بود گنجِ تن آسانی

(کیا ہی بری ہے وہ بادشاہت جسے پریشانیِ خاطر کا رنج لاحق ہو اور کیا ہی خوب ہے وہ درویشی جسے آرام و راحت کا خزانہ میسر ہو)

پس از سی سال روشن گشت بر خاقانی ایں معنی کہ سلطانیت درویشی و درویشی است سلطانی (۵)

(تیس سال بعد خاقانی پر یہ بات منکشف ہوئی کہ بادشاہت درحقیقت درویشی ہے اور درویشی درحقیقت بادشاہت ہے)

یہاں یہ اشعار اس طرف توجہ دلانے کے لیے نقل کیے گئے ہیں کہ سودا نے اپنے قصیدے کی تشبیب میں جو حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز اختیار کیا ہے تو اس کا ماخذ خاقانی کا زیر بحث قصیدہ ہے۔ موازنے کے لیے سودا کے قصیدے سے تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہووے نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی
خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی
عروجِ دست ہمت کو نہیں ہے قدر بیش و کم سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زرافشانی
اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمرِ خضر طولانی
برنگِ کوہ رہ خاموش حرفِ ناسزا سن کر کہ تا بد گو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی
کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو کہ زیبِ ترکِ چشمِ یار ہے سرمہ صفاہانی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سودا کا یہ قصیدہ مطلع و تشبیب سے لے کر گریز تک جدت و طرفگی کا حامل ہے اور سودا نے بہ طور خاص تشبیب میں خاقانی کا کامیاب تتبع کیا ہے۔ لیکن اس قصیدے کا نعتیہ حصہ بہت کمزور ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ سودا علوم اسلامیہ اور رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سیرت و شمائل نبوی سے بڑی حد تک ناواقف تھے۔ اس باب میں ان کا مبلغ علم چند ضعیف روایات اور بعض مشہور مضامینِ نعت تک محدود تھا۔ مثلاً:

۱۔ حضرت آدمؑ کی پیشانی میں نور احمدی ﷺ کا موجود ہونا۔ ۲۔ روایتِ لولاک لما خلقت الافلاک۔ ۳۔ حضور پاک ﷺ کا شافع محشر ہونا۔ ۴۔ آپ ﷺ کا کمال عدل و انصاف۔ ۵۔ جسم اطہر ﷺ کے سایۂ مبارک کا زمین پر نہ پڑنا۔

پھر ان مضامین کے نظم میں بھی سودا ندرت یا تازگی کا کوئی پہلو پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ چنانچہ پہلے دو مضامین انھوں نے روایتی انداز میں نظم کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

ملک سجدہ نہ کرتے آدمِ خاکی کو گر اس کی امانت دارِ نور احمدی ہوتی نہ پیشانی
اس کو آدم و حوّا کی خلقت سے کیا پیدا مراد الفاظ سے معنی ہے تا آیاتِ قرآنی

اس کے بعد انہوں نے مضمون شفاعت نظم کیا ہے، لیکن یہاں وہ جدت کی کوشش میں جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں:

خیالِ خُلق اس کا گر شفیع کا فراں ہووے رکھیں بخشش کے سر، منت یہودی اور نصرانی
زباں پر اس کی گذرے حرف جس جا گہ شفاعت کا کرے واں نازِ آمرزش پہ ہر اک فاسق و زانی

جہاں تک مضمون عدل و انصاف کا تعلق ہے تو سودا نے یہاں سب سے زیادہ زورِ طبع

صرف کیا ہے، لیکن ان کی باتیں سب خیالی ہیں جن کا سیرت وشمائل نبوی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
یہ اشعار دیکھیے:

رکھا مسند پہ آ جب سے قدم ان نے شریعت کی — کرے ہے موجِ بحرِ معدلت تب سے یہ طغیانی
اگر نقصان پر خس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو — گرے کو آگے کے وہیں کرے غرق آن کر پانی
پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا — شباں نے گرگ کو گلے کی سونپی ہے نگہبانی
ہما آسا ہے پرواز ملخ اوجِ سعادت پر — کرے ہے مور چڑھ کر سینۂ دَدْ پر سلیمانی
کھلے ہے غنچۂ گل باغ میں خاطر سے بلبل کی — جواب اوراقِ جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

البتہ سایۂ مبارک کے معدوم ہونے کے سلسلے میں سودا نے حسنِ تعلیل کا ایک دلکش پہلو پیدا کیا ہے:

نہ ہونے سے جدا سائے کے اُس قامت سے پیدا ہے — قیامت ہووے گا دل چسپ وہ محبوب سبحانی

لیکن اس کے بعد حضرت یوسفؑ کے تذکرے میں استخفاف کا انداز پیدا ہو گیا ہے:

جسے یہ صورت وسیرت کرامت حق نے کی ہووے — بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسفِ ثانی
معاذ اللہ یہ کیسا حرف بے موقع ہوا سرزد — جو اس کو پھر کہوں تو ہوؤں مردودِ مسلمانی
کدھر اب فہم ناقص لے گیا مجھ کو، نہ یہ سمجھا — کہ وہ مہرِ الوہیت ہے یہ ہے ماہِ کنعانی

اس کے بعد قصیدے کے اختتامی اشعار ہیں۔ لیکن انہیں اس قصیدے کا کمزور ترین حصہ کہنا چاہیے کیونکہ اس میں سودا نے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے معاذ اللہ عبد و معبود کے درمیان فرق کو مٹانے کی جسارت کی ہے۔ کہتے ہیں:

جو صورت اس کی ہے لاریب ہے وہ ہے صورتِ ایزد — جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنی ربانی
حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر — کہ دیکھا جن نے ان کو ان نے دیکھی شکل یزدانی

یہاں ضمناً یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں عرفی شیرازی کا نعتیہ قصیدۂ میمیہ بھی بہت مشہور ہے اور اس میں بھی نعت کی بنیاد زیادہ تر خیالی مضامین پر رکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ سودا نے اس قصیدے کو بھی پیش نظر رکھا ہو۔ اس کا مطلع یہ ہے:

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را — ہمت نکشد نیشترِ لا و نعم را

(عالی حوصلہ لوگ امرا کے لطف وکرم سے اذیت محسوس کرتے ہیں کیونکہ انھیں امیروں کے انکار واقرار کی تاب لانا دشوار ہوتا ہے)

اس قصیدے کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تاثیر برد سہم تواز حکم کواکب　　تغییر دہد ہیبتِ تو طعم نعم را

(اے رسولِ پاک (ﷺ) آپ کے خوف کی وجہ سے ستاروں کے خواص زائل ہوجاتے ہیں (یعنی نحس ستارہ بھی سعد بن جاتا ہے) اور آپ کی ہیبت کی وجہ سے نعمتوں کا ذائقہ تبدیل ہوجاتا ہے (یعنی زہر آلود کھانا بھی بامزہ ہوجاتا ہے)

انعام تو بر دوختہ چشم و دہنِ آز　　احسانِ تو بشگافتہ ہر قطرۂ یم را

(آپ کے انعام نے لالچ کی آنکھ اور اس کا منہ بند کردیا ہے اور آپ کے احسان نے (بخشش کے لیے موتیوں کی تلاش میں) سمندر کے ہر قطرے کو چیر ڈالا ہے)

تاذاتِ ترا اصلِ مہمات نخوانند　　نشنید قضا ترجمۂ لفظ اہم را

(جب تک کہ آپ ﷺ کی ذات پاک کو اصلِ مہمات کہہ کر پکارا نہ گیا، اس وقت تک قضا وقدر کو لفظ ''اہم'' کا ترجمہ سننا نصیب نہ ہوا)

تامجمع امکان ووجوبت ننوشتند　　مورد متعین نشد اطلاق اعم را

(جب تک کہ آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات کو مجمعِ امکان ووجوب نہ لکھا گیا، اس وقت تک مفہومِ عم کے اطلاق کا محل متعین نہ ہوسکا۔)

تقدیر بہ یک ناقہ نشانید دومحمل　　سلمائے حدوث تو ولیلائے قدم را

(قدرت کے ہاتھوں نے ایک ہی اونٹنی پر آپ ﷺ کے حدوث کی سلمیٰ اور قدمِ الٰہی کی لیلیٰ کے دو کجاوے کس دیے ہیں۔)

تا نام تر افسر فہرست نکردند　　شیرازۂ مجموعہ نبستند کرم را (۷)

(جب تک کہ آپ ﷺ کا نام نامی سرفہرست نہ رکھا گیا، مجموعۂ کرم کی شیرازہ بندی نہ ہوسکی۔)

لیکن یہاں سودا و عرفی کے موازنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تتبع کی کوشش کے باوجود سودا، عرفی کی بلند فکری سطح تک پہنچنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔

اب ہم اقبال سہیل کے قصیدے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ قصیدہ نعتیہ ہے۔ اس لیے سہیل نے یہ التزام کیا ہے کہ اس کی تشبیب کے ہر شعر میں جلوہ و نور یا لطف و سرور یا حسن و عشق یا باغ و بہار کا کوئی نہ کوئی تلازمہ ضرور رکھا جائے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

تلازمات نور:

ابھی تک کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ دشتِ ایمن کا قیامت ہے قیامت جلوۂ جاناں کی عریانی

ادھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمت مشرق سے اُدھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبستانی

ادھر صبحِ گریباں چاک کا راہ عدم لینا ادھر خورشیدِ عالم تاب کا آغازِ رخشانی

تلازماتِ بہار:

کہیں دوشِ صبا پر رقص کرنا نکہتِ گل کا کہیں شاخِ نشیمن پر عنادل کی حدی خوانی

ادھر غنچوں کے لب پر وِردِ یا فتاح جاری ہے اُدھر محوِ اقامت ہے قطارِ سروِ بستانی

ادھر سبزے کا جاگ اٹھنا خمارِ خواب نوشیں سے اُدھر بادِ سحر سے زلفِ سنبل کی پریشانی

تلازمات حسن و عشق:

تمناؤں کا حشر اٹھا ہے پھر ویرانۂ دل میں جنوں نے دل کو دی پھر دعوتِ شوریدہ سامانی

چمن میں جس طرف دیکھو نظر بازوں کا جھرمٹ ہے الٰہی! کوچۂ قاتل ہے یا صحنِ گلستانی

نہ جانے حسن ہے یا عشق اتنا جانتے ہیں ہم ہمیں کھینچے لیے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہانی

نعت کے لحاظ سے سہیل کے قصیدے کی یہ تشبیب موقع و محل اور مقتضائے حال کے عین مطابق ہے۔ اس لیے کہ آئندہ ذکر کیے جانے والے مضامین سے اس کا ربط و تعلق ظاہر و باہر ہے۔ اس کے برخلاف سودا کے قصیدۂ نعتیہ کی تشبیب اگرچہ حکیمانہ و فلسفیانہ افکار و خیالات پر مبنی ہونے کی بنا پر دلچسپ اور پر کشش ہے، لیکن مضمونِ نعت سے چنداں مناسبت نہیں رکھتی۔ اسی طرح سودا کے قصیدے کا مطلع بھی اگرچہ فکر اور ندرتِ خیال کے لحاظ سے چونکانے والا ہے لیکن نعتیہ قصیدے کے لیے مناسب و موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس میں کفر کو تمغائے مسلمانی کہا گیا ہے اور علامتِ کفر زنار کے بالمقابل حاملِ لوائے اسلام شیخ کو عاجز و بے بس دکھلایا گیا ہے۔ یہی اعتراض محسن کاکوروی کے معرکہ آرا قصیدۂ لامیہ پر بھی کیا گیا ہے کہ اس کی تشبیب میں بھی کفر اور علامات

کفر کا تذکرہ اس زور وشور سے کیا گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں اسلام دبتا ہوا محسوس ہوتا ہے، لیکن سہیلؔ نے ایسے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی، بلکہ معاملہ برعکس رکھا ہے۔

تشبیب کی طرح سہیلؔ کے قصیدے کی گریز بھی بہت خوب ہے۔ کیونکہ یہاں تشبیب سے نعت اس طرح بے ساختہ برآمد ہوئی ہے جس طرح کلی سے پھول برآمد ہوتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

کمالِ عاشقی ہے آپ مرنا اپنے جلووں پر — مرے مذہب میں خود بینی کو کہتے ہیں خدادانی
خود اپنی شکل دیکھی پردۂ برق تجلی میں — تعجب کیا اگر تھی دیدۂ موسیٰ کو حیرانی
کہاں کا دشتِ ایمن طور کیا، برقِ تجلی کیا — یہ سب کچھ تھی جمالِ مصطفیٰ کی پرتو افشانی

گریز کے بعد مدح یا نعت شروع ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سہیلؔ کے زیر بحث قصیدے کا سب سے منفرد اور دلکش حصہ یہی ہے۔ اس انفرادیت کے کئی پہلو ہیں۔ اول یہ کہ سہیلؔ نے نعت کی بنیاد جن مضامین پر رکھی ہے وہ روایتی اور بار بار کے باندھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر سہیلؔ کے یہاں پہلی بار سلک نظم میں پروئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر نعت کے یہ ابتدائی اشعار دیکھیے:

محمد وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی — محمد وہ حریمِ قدس کا شمع شبستانی
محمد یعنی وہ حرف نخستیں کلکِ فطرت کا — محمد یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی
وہ فاتح جس کا پرچم اطلسِ زنگاریِ گردوں — وہ اُمّی جس کے آگے عقلِ کُل طفلِ دبستانی
وہ رابطِ عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے — وہ فارق زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی
وہ ناطق جس کے آگے مہر برلب بلبلِ سدرہ — وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطق ربانی

نعت گو سہیلؔ کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر مضامینِ نعت کا ماخذ و مصدر آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور کتب سیرت وشمائل ہیں، جنہیں سہیلؔ نے اعلیٰ درجے کی شاعرانہ فن کاری و ہنرمندی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نعتیہ اشعار حقائق پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ شکوہِ بیان، روانی، موسیقیت اور تازگی وطرفگی کی صفات سے بھی متصف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں معنوی مناسبات اور لفظی رعایات کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان تمام

خوبیوں نے مل کر کلام شاعر کو سحرِ حلال کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ عادل جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے غبارِ مسکنت ہو یا وقارِ تاج سلطانی
وہ جامع جس نے یکجا کردیے بکھرے ہوئے دانے مٹادی جس نے آ کے باہمی تفریق انسانی
وہ درس آموزِ فطرت جس نے سب سے پہلے دنیا میں بتائے اہلِ عالم کو حقوقِ جنسِ نسوانی
وہ گنجورِ معارف جس کے اک اک حرف میں پنہاں نکاتِ فلسفی ، اسرارِ نفسی، رازِ عمرانی
وہ کشافِ سرائر، جس نے کھولا چند اشاروں میں علومِ اولین و آخریں کا گنجِ پنہانی

سہیلؔ کے اس نعتیہ قصیدے میں بعض ایسے خوب صورت اشعار بھی ہیں جن کی مثال نعتیہ شاعری کے پورے ذخیرے میں بہ مشکل مل سکے گی۔ مثلاً:

تراشہ جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل غسالہ جس کے تلووں کا زلالِ آبِ حیوانی
نہیں مہرِ درخشاں اس کے فیضِ جبہہ سائی سے چمک اٹھا ہے چرخِ چار میں کا داغِ پیشانی

نعت میں انبیاے سابقین کا ذکر بالعموم آتا ہے اور آنا بھی چاہیے، لیکن بعض اوقات یہ تذکرہ شایانِ شان نہیں ہوتا۔ سہیلؔ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ انبیاورسل کے ذکر میں حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ زیر بحث قصیدے سے بعض مثالیں پیش کیا جاتی ہیں:

وہ مقصودِ دوعالم مستغاثِ قاصی ودانی کیا جس نے مکمل نسخۂ اخلاقِ انسانی
مبشر جس کی بعثت کا ظہور عیسیٰ مریم مصدق جس کی عظمت کا لبِ موسیٰ عمرانی
تعالی اللہ ذاتِ مصطفیٰ کا حسنِ لاثانی کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصاف امکانی
دعائے یونسی ، خلقِ خلیلی ، صبرِ ایوبی جلالِ موسوی ، زہدِ مسیحی ، حسنِ کنعانی (۸)

کسی مضمون کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرنا، ایجاز، کہلاتا ہے اور تکرارِ بے فائدہ سے بچتے ہوئے خوبی و دل آویزی کے ساتھ قدرے تفصیل سے پیش کرنے کو اطناب کہتے ہیں۔ سہیلؔ کو دونوں طرزِ ادا پر پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ زیر بحث قصیدۂ نعتیہ کے اشعار اکثر و بیشتر ایجاز کے حامل ہیں۔ لیکن واقعۂ معراج کا ذکر انہوں نے اطناب کے پیرائے میں کیا ہے۔ اس سلسلے کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حریم ام ہانی میں حضور آرام فرما تھے درِ دولت پہ قدسی و ملک تھے محوِ دربانی

وہ چشمِ نرگسیں تھی بند لیکن چشم دل وا تھی سرہانے طالع بیدار کرتا تھا مگس رانی

ادب سے آکے جبریل امیں نے یہ گزارش کی کریں سرکار بزم نور تک تشریف ارزانی

سنی روح القدس سے جب طلب بزمِ حضوری کی اٹھے اور دی براقِ پاک پر دادِ سبک رانی

براق برق پیکر لے چلا یوں ذاتِ انور کو فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضور اس طرح گزرے گنبدِ مینائے گردوں سے نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی

سہیلؔ کے قصیدۂ نعتیہ کے کسی قدر تفصیلی تجزیے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منیرؔ شکوہ آبادی کے ''قصیدہ در نعت'' موسوم بہ ''فریادِ زندانی'' کا بھی ذکر کیا جائے۔ حسن اتفاق کہ منیرؔ کا قصیدہ بھی سوداؔ ہی کی زمین میں ہے۔ اس کا مطلع اس طرح ہے:

رخِ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغضِ پنہانی صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی

منیرؔ شکوہ آبادی امیرؔ اور داغؔ کے معاصرین میں ہیں۔ انہوں نے قصیدہ گوئی کے فنی لوازم کا اہتمام کرتے ہوئے بہ کثرت قصائد لکھے ہیں۔(۹) ان کا زیر بحث قصیدہ اس لحاظ سے ایک معرکہ آرا قصیدہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ شعوری طور پر سوداؔ کا تتبع کیا ہے بلکہ بہ حیثیت مجموعی ہر طرح ان سے آگے نکل جانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سوداؔ کا قصیدہ ۴۸/اشعار پر مشتمل ہے تو منیرؔ نے اپنے قصیدے کی تعدادِ ابیات ۱۹۸/رکھی ہے۔ اسی طرح قصیدے کے تمام اجزاے ترکیبی میں عموماً اور مضامین نعت کے بیان میں خصوصاً انھوں نے سوداؔ سے کہیں زیادہ زورِ طبع صرف کیا ہے۔ مثلاً سایۂ مبارک کے معدوم ہونے کا مضمون سوداؔ نے صرف ایک شعر میں اس طرح ادا کیا تھا:

نہ ہونے سے جدا سائے کے اس قامت سے پیدا ہے قیامت ہووے گا دلچسپ وہ محبوب سبحانی

تو منیرؔ نے اسی مضمون کو سات شعروں میں اس طرح باندھا ہے:

کہوں کیا سایۂ پرنور کے معدوم ہونے میں سبھوں کے توسنِ فکرت نے کی ہے اس میں جولانی

نہ ہوتا جمع یہ سایہ اگر مدِ امانت میں نہ ہوتی خوش سواد اس مرتبہ اقلیم روحانی

سیاہی چشم و زلفِ حور کی اس کی بدولت ہے قلم نے لوح پر لکھے اسی سے حکم ربانی

کلام پاک میں واللیل اسی کو حق نے فرمایا امانت ہے قسم کے واسطے یہ ظل نورانی

یہی تو پردہ دار عاشق و معشوق ٹھہرا تھا شبِ معراج بن کر کی اسی نے نور افشانی

اسی سائے نے شاید لے لیا ظل حمایت میں کہ طوبیٰ کی ملائک کرتے ہیں اتنی نگہبانی

بنی شام جوانی بھی اسی سائے کے صدقے میں لباسِ کعبہ نے پائی اسی سے مشک افشانی

ان سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منیرؔ سوداؔ کے دائرے سے باہر نہیں جاتے یعنی جس طرح سوداؔ روایتی یا خیالی مضامین پر نعت کی بنیاد رکھتے ہیں، وہی کیفیت منیرؔ کی بھی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نہیں ممکن کرے کوئی گمانِ بطنِ نورانی عبث باندھے ہے پتھر پیٹ پر مُہر سلیمانی

بڑھے گی اس قدر حیرت جو صبرِ پاک دیکھے گا بنے گا سورۂ صاد اک نظر میں چشم قربانی

مگر فرشِ زمیں پر روضۂ اقدس بنانا ہے سروں پہ ڈھوتے ہیں حور وملائک خشتِ پیشانی

سوا پایا مزا، اصلی وطن سے آپ کے دل میں اتر کر لامکاں سے آئیں جب آیات قرآنی

جو زر بخشی کی خاطر نام لکھے وہ فقیروں کا نوالہ کھائے سونے کا دہانِ میم مہمانی

جو اس کے گیسوے پرنور حکم عام فرمائیں کسی گھر میں نہ کرنے پائے جمعیت پریشانی (۱۰)

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ منیرؔ باوجود شاعرانہ قادرالکلامی اور طباعی کے، روایت کے دائرے میں محصور ہیں۔ اس کے برخلاف اقبال سہیلؔ اس حصار کو توڑنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا گیا یہی ان کا نشانِ امتیاز ہے۔ البتہ "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" کے بہ مصداق اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ سہیلؔ کے زیر بحث نعتیہ قصیدے میں دعا کا حصہ مفقود ہے، حالانکہ منقبتی قصائد کا عموماً اور نعتیہ قصائد کا خصوصاً یہ ایک اہم اور ضروری جز ہے۔

حواشی

(۱) کلیات سہیل، اقبال احمد خاں سہیلؔ، مرتبہ عارف رفیع، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص ۷۔ (۲) ایضاً، ص ۸۔ (۳) ایضاً، ص ۲۲۔ (۴) کلیاتِ خاقانی، مطبع نول کشور ۱۲۹۳ھ، ص ۲۴۔ (۵) دیوان خاقانی شروانی، انتشارات ارسطو ۱۳۶۲، ایران، ص ۳۳۵۔۳۴۰۔ (۶) انتخاب قصائد اردو، مرتبہ ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ، طبع چہارم، ۱۹۹۵ء، ص ۳۴۔۳۶۔ (۷) کلیاتِ عرفی شیرازی، بہ کوشش غلام حسین جواہری، ایران، سنہ ندارد، ص ۹۔۱۱۔ (۸) کلیات سہیل، ص ۳۰۔۳۴۔ (۹) انتخاب قصائد اردو، ص ۱۲۸۔۱۳۶۔

نعت نگاری کے بدلتے رجحان

تجاوز حدود کے زاویے اور رویے

ڈاکٹر معین الدین عقیل

سیرت طیبہ کی ترتیب و تدوین کا آغاز عہدِ رسالت ہی میں ہو چکا تھا اور عہدِ صحابہ و تابعین میں سیرت نگاری کی مبسوط و مفصل صورتیں سامنے آنے لگی تھیں جن میں قصائد اور منظوم سیرت نگاری کی مثالیں بھی شامل ہیں اور جو معروف بھی ہیں۔ ایسی منظوم مثالیں مختصر یا مفصل بھی ہیں اور جزوی و غیر مربوط بھی۔ منظوم جزوی سیرت نگاری کی ایک نمائندہ مثال نعت نگاری ہے۔ جو اولاً آنحضورؐ کی شان میں لکھے جانے والے قصیدے کا ایک جزو ہوتا تھا اور جس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علی الخصوص ایک مستقل صنف کی صورت اختیار کرلی۔ اس میں شاعر سیرت کے اوصاف کو یا ان کے کسی پہلو یا جزو کو اپنے احساس، جذبے اور تاثر یا اپنے زاویے سے پیش کرتا ہے اور اس میں وہ حسن اور خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ادبی کاوش کے لوازم ہیں۔ یوں مسلمانوں کے ادب کی تاریخ میں نعت نگاری نے بطور ایک باقاعدہ صنفِ سخن اپنی ایک مستقل جگہ بنالی اور نعت نگاری کی اس طویل روایت نے شاعرانہ اور ادبی اسلوب میں سیرتِ طیبہ کی جزوی یا مربوط و غیر مربوط مثالیں پیش کیں۔ عربی، فارسی، ترکی، اردو بلکہ مسلمانوں کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب میں اس صنف نے سیرتِ طیبہ کی منظوم تاریخ کے ضمن میں اپنا حصہ پیش کیا یا کردار ادا کیا ہے۔ منظوم سیرت نگاری کے ضمن میں وہ منظومات بھی اہم ہیں جنہیں شعراء نے سیرتِ طیبہ اور حیات النبیؐ کے جزوی مراحل، خصوصاً پیدائش، واقعۂ معراج اور وفات وغیرہ پر منحصر رکھ کر طویل یا مختصر نظمیں یا مثنویاں لکھیں، جو

کراچی۔

میلادنامہ (مولودنامہ، تولدنامہ)، شمائل نامہ، معراج نامہ اوروفات نامہ وغیرہ کی صورت میں مسلمانوں کی قریب ہر ترقی یافتہ زبان میں لکھی گئیں۔ اردو زبان وادب کی تاریخ بھی ایسی اصنافِ ادب کی نمائندہ اور عمدہ مثالوں سے انتہائی باثروت ہے اور اس میں شک نہیں کہ شاعروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنے عقیدت مندانہ اور والہانہ جذبات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سیرت کے جستہ جستہ یا جزوی پہلو بھی پیش کیے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی اپنی جگہ محلِ نظر ہے کہ اس عمل میں ان میں سے بعض شاعروں سے بے احتیاطی بھی روا رہی ہے۔ اس عمل کا بظاہر ایک تاریخی وتہذیبی سبب نظر آتا ہے جو اپنی جگہ ناقابل فہم نہیں اور اسی طرح نظرانداز کرنے کے قابل بھی نہیں۔

اردو شاعری برصغیر کی تاریخ وتہذیب اور ثقافتی روایات کا ایک نہایت پرکشش اور مقبول ورثہ ہے۔ اگرچہ اس کی مقبولیت اور فروغ میں اور اس کے فن اور اسالیب پر مقامی مزاج کے اثرات بہت نمایاں ہیں اور یہ اثرات عین فطری بھی ہیں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب اور علم وفن نے جس طرح ہنداسلامی روایات کے فروغ میں حصہ لیا ہے اور ان کی نئی صورت گری بھی کی ہے، ان میں اردو شاعری بھی شامل ہے۔ جس طرح خود اردو زبان اگرچہ مقامی ضرورتوں، معاشرتی تقاضوں اور یہاں کے انسانی مزاج اور علاقائی ثقافتوں سے بنی اور فروغ پائی ہے اور اس نے اپنے قواعد و ضوابط، اسالیب اور اظہار کے طریقے مقامی ضرورتوں اور مزاج وآہنگ کی مناسبت سے ترتیب دیے ہیں لیکن اس کے ذخیرۂ الفاظ اور اظہار واصناف پر عربی اور فارسی زبانوں کے ادب اور روایات کا ایک واضح اثر موجود ہے۔ اس زبان نے اپنے مخصوص مزاج اور پس منظر کے تحت اظہار کی مقبول صورتوں اور اصناف کو زیادہ تر عربی اور فارسی سے اخذ کیا ہے اور وہی اصناف اس زبان میں زیادہ مقبول و معروف ہیں جو عربی اور فارسی زبانوں سے ماخوذ ہیں۔

سیاسی لحاظ سے برصغیر کے عہدِ وسطیٰ کا وہ دور جب ہنداسلامی تہذیب نے فروغ پایا، اظہار کی مقبول اصناف میں مقامی مروج اصناف گیت، بارہ ماسے، ٹھمری اور دوہے وغیرہ نے اس زبان کے ادب میں اپنی ایک خاصی اہم جگہ بنا رکھی تھی، جب کہ عربی وفارسی زبانوں کی مقبول ترین اصناف قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی وغیرہ اردو زبان کے فروغ وارتقا کے ہر دور میں اس کی مقبول ترین اصناف رہی ہیں۔ سیاسی تبدیلیوں اور اصلاح و بیداری کی تحریکوں کے دوران اور پھر معاشرتی تقاضوں کے

تحت اوران سے کہیں بڑھ کر مغربی علوم اور جدید فکر و فلسفے اور علمی و تعلیمی تصورات کی آمد نے جہاں ہمارے ادب کو نئی اور مفید اصناف سے متعارف کرایا وہیں اظہار کے متعدد قدیم اور روایتی اسالیب بتدریج اوجھل ہو کر اب اپنا وجود قریب قریب معدوم کر چکے ہیں۔ان تبدیلیوں کے باعث زبان کے مزاج اور اظہار کی صورتوں میں بھی بہت نمایاں تبدیلی آئی ہے اور جہاں گیت، بارہ ماسے اور دوہے جیسی عام اور پسندیدہ اصناف کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی ہے وہیں مسلمانوں میں قومی و ملی احساسات کے فروغ اور بیداری کی تحریکوں اور مذہبی مسالک کی باہمی کشمکشوں اور تنازعات کے نتیجے میں بھی، جس میں مقام رسالت پر بحث و مباحثہ بھی شامل ہے، نعت نگاری نے ، ماضی یا عہد وسطیٰ کے مقابلے میں، عہدِ حاضر میں بتدریج زیادہ توجہ اور مقبولیت حاصل کی ہے۔

ہند اسلامی تہذیب کے مظاہر و اثرات میں ہم اردو زبان کے مزاج و اسالیب کو بھی شمار کر سکتے ہیں جو موضوعات ہی نہیں الفاظ اور آہنگ کی تبدیلیوں اور خیالات اور جذبات و احساسات کی بدلی ہوئی صورتوں میں نمایاں ہیں۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اصناف و اسالیب جو وسطِ ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کی مسلم تہذیب سے مستعار ہیں، یعنی قصیدہ، غزل، مثنوی اور رباعی وغیرہ، اور ساتھ ہی اپنے موضوع کی مناسبت سے نعت بھی، ہیئت و اسلوب میں ان تبدیلیوں سے، جو معاشرتی اور سیاسی حالات یا مغربی علوم و تصورات کے اثرات کا نتیجہ رہی ہیں، بہت کم متاثر ہوئے ہیں اور ان میں بھی غزل اور نعت کے علاوہ دیگر روایتی اصناف کی مجموعی نوعیت بھی ہندوستانی ماحول سے بہت کم متاثر ہوئی ہے۔لیکن غزل اپنے فن کے بنیادی مزاج و موضوع کو ہند اسلامی تہذیب و تصورات سے ایک حد تک محفوظ نہ رکھ سکی اور نعت نگاری بھی، جس کے اصل موضوع و مزاج کو مقامی اثرات سے متاثر نہ ہونا چاہیے تھا، قدرے خود کو بچا نہ سکی۔چنانچہ نعت میں، حیات مبارکہ و سیرت طیبہ کو اپنا موضوع بناتے ہوئے، شعراء حضرات اپنے بے پناہ والہانہ اور عقیدت مندانہ جذبات کے تحت غلو کی حدود تک، جہاں شرک بھی ہم آمیز ہو جاتا ہے، پہنچتے اور حدِ اعتدال کو پار کرتے نظر آتے ہیں۔اسی ذیل میں اردو نعت گوئی میں ایک اور منفی صورت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس میں ہندو عقائد یا ہندوستانی مقامی اثرات بھی کافی در آئے ہیں، جو محلِ نظر ہیں۔جس طرح اسلامی تہذیب نے برعظیم میں آنے کے بعد ایک عرصے کے معاشرتی اختلاط کے نتیجے میں ہند اسلامی تہذیب کی صورت اختیار کر لی تھی، ادبی اصناف

میں سے نعت نگاری نے، دیگر ادبی اصناف جیسے غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ کے مقابلے میں، مقامی اثرات کو زیادہ قبول کیا۔ دیگر اصناف میں نفس مضمون کے علاوہ ہیئت میں تبدیلی کے جزوی امکانات تو تھے، جو دیکھنے میں بھی آئے، مگر ان کے بنیادی لوازم اور فن میں تبدیلی کا کوئی امکان اور سبب نہ تھا، چنانچہ فن اور ہیئت کے لحاظ سے ان میں کوئی واضح اور بنیادی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ ان کے برعکس نعت کے ساتھ یکسر ایسا نہ ہوا۔ عربی اور فارسی نعت کے مضامین، مطالب اور جذبہ واحساس کے بنیادی واساسی اشتراک کے باوجود اردو نعت نگاری، قدرے اور جزوی ہی سہی، مقامی اثرات سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ یوں عربی وفارسی نعتوں اور اردو نعتوں کے درمیان صوری ومعنوی ہر دو اعتبار سے فرق دیکھا جاسکتا ہے۔

نعت یوں تو محض وصف وتوصیف کے مفہوم سے عبارت ہے لیکن ادب میں یہ ایسی صنف سے متصف اور مخصوص ہے جس میں شاعر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات سے اظہارِ عقیدت ومحبت پر مبنی اپنے دینی احساسات اور عقیدت مندانہ جذبات نظم کرتا ہے۔ اپنی اس تعریف کے مطابق نعت میں فی الحقیقت جو موضوعات اور مضامین نظم ہونے چاہئیں، ان کا محور رسالت، عبدیت، محبوبیت، رحمت اور فضیلت کے گرد ہی استوار رہنا چاہیے۔ آنحضور کی ذات وصفات اور حیثیت ومرتبے کے یہی وہ لوازم ہیں جن کی سند قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ سے ملتی ہے (۱)، اور یہی وہ حدِ توازن ہے جس سے نعت کو تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ عربی وفارسی اور اردو کی نمائندہ اور عمدہ نعتوں میں جو مضامین اور احساسات وجذبات نظم ہوئے ہیں انہیں بالعموم ان سے مختلف اور الگ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ایسی نعتوں سے قطع نظر متعدد شعراء نے نعت کو تخلیق کرتے ہوئے اپنے شدید اور والہانہ جذبات سے مغلوب ہوکر مذکورہ حد سے تجاوز بھی کیا ہے۔ اس عمل یا رویے میں شعراء نے غلو سے بھی کام لیا ہے اور ایک حد تک شرک سے بھی وہ لاشعوری طور پر اپنی نعت کو مملو ہونے سے بچا نہ سکے۔ یہاں ان کے اس عمل سے قطع نظر نعت اور اس کے مضامین میں مقامی اثرات کی کارفرمائی پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے۔ اگرچہ غلو اور شرک کو بھی مقامی اثر کے تحت شمار کیا جاسکتا ہے مگر ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ یہ صرف اردو زبان میں لکھی گئی نعتوں سے مخصوص نہیں، دیگر زبانوں کی نعتوں میں بھی یہ خیالات وعناصر موجود ہیں، یہاں مقامی اثرات کے ذیل میں محض ان اثرات کا جائزہ پیش نظر

ہے جو دراصل وہ ہندو عقائد و تصورات ہیں جن کو اردو شعراء نے یقیناً اپنی سادگی میں اور غیر شعوری طور پر اپنی نعتوں کے مضمون کے طور پر باندھا اور اپنے تئیں ایک حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسلمانوں نے برعظیم میں آکر جس تہذیب و تمدن کو دیکھا اس میں مقامی زبانوں، خصوصاً سنسکرت زبان کے ادب کو، جو اگرچہ اس وقت کے معاصر یورپی و یونانی ادب سے، بقول گستاؤلی بان (Gastave Le Bon، ۱۸۴۱ء-۱۹۳۱ء)، کمتر درجے کا تھا (۲)، خاصہ پرکشش پایا۔ شاعری اور اس میں گیت، کیرتن اور بھجن ہندوؤں میں اس قدر مقبول تھے کہ عبادتوں کا حصہ تھے اور صبح کا آغاز وہ بھجن گا کر کرتے تھے جن میں دیوی دیوتاؤں کی مدح کی جاتی تھی۔ ہندو مذہب میں چونکہ اعتقادات غیر معین اور غیر محدود ہیں اس لیے تخیل آزاد اور لامحدود ہے۔ ان میں بیان کردہ خیالات میں توحید اور شرک کی کوئی قید نہیں اس لیے ان میں فرق قائم نہ رہتا تھا۔ شاعری میں ایہام ایک عام رجحان تھا، جس میں الفاظ کا مفہوم ایک نہیں رہتا، کئی کئی معنی پیدا ہو سکتے تھے۔ فرق اور تضاد ان کے لیے اہم نہ تھے۔ ایک لمحے میں وہ جس دیوتا کو عظیم قرار دے کر اس کی مدح سرائی کرتے، دوسرے لمحے وہ کسی اور دیوتا کو برتر قرار دیتے اور پھر اس کی مدح سرائی کرتے۔ بھجن گانے والے اپنے جوش اور جذبے میں جو لفظ چاہتے استعمال کر دیتے اور خیالات پر غور نہ کرتے (۳)۔ ہندو عقائد پر مبنی طویل نظمیں: ''مہابھارت'' اور ''رامائن'' دیوتاؤں کی عظمت اور قوت کو پیش کرتی ہیں مگر یہی دیوتا گاہے راکشسوں سے مات بھی کھا جاتے ہیں یا راکشس ان پر حاوی ہو جاتے ہیں (۴)، ایک دیوتا وقتی طور پر قادر مطلق کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے لیکن ہمیشہ یہی دیوتا قادر مطلق بھی نہیں رہتا۔ اس طرح ہندوؤں میں ایک خدا کا تصور محض خیالی اور تصوراتی نظر آتا ہے۔ ہاں جس وقت جس دیوتا کا بھجن گایا جاتا ہے اس وقت وہ افضل اور برتر ہوتا ہے۔ قدرت اور طاقت کی مناسبت سے دیوتاؤں کی کثرت نے جو تصور عام کیا اس کا ایک نتیجہ وحدت الوجود کی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس عقیدے نے ہندو ویدانت اور اس کے زیر اثر ہند اسلامی تصوف میں ایک مستقل اور مضبوط مکتب فکر کی حیثیت اختیار کی جو شاعری کا بھی ایک مقبول موضوع بن گیا۔ اکثر اردو شاعروں نے اپنے کلام میں اسے جگہ دی اور نعت نگاروں نے نعت میں بھی ایسے مضامین باندھے جو اس نظریے کے قریب ہیں اور اسی رجحان کا اثر ہے کہ بعض نعت نگار شاعروں کے لیے عبد اور معبود، خدا اور رسول ایک وجود بھی ہو جاتے

ہیں۔ نعت میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، بطور نمونہ ایک دو شعر کافی ہیں:

دوئی کا مطلقاً پردہ نہ تھا جب ذات خالق سے　　معما کس طرح کھلتا نبی کی ذات یکتا کا (۵)

اس خلوت وحدت میں نہ تھا نام دوئی کا　　اللہ سے یوں ہو گئے واصل شب معراج (۶)

وحدت الوجود کے نقادوں، اور اسی مناسبت سے نعت کے نقادوں نے اس نظریے کو شرک کا مماثل قرار دیا ہے اور نعت میں ایسے مضامین کو بھی شرک کی صف میں شمار کیا ہے۔ طول کلام کے خیال سے یہاں تفصیلات اور مثالوں سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

ہندو عقائد کے تعین میں منظومات کا مجموعہ ''رگ وید'' اور ان کی طویل منظوم کتابیں: ''مہابھارت'' اور ''رامائن'' بہت نمائندہ اور معاون ہیں۔ ان میں سے ''رگ وید'' میں شامل بھجنوں کا موضوع عالم فطرت سے متعلق دیوتاؤں، اندر اور اگنی وغیرہ کی مدح میں ہے، جب کہ ''مہابھارت'' میں دیوتاؤں، رشیوں اور حکمرانوں کی داستانیں اور ان سے منسوب معجزات اور خرق عادات کارنامے بیان کیے گئے ہیں، اور ''رامائن'' میں فوق الفطرت طلسمی ماحول، غیر حقیقی کردار، بھوت پریت وغیرہ کی قوت اور طاقت کے کرشمے پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو قدیم ہندوستان کے ادب میں اوتاروں، دیوتاؤں اور راکشسوں کے قصے شامل ہیں جو اپنی فوق الفطرت قوتوں سے دشمن پر فتح پاتے ہیں۔ اس سارے ادب کا انحصار فوق الفطرت قصوں اور طلسماتی ماحول پر ہے، جس میں شخصیت پرستی کے عنصر یا رجحان نے مذہب کے حوالے سے مدح سرائی کو جزوِ ایمان کی حیثیت دے رکھی ہے اور جسے عبادتوں میں شامل کر لیا گیا اور مدحیہ گیتوں (بھجنوں) میں اس طرح جگہ دے دی گئی کہ مبالغہ آرائی اور غلو نے جزوِ لازم کی حیثیت اختیار کر لی (۷)۔ اس رویے کے تحت کم تر حیثیت کے دیوتا کو بھی، مدح سرائی کے جوش میں طبقۂ بالا بلکہ اعلیٰ ترین، قادرِ مطلق کے درجے پر پہنچا دیا گیا کہ پھر قادرِ مطلق کی حیثیت برقرار نہ رہی اور اس کی حقیقی مدح کا حق ادا نہ ہو سکا۔

انسانی سطح پر اس عمل کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک دیوتا وشنو کے دو اوتار رام اور کرشن قصے اور کہانیوں میں بہت مقبول اور معروف رہے ہیں۔ ان دونوں کا کردار عشق و محبت کے حوالے سے مثالی ہے اور عوام کے لیے اس قدر پسندیدہ ہے کہ سب ہی ان کے متوالے اور عاشق ہیں۔ یہاں تک کہ کرشن کا کردار تو عورتوں کے لیے ایک مثالی اور پرکشش حیثیت کا حامل بن گیا۔ اس عشق نے ہر

ایک کے لیے ان کرداروں میں وہ کشش اور جاذبیت پیدا کردی ہے کہ بیک وقت تاریخ اور ادب میں ان کی طرح کی مدح سرائی کی کوئی اور مثال نہیں۔ انہیں ان کے چاہنے والوں اور شاعروں وفن کاروں نے اوتاروں کے درجے سے اٹھا کر خدا کے درجے پر پہنچا دیا۔ اس طرح ادب اور فن کی دنیا میں ان کی حیثیت مخلوق کی نہیں خالق کی ہوکر رہ گئی ہے۔ اس طرح ہندوؤں کی مذہبی شاعری یا بھجن میں جوش عقیدت کے نتیجے میں دیوتاؤں کے مابین حفظ مراتب کا فرق نہیں کیا جاتا اور اوتاروں کو بھی ایشور یا خدا کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فوق الفطرت عادت اور قوت کو انسان یا اوتاروں سے منسوب کرنے کا عمل ہندوؤں کی مذہبی شاعری میں عام ہے۔ قرون وسطیٰ کے اس زمانے میں کہ جب ہندوستان میں بھگتی تحریک کا اثر پھیل رہا تھا اور تصوف اور ویدانت کے پیروکار مذہب کا نام لے کر عوام میں مذاہب کے باہمی اشتراک اور رام اور رحیم کے ایک ہونے کا پیغام دے رہے تھے، ہندوؤں نے مسلمان فاتحین اور حکمرانوں کی رضا اور خوشنودی کے لیے حمد، نعت اور سلام و مرثیے اور منقبتیں لکھنی شروع کیں، فارسی زبان کو اختیار کیا، قرآن کے منظوم ترجمے کرنے لگے اور صوفیہ اور بزرگوں کی محفلوں میں شرکت اور ان کے مزاروں پر حاضری دینے کو خود اپنے لیے حاجت روائی اور نجات کا وسیلہ سمجھنے لگے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے رام، کرشن اور شیو اور گنگا جمنا پر نظمیں لکھنی شروع کیں، ڈھولک کی تھاپ پر درگاہوں اور خانقاہوں میں سماع اور قوالی کو ثواب سمجھ کر اپنا لیا اور بسنت کی تقریبات اہتمام سے منائی جانے لگیں۔ مسلمان حکمرانوں نے رام لیلا اور دسہرے کے تیوہار کو عوامی انداز میں سرکاری سطح پر رائج کیا۔ جو لطف انہیں بھگتی تحریک کے زمانے میں کیرتن اور بھجن کے عوامی ناچ گانوں میں آتا تھا وہ اب دلی اور لکھنؤ کے امام باڑوں اور کربلائے معلیٰ میں سوز خوانی کی محفلوں اور تعزیہ نکالنے میں ملنے لگا۔ اسی زمانے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی شادیاں، تیج تیوہاروں میں باہمی شرکت اور ہولی دیوالی مشترکہ طور پر منائی جانے لگیں تو باہمی مہر و محبت انہیں اور قریب تر اور آگے تک کیوں نہ لے جاتی۔ چنانچہ مسلمان صوفیہ نے ہندو پنڈتوں سے سنسکرت زبان اور الٰہیات کے درس لینے شروع کر دیے اور ہندو جوگیوں کی پیروی میں رہبانیت کو نجات کا راستہ سمجھ کر اسے اختیار کرنے لگے تو ان کی تہذیب وثقافت، تمدن اور فکر و عمل یہاں تک کہ ان کے عقائد کیسے متاثر نہ ہوتے۔ چنانچہ اس وقت کے صوفیہ میں حد درجہ تعظیم کے احساس کے تحت آنحضورؐ کی ذات کے مافوق الفطرت ہونے کا

خیال بھی عام ہوگیا تھا(۸)۔اسی طرح تصوف کے زیر اثر دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح اردو ادب اور خاص طور پر اردو شاعری نے عہد قدیم کے ہندوستانی ادب سے ہر سطح پر اثرات قبول کیے(۹) اور اس بنیاد پر اردو نعت بھی ان خیالات و مضامین سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکی جو اس وقت کے ہندوستانی ادب اور کیرتن اور بھجنوں میں پیش کیے جاتے تھے۔

اسلام کے بنیادی عقیدے میں اللہ کی وحدانیت، لاالہ الا اللہ کا اقرار اصل ایمان ہے جس کے ساتھ محمد رسول اللہ کا اعلان آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کے رسول یا پیغمبر ہونے سے مخصوص ہے، جو''عبدیت'' کی حیثیت میں اپنے اس انتہائی عروج پر ہیں کہ جو دوسرے انسانوں سے افضل و برتر ہے۔''اسری بعبدہ'' کہہ کر اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کی حیثیت و مرتبت کو واضح فرمادیا ہے۔لیکن متعدد شعراء نے عشق محمدی سے مغلوب ہو کر مقام رسالت و رفعتِ عبدیت کے اظہار میں توازن کو پار کرنے میں تکلف نہ کیا۔اس کی یہاں محض ایک مثال حروف اور الفاظ کی قطع برید میں دیکھی جاسکتی ہے، جب نعت کے معروف و ممتاز شاعر محسن کاکوروی (۱۸۲۶ء۔۱۹۰۵ء) نے اپنے ایک شعر میں میم کے پردے کو ہٹا کر عرب کے عین کو لفظ سے جدا کر کے احمد کو احد اور رسول عربی کو عرب سے بڑھا کر رب کی شان میں جلوہ گر دکھانے کی کوشش کی ہے۔(۱۰)

عینیت غیر رب کو رب سے غیریت عین کو عرب سے
ذات احمد تھی یا خدا تھا سایہ کیا میم تک جدا تھا (۱۱)

محمد کمال الدین شایق حیدرآبادی (۱۸۶۷ء۔۱۹۳۵ء) نے اسی لفظی قطع برید سے قریباً یہی بات اپنے انداز سے کہی ہے:

میم کا رخ سے اٹھا کر گھونگھٹ شکل دکھلا میرے پیارے احمد (۱۲)

یہی خیال اس طرح بھی پیش کیا گیا ہے:

احد نے صورت احمد میں اپنا جلوہ دکھلایا بھلا پھر کس طرح سے کوئی اس کا مرتبہ جانے (۱۳)

اسی مضمون کو ایک اور شاعر محمد آغا داؤد صحو (۱۸۳۷ء۔۱۹۰۶ء) نے اس طرح باندھا ہے:

پردۂ میم میں چھپے ہیں حضور ہم سے نزدیک ہیں نہیں کچھ دور (۱۴)

لیکن اسی شاعر کا ایک دوسرا شعر بھی اہم ہے،لیکن پیرایہ مختلف ہے:

مرا دل ہے محو جمال محمد وصال خدا ہے وصال محمد (۱۵)

اردو شاعروں کے کلام میں یہ مضمون بکثرت نظم ہوا ہے۔ یہ جرأت عبد اور معبود کو ایک جتانے اور ایک سمجھنے میں بھی ظاہر ہوئی ہے، جیسے:

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہوکر اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہوکر (۱۶)

ایسے مضامین کئی صورتوں میں بیان ہوئے ہیں:

اے آرزوے خلد کہیں اور چلی جا رہتی ہے مرے دل میں تمنائے مدینہ (۱۷)

اور اس سے بڑھ کر عبد کو معبود سے بھی سوا ظاہر کرنا کچھ ایسا ہی ہے جیسے ہندو عقیدے کے تحت رام کو تمام دیوتاؤں سے برتر قرار دینا۔ چنانچہ ذیل کے شعر میں بیان کردہ احساس کو کیا کہا جاسکے گا:

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمد سے (۱۸)

اس سے بھی آگے بڑھ کر شاعر نے یہاں تک کہنے سے بھی بلکہ اس حد تک غلو سے بھی گریز نہ کیا کہ خالق حقیقی تو دراصل رسالت مآبؐ کی ذات ہے:

وہ نغمۂ کن جس سے مرتب ہوئے کونین اللہ کے پردے میں محمد کی صدا ہے (۱۹)

زبانِ شمع رسالت اگر نہ ضو دیتی قسم خدا کی خدا یوں خدا نہیں ہوتا (۲۰)

اسی شاعر نے، اسی نعت میں عبد اور معبود کے درمیان کے فرق کو بلا تکلف نظر انداز کیا ہے جو اردو کے نعت لکھنے والے کئی شعراء کا رویہ ہے:

محمد سر قدرت ہے کوئی رمز اس کا کیا جانے شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے (۲۱)

خدا اور بندے کے درمیان جو مماثلت شاعروں نے دیکھی ہے ایسی ہی مماثلت اور یکسانیت شاعروں نے رسالت مآبؐ اور اولیائے کرام میں بھی تلاش کرلی ہے اور اس کی مثالیں کچھ کم بھی نہیں۔ یہاں صرف یہ ایک دو شعر بطور مثال کافی ہیں:

پیارے نبی سے ملتا ہے انداز غوث کا ہے رازِ احمدی میں نہاں راز غوث کا (۲۲)

رسول اللہ کا جلوہ ہے جلوہ غوثِ اعظم کا عجب پیارا عجب بانکا ہے نقشہ غوث اعظم کا (۲۳)

ولائے حضرتِ خالق ولائے غوثِ اعظم ہے رضا اللہ کی عین رضائے غوث اعظم ہے (۲۴)

شاعروں نے ایسی ہی عقیدت دیگر اولیائے کرام کی نسبت بھی بیان کی ہے اور ان کی مدح

سرائی اس عقیدت ومحبت کی شان سے کی ہے کہ انھیں نہ صرف آنحضورؐ کے مماثل قرار دے دیا ہے بلکہ خدائی تک کے اوصاف ان میں تلاش کر لیے ہیں اور انہیں خدا تک کہنے سے گریز نہ کیا۔ان کا اس حوالے سے یہ عمل بالکل اسی طرح ہے جیسے ہندو شعراء بھجنوں میں ایک دیوتا کی مدح سرائی اس طرح کرتے ہیں کہ دیگر سارے دیوتا اس کے مقابل کم حیثیت ہو جاتے ہیں۔یہاں موضوع کی تحدید کے باعث ایسی مثالوں سے گریز کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی ماحول کے جو اثرات اردو شاعری پر نظر آتے ہیں وہ صرف مضامین وخیالات ہی تک مخصوص نہیں ہیئت اور اسالیب تک میں یہ اثرات موجزن ہیں۔مثنوی اگرچہ عربی وفارسی سے اردو میں آئی ہے لیکن مختصر مثنویوں نے ،مضامین نعت کو بیان کرنے کے لیے معراج نامہ،میلاد نامہ، شمائل نامہ،نور نامہ اور وفات نامہ جیسی منظومات میں خود کو ڈھال لیا جو مقامی اثرات کی واضح مثالیں ہیں۔اگرچہ ایسی نظموں کی دیرینہ روایت مسلمانوں کی دیگر زبانوں میں بھی پختہ اور مستقل ہے لیکن اردو میں بھی اس روایت نے بہت فروغ پایا۔اردو میں مقامی یا ہندو اثرات کے تعلق سے یہ ایک مثال بھی کافی ہے،جیسا کہ شاہ امین گجراتی نے اپنی مثنوی ''تولد نامہ'' میں آنحضورؐ کی پیدائش کے موقع پر وہاں ایک برہمن کے موجود رہنے اور آنحضورؐ کی گردن کے اطراف سیاہ دھاگہ باندھتے ہوئے دکھایا ہے جس کی نظر بد سے بچانے کے لیے ہندوؤں میں ایک عام روایت ہے۔پھر ابوجہل آکر دائی حلیمہ کے بیٹے احمد کو،رسول اکرم کے گمان میں،دھوتی باندھتا ہے،قشقہ کھینچتا ہے،جنیو پہناتا ہے اور احمد کو آگ میں ڈال دیتا ہے۔آگ گلزار بن جاتی ہے۔برہمن کا باندھا ہوا گلے کا دھاگہ سانپ بن جاتا ہے(۲۵)۔امین گجراتی کی مثنویاں:''تولد نامہ''،''معراج نامہ''،''وفات نامہ'' اس نوعیت کے ادب میں اس لحاظ سے نمایندہ ہیں کہ ان میں بیان کردہ واقعات کو پیش نظر رکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دیگر شعراء کی اس نوعیت کی کاوشیں متعلقہ عنوان کے تحت کس قسم کے واقعات کو پیش کرتی تھیں۔مشتے از نمونہ یہ واقعات جن کی کوئی اصل اور حقیقت نہیں ایسی منظومات میں عام ملتی ہیں اور ان میں ہندو عقائد،رسومات اور رواجوں کی جھلک جا بجا موجود نظر آتی ہے۔ایسی منظومات کی کثرت اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں مقبولیت اور پسندیدگی حاصل تھی تب ہی یہ اور ایسی منظومات متعدد شعراء کی طبع آزمائی کا موضوع بنی رہیں۔

اپنے عنوان کی مناسبت سے ان مثنویوں یا منظومات میں آنحضورؐ کی شخصیت اور ذات کے متعلقہ پہلوؤں کو بیان کرنے کی روایت نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی تھی۔ جشنِ میلاد النبی منایا جانے لگا تو میلاد ناموں اور شب معراج کی تقریبات منعقد ہونے لگیں تو معراج ناموں کی قرأت ایک لازمہ بن گئی تھی۔ اب یہ روایت برعظیم پاک و ہند سے نکل کر مسلمانوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ اور دوسرے ملکوں میں بھی پہنچی ہے۔ ان اصناف کی تخلیق اور ان کا مجلسی استعمال اگرچہ دیگر مسلم ممالک اور زبانوں میں بھی مروج ہے اور ان کی قرأت کو سکون، تحفظ اور ثواب کا باعث سمجھا جاتا ہے (۲۶)، لیکن اس روایت کو برعظیم میں نسبتاً زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ مسلمانوں کو اس عمل کی تحریک ان روایتوں اور رواجوں سے ملی جو انہوں نے یہاں آ کر دیکھیں کہ کس طرح ''رامائن'' کے اشلوک یا اجزا، جن میں ان کے دیوتاؤں کے احوال اور قصے شامل ہیں، یہاں کی مجلسوں اور تقریبات میں پڑھے جاتے تھے۔ اس ضمن میں گوتم بدھ کی پیدائش اور کرشن کی پیدائش کے وقت کے مناظر مذہبی شاعری میں بہت مقبول رہے ہیں۔ چنانچہ خاص طور پر میلاد ناموں اور معراج ناموں کو شاعروں نے ان ہی کے طرز پر لکھنا شروع کیا (۲۷) اور پڑھنے کا انداز بھی وہی اختیار کیا۔ ان منظومات میں تاثیر پیدا کرنے اور محفل پر ایک اثر قائم کرنے کے لیے آنحضورؐ کی ذات و شخصیت اور احوالِ زندگی کے متعلق خلاف واقعہ، غیر عقلی، معجزاتی یہاں تک کہ طلسماتی واقعات بھی نظم کیے جانے لگے۔ آغاز میں یہ عمل اور طریقہ ممکن ہے اس خیال و مقصد سے اختیار کیا گیا ہو کہ وہ لوگ جو ہندو دیوتاؤں کے فوق الفطرت کارناموں اور محیر العقول واقعات کو سن کر ان کے تابعِ فرمان بن جاتے تھے، آنحضورؐ کی عظمت و فضیلت ان کے دلوں پر بھی ثبت ہو جائے اور وہ اسلام قبول کر لیں یا اگر مسلمان ہیں تو ہندوؤں کے اثر میں نہ جائیں اور اسلام سے قریب رہیں۔ نور نامے اور شمائل نامے اس تاثیر میں مزید اضافے کا سبب بنے۔ نیت اور مقصد چاہے جتنا بھی مثبت ہو لیکن اس کا ایک منفی نتیجہ بہر حال یہ بھی سامنے ہے کہ متعدد غلط روایات اور حکایات نے جگہ پالی اور عوام ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ سب ان میں سے اکثر کے عقیدے کا جزو بھی بن گئے۔ یہاں منظومات میں آنحضورؐ کی ذات سے منسوب تصوراتی معجزوں پر اس قدر زور دیا گیا کہ عمل اور جہد و جہاد پس پشت رہ گئے۔ اسی طرح معراج ناموں میں آسمانوں کی سیر کے حیرت انگیز واقعات اور طلسماتی ماحول نے مسلمانوں میں غلط روایات

کے عام کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملی اور فکری سطح پر حقیقت پسندی سے دور کر دیا۔ نور نامے، معراج نامے، میلا دنامے اور شمائل نامے جیسی منظومات نے مبالغہ آرائی کو فروغ دیا اور خیال و خواب کی دنیا میں پہنچا دیا۔ پھر دلچسپ صورتِ حال یہ بھی رہی کہ جس کسی نے بھی ایسے تصورات اور عقائد کا اظہار کیا اس نے بالعموم اسے ''طریقۂ محمدیؐ'' کا نام دیا۔ اس عمل میں صرف سیدھے سادے مسلمان نہیں بلکہ ان کے پیشوا اور رہنما بھی شامل ہیں۔ (۲۸)

نعت کے مضامین میں اردو شعرا میں بہت کم شاعروں نے بیان سیرت اور اظہارِ عقیدت و محبت میں احتیاط اور صحت کا لحاظ رکھا ہے۔ شمائل ناموں اور سراپا نگاری میں اس کا قوی امکان بھی تھا (۲۹)۔ اس رویے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اٹھارویں صدی کے موقر شاعر اور مصنف مولوی محمد باقر آگاہ (۱۷۴۵ء-۱۸۰۶ء) نے اپنی تحریر کردہ منظوم حیات طیبہ ''ہشت بہشت'' کے اختتامی اشعار میں اس رویے پر گرفت کرتے ہوئے شعراء کو بیان سیرت میں احتیاط کو لازم رکھنے کی تلقین کی ہے (۳۰)۔ اسی طرح امیر مینائی (۱۸۲۹ء-۱۹۰۰ء) نے اپنے تجربے کی بنیاد پر بلا تکلف یہ تسلیم کیا کہ شاعری اور انشاء پردازی میں حقائق کے بیان میں حد سے تجاوز ہو جاتا ہے، چنانچہ انہوں نے اس ضمن میں خود اپنی بعض منظومات، خصوصاً: ''شاہ انبیا''، ''صبح ازل''، ''شام ابد''، ''لیلۃ القدر'' میں بیان کردہ واقعات کے بعد میں درست ثابت نہ ہونے پر قارئین سے معذرت کا اظہار کرنے میں عار محسوس نہ کی (۳۱)، جو ایک مناسب و مثبت رویہ تھا۔

ہندوستان میں اردو شاعری اصلاً تو عربی و فارسی اور قدرے ترکی شاعری کی روایت کا ایک وسیع تر پھیلاؤ ہے اور اس نے آغاز ہی سے ان ادبی اسالیب اور اصناف ہی پر خود کو کار بند رکھا جو اس نے بڑی حد تک اپنی مذکورہ سرپرست زبانوں کے ادب سے اختیار کیے لیکن اس نے مقامی زبانوں کے اسالیب سے بھی صرف ِنظر نہ کیا اور کئی نمایندہ اور مقبول اسالیب و اصناف اس نے مقامی زبانوں سے اخذ کیے، یہاں تک کہ اس نے بعض صورتوں میں مقامی لب ولہجہ اختیار کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور شعری اسالیب اور ان کی مناسبت سے نظام عروض تک اپنا لیے۔ ہر زبان کی شاعری میں عشق و محبت ایک لازمی موضوع کی حیثیت میں موجود ہے۔ اردو شاعری میں اس کا اظہار، فارسی و عربی کے مماثل، مرد کی جانب سے ہوتا ہے اور عورت کی جانب سے گریز اور جفا ایک امر واقعہ ہے۔ لیکن

ہندوستانی زبانوں کے ادب میں یہ اظہار مرد کے بجائے عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہندو اساطیر میں کرشن عشق کا دیوتا ہے جس سے اس کی گوپیوں کو عشق ہے اور وہ اپنے عشق کا اظہار اپنے نسوانی لب و لہجے میں کرتی ہیں چنانچہ ہندی شاعری میں اظہارِ عشق کی روایت کا نسوانی لب ولہجہ یہاں کا ایک تہذیبی مزاج ہے۔گیت، بارہ ماسہ اور ٹھمری جیسی اصناف نسوانی جذبات واظہار کے لیے مخصوص ہیں۔اس روایت سے اردو شاعری بھی متاثر ہوئی ہے اور اس کی کئی اصناف میں یہ روایت مخصوص اور مستحکم ہوئی ہے۔یہاں تک کہ غزل جیسی عربی صنف بھی اس لہجے سے خود کو بچا نہ سکی۔موجودہ عہد میں خواتین میں غزل میں اپنا نسوانی لہجہ اور واحد متکلم میں اظہار پہلے نسوانی بیداری اور انقلاب کے ساتھ ساتھ ایک فیشن کے طور پر درآیا تھا اب مستقل ہو گیا ہے لیکن زمانۂ قدیم میں فارسی کے مرد شاعروں تک میں یہ انداز اور لہجہ دیکھنے میں آتا ہے۔حتیٰ کہ امیر خسرو (۱۲۰۹ء۔۱۳۲۵ء) جیسے صوفی شاعروں اور عہدِ حال کے بزرگ نعت گو شاعروں جیسے امجد حیدر آبادی (۱۸۸۰ء۔۱۹۶۱ء) تک نے نسوانی لہجے میں غزل لکھنے کا تجربہ کرنا پسند کیا (۳۲)۔عہد وسطیٰ کے صوفی شعرا اور ان میں سے وہ شاعر جو خصوصاً اردو میں شعر کہتے رہے، ان میں اظہار عشق کے لیے نسوانی لہجے کا استعمال ایک غیر معمولی رجحان نہیں تھا۔متعدد صوفی شعراء نے نسوانی لہجے میں نظمیں لکھیں۔چنانچہ نعت میں بھی یہ رنگ موجود ہے (۳۳)

نعت نگاری میں مقامی اثر پذیری کی اور بھی صورتیں اردو میں داخل ہوئیں۔غزل اور مثنوی کی مقبول ومعروف ہیئت کے علاوہ گیت اور ٹھمری جیسی مخصوص اصناف میں بھی نعتیں لکھی گئیں جن میں مرد شاعروں نے نسوانی لہجے میں ان اصناف کے تقاضوں کے مطابق لطیف پیرائے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔لیکن ان اصناف میں چونکہ نفس مضمون کا تعلق صرف جذبات عشق اور جدائی اور فراق کی کیفیات کے اظہار سے ہے جن میں آنحضورؐ کی سیرت ومرتبت موضوع نہیں، اس لیے تفصیل اور مثالوں سے یہاں گریز کیا جاتا ہے۔مگر یہ منظومات نعت میں بھی ہندو روایات اور اثرات کی ترجمانی خوب کرتی ہیں اور نعت جیسی مخصوص صنف میں بھی ان اثرات کی نمایاں مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔نفس مضمون کی نوعیت سے قطع نظر کہ وہ آنحضورؐ کی سیرت وحیثیت سے کس حد تک متعلق ہیں، یہ امر بہر حال محل نظر ہے کہ شاعروں نے نعت پیش کرتے ہوئے ہندوستانی اثرات کے ذیل میں

علامتوں اور تشبیہات کے تعین و استعمال میں بھی خاصی بے نیازی کا مظاہرہ کیا ہے اور نفس مضمون کے تقاضوں اور اسلامی تاریخی روایتوں کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے ہندوستانی اور ہندو عقائد سے وابستہ استعارے، تشبیہات اور تلمیحات کو بے دریغ استعمال کر ڈالا۔ اس عمل میں محسن کاکوروی اور امجد حیدرآبادی جیسے معتبر اور محترم شعراء بھی دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔ ان شعراء نے رام، کرشن، راجہ اندر، کنہیا، گوپی، رتھ، درشن، جوگ اور جوگی، مندر، بھبوت، ہنڈوے کا میلہ، بیراگی، گنگا، کاشی، متھرا، مہابن، برہمن، تیرتھ، گیان جیسے الفاظ ان کے جغرافیائی تناظر ہی میں نہیں عقیدے اور روایات کے ذیل میں بھی استعمال کر ڈالے۔ پھر کالی گھٹا، بادل، ابر، بارش یا برسات کے موسم کو عشق و فراق کے جذبات کے اظہار کے لیے شاعروں نے بکثرت استعمال کیا ہے اور صنف بارہ ماسہ تو اسی قسم کے اظہار کے لیے مخصوص رہی ہے۔ یہی نسبت دیگر زبانوں میں بھی ابر کے لیے مستعمل رہی ہے (۳۴) غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) نے بھی آنحضورؐ کے لیے ''ابر گہربار'' کی ترکیب استعمال کی تھی (۳۵) اردو میں محسن کاکوروی کا نعتیہ قصیدہ ''مدیح خیر المرسلین'' (۳۶) اس تعلق سے ایک نمایندہ مثال ہے جس کی تخلیق میں آنحضورؐ کے ''ابر رحمت'' ہونے کے عقیدے نے، معروف ''قصیدۂ بردہ'' کی پیروی میں، ایک مرکزی تصور کا کام کیا۔ اس قصیدے کی تمہید یا تشبیب میں محسن نے ہندوستانی ماحول اور اس سے متعلقہ تشبیہات اور تلمیحات کو پیش کرنے میں اس قصیدے کا حسن تصور کیا اور نعت کے قاری کو ایک مکمل ہندوستانی ماحول میں پہنچا دیا جہاں وہ سری کرشن کی جائے پیدائش اور ان مقامات، کاشی و متھرا کی سیر کرتا ہے جو سری کرشن کی گزرگاہیں تھیں۔ یہ قصیدہ فنی اعتبار سے بہت خوبیوں کا حامل ہے اور بہت مقبول و مشہور بھی ہوا کہ اس کی پیروی اور تضمین میں متعدد نعتیں لکھی گئیں (۳۷)۔ اس پر اعتراضات بھی ہوئے کہ اس میں ہندو عقائد پر مشتمل ماحول اور تشبیہات کا بکثرت استعمال ناروا بلکہ غیر ضروری ہے۔ (۳۸)

نعت لکھنے والوں نے جہاں آنحضورؐ کی سیرت و صفات کو انتہائی عقیدت کے ساتھ بیان کرنے کو مستحسن سمجھا ہے وہیں ان کے شمائل، پیکر، اعضائے جسم مبارک یہاں تک کہ ملبوس و مرکب کو بھی ممدوح سے نسبت کے باعث عزیز رکھا اور نعت کا موضوع بنایا اور ان کی تعریف و صفات میں سارا زور بیان صرف کر دیا۔ نعت میں سراپا نگاری کی روایت عربی و فارسی زبانوں کے مقابلے میں

اردو اور ساتھ ہی پنجابی، سندھی، ہندی، تامل، بنگالی اور گجراتی زبانوں میں زیادہ عام ہوئی جسے واضح طور پر مقامی اثر کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہاں محبوب مونث ہے جب کہ فارسی شاعری میں مذکر۔ جس کے لیے سراپا نگاری کی گنجائش کم تھی۔ محبوب کے سراپا کو بیان کرنے میں اردو شاعروں نے جو لاف زنی کی ہے اس کے محض نمائندہ نمونوں کے لیے وہ متعدد بیاضیں، انتخابات اور خصوصاً ''تذکرہ سراپا سخن'' (۳۹) از محسن لکھنوی (۱۷۹۱ء۔۱۸۷۱ء) کافی ہے، جن میں محبوب کے تمام اعضائے جسمانی کو شاعرانہ زاویے سے نظم کیا گیا اور جس کو بہتر سے بہتر اور خوب سے خوب تر انداز میں نظم کرنے میں شاعر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔

یہی نوعیت، نعت کے ساتھ ساتھ، مرثیہ نگاری میں بھی ہندوستان کے ادبی ماحول میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مرثیے نے بھی، کہ جسے اپنے پس منظر اور بنیادی حوالے کے مطابق کربلا اور واقعات کربلا یا متعلقات تک مخصوص و محدود رہنا چاہیے تھا، ہندوستان میں لکھا گیا تو، نعت کی طرح، ہندوستانی ماحول اور اس کے اثرات سے خود کو بچا نہ سکا۔ ہندوستان کے مرثیہ لکھنے والوں کے پیش نظر جہاں تاریخی اور مذہبی طور پر سانحۂ کربلا کے واقعات و حکایات کا ایک انبار بطور موضوع موجود تھا، وہیں راس لیلا، رام لیلا، کیرتن، سوانگ، ناٹک، نوٹنکی اور رہس وغیرہ کی ایک رنگا رنگ دنیا بھی انہیں اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ ویدوں اور پرانوں کی کہانیاں اور دیومالائی داستانوں کی پسندیدگی و مقبولیت بھی ان کے عام مشاہدے میں موجود تھی۔ اس پس منظر اور اس مشاہدے نے اولاً دکن اور دلی میں اور پھر ایران سے آئے ہوئے تازہ خون اور ایرانی روایات نے اودھ اور لکھنؤ میں فروغ پا کر انسانی ترقی یافتہ قوت متخیلہ کو روحانی و جذباتی رشتے سے استوار کر کے وہ جلا بخشی کہ زورِ بیان اور فن دونوں ششدر رہ گئے۔ ماحول، مناظر فطرت، کرداروں کی عادات و اطوار، رسومات، رہن سہن، انسانی مزاج و نفسیات کو ہندوستانی رنگ و آہنگ کے مطابق پیش کرنے میں مرثیہ نگاروں نے خوب خوب مہارت فن اور زورِ بیان کا مظاہرہ کیا۔ سہرا باندھنا، مہندی لگانا، بلائیں لینا، صدقہ دینا، صدقے ہونا، مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہنا، کھیتی ہری رہنا، صندل سے مانگ بھرنا، نیگ لینا، دینا، بہنوں کا سر پر آنچل ڈالنا، ساچق، آرسی مصحف، نتھ بڑھانا، چوڑی توڑنا، گھونگھٹ ڈالنا، سالگرہ کے ناڑے میں گرہ لگانا، دودھ بخشنا، دودھ کی قسم دینا، افشاں چھڑانا، بیوہ کا سفید کپڑے پہننا، منہ پر خاک ڈالنا، کاجل

لگانا، نظر بد کا ٹیکا لگانا، کالا دانہ اتارنا، ہاتھ جوڑنا، قبروں پر جانا، اگربتی اور چراغ جلانا، رسوم و عادات کے ذیل میں ہندوستانی ہی ہیں۔ اسلحہ میں کٹاری، بھالے، برچھی، نیزے ہندوستانی ہیں۔ بہادری میں ارجن کا ذکر، جانوروں میں ہاتھی، گینڈے، ناگن اور چتلے سانپ، یہ سب ہندوستانی ہیں جو اردو مرثیوں کے عناصر اور اجزاء بنا دیے گئے۔(۴۰)

اس قسم کی مذہبی شاعری میں اظہار عقیدت و محبت میں شاعروں سے مبالغہ آرائی، جزئیات نگاری اور حقائق کے مقابلے میں تصور و تخیل کی کارفرمائی کچھ غیر متوقع نہیں اور فطری طور پر شاعروں کے لیے مقامی اثرات کو قبول کرنا بھی بعید نہیں، لیکن ان اثرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعر میں جاذبیت اور زور و اثر شامل کرنے کے لیے شاعروں نے واقعیت، سچائی اور حقیقت بیانی کا لحاظ نہ رکھا اور مذہبی عقائد کے معاملے میں بے نیازی برتنے سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ خصوصاً نعت لکھنے والوں نے سیرت و شمائل بیان کرتے ہوئے تلاش و تحقیق اور حقیقت بیانی سے زیادہ اپنے حسنِ ذوق اور زورِ بیان کا زیادہ مظاہرہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس مقامی رجحان کا اور اس تناظر میں دگر اعتقادی اثرات کا سیرتِ طیبہ کے تعلق سے نعت میں شامل ہونا مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ پھر اس تناظر میں کہ سیرت پر ایک کتاب کے قارئین کا دائرہ اتنا وسیع شاید نہ ہو جتنا کہ کبھی کبھی ایک عمدہ شاعر کی ایک منتخب نعت کا ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے نعت کو اپنے مطالب میں صحت اور واقعیت سے الگ نہیں ہونا چاہیے اور ایک نعت گو شاعر کو، اپنی نعت کے حسن اور اس میں جاذبیت اور تاثیر پیدا کرنے کی خاطر اپنی نعت کے مطالب کو حقیقت سے دور نہیں ہونے دینا چاہیے۔

حوالہ

(۱) اس ضمن میں چند متعلقہ اسناد و حوالوں کو سید رفیع الدین اشفاق ''اردو میں نعتیہ شاعری''، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۳۱۔ ۵۰، میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (۲) گستاؤلی بان (GastaveLeBon)، ''تمدن ہند'' فرانسیسی سے اردو ترجمہ، سید علی بلگرامی، کرچی، ۱۹۶۲ء، ص ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ (۳) لی بان، ص ۲۰۱۔ (۴) لی بان نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں: ص ۲۰۳۔ (۵) اشفاق، ص ۱۰۶۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً، ص ۹۹۔ (۸) این میری شمیل Annemarie Schimmel، *As through a Vei Mystic Poetry in Islam.*، نیویارک، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷۷۔ (۹)

متعدد محققین نے اس موضوع پر دادِ تحقیق دی ہے۔ ایک مبسوط مطالعہ، پرکاش مونس، ''اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر''، الہ آباد، ۱۸۷۸ء، اس موضوع کا مفصل احاطہ کرتا ہے، جب کہ اس کے برعکس ایک باہمی اثر پذیری کے مطالعے کے لیے: سید اسد علی، ''ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات''، دہلی، ۱۹۷۹ء مفید ہے۔ (۱۰) اشفاق، ص ۱۰۳؛ یہ مضمون اس صورت میں بکثرت موضوع بنا ہے: جس طرف نظریں اٹھاتا ہوں نظر آتے ہیں آپ/ میری خاطر کس قدر تکلیف فرماتے ہیں آپ ......، رشید وارثی، ''اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۶۔ (۱۱) ''کلیات نعت محسن کاکوروی''، مرتبہ محمد نورالحسن، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۲۳۲۔ (۱۲) ''کلیات شایق''، ص ۱۲۵، بحوالہ اشفاق، ص ۱۰۴۔ (۱۳) ''خزینۂ نعت''، مرتبہ محمد شریف، لاہور، سنہ ندارد، حصہ اول، ص ۴۶۔ (۱۴) ''دیوان محوؔ''، ص ۳۶، بحوالہ اشفاق، ص ۱۰۴۔ (۱۵) ''دیوان محوؔ''، ص ۳۲، بحوالہ ایضاً۔ (۱۶) ''میر شمس الدین فیض: حیات اور کارنامے''، لئیق صلاح، حیدرآباد دکن، ۱۹۸۰ء، ص ۳۳۹۔ (۱۷) اشفاق، ص ۱۰۴۔ (۱۸) ایضاً، ص ۱۰۵۔ (۱۹) رشید وارثی، ص ۹۸۔ (۲۰) ''کلیاتِ شایق''، ص ۳۶۔ (۲۱) ایضاً، بحوالہ اشفاق، ص ۱۰۵۔ (۲۲) ایضاً، ص ۱۰۶۔ (۲۳) ایضاً، ۱۰۴۔ (۲۴) ''ریاض معلی''، ص ۶۲، بحوالہ ایضاً۔ (۲۵) ایم۔ جے۔ ڈار، *Gujrat's Contribution to Gujari and Urdu*، مشمولہ: Islamic Culture، ۲۷، (۱۹۵۳ء)، ص ۱۸۔ ۳۶؛ سید ظہیر الدین مدنی، ''گجری مثنویاں''، گاندھی نگر، ۱۹۹۲ء، ص ۳۳۔ ۳۵۔ (۲۶) این میری شمیل، ص ۱۸۱۔ (۲۷) ایضاً، ص ۱۸۲۔ (۲۸) علی ایس۔ اثانی اور کمال عبدالملک، *Celebrating Muhammad Images of the Prophet in Popular Muslim Poetry*، ساؤتھ کیرولینا، ۱۹۹۵ء، ص ۲۶؛ و نیز این میری شمیل، *And Muhammad is His Messenger*، نارتھ کیرولینا، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۶۔ ۲۳۸؛ *The Golden Chain of 'Sincere Muhammadans*، مشمولہ: The Rose and the Rock، مرتبہ: بروس لارنس BruceLawrence، درہم، ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۴۔ ۱۳۷۔ (۲۹) اس ضمن میں اردو نعت کی ساری تاریخ میں مثالوں اور نمونوں کی کمی نہیں۔ ایسی نعتیں بکثرت پیش کی گئیں جن میں سراپا اور شمائل بیان کرنے میں شاعروں نے کمال قدرت اور زورِ بیان اور مثالی فن کا ثبوت دیا ہے۔ یہ محض ایک دو مثالیں بہت نمایندہ اور ممتاز نعت گو شاعروں کے کلام سے اخذ ہیں:

قد رعنا کی ادا جامۂ زیبا کی پھبن   سرمۂ چشم غضب ناز بھری وہ چتون

وہ عمامے کی سجاوٹ وہ جبین روشن   اور وہ کھڑے کی تجلی وہ بیاض گردن

وہ عمامہ عربی وہ نیچا دامن   دلربایانہ وہ رفتار وہ بے ساختہ پن

غلام امام شہید، بحوالہ عبدالسلام ندوی ''شعر الہند''، حصہ دوم، اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء، ص ۲۰۶۔

حقا کہ وہ جسم سر سے تا پا ہے شاہد غیب کا سراپا
دیکھا ہے خدا نے اپنا عالم آئینہ بنا کے قد آدم
کھینچی بہ کمال حسن تدبیر نقاش ازل نے اپنی تصویر
رخ میں صفت جمال دی ہے صورت میں جان ڈال دی ہے
ابرو پہ جبین مہ شمائل رکھی ہوئی رحل پر حمائل
اس گردن صاف کی بلندی تکبیر فریضہ سحر کی
رعنائی قامت مناسب روزے میں اذان وقت مغرب
دیکھی جو وہ صورت دل آرا ارواح کو دفعتاً غش آیا
کہتے تھے ملک سنی نہ دیکھی صورت ہے کہ قدرت الٰہی

محسن کاکوروی، ص ۱۴۲۔ ۱۴۴۔ معراج ناموں کی مثال:

آمد آمد کی جو افلاک پہ پیہم تھی دھوم عرش ہر مرتبہ بس شوق سے جاتا تھا جھوم
پاؤں رکھتا تھا جہاں ناز سے وہ عین علوم اس جگہ آنکھیں بچھاتے تھے تمنا سے نجوم
اور ہر اک نقش قدم پر تھا فرشتوں کا ہجوم کوئی رکھتا تھا جبیں اور کوئی لیتا تھا چوم
کوئی کرتا تھا ادا عشرت و شادی کی رسوم اور کسی نغمے سے ہوتا تھا یہ مضموں مفہوم
مہر نے فرش تمامی کا بچھایا تھا تمام بادۂ نور سے لبریز ہوا اس کا جام
چاندنی پر جو بنایا تھا ستاروں کا کام ماہ کو حسن ملاحت سے ملی شہرت عام
ملک و جن و بشر کرتے تھے جھک جھک کے سلام حور و غلماں کی زبانوں پہ تھا جاری یہ کلام

غلام امام شہید، بحوالہ: عبدالسلام ندوی، ص ۲۰۶۔ ۲۰۷۔

(۳۰) ذاکرہ غوث، ''مولانا محمد باقر آگاہ، شخصیت اور فن''، مدراس، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲۱، ۲۲۷، ۲۲۳؛ ''ہشت بہشت'' کے تعارف کے لیے: ص ۲۱۷۔ ۲۴۰؛ ''ہشت بہشت'' اردو کے نعتیہ ادب میں اس لحاظ سے منفرد اور معتبر مقام کی حامل ہے۔ (۳۱) امیر مینائی، ''خیابانِ آفرینش''، مقدمہ ''محامد خاتم النبیین''، مرتبہ: اسرائیل احمد مینائی، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۳۸۔ (۳۲) امیر خسرو:

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
سپیت من کی دورا ہے راکھوں، جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

''امیر خسرو کا ہندوی کلام''، مرتبہ گوپی چند نارنگ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۶

امجد حیدرآبادی:

نکلی ہے گھر سے جوگن کفنی گلے میں ڈالے — پاؤں میں پڑ گئے ہیں اب چلتے چلتے چھالے
گرنے کو ہوں زمیں پر ہے کون جو سنبھالے — یثرب نگر کے راجا او کالی کملی والے
کرپا کی اک نظر ہو دکھیا پہ اپنی پیارے — بھولی نہیں میں تم کو تم کیوں مجھے بسارے

''ریاض امجد''، حصہ اول، حیدرآباد، ۱۹۴۱ء، ص ۱۲۔

(۳۳) اثانی، ص ۲۷۔ (۳۴) شارلو وادے ویل Barahmasa in Indian Literatures. Charlotte Vaudeville، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷-۳۳؛ سندھی زبان میں اس روایت کا اچھا مطالعہ اثانی، ص ۲۹-۳۶ میں ہے۔ (۳۵) غالب نے اس حوالے سے اپنی ایک مثنوی کا عنوان ہی ''ابر گہربار'' رکھا۔ مطبوعہ دہلی، ۱۸۶۴ء۔ (۳۶) مشمولہ: ''کلیات نعت محسن کاکوروی''، ص ۹۵-۱۲۳۔ (۳۷) جیسے، ایضاً، ص ۹۵۔ (۳۸) ان اعتراضات کے جواب بھی دیے گئے اور تاویلیں بھی پیش ہوئیں، مثال کے طور پر معروف شاعر اور نعت گو امیر مینائی نے بھی تاویل اور ماضی سے مثالیں دے کر اسے جائز قرار دیا، ایضاً، ص ۹۳؛ اس قصیدے میں ہندو عقائد اور ہندوستانی اثرات کا ایک اچھا جائزہ، اثانی، ص ۳۷-۴۵ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (۳۹) مطبوعہ مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۶۱ء۔ (۴۰) اردو مرثیہ نگاری میں ہندوستانی ماحول اور عقائد و رسوم کے اثرات کا جائزہ و مطالعہ متعدد تصانیف میں موجود ہے، جو اس ضمن میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں، جیسے: صالحہ عابد حسین، ''میر انیس سے تعارف''، دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۲۹-۴۴؛ گلزار زتشی دہلوی، ''مرثیہ گوئی میں قومی یکجہتی، غیر اسلامی عناصر اور مشترکہ تہذیب کے عوامل''، مشمولہ: ''اردو مرثیہ''، مرتبہ، شارب ردولوی، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۷۴-۲۸۰؛ گوپی چند نارنگ، ''مراثی انیس میں ہندوستانیت''، مشمولہ: ''انیس شناسی''، مرتبہ، گوپی چند نارنگ، دہلی، ۱۹۸۱ء، ۴۳۲-۴۶۳؛ سید اطہر رضا بلگرامی، ''مراثی انیس کا ہندوستانی سماج''، مشمولہ: ''رسالہ جامعہ''، نذر انیس، مرتبہ شمیم حنفی، دہلی، جولائی-دسمبر، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۹-۲۲۰۔

مخطوطہ مخزن کائنات-ایک تعارف

جناب سید حسن رضا عارف ہاشمی

راقم الحروف کو بہ زبان فارسی ایک صوفیانہ سوانحی طرز کی مثنوی کا قلمی نسخہ جو یندہ یا بندہ کی تقریب سے ہاتھ آیا ہے۔ یہ مثنوی بارہویں صدی ہجری کے آخر ربع ۱۱۷۹ھ کی ہے۔ جسے جونپور کے ایک صوفی شاعر نے نظم کیا ہے۔

آج بھی عربی فارسی کے نایاب مخطوطے وہاں سے دستیاب ہوجاتے ہیں، جہاں سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ مسلم جن کے اسلاف صاحب علم واقتدار رہے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں آج ان کے اخلاف عمومی صف میں آگئے ہیں یا انگریزی داں (ہندی داں) تجارت پیشہ ہو گئے ہیں، ان کی بے توجہی وناواقفیت سے ایسے علمی خزانے بہت کچھ برباد ہوگئے اور ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے قلمی نوادر کی جستجو ہونی چاہیے اور ان لوگوں کو بھی رضا کارانہ طور پر ان نسخوں کو موقر لائبریریوں کے سپرد کردینا چاہیے تاکہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ ہوجائیں اور لائبریریوں کے قلمی خزانہ میں اضافہ ہو۔

فیزیکل ڈسکرپشن (۱): کتاب کا جائزہ کچھ یوں ہے۔ ایک سو چھیاسی صفحات، اوراق پریشان، خستہ وبوسیدہ حالت میں موجود ہیں۔ مبیضہ کا سائز ۸×۵ انچ ہے یعنی پوسٹ کارڈ سائز سے ذرا بڑا۔ ہر صفحہ پر ۱۷ سطریں ہیں اور ہر سطر میں ایک شعر، 3162=(17x186)، اس طرح تین ہزار سے زاید اشعار ہیں۔ رسم الخط نستعلیق، خوش خط، حروف موتی کی طرح نکھرے نکھرے ہوئے، روشنائی سیاہ پختہ اور پائیدار ہے، خوب پڑھے جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانہ کی اور آج کی لکھاوٹ میں فرق آگیا ہے۔ جہاں جہاں نئے عنوانات قائم کیے گئے ہیں یا کوئی خصوصیت ظاہر کی گئی ہے، وہاں سرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ جو کچی تھی وہاں حروف نم آلود ہوکر اکثر پھیل گئے ہیں اور

محلہ سیتارام، اعظم گڑھ۔

دوسرے صفحہ کو بھی داغدار کردیا ہے، پڑھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔

مبیضہ کا سرورق غائب ہے، جس پر کتاب، صاحب کتاب اور کبھی کاتب کا نام اور سن کتابت درج ہوتا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک کا ہندسہ رقم ہے، یعنی صفحہ اول، ۳، ۴ صفحات کے کونے پھٹے ہوئے ہیں، جس سے شعر ادھورا رہ گیا ہے، کوئی صفحہ سوائے سرورق کے ضائع نہیں ہے اور کتاب کے آخر میں کتنے صفحات ضائع ہیں، نہیں کہا جاسکتا، لیکن شاعر نے مثنوی کے صفحہ ۱۷۵ پر ایک عنوان قائم کیا ہے۔

''آخر کتاب'' جس کے ۱۰ صفحات موجود ہیں نہیں کہا جاسکتا، ادھر کتنے صفحات ضائع ہیں لیکن قیاس ہے کم صفحات ہی ضائع ہوئے ہوں گے۔

مثنوی کا معنوی جائزہ: یہ کتاب صوفیانہ، سوانحی طرز کی مثنوی ہے، جس میں نعت رسولؐ، مدح صحابہؓ وخلفائے راشدین، منقبت ائمہ اہل بیتؑ، ائمہ جمہور اسلام، امام اعظم اور ان کے شاگرد ابومحمد وابویوسف، امام مالک وشافعی (حنبل کا ذکر نہیں ہے) اور مخصوص صحابہ وتابعین اور محدثین میں امام بخاری وصحیح مسلم کا ذکر ہے۔

اس کے بعد ہندو بیرون ہند کے مشائخ عظام، صوفیائے کرام، علما ومفکرین اسلام اور فاتحین کا بھی ذکر ہے مثلاً امیر تیمور، محمود غزنوی، بہرائچ والے مسعود غازی شہید کا ذکر ہے۔ یوں ۱۹۵ نام ہیں جو مثنوی کے مختصر صفحات میں ص ۶۹ سے ص ۱۲۸ تک آگئے ہیں۔

چونکہ صاحب مثنوی جونپور کے باشندہ تھے، انہیں ذہنی ہم آہنگی وقلبی تعلق جونپور سے ہے۔ اس بنا پر انہوں نے الگ سے ایک عنوان قائم کرکے جونپور کے آباد ہونے اور اس کے مشائخ وصوفیہ کا ذکر ص ۱۲۹ سے ص ۱۷۵ تک کیا ہے، جس سے محققین کو مدد مل سکتی ہے۔ ص ۱۷۵ سے ۱۸۶ تک شاعر کے دور کے لوگوں کا ذکر ہے، شاعر نے اپنے شجرہ اور حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مبیضہ کے محدود صفحات میں اس قدر نام آنے سے یہ کتاب کتاب فہرست بن کر رہ گئی ہے۔

مثنوی کی زبان عام فہم، مثل گلستان وبوستان ہے لیکن شاعر کو دیگر اصناف سخن پر بھی قدرت حاصل ہے، جابجا مناجات، قصیدہ اور قطعات ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے اس مبیضہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلے حصہ میں نعت، مدح صحابہ، منقبت آل رسول اور ائمہ جمہور محدثین کا ذکر ہے۔ دوسرے حصہ میں مشائخ اسلام کے (ہندو بیرون ہند کے نام) آئے ہیں اور تیسرے حصے میں جونپور کے مشائخ کا مخصوص طور پر ذکر ہے، جو کتاب کے حصہ ۱۲۸ سے خاتمہ کتاب تک دراز ہے۔ خاتمہ کتاب کے عنوان میں صوفی صاحب نے اپنا شجرہ بیان کیا ہے۔ بلبن کے زمانہ میں موصوف کے اجداد خراسان سے دہلی اور وہاں سے شاہان شرقیہ کے زمانے میں وارد جونپور ہوئے تھے۔

مثنوی کی ایک خوبی یہ ہے کہ جو بھی نام آیا ہے۔ اس کی ولادت ووفات کا تاریخی مادہ نکالا گیا ہے۔ تاریخی مادہ نکالنے میں شاعر کو یہ دسترس حاصل ہے کہ ایک ہی مصرعہ میں دو دو بار تاریخی مادہ نکالتے ہیں اور کہیں کہیں اپنے ممدوح کا نام ہی تاریخی مادہ بنا دیتے ہیں۔ (ذکر آگے آتا ہے)

کتاب کا تاریخی مادہ نکالنے کے سلسلہ میں مثنوی کا نام مخزن کائنات (۱۱۷۹ھ) معلوم ہوا۔ شاعر کا نام احسن اللہ بطور تخلص بیسیوں بار آیا ہے۔ کتاب کے ص ۲ پر ایک عنوان ہے "سبب تالیف کتاب" جس کے چار صفحات پر محیط ۱۶۸ اشعار ہیں۔ یہ معلوماتی اور قیمتی ہیں۔ یعنی یہ مثنوی کس ہجری میں لکھی گئی؟ کتنے عرصہ میں لکھی گئی؟ موضوع کیا ہے؟ شاعر نے عہد جوانی کیسے کاٹا اور جب بزم عیش وعشرت بکھر گئی، بال بچوں کے گزر جانے سے دل کی دنیا اجڑ گئی تو شاعر نے اس کتاب کو توشۂ آخرت بنالیا۔

جائے فرزند ایں کتاب مرا یہ شود شافع عذاب مرا

عنفوان شباب پر شاعر کی سیاہ راتیں، بادہ پرستی ومشاہدۂ حسن وشباب کی نذر ہوئی تھیں لیکن صبح صادق حق پرستی سے روز روشن کرتے تھے۔ شاعر کی زبانی سنیے ؎

عنفوان شباب مستی بود غفلت از راہ حق پرستی بود
دست وقلب وزبان، نگاہ ہمہ اک جہان کاست گناہ ہمہ
گرچہ کسب گناہ می کردم ہم بہ طاعت نگاہ ہم کردم
شب چراغ گناہ روشن کرد از گل خیر روز روشن کرد
ہم بہ ورد تلاوت قرآن داشتم شغل اندراں عصیان

چونکہ شاعر کے دل میں خیر کی رمق باقی تھی۔ اعتراف تھا "گناہ می کردم" اس لیے جب نیرنگیٔ روزگار سے ادبار کا زمانہ آیا تو شاعر نے اسے عذاب خداوندی جانا۔ بیوی بچے سب رخصت

ہوئے، سب کچھ لٹا کے ہوش آیا تو اپنے آپ کو دینی کتابوں کے مطالعہ میں غرق کر دیا۔

روز و شب دیدن احوال   شد چوں از فضل ایزد متعال
شغل مذکور چوں اثر کردہ   در دل من چنیں گزر کردہ
انچہ در سینۂ بود مکتوم   جلوہ گرد شد بصورت مرقوم

اس مثنوی کا موضوع کیا ہے، ان تین اشعار میں یوں وضاحت کی ہے:

کہ بہ من حضرت رسول کریمؐ   و ز صحابہ و اہل بیت عظیم
و ز ہمہ اولیا کہ مشہور اند   از عبرت تا بہ ہند منظور اند
دیگر از عمدگان ہند زمین   خاص(۲) یاران بندہ مسکین

اس مثنوی کی منفرد اور خاص خوبی اس کا تاریخی مادہ ہے، جس کا شاعر کو بھی احساس ہے۔ اتنے سارے نام جن کی تعداد مجموعی طور پر ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ ولادت و وفات، خاص خاص واقعات کا تاریخی مادہ نکالنا بہت بڑی بات ہے۔ بات بات پر تاریخی مادہ ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ کہتے ہیں ؎

سال مولود و سال رحلت و ماہ   در قلم آورم بلا اشباہ
اختلاف رواۃ بگزارم   روئے خود سوئے ما اتفق آرم

سن تصنیف اور تاریخی نام: یہ مثنوی ۱۱۷۹ھ میں لکھی گئی۔ شاعر نے ۱۱۷۹ھ کا تاریخی مادہ مخزن کائنات سے نکالا ہے۔ سن ہجری لکھنا جو انگریزی عہد میں تکلفاً اور اب ہندی زمانے میں عموماً ناپید ہے۔ وہ شعر یوں ہے ؎

مخزن کائنات نامش خواں   سال تالیف ہم زمانش داں
۱۱۷۹

شاعر کی زود گوئی استعجاب میں ڈال دیتی ہے، شاعر نے مثنوی مخزن کائنات ڈھائی ماہ میں تیار کر لی تھی۔ تین ہزار سے اوپر اشعار ہیں۔ خود فخریہ کہتے ہیں ؎

درمیان دو ماہ و چند ایام   از رجب تا بہ نصف ماہ صیام

مضمون کے اعتبار سے تاریخی مادہ نکالنا اور شخصیت کے رتبہ کا خیال رکھنا یہ معمولی بات نہیں، اب تو لوگ ابجد، ہوز، حطی سے گھبراتے ہیں۔

مثنوی کے صفحہ اول کا مضمون تبرکاً وثواباً یوں ہے۔ دودو شعر نکالے ہیں۔ عنوان ہے ''خلفاء اربعہ، عشرہ مبشرہ اوراصحاب صفہ''۔

افضل الناس بعد پیغمبر (کونہ پھٹا ہوا ہے)
ہست ابو بکر حضرت صدیق (کونہ پھٹا ہوا ہے)
بعد او حضرت عمر باشد ملک عدل با قمر باشد
رائے او حسب وحی حق بودہ بہ زبان غیر حق نہ فرمودہ
بعد او بودہ حضرت عثمان صاحب شرم قبلہ الاخوان
ذات او بودہ جامع القرآن مورد الحیا من الایمان
مرتضی بعد اوست شاہ سوار ہم چوں قران پس از آمد چار
(یعنی تورات، زبور، انجیل کے بعد قرآن نازل ہوا ہے)
او خلافت ز مصطفی دارد فیض باطن ہم از خدا دارد

اس کے بعد حضرت سعد بن وقاص، ابوعبیدہ، سعد بن عبدالرحمان، طلحہ بن زبیر رضوان علیہم یعنی عشرہ مبشرہ کی شان میں اشعار ہیں۔ (خلفائے راشدہ ۴+۶=۱۰)

ایں ہمہ عشرہ مبشرہ را کہ بہشتی بود قطعی ابدا

مثنوی کے صفحہ ۴ پر تالیف کتاب کا عنوان از حد معلوماتی ہے، جس کا ذکر ہو چکا۔ ہدیتاً وتبرکاً اشعار کے بعد صوفی صاحب نے اپنے پیر کا ذکر کیا ہے اور حق پیری پر زور وشور طور سے ادا کیا ہے۔ بہت زیادہ مدحیہ اشعار ان کی شان میں نکالے ہیں۔

شاعر غالباً اس دور آزمائش وابتلا میں جب بیوی بچوں کے گزر جانے کا صدمہ عظیم پہنچا ہے۔ حضرت غلام رشید قدس سرہ کے دست مبارک پر بیعت کر لیتا ہے ؎

کہ بہ صد آرزو مرید شدم بندہ ثانئ رشید شدم

''پیر دست گیر حضرت غلام رشید'' کا عنوان قائم کر کے غالباً ۵۰ سے اوپر اشعار نکالے ہیں۔ اپنے پیر صاحب کی امتیازی شان یہ بیان کی ہے کہ صوفیوں اور مشائخ کے روایتی لباس سے ان کو اجتناب تھا۔

نہ لباس مشائخانہ بود دوسرا مصرعہ دیمک چاٹ گئی ہے

وضع او چوں سپاہیانہ کہ بود قول او چونکہ عارفانہ کہ بود

کہ سے زور پیدا کیا ہے۔

بھلا صوفی صاحب اپنے پیر کا سن ولادت ووفات کیوں نہ نکالتے ؎

سال میلاد گفت بے شک وریب اجود نیک بخت ہاتف گفت

مولد ۱۰۹۶ھ

اور وفات کا تاریخی مادہ یوں ہے ؎

ہاتف غیب گفت تاریخش مہدی امت رسول خدا

ف ۱۱۶۷ھ

نوٹ: ردیف الگ ہوگئی؟ یہ کاتب کی غلطی ہوگی۔

حضرت غلام رشید کے تذکرہ کے لیے مولانا حبیب الرحمان کی کتاب ''اعظم گڑھ کے علما و صوفیہ'' پڑھیے۔ موصوف دیوگام کے تھے۔ حضرت غلام رشید کا مدفن شہر پورنیہ (اڑیسہ) ہے ؎

او میان پورنیہ اک چند روضۂ جد خویش کردہ پسند

حضرت غلام رشید کے جد امجد بھی اڑیسہ کے گھور کفرستان میں علم وآگہی ومحبت سے اسلام کی تبلیغ کرر ہے تھے۔ مرحبا صد آفرین ہمارے صوفیائے کرام، جن کی جولان گاہ وہاں تک تھی۔

پیر خود کے عنوان کے بعد صوفی صاحب کی نظر انتخاب میں ۷، ۸ مشائخ آئے ہیں، جن کے اسمائے گرامی لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ۱۔ حضرت شمشاد علوی، ۲۔ حضرت خواجہ بیر کفر قدس سرہ، ۳۔ حضرت خواجہ حذیفہ عرشی قدس سرہ، ۴۔ حضرت خواجہ ابراہیم ادھم، ۵۔ حضرت خواجہ (؟)، ۶۔ فضیل عباس قدس سرہ، ۷۔ حضرت عبدالواحد، ۸۔ خواجہ حسن بصری رضوان اللہ علیہم۔ عموماً ان سارے صوفیائے کرام کا سن ولادت ووفات شان عظمت میں ۴، ۵ اشعار کہے گئے ہیں۔ خواجہ ادھم کا بیان ذرا تفصیلی گیارہ اشعار میں ہے۔

چونکہ صوفیائے کرام حضرت علیؓ کو اقلیم روحانیت کا شاہنشاہ مانتے ہیں اور بہت سے مشائخ کا رشتۂ نسب وارادت اس ذات اقدس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے صوفی صاحب احسن اللہ علوی کا

سلسلۂ نسب حضرت علیؓ کی ذات بابرکات تک جاتا ہے۔ ارادت وعقیدت میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں۔ جو صرف صوفیائے کرام کو زیب دیتا ہے۔ صوفی صاحب عنوان باندھتے ہیں:

''پیر پیران جہان شاہ مردان علی علیہ السلام'' ہے

مرتضٰی ہم چوں مصطفٰی باشد که به دین حاجت که او باشد

نائب مصطفٰی علی ولی است صاحب مصطفٰی علی ولی است

صد ہزار اولیا مریدی اند اہل عرفان ہم از مریدی اند

سال ثقلش بہ قطعہ مرقوم ...... ازخلق شد نہاں مخدوم

ف۱۰۴۰ھ ف۱۰۴۰ھ ف۱۰۴۰ھ

اور ایک طویل منقبت (قصیدہ) ہے، جو طوالت کے خیال سے ترک کیا جاتا ہے۔ ۴۰ اشعار نظم فرماتے ہیں، منقبت کے دو شعر جو مستند و معتبر و متفق ہیں، تاریخ اور حدیث ہیں۔ جس میں خم غدیر و رسول اللہؐ کے مختصر خطبہ کا ذکر آیا ہے اور رسول اللہؐ نے خطبہ میں فرمایا تھا:

''من کنت مولاہ فعلی مولاہ''۔ جس کا میں مولا ہوں علی اس کا مولا ہے۔

رسول اللہؐ کی زبانی صوفی صاحب فرماتے ہیں

بہ گفتار ہر کرا ہاشم مولا بود مولا علی بے شبہ او را

مبارک باد بدر بر غدیرش رسید از خلق حیدر شد آمیرش

اہل لغات نے بہت سے معنی مولا کے بیان کیے ہیں۔ کچھ معنی اس زمانے میں غلام کے مستعمل بھی رہے ہیں۔ پھلواری شریف کے ایک صوفی صاحب کا یہ شعر کتنا پر لطف ہے۔ فرماتے ہیں:

چرا در معنی من کنت مولا می روی ہرسو

علی مولا بہ ایں معنی کہ پیغمبر بود مولا

صوفی احسن اللہ علوی نے مخزن کائنات میں حمد باری تعالیٰ سے کیوں شروع نہیں کیا؟ کیا کوئی صفحہ تھا جو ضائع ہوگیا ہو۔ نعتیہ اشعار بھی مثنوی کے صفحہ ۳۲ پر آئے ہیں اور اس کے بعد خلفائے راشدین کی مدح میں اشعار نظم فرماتے ہیں۔ رسول اللہؐ کا عنوان ہے:

''خاتم الانبیا حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مصطفیٰ مالک زمین و زمان خاتم الانبیا شہ عرفان
کہ حبیب خدائے عالم خود بہر او شد زمین زمان موجود
شاہ دو کون بود فخر و را دل فقیر و معیشت فقرا
سرور جملہ انبیائے کرام مالک کل اولیائے عظام
پدر مہربان امت بود شافع جرم روز خجلت بود

اس کے بعد بہت سارے اشعار مناجات اور اپنے جرم پر خجل ہونے اور رسول خدا سے التماس دعا کے ہے۔ اردو ادب میں حالی کی دعا ''اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے۔ امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔ اور فارسی میں ملا جامی کی دعا بہت زوردار ہے زمہجوری برآمد جان عالم ترحم یا نبی اللہ ترحم صوفی احسن اللہ کی مناجات ایسی زوردار تو نہیں ہے۔ لیکن صدق دل سے نکلی ہوئی دعا پراثر ہے جو عزت وآبرو، دین وایمان ضعیفی کے بوجھل مہ وسال بخیریت گزر جانے کے لیے مانگی گئی ہے۔ صوفی صاحب دست وہ دعا ہیں ؎

رحمت عالمی شفیع گناہ رحم لازم ترا بہ حال تباہ

مدح صحابہ: نعتیہ کلام، دعا اور مناجات کے بعد خلفائے راشدین کی مدح میں دوبارہ مفصل اشعار ہیں۔ مثنوی کے شروع میں جو اشعار کہے تھے وہ تبرکاً تھے۔ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ

یار غار نبی ابو بکر است صاحب صدق را و معتبر است
جان و تن مال جملہ و دختر کرد بر مصطفیٰ نثار نگر
مثل او در صحابہ کس نہ بود یار عنقا ببیں مگس نہ بود

رحلت تاریخی مادہ یوں ہے:

عمر او بود شصت و سہ سالہ گزرش شد گرفتہ در ہالہ
کرد ہاتف ز سال وصل خطاب کہ ہما رفتہ از جہان در باب

اس مصرع میں دوبار تاریخ وفات کا مادہ حسب مرتبت ہما (۱۲) اور جہان (۱۳) سے نکالا ہے شاید کاتب نے جہان در باب جہان خراب کے بدلہ لکھ دیا ہے۔

خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ عنوان ہے، چار اشعار ملاحظہ فرمائیں:

صاحب عدل حضرت عمر است   کہ زنخل عدالت او ثمر است
گفت پیغمبر از رہ الطاف   وصف ان شاہ انصاف

یہ زوردار شعر ہے

کہ گریزد زہیبتش ابلیس   کہ شود عیش رفت آزو تلبیس
سال ثقلش بہ کن زخامہ نگاہ نہ بود کس بہ عدل چوں آن شاہ (ف ۲۳ ہجری)

خلیفہ سویم رضی اللہ عنہ

آں کہ اہل دو نور عثمان است   قالب دین را دل و جان است
در جہان خاتم المروت بود   صاحب ہمت اہل الفت بود
بود ہشتاد و ہشت یا کہ دو سال   مدت عمر آں شہ فضال
سال وصلش بہ گفت ایں غمگین   شدہ اوج حیا برون از دین
ف ۳۵ھ   ۳۵ھ

ایک مصرعہ میں دو بار تاریخ وفات کا مادہ نکالا گیا۔ رتبہ اور فضیلت کا خاص خیال رکھا گیا۔ چونکہ صوفیائے کرام حضرت علی کرم اللہ وجہ کو تاجدار مملکت روحانیت جانتے ہیں۔ احسن اللہ اپنے پیشوا کی شان میں ''پیر خود'' کے بعد پیران جہان کے عنوان سے کافی اشعار کہہ چکے تھے۔ اس لیے خلیفہ چہارم کا عنوان نہیں قائم کیا ہے۔

مخزن کائنات کے صفحہ ۳۲ سے ۴۰ تک یعنی ۸ صفحات میں بہت اختصار کے ساتھ اپنے مخصوص ومنتخب صحابہ کرام کا ذکر دو تین اشعار میں کیا ہے۔ اس میں کوئی خاص بات سوائے تاریخی مادہ کے نظر نہیں آتی۔

صفحہ ۴۰ سے ۶۳ تک یعنی ۲۴ صفحات پر خانوادہ رسول اکرمؐ، حضرات حسنین، خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا کی بارگاہ میں عقیدت کے اشعار ہیں۔ منقبت کے ساتھ ایک معجزہ ضرور بیان کیا ہے۔ معجزہ کو صوفی صاحب ''حکایت'' کا عنوان دیتے ہیں، کشف و کرامات کی بھرمار ہے۔ جو ہر امام کے ساتھ ہے۔

کچھ اشعار پیش ہیں:

ہست بعد از علی امام زمن نور چشم نبی امام حسن
بعد او بود ہادی کونین نور چشم نبی امام حسین
صفت حضرت حسین و حسن ہم چوں خورشید و مہ بہ او روشن
جگر و جان مصطفیٰ بودند دین و ایمان مرتضیٰ بودند

خاتون جنت حضرت محمد مصطفیؐ کی چہیتی بیٹی ہیں، جن کے طفیل میں اللہ نے حضرات حسنین جیسے بیٹے عطا فرمائے۔ حضرت علی شجاع و جری کرار غیر فرار شوہر ہیں۔ بیویوں کو اپنے بہادر شوہر پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ شاعر نے عفت و عصمت کو مجسمہ قرار دے کر خدمت گزاری و عصمت سرا پر جھاڑو لگانے پر مقرر کر دیا ہے۔ علامہ اقبال جیسے دانشور شاعر کی نگاہ اس نکتہ پر گئی ہے ؎

حضرت مریم ز یک نسبت عزیز از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

منقبت کے بعد بارگاہ خاتون جنت میں بہت لمبی الحاح وزاری ہے۔ بارگاہ باری تعالیٰ میں توبہ واستغفار ہے۔ یہ مناجات ۴۹ اشعار کی ہے۔ عربی میں بھی اکثر اشعار ہیں۔ جس سے شاعر کی عربی دانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تن من دھن کی حفاظت، فراغت روزی، ایمان کی سلامتی، آفات سے امان، معاصی سے توبہ، شیطان رجیم سے تعوذ، فضل و منزلت کی آرزو، غرض ہر شعر میں ایک بات ہے۔

رب یا ذوالجلال و الاکرام بالحسین الہدی علیہ السلام
قوت تن فراغت روزی بعد ایمان ثابت الاسلام
احسن اللہ رزقنا ابدا مع عیش موافق الایام

صوفی صاحب کی مناجات کی ردیف میمہ ہے۔ مرزا غالب نے ایک قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہا تھا، جس کی زمین اور ردیف میمہ ہے۔ اس مشہور قصیدہ کا پہلا شعر یوں ہے

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

کیا یہ مناجات مرزا غالب کی نظر سے گزری تھی؟ تحقیق طلب ہے۔

چونکہ حضرات حسنین رضوان اللہ علیہم کی مدح میں چند اشعار کہنے سے صوفی صاحب کی سیری نہیں ہوئی۔ دوبارہ الگ الگ عنوان باندھا ہے۔ تاریخ ولادت وشہادت بیان کی ہے۔ تاریخی مادہ نکالا ہے۔ حضرت امام حسن کے لیے شاعر نے یہ عنوان باندھا ہے۔

تولد ورحلت حضرت امام حسن علیہ السلام،تولد کی تاریخ جنت سے اور رحلت کی آہ داد از جہان فرمود سے نکالی ہے۔حضرت امام حسین کے تولد وشہادت کی سرخی ہے۔تاریخ تولد ورحلت امام حسین علیہ السلام

گفت ہاتف سر جلیل بود یا کہ گوید سر دلیل بود

ولادت ۳ھ پ ۴ھ

اورشہادت کے لیے

از محرم دھم روز جمعہ کہ بود بہر امت فدائی سر فرمود

ش ۱۴ھ

دوبارہ تاریخ رحلت نکالتے ہیں

سال ان رحلت امام امم رفت امید گاہ از عالم

۶۱ھ ۶۱ھ

حضرات حسنین کے بعد امام حسین کے فرزند علی بن الحسین کا ذکر ہے جنہیں کثرت عبادت سے زین العابدین کہا جاتا تھا اور نام سے زیادہ لقب مشہور ہے۔

ان امام ہمام زین عباد قطب ابدال و مرشد و اوتاد

وارث دین مصطفیٰ بودہ مالک علم مرتضیٰ بودہ

ہر کما ے کہ بود در حسنین بود او چوں نور عینین

طبع من سال فصل ان کردم گفت بیرون ہما شد از عالم

صوفی احسن اللہ علوی شیعوں کے امام اثنا عشرہ حضرت محمد بن حسن العسکری کی نسبت اثنا عشری شیعوں جیسا عقیدہ رکھتے ہیں۔اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

مذہب سنی ار چہ نیست چنین کہ بود زندہ ان امام مبین

لیکن صوفی صاحب کا عقیدہ ہے:

لیک شد اعتقاد این بندہ کہ بود ہم چوں خضر یا بندہ

اور اپنے اعتقاد میں دلیل پر دلیل دیتے چلے گئے ہیں۔

ایک جملہ معترضہ: خانوادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً ائمہ اہل بیت سے گروہ صوفیہ (اصفیا) کی بڑھی ہوئی عقیدت دیکھ کر بعض ناقدین صوفی ازم، اس طرف گئے ہیں کہ یہ حالت تقیہ میں شیعہ تھے لیکن بات یہ نہیں ہے۔ان کا مسلک اخوت ومحبت بین المسلمین تھا۔خلفائے بنی عباسیہ نے جو مذہبی مباحثہ ومناظرہ سے ایک ماحول پیدا کردیا تھا۔اسی کا تریاق یہ مسلک تھا امام غزالی کے اوراق زندگی الٹ جائیں۔مولانا روم کے حالات پڑھ جائیں، جنہوں نے مناظرہ سے برأت کرلی تھی۔مولانا روم ہر فرقہ کو یکساں احترام دیتے تھے۔دراصل اس فرقہ کا پیغام محبت تھا۔دلوں کو جوڑنے میں یقین رکھتے تھے۔

دوسری طرف صوفیائے کرام نے فروغ اسلام کے لیے جو بساط بچھائی تھی۔اسی مسند رشدو ہدایت کے رہبرو مشعل راہ ائمہ اہل بیت تھے۔ان کا رشتہ ارادت وروحانیت خانوادۂ رسول پاکؐ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ جاملتا ہے۔

ذکر ائمہ اہل بیت علیہ السلام کے بعد ائمہ جمہور اسلام جن سے مسالک اربعہ ہیں۔انہیں زیر قلم لائے ہیں (امام حنبل کو نظرانداز کردیا ہے) سب سے زیادہ امام اعظم حضرت نعمان بن ثابت کی شان میں اشعار کہے ہیں۔مدح کے بعد وہی طریقہ مادہ تاریخی کا ہے۔سرخی قائم کی ہے ''امام اعظم ابوحنیفہؓ''۔

بو حنیفہ کہ اجتہاد بود دوست دار نبی و آل بود
در جناب امام دین صادق کردہ دو سال خدمت لائق

تطویل کے خیال سے مدحیہ کلام چھوڑا جاتا ہے۔

سال میلاد را نوشت چنین مظہر الحق کہ بود اہل یقین
سال میلاد ان شہ والا سر فقہا است یا سر علما

پ۷۰ھ پ۷۵ھ

سال ثقار آن شہ اعظم اوج علم آمدہ بقید قلم

ف۱۵۰ھ

اور دونوں شاگردوں کے لیے ایک سرخی قائم کی ہے ''ابومحمد وابویوسف رضی اللہ عنہم''۔

از تلامیذ او محمد نام هم ابو یوسف ان بہ علم تمام
یعنی شرع و قاضیٔ اسلام اجتہادش جہان گرفت تمام

مدح، تاریخ میلاد وارتحال ملاکردس اشعار ہیں اورانہیں سےصوفی صاحب کا حنفی المذہب ہونا ثابت ہوتا ہے۔اس کے بعد امام مالک کی سرخی ہے۔

بود مالک محدث دوران قدوۃ دین مقتدائے جہان
شافعی بود خاص شاگردش ہم چوں پرواز بود در گردش

امام شافعی کا ذکر ہے۔لیکن امام حنبل کونظرانداز کردیا ہے۔محدثین میں صحاح ستہ سے صرف دوحضرات کا بیان ہے۔بقیہ صوفی صاحب کی نظرانتخاب میں نہیں آئے۔امام بخاری اورامام مسلم دونوں کوصوفی صاحب نے رضی اللہ عنہ سے ملقب کیا ہے۔

ان محمد کہ ابن اسماعیل برّہ حق بخلق بود دلیل
بود عالم بہ علم دین حدیث قطع شک کردہ از بہ فن حدیث

اورصحیح مسلم کے عنوان سے"صاحب کتاب صحیح مسلم رضی اللہ عنہ"

چونکہ تصنیف در حدیث نمود ان کتاب صحیح مسلم بود
ہاتف غیب گفتہ است بدان سال ثقار او تو نافع خوان

ف۱۰۳ھ

ان محترم،مقدس،متبرک ہستیوں کے اس قدراختصار سے جائزہ لینے پربھی مقالہ کے اتنے صفحات صرف ہوگئےلیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادانہ ہوا۔یوں مخزن کائنات کا جزاول تمام ہوا۔جوصفحہ اول سے ۶۵ تک محیط ہے۔دوسراجز صفحہ ۶۵ سے صفحہ ۱۲۸ تک دراز ہےجس میں

از ہمہ اولیا کہ مشہور اند از عرب تا بہ ہند مشہور اند

عرب،عجم،کاشغروہند کےصوفیائے کرام،علمائے عظام،فقہا،حکما،متکلمین (امام غزالی، مولاناروم) شعرائے عارفین (امیرخسرو،شیخ سعدی،حافظ شیرازی) بلکہ اولوالعزم فاتحین امیر تیمور، محمودغزنوی،بہرائچ والے غازی سالارمسعودشہید تک ہیں۔تبرکاً کاشغر کے ایک صوفی کا نام لکھ دیا جاتا ہے،نہ جانے کتنے ہوئے ہوں گے۔

قبلہ امت است سعدالدین　　کاشغر داشت موطن تمکین

مثنوی مخزن کائنات کے جز دوم میں ہند و بیرون ہند کے ۱۷۵ مشائخ کے اسمائے گرامی لائے ہیں۔ظاہر ہے فقط ۶۲ صفحات میں اتنے سارے نام؟ یوں یہ سوانحی مثنوی کتاب فہرست بن گئی ہے۔صوفی صاحب کی خاص دلچسپی وفن کاری تاریخ تولد ورحلت سے ہے جس کے تاریخی مادہ نکالنے میں مہارت دکھائی ہے۔عجیب عجیب ڈھنگ اور سورنگ سے تاریخ نکالے ہیں مثلاً: شہاب الدین سہروردی کی پیدائش ۵۱۴ھ کی ہے، پورا نام آ گیا ہے۔

سال میلاد گفت مظہر دین　　اکمل اولیا شہاب الدین

م ۵۴۱ھ

شمس تبریز کے سن وفات کے لیے:

گفت دل سلطان شمس الدین بود

ف ۶۴۵ھ

مخزن کائنات میں جتنے نام آئے ہیں، تقریباً سب کے ذکر سے سیرت الاولیا کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔اکثر جن کے مزارات سے عوام الناس عقیدت رکھتے ہیں۔راقم السطور کو کوئی منفرد بات نظر نہیں آتی۔اس لیے صرف نظر کیا جاتا ہے۔اگر قارئین کو دلچسپی ہوگی تو کسی قسط میں بیان کیا جائے گا۔

لیکن وہ مشائخ جو ہندوستان کے ہیں، جنہیں صوفی صاحب نے مثنوی میں دیگر ازعمگان ہند زمین کہا ہے۔ان کے نام اور سن وفات لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔یہ ہندوستانی علما وفضلا، صوفیائے کرام سرزمین گجرات سے بنگال تک، ملتان ولاہور سے دہلی و آگرہ، لکھنؤ، رودولی، میرٹھ، امیٹھی، اعظم گڑھ کی قدیم بستیاں، بنارس، الہ آباد، بہار میں دربھنگہ، پٹنہ، راجستھان میں ناگور، نارول سرہند وغیرہ وہ بہت سے نام جو صوفی صاحب کی نظر انتخاب میں تھے اُج امتداد زمانہ کے ہاتھوں دھندلا گئے ہیں۔

صاحب مثنوی احسن اللہ علوی نے دہلی کے مشائخ کا نام کم بیان کیا ہے ورنہ ایک اور مخزن کائنات کا در کھل جاتا۔شاید وجہ یہ رہی ہو۔آفتاب کو چراغ دکھانا کیا ضرور تھا؟ صوفی صاحب جونپور

کے باشندہ ہیں، جسے شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ دہلی کے فرماں روا نے شرقی حکومت ختم کر کے جونپور کی انیٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ شیراز ہند کا ہر میدان میں دہلی والوں سے سابقہ رہتا تھا۔ خست برتی ہو بہر کیف۔ صاحب بیاض، صوفی موصوف کی نظر انتخاب میں جو ہندی نام آئے ہیں ان کو الگ کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ راقم نے کوشش یہ کی ہے کہ انہیں علاقہ جات میں تقسیم کردیا ہے۔

محققین اور اہل قلم (تاریخ و سیر) کے لیے یہ قلمی نسخہ ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ صاحب مثنوی حضرت احسن اللہ علوی مرحوم و مغفور جونپور کے باشندہ تھے۔ اسی قلبی تعلق و ہم آہنگی سے موصوف نے مشائخ جونپور کا ذکر مخزن کائنات کے صفحہ ۱۲۹ سے آخر تک یعنی خاتمۂ کتاب تک کیا ہے، کم و بیش ۹۰ شخصیتیں زیر قلم لائے ہیں۔

خاتمہ کتاب کا عنوان قائم کر کے صوفی صاحب نے اپنے حالات و شجرۂ نسب بیان کیا ہے جو صفحہ ۱۸۶ تک ہے اور نہ جانے کتنے صفحات ضائع ہوئے ہوں گے۔ مشائخ جونپور جن میں علما، فضلا، صوفیہ، صاحب قضایا، غرض ایک گلدستہ ہے۔ ان کے لیے راقم السطور نے ایک قسط مقرر کی ہے، جن کا ذکر آیندہ انشاءاللہ۔

حواشی

(۱) شبلی اکیڈمی کی لائبریری میں مخطوطات کے رجسٹر میں اس عنوان کے لیے PsysicalDiscription آیا ہے۔ (طبعی وضاحت) (۲) اس مصرعہ کا اشارہ مشائخ جونپور کی طرف ہے اور اکٹھا ۸۸ نام لائے ہیں، جو دوسری قسط میں رقم ہوں گے، انشاءاللہ۔

پیغمبر اسلام کی بارگاہ میں غیر مسلم شعراء کا خراج احترام

ڈاکٹر راہی فدائی

نعت شریف کے سلسلہ میں عام طور پر اہل علم کا یہ رجحان ہے کہ ان کے نزدیک نعت پاک کہنے والے شعراء حضور اکرمؐ کی عقیدت ومحبت میں ڈوبے ہوئے رہتے ہیں اور ان کا ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرع عشق رسولؐ کی نشاندہی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور ان کے خیال میں شاعر نعتوں میں جس قدر وارفتگی کا اظہار کرے گا اسی قدر اس کے اشعار میں تاثیر پیدا ہوگی، یہی سبب ہے کہ شعر کو دلی جذبات کا آئینہ کہا گیا ہے اور ایسے موقع پر ہی ''از دل خیزد بر دل ریزد'' (دل سے نکلنے والی بات ضرور دل پر اثر کرتی ہے) کا مقولہ استعمال کیا جاتا ہے۔

راقم الحروف اسلامیات وادبیات کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ حضور پر نورؐ سے عشق ومحبت ایمان کی سلامتی کے لیے لازم وشرط اولین ہے نہ کہ نعت گوئی کے لیے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں مروی ہے:

لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین (متفق علیہ)	یعنی تم میں سے کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں (رسول اللہؐ) اس کی ذات، اس کے ماں باپ، اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ اس کا محبوب نہ رہوں۔

نعت گوئی کے لیے شرط یہ ہے کہ شاعر کو فن شاعری پر دسترس حاصل ہو اور وہ اپنے ممدوح کے

بنگلور، کرناٹک۔

اوصاف وکمالات کا بخوبی علم وادراک رکھتا ہو، پھراس علم کو جذبہ میں اور جذبہ کو شعر میں تبدیل کرنے کا میلان طبع اپنے اندر پاتا ہوتو اس کی کہی ہوئی نعتوں میں دل کشی اور اثر انگیزی پیدا ہوگی۔مزید براں اگر وہ لفظوں کی معنویت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صنائع وبدائع کا استعمال اپنے اشعار میں مناسب طور پر کرے تو اثر آفرینی میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور یہ تاثر تادیر قائم بھی رہے گا۔

غرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی شاعر کا نعتیہ کلام پڑھتے یا سنتے ہیں اور وہ دل کو چھو جاتا ہے تو فوراً کہہ اٹھتے ہیں شاعر نے آپؐ کے عشق میں ڈوب کر شعر کہا ہے۔حالانکہ حقیقت حال ایسی نہیں ہوتی ہے، چنانچہ بعض نعت گو شعراء ایسے بھی ہیں جنہیں آنحضرتؐ کی سنتوں کی پیروی کا خیال تو کجا اسلام کے فرائض وواجبات کا بھی لحاظ نہیں رہتا مگر وہ بہترین نعتیہ اشعار کہہ رہے ہیں اور ''لم تقولون مالا تفعلون'' کی منہ بولتی تصویر پیش کررہے ہیں۔اگر واقعتاً وہ ''حب رسولؐ'' میں غرق رہتے تو بہ مصداق ''الاناء یترشح بما فیه'' یعنی برتن وہی چیز انڈیلتا ہے جو اس میں موجود ہے، ان کا ظاہر بھی باطن کا عکس جمیل ہوتا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ نعت پاک کی طرف شاعر کا میلان اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسے آنحضرتؐ کی مقدس ذات واعلیٰ صفات سے کسی نہ کسی حد تک لگاؤ اور تعلق ہے جس کے زیر اثر وہ نعت کہنے پر آمادہ ہوا ہے۔اس لگاؤ اور ربط وتعلق کی تعبیر ''عشق رسولؐ'' جیسے پر معنی و پروقار لفظ سے کرنے کی بجائے چاہت اور احترام کے الفاظ سے کریں تو مناسب ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کے کئی درجے ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ عشق ہے اور ادنیٰ درجہ احترام۔اسی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت سارے شعرائے کرام نے نعتیں کہی ہے، جن میں غیر مسلم شعراء کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔ ان غیر مسلم شعراء کے یہاں حضور اکرمؐ کی شان اقدس میں رطب اللسان ہونے کا جذبہ اسی احترام کے راستے سے درآیا ہے جسے احترام انسانیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے، کیونکہ آپؐ تمام اقوام عالم کے اہل علم و فضل اور اصحاب دانش وبینش کے نزدیک ''انسان کامل'' ہیں۔آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور آپؐ کے عظیم اخلاق دوست ودشمن، اپنا پرایا اور ادنیٰ واعلیٰ سبھی کے حق میں یکساں ہیں، یہی سبب ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم اہل سخن بھی آپؐ سے متاثر ومرعوب ہیں۔اس تاثر کے پیش نظر جناب پنڈت بال مکند عرش ملسیانی (ولادت ۱۹۰۸۔وفات ۱۹۷۹ء) ابن وتلمیذ جوش ملسیانی نے کیا خوب کہا ہے:

حاصلِ جلوۂ ازل ، پیکرِ نورِ ذات توؐ　　شانِ پیمبری سے ہے سرورِ کائنات توؐ

آنحضرتؐ کی حیات طیبہ، آپؐ کے مبارک و مقدس عادات و اطوار اور آپؐ کے شمائل و فضائل سے متاثر ہوکر پروفیسر تلوک چند محروم (۱۸۸۷ء-۱۹۶۶ء) نے یہ اقرار کیا ہے:

مبارک پیشرو جس کی ہے شفقت دوست و دشمن پر مبارک پیش رو جس کا ہے سینہ صاف کینے سے

آپؐ کی سیرت پاک کے مطالعہ سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (ولادت ۱۹۰۹ء) کا جذبۂ احترام چاہت اور محبت میں بدل گیا، چنانچہ کہتے ہیں:

تکمیل معرفت ہے محبت رسولؐ کی ہے بندگی خدا کی ، اطاعت رسولؐ کی
عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں کچھ مسلماں کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

آخر الذکر شعر کے مضمون کو چندر پرکاش جوہر بجنوری (ولادت ۱۹۲۳ء) نے اس طرح ادا کیا ہے:

نہیں ذکر محمدؐ کے لیے تخصیص مذہب کی
یہ کس نے کہہ دیا، یہ صرف مسلم کی زباں تک ہے

اسی طرح جناب جوش ملسیانی کے شاگرد کالی داس گپتا رضا (ولادت ۱۹۲۵ء) کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

جام و مینا سے نہیں ہم کو سروکار مگر آپؐ کے نام سے آجائے تو مستی اچھی

پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (ولادت ۱۹۷۶ء) کے ایک شاگرد امیر چند قیسی جالندھری کا یہ اعتراف بھی خوب ہے:

حیات سادہ کے اسباق دے کے عالم کو تکلفات کے پردے اٹھا دیے تو نے

حضور پر نورؐ کے بلند ترین اخلاق اور اعلیٰ و ارفع اقدار سے متاثر ہوکر کرشن بہار نور نے خود کو آپؐ کے قدموں میں ڈال دیا اور اس عمل کو اپنی معراج قرار دیا، اس طرح انہوں نے اپنے تخلص نور کا گویا حق ادا کیا۔ ان کا قطعہ

دیر سے نور چلا اور حرم تک پہنچا سلسلہ میرے گناہوں کا کرم تک پہنچا
تیری معراج محمدؐ تو خدا ہی جانے میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (۱۸۶۶ء-۱۹۵۵ء) تلمیذ شمس العلماء الطاف حسین حالی (متوفی ۱۹۱۵ء) حضور اکرمؐ کے حسن گفتار و بلندیٔ کردار پر اس قدر وارفتہ ہوئے کہ انہوں نے محسوس کیا، ان کے

پاس سب کچھ موجود ہے مگر ایک چیز کی کمی ہے جس کے بغیر زندگی لایعنی سی لگتی ہے، وہ ہے دل کی تاریکی کو دور کرنے کا واحد ذریعہ "نور ایمانی"۔ اسی کی آرزو میں حضرت کیفی نے بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی

یوں روشنی ایمان کی دے دل میں کہ جیسے بطحیٰ سے ہوا جلوہ فگن نورؐ خدا کا(۱)

آپؐ کے مقدس حالات و کمالات کا تہ دل سے اعتراف کرتے ہوئے جناب بابو برج گوپی ناتھ صائب بیکل امرتسری نے کس عمدگی سے اپنے جذبات کا اظہار نظم مسدس میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

اے رسول پاک ، اے پیغمبر عالی وقار
چشم باطن بیں نے دیکھی تجھ میں شانِ کردگار
تیرے دم سے گل نظر آئے رہ عرفاں کے خار
خوبیوں کا ہو تری کیونکر بھلا ہم سے شمار
نور سے تیرے اندھیرے میں درخشانی ہوئی
تیرے آگے آبرو کفار کی پانی ہوئی

اک جہالت کی گھٹا تھی چار سو چھائی ہوئی
ہر طرف خلق خدا پھرتی تھی گھبرائی ہوئی
شاخ دیدار کی بھی بے طرح مرجھائی ہوئی
لہلہا اٹھی تری جب جلوہ آرائی ہوئی
تیرے دم سے ہوگئیں تاریکیاں سب منتشر
پاگئی راحت ترے آنے سے چشم منتظر

کیوں نہ ہم بھی اس جہاں کا پیشوا مانیں تجھے
کیوں نہ راہ حق میں اپنا رہنما مانیں تجھے
دیکھنے دے خدا آنکھیں تو پہچانیں تجھے
حق کی ہے بیکل صدا شمس الضحیٰ مانیں تجھے
گو مسلمانوں کا اک پیغمبر اعظم ہے تو
اپنی آنکھوں میں بھی اک اوتار سے کب کم ہے تو(۲)

بیکل امرتسری کے بند کے آخری شعر پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ہندو حضرات کے یہاں جو ''اوتار'' کا عقیدہ ہے اس کی ترجمانی شاعر نے اپنے شعر

گو مسلمانوں کا اک پیغمبر اعظم ہے تو اپنی آنکھوں میں بھی اک اوتار سے کب کم ہے تو

میں کی ہے۔ ان کے مذہب میں ''اوتار'' کا عقیدہ یہی ہے جتنے مہاپرش اور مقدس ہستیاں ہیں، وہ سب بھگوان اور خدا کے نہ صرف مظاہر ہیں بلکہ ''اوتار'' ہیں۔ یعنی ان بزرگوں میں نعوذ باللہ خدا حلول کیے ہوئے ہے۔ یہاں یہ فرق ملحوظ رہے کہ ''اوتار'' کا اعتقاد اسلام میں صریح کفر و باطل ہے اور مظاہر حق ہونے کا اعتقاد صحیح اور درست ہے۔ ایک مومن کامل رب تعالیٰ کا مظہر جمیل اور اس کی قدرت کا عکس حسین ہوتا ہے، جس کے اشارے قرآن پاک اور حدیث شریف میں پائے جاتے ہیں اور یہ حقیقت اہل علم و عرفان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے، اس مقام پر تفصیل غیر ضروری ہے۔

راقم نے مقالہ کی تمہید میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ غیر مسلم شعراء حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی منور و مبارک شخصیت سے متاثر ہوکر آپؐ کی چاہت و احترام میں نعت گوئی پر از خود آمادہ ہوجاتے ہیں اور آپؐ کی ثناخوانی و مدح سرائی میں رطب اللسان ہونے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس جذبہ و احساس کو عشق و محبت کا نام دینا اور اس شاعری کو عشقیہ شاعری کہنا جیسا کہ ہمارے عام نقادوں کا خیال ہے، غیر حقیقی رویہ بھی ہے اور بعید از قیاس رجحان بھی، اگر واقعتاً حضور اکرمؐ کی ذات اقدس سے ان غیر مسلم شعراء کا عشق سچا اور پکا ہوتو ضرور انہیں حلقہ بگوش اسلام ہونے کی توفیق ملی ہوتی۔ اس بات کا انہیں خوب علم ہے کہ وہ اسلام کے عقیدۂ توحید پر نہیں ہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپؐ کی بھرپور تعریف و توصیف کرنے کے باوجود اصل دین و توحید الٰہی کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں کہلاتا اور اسے دیار رسولؐ کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وہ احساس ہے جس نے شاعر کو درج ذیل شعر کہنے پر مجبور کردیا، ٹھاکر دامودر ذکی محبوب نگری (تلنگانہ) شاگرد ازل لاہوری و حبیب اللہ وفا حیدرآبادی (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۶ء) نے اپنی شدید خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

اتنی سکت کہاں ہے میں آسکوں وہاں تک تو خواب میں تو آجا اک بار اے مدینہ

زیارت مدینہ منورہ کی آرزو میں بابو روشن لعل صاحب نعیم ڈیرہ غازی خاں نے اپنے جذبات و تصورات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے:

مرجائے نہ یہ ہند میں بیمارِ مدینہ للہ بلا لیجیے سرکارِ مدینہ
مدفن ہو تہہِ سایۂ دیوارِ مدینہ حسرت ہے کہ دم نکلے درِ شاہِؐ عرب پر
کافی ہے مجھے گوشۂ گلزارِ مدینہ اے شیخ تجھی کو رہِ فردوس مبارک
تعویذِ لحد ہو در دربارِ مدینہ(۳) مرجائے نعیم الفتِ سرورؐ میں الٰہی

اولین نعت گو غیر مسلم شاعر: دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جس طرح اردو زبان کے اولین شاعر حضرت بندہ نواز گیسو دراز (۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء، ۸۲۵ھ مطابق ۱۴۲۱ء) گلبرگہ کی سرزمین میں آسودہ ہیں اسی طرح اردو کے اولین نعت گو غیر مسلم شاعر جن کا نام نامی ایکناتھ مہاراج ہے، دکن ہی کی خاک سے اٹھے ہیں۔ ایکناتھ جی مہاراشٹر کے متوطن تھے۔ مراٹھی کے قدیم واہم شعراء میں مہاراج کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے مراٹھی کی صنف شاعری ''بھاروڑ'' میں خوب طبع آزمائی کی ہے، ایک سنت ہونے کے اعتبار سے ان کا کلام عوام وخواص میں مشہور ہے۔ ایکناتھ جی کی ولادت حضرت بندہ نواز کے وصال کے ایک صدی بعد (۱۵۳۳۔ ۱۵۹۹ء) ہوئی تھی۔ مشہور محقق وادیب ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب نے ایکناتھ جی کو کھوج نکالا ہے، ان کی نعتیہ شاعری پہلی بار ڈاکٹر نشیط کے توسط سے اہل علم میں روشناس ہوئی ہے۔ ایکناتھ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

خیال کیا، مچھلی والے ولیکن دریا و ڈھونڈے گوند محمدؐ
کھیل کھلانے آیا محمدؐ
دشرتھ، رام رانا ولیکن دیو چھڑاوے بند محمدؐ
کھیل کھلانے آیا محمدؐ
لنکا پتی راون مارا ولیکن راجیہ دیا بھبیشن محمدؐ
کھیل کھلانے آیا محمدؐ (۴)

اردو میں غیر مسلم نعت گو شعراء کی تعداد سینکڑوں میں ہے، جن میں سے بعض منتخب شعراء کو تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے تاکہ بارگاہ رسالت مآبؐ میں خراج احترام ونذرانۂ عقیدت گزارنے والوں کے جذبات واحساسات کی کماحقہ قدر افزائی ہوسکے اور ساتھ ہی ان کے اسلوب ادا اور طرز سخن کا کسی قدر اندازہ بھی لگایا جاسکے، راقم کی گذارش ہے کہ منصب نقد وانتقاد پر فائز حضرات

نعت کی وسعت و وقعت، اس کے تنوع و ترفع اور اس کی رنگارنگی و ہمہ جہتی کا صحیح ادراک کرتے ہوئے نعت گو شعراء کو ان کا مناسب مقام و مرتبہ دینے میں تکلفات و تعصّبات سے کام نہ لیں۔

۱۔ عاشق دہلوی، مہارانہ کلیان سنگھ (۱۷۴۹۔۱۸۲۲ء):

یہ لکھتے ہے نعتِ رسولؐ خدا مغیث الوریٰ خواجۂ دوسرا
محمدؐ ہیں محبوبِ پروردگار محمدؐ ہیں مطلوبِ پروردگار (۵)

۲۔ ساقی سہارن پوری، منشی شنکر لال ولد خوب چند (۱۸۶۰۔۱۸۹۰ء) تلمیذ منشی لال کمند بے صبر (وفات ۱۸۸۵ء) و فیض یافتۂ مرزا غالب و منشی تفتہ:

مرا ہر لفظ نعتِ احمدیؐ سے درّ یکتا ہے لکھا جو دائرہ ہے وہ مہِ کامل کا ہالا ہے
صفاتِ ذات احمدؐ لکھ سکوں کیا میری طاقت ہے خیال اہلِ دانش جب یہاں مکڑی کا جالا ہے
نعت لکھتا ہوں مگر شرم مجھے آتی ہے کیا مری انؐ کے مدح خوانوں میں پیشی ہوگی

ساقی نے کفر و شرک کے خلاف بلا تکلف لکھا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کا کلام نہیں بلکہ خدا ترس مومن کا کلام ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

ہوئی کافور نورِ مصطفیٰؐ سے شرک کی ظلمت سیاہی سے ندامت کی دلِ کفار کالا ہے (۶)

۳۔ ساحر دہلوی پنڈت امرناتھ مون (۱۸۶۳۔۱۹۴۲ء) وظیفہ یاب ڈپٹی کلکٹر:

مرا قلب مطلعِ نور ہے کہ حرم میں جلوۂ یار ہے دل و دیدہ محوِ نظارہ ہیں کہ نہ گرد ہے نہ غبار ہے
بے سایہ نور باعث ایجاد و مغفرت جس کے وجودِ جود سے رحمت نہال ہے
امت کا اپنی شافعِ روز جزا بنا اب پرسشِ جواب نہ روئے سوال ہے (۷)

۴۔ شاد، مہاراجہ کشن پرشاد ولد راجہ ہری کشن پرشاد (۱۸۶۴۔۱۹۴۰ء) وزیر اعظم سلطنت آصفیہ، حیدرآباد، صاحب مجموعہ نعت "ہدیہ شاد" (مطبوعہ ۱۳۲۶ھ)۔ شاد صاحب کے کلام سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ یہ ایک غیر مسلم کا کلام ہے۔ وہ نعت گوئی کی توفیق پر خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہوئے کہتے ہیں:

مشغلہ نعتِ نبیؐ کا ہے مجھے شکرِ خدا بعد مدت کے یہ ہاتھ آیا ہے مقصد مجھ کو

شاد کی وارفتگی اور جذبات کی فراوانی کا عالم دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ رب تعالیٰ اپنے محبوبؐ کی

ثناخوانی کس کس زبان و کس کس قلم سے کروا رہا ہے اور کن کن زاویوں سے رسول اکرمؐ کی مدح سرائی ہو رہی ہے۔ مہاراجہ شاد کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کافر عشق محمدؐ خلق کہتی ہے مجھے سب مسلماں قدر کرتے ہیں مرے زنار کی
کافر ہوں کہ مومن ہوں، خدا جانے میں کیا ہوں پر بندہ ہوں ان کا جو ہیں سلطانِ مدینہؐ
ہم خیالِ رخِ پُرنور میں حیراں ہوں گے یاد آئیں گے جو گیسو تو پریشاں ہوں گے
لے گیا بخت اگر روضۂ اقدس کی طرف جان و دل سے کبھی صدقے کبھی قرباں ہوں گے
ہم کو تو گلشنِ طیبہ میں اڑا کر لے جا ہم ترے باد صبا، بندۂ احساں ہوں گے
جب سے وحدت کا ہوا دل میں خیال تھا جو بیگانہ، یگانہ ہوگیا
کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی رنگ شادؔ اب عاشقانہ ہوگیا(۸)

۵۔کوثری، چودھری دلورام ولد بھورا رام حصاری (۱۸۸۲۔ ۱۹۳۳ء) اردو کے ممتاز نعت گو شاعر ہیں، جنہیں پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نے "حسان الہند" کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔ کوثری نے دولت ایمانی سے محرومی کے باوجود حضور اکرمؐ کی بارگاہ اقدس میں نعتوں کا نذرانہ پیش کیا، آل اطہار و اصحاب کبار کی منقبتیں لکھیں اور اسلامی روایات پر بہترین نظمیں قلم بند کیں۔ زندگی بھر یہی مشغلہ رہا، حیدرآباد، بھوپال، رامپور وغیرہ درباروں میں انہیں نعت خوانی کی دعوت دی جاتی تھی اور ان کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ کوثری نے کیا خوب کہا ہے:

کرے اے ہندو بیاں اس طرز سے تو وصف احمدؐ کا مسلماں مان جائیں لوہا سب تیغِ مہند کا
محمدؐ اور دِلّو رام میں نقطہ نہیں کوئی کہ ہے مداح اور ممدوح میں یہ ربط کس حد کا

دِلّو رام کوثری کو یہ اعتماد ہے کہ دوزخ کی آگ انہیں جلائے گی نہیں، کیونکہ وہ مداح نبیؐ ہیں، جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے:

ہندو سمجھ کے مجھ کو جہنم نے دی صدا میں پاس جب گیا تو نہ مجھ کو جلا سکا
بولا کہ تجھ پہ کیوں مری آتش ہوئی حرام کیا وجہ تجھ پہ شعلہ جو قابو نہ پا سکا
میں نے کہا کہ جائے تعجب نہیں ذرا واقف نہیں تو میرے دلِ حق شناس کا

انہیں یقین ہے کہ رسول اکرمؐ کی معیت حاصل ہوگی، جس کے وسیلے سے خدائے رب العزت

کا ساتھ میسر آئے گا۔ چنانچہ وہ اس طرح رقم طراز ہیں:

کوثری تنہا نہیں ہے مصطفیٰؐ کے ساتھ ہے جو نبیؐ کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے
لے کے دِلّو رام کو حضرت گئے جنت میں جب غُل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے(۹)

۶۔فلک لاہوری، لالہ لال چند، تلمیذ دوارکا پرساد افق لکھنوی (۱۸۷۷۔۱۹۶۷ء):

نغمۂ وحدت حق دہر میں گایا تونے کملیؐ والے یہ عجب گیت سنایا تونے
رب بے مثل کا دنیا میں بٹھا کر سکہ نقش ، اوہام پرستی کا مٹایا تونے
ریت کے ذروں کو بارود کی طاقت بخشی خاکِ ناچیز کو اکسیر بنایا تونے
گنبد و سقفِ فلک، گوش زمیں گونج اٹھے کوسِ توحید عرب میں جب بجایا تونے (۱۰)

۷۔جواں سندیلوی، منی لال، تلمیذ ہنر سندیلوی و آرزو لکھنوی (۱۸۸۹۔۱۹۷۴ء) کے مسدس کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں، جس میں انہوں نے واقعہ معراج کو کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:

آج کیا ہے جو سجاوٹ ہے سرِ چرخِ بریں چاندنی رات بھی دلکش ہے، ستارے بھی حسیں
نور ہی نور ہے ظلمت کا کہیں نام نہیں قابلِ دید ہے گلزارِ جناں کی تزئیں
حکم خالق ہے، فرشتے سبھی ہوشیار رہیں مرے محبوبؐ کی تعظیم کو تیار رہیں (۱۱)

۸۔جوہر بلگرامی، شنکر سہائے ولد بابو سری واستو (۱۸۹۰۔۱۹۷۱ء) منصف و ناظم دیوانی و فوج داری، حیدرآباد دکن:

یوں تو دنیا میں بہت سے ہوئے مولیٰ والے پر تریؐ شان ہی کچھ اور تھی بطحیٰ والے
تو وہ مخلوق کہ خالق تری تخلیق پہ خوش بعد مولیٰ تجھےؐ کیوں مانیں نہ مولیٰ والے
آئے گا سوا نیزے پر جب نیر اعظم ہم ہوں گے تہ دامنِ سلطانِؐ مدینہ (۱۲)

۹۔جذب رائے پوری، پنڈت رگھوندر راؤ، تلمیذ ترکی و شوکت میرٹھی (۱۸۹۴۔۱۹۷۳ء) ایڈوکیٹ:

لکھتا ہوں ثنائے رخِ نیکوئے محمدؐ روکش خورشید فلک روئے محمدؐ
مکے سے مدینہ سے ہی پہنچی سرِ افلاک بوئے گل رخسارہ و گیسوئے محمدؐ
اس جذب دل افگار کو رویا میں کسی شب یا رب تو دکھا دے رخ نیکوئے محمدؐ (۱۳)

۱۰۔سامی جبل پوری، منشی مہادیو پرساد تلمیذ مضطر خیرآبادی (۱۸۹۵۔۱۹۷۱ء) بڑے

پُرگو شاعر گذرے ہیں، سامی نے آقائے نامدارؐ کی مدحت وثنا کرتے ہوئے قربت رسول اکرمؐ کی تمنا میں خود کو وقف کیا ہے اور اپنے گناہوں کی مغفرت بھی طلب کی ہے۔ سامی اپنا مدعی پیش کرتے ہوئے عرض گزار ہیں:

جنت کی سمت رخ نہ کروں آپؐ کے بغیر حضرتؐ کا ہوں گدا تو طبیعت غیور ہے
ممکن ہے مدح کس سے ہو اس ذات پاک کی مدحت طراز جس کا خدائے غفور ہے
کافی ہے یہ نصیحت اغیار کے لیے وہ دور ہے خدا سے، نبیؐ سے جو دور ہے
مقصود عرض حال ہے ورنہ غلام کو دعویٰ کلام کا نہ زباں کا غرور ہے
خادم کا بال بال گنہگار ہے تو ہو مداح ہے حضورؐ کا اتنا ضرور ہے
لاکھوں خطائیں کی ہیں بس اتنی امید پر حضرتؐ بھی ہیں کریم، خدا بھی غفور ہے
محشر میں دیکھ لیں گے جنہیں اشتباہ ہو سامی ہے اور جامِ شرابِ طہور ہے

جناب سامی نے مقطع کے بعد ایک تاریخی شعر رقم کیا ہے، جس میں اس واقعہ کا سن ہے جبکہ جبل پور میں ۶ رشعبان ۱۳۴۵ھ مطابق فروری ۱۹۲۷ء کو بعد مغرب ایک روشن ستارہ ٹوٹا اور وہ صاف طور پر آپؐ کا اسم گرامی ''محمدؐ'' کی شکل اختیار کر گیا، اس نظارہ سے بہت سارے خوش نصیب بہرہ ور ہوئے، اسی کی طرف سامی نے اپنے دو شعر میں اشارہ کیا ہے:

تارے سے نامِ نامئ حضرت عیاں ہوا یہ معجزہ حضور کرامت ظہور ہے
تھی مجھ کو فکرِ سال کہ ہاتف نے دی ندا لوحِ فلک پہ جلوۂ نامِ حضورؐ ہے(۱۴)

۱۱۔حامی بریلوی، بشن نارائن ولد پنڈت دیبی پرشاد صادق بریلوی (ولادت تقریباً ۱۸۹۶ء) صاحب دیوان شاعر تھے، شاعری انہیں ورثہ میں ملی تھی، تاریخ روہیل کھنڈ مع تاریخ بریلی کے مولف مولانا عبدالعزیز خان بریلوی نے جناب حامی کی خوب تعریف کی ہے:

ہو کیوں نہ بشر تابعِ فرمانِ محمدؐ فردوس میں جائیں گے غلامانِ محمدؐ
عاشق تپشِ مہر قیامت سے ڈریں کیوں کافی ہے انہیں سایہ دامانِ محمدؐ
از بسکہ گنہگار ہوں، محشر میں الٰہی چھوٹے نہ مرے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ
بخشیں مجھے توفیق اگر نعت کی حامیؔ بھولوں نہ کبھی عمر بھر احسانِ محمدؐ(۱۵)

۱۲۔ اختر ہوشیار پوری، پنڈت ہری چند تلمیذ حفیظ جالندھری (۱۹۰۰۔۱۹۵۸ء) کو اپنے وسعت مشرب پر فخر ہے اور وہ تصور میں سبز گنبد کی زیارت سے مشرف ہو کر انتہائی خوش ہیں۔

وسعتِ مشرب سے ہیں اک مخزن اسرار ہم کفر ہم ، اسلام ہم ، تسبیح ہم زنّار ہم
سبز گنبد کے اشارے کھینچ لائے ہیں ہمیں لیجیے دربار میں حاضر ہیں اے سرکار ہم
نام پاک احمدِ مرسل سے ہم کو پیار ہے اس لیے لکھتے ہیں اختر نعت میں اشعار ہم (۱۶)

۱۳۔ باغ اکبر آبادی، حکیم بال کشن داس ولد حکیم ہنومان سہائے تلمیذ حضرت سید محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی وفلک حیدر آبادی (۱۹۰۶۔۱۹۵۹ء) بڑے شائستہ وشستہ مذاق کے حامل تھے، حکیم باغ صاحب کی نعتوں میں دلکشی ودل آویزی موجود ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

رہا کرتا ہے اس میں جلوۂ یکتا محمدؐ کا مرا دل ہے ازل سے آئینہ خانہ محمدؐ کا
گلہ غم کا نہیں، غم دینے والے یہ شکایت ہے جو تجھ کو غم ہی دینا تھا، تو غم دیتا محمدؐ کا
اگر تجھ کو محبت ہے جو تیرا عشق صادق ہے تو آنکھیں بند کر کے کھینچ لے نقشہ محمدؐ کا (۱۷)

۱۴۔ دل کشمیری، منوہر لال ولد گوند امل آنند شاگرد اثر لکھنوی و جوش ملسیانی (ولادت ۱۹۱۲ء) مصنف مجموعۂ کلام ''نقد دل'' (مطبوعہ ۱۹۷۳ء) دل اسٹیٹ بینک آف انڈیا جموں کے اعلی عہدے پر فائز ہو کر وظیفہ یاب ہوئے، دل صاحب نے جموں میں ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی، جو اولاً ''بزم سخن'' کے نام سے اور بعد میں ''بزم اردو'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ دل حضور اکرمؐ کے اخلاق کریمانہ کی تعریف و توصیف میں اس طرح رطب اللسان ہیں:

آقا جو محمدؐ ہے عرب اور عجم کا بے مثل نمونہ ہے مروت کا کرم کا
حاصل ہے جنہیں تیرے غلاموں کی غلامی لیتے نہیں وہ نام کبھی قیصر و جم کا
فردوس نظر ہے ترے مسکن کی زیارت روضہ ترا دنیا میں بدل باغ ارم کا
کیا دل سے یہاں ہو تیرے اخلاق کی توصیف عالم ہوا مداح تیرے لطف و کرم کا (۱۸)

۱۵۔ مکھن حیدر آبادی، راجہ مکھن لال (وفات مابعد ۱۸۴۴ء) صاحب دیوان شاعر تھے، جن کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ ''گورنمنٹ مینو اسکرپٹ لائبریری'' کی زینت ہے۔ انہوں نے نعتیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہی ہیں۔ ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں عمر خیام کی رباعیات کا منظوم

ترجمہ صنف رباعی ہی میں کیا، مکھن لال کو حضور اکرمؐ سے بے پایاں عقیدت تھی، اس لیے آپؐ کی شفاعت کی آرزو میں اشعار کہے ہیں:

بسکہ تونے کیا ہے جرم عظیم جا پکڑ دامنِ شفیعِ رحیم
عرض کر بندگی بصد تعظیم بول اپنا پکار حال سقیم
کر مدد مجھ پہ یا رسول اللہ تا نہ دیکھو عذاب نارِ جحیم(۱۹)

۱۶۔رونق دہلوی، منشی پیارے لال تلمیذ راسخ دہلوی (وفات ۱۹۳۴ء) بلند پایہ شاعر تھے، زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی، نعتوں میں طباعی کا مظاہرہ خوب کیا ہے:

کلمہ صلِّ علیٰ وردِ زباں رکھتا ہوں خواب میں دیکھ لیا ہے قدِ بالا تیرا
عفو ہو جائیں گی محشر میں خطائیں ساری داورِ حشر کو دوں گا میں حوالا تیرا
آہ کر ہجر محمدؐ میں سنبھل کر اے دل عرش کے پار نکل جائے گا نالا تیرا(۲۰)

۱۷۔منظر، ڈاکٹر کے، مدنا منظر تماپوری ابن پر بھوراؤ (۱۹۲۰۔۱۹۸۲ء) سول سرجن ہونے کے باوجود فطرتاً صوفی منش تھے۔اردو، ہندی، کنڑی اور انگریزی میں شعر کہتے تھے۔اردو شاعری میں نعتوں کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا۔حضور اکرمؐ کی شان یکتائی میں شعر کہتے ہوئے ان پر محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔اسی لیے ڈاکٹر صاحب کے اشعار میں تاثیر کا عنصر نمایاں ہے:

تمہارے چہرۂ زیبا کو ہم قرآں سمجھتے ہیں تمہاری ہر ادا کو معنیٔ فرقاں سمجھتے ہیں
تمہارے عشق میں جینا، تمہارے عشق میں مرنا اسے ہم دین کہتے ہیں، اسے ایماں سمجھتے ہیں
الٰہی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آئے کروں سجدہ جہاں نقشِ کفِ پا ہو محمدؐ کا(۲۱)

حضور پُرنورؐ کی بارگاہ اقدس میں خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور آج بھی بہت سارے غیر مسلم شعراء اس پاک شغل میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اسے اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ان شعراء میں جناب چندر بھان خیال (ولادت ۱۹۴۶ء) اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ انہوں نے ''لولاک'' (مطبوعہ ۲۰۰۲ء) کے نام سے منظوم سیرت طیبہ تحریر کی، خیال صاحب اولین غیر مسلم منظوم سیرت نگار ہیں۔''لولاک'' کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اوج بخش و بخت آور، نام تھا محمدؐ کا آسروں نے ڈھونڈا تھا آسرا محمدؐ کا

رفعتوں کی خاموشی ، وسعتوں کی تاریکی　　ختم ہوگئی جیسے مصطفیؐ کی آمد پر

برق سی گری اک دم واہموں کے برگد پر　　ہل اٹھا نظام شر خیر کی اس آمد پر

جذبہ صداقت اب زندگی کے صحرا میں　　چہچہاتی چڑیوں سا چہچہاتے پھرتا تھا

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور حضور اکرمؐ کی شان اقدس کا کرشمہ ہے کہ آج کے لسانی ومذہبی تعصب کے زمانے میں بھی اردو کے غیر مسلم شعراء ہی نہیں بلکہ ہندی کے غیر مسلم شعراء بھی نعتیں کہنے کو اپنی خوش قسمتی تصور کررہے ہیں، جس کی ایک مثال جواں سال شاعر گیان چندمرمکیا بنگلور (ولادت ۱۹۵۹ء) کی ہے، جن کا کلام ہندی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ دیکھیے کہ مرمکیا کے یہ شعر کس قدر سادگی وشائستگی کا نمونہ ہیں:

کرنے دو مجھے صاحب ایمان کو سلام　　حضرت رسولؐ پاکِ مہربان کو سلام

جب آپؐ نے انسانیت کی راہ دکھائی　　انسان بھی کرنے لگے انسان کو سلام

راقم کو اس مقالے کی تیاری میں محترم ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا تعاون حاصل رہا، جس کے لیے وہ ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہے۔

مآخذ

(۱) مسلم سلیم، ہندو گو شعراء، کھوج خبر نیوز ڈاٹ کام Muslim salum.blogspot.in۔ (۲) ''مسلمان لاہور'' کا غیر مسلم نعت گو شعراء نمبر، ج ۷، شمارہ ۸، ص ۳۱، ۳۲۔ (۳) ایضاً ص ۳۶۔ (۴) ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے، بہار آفسیٹ اکولہ (مہاراشٹر) ۱۹۹۵ء، ص ۵۴۔ (۵) علیم صبا نویدی، نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے، مطبوعہ تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چینائی-۲، ۲۰۰۲ء، ص ۳۱۔ (۶) ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق، اردو میں نعتیہ شاعری، مطبوعہ کراچی (پاکستان)، ۱۹۷۶ء، ص ۲۷۵-۲۷۶۔ (۷) ''مسلمان لاہور'' ص ۴۲، ۴۷۔ (۸) ''اردو میں نعتیہ شاعری'' ص ۴۹۲-۴۹۳۔ (۹) ''مسلمان لاہور'' ص ۲۵-۲۶۔ (۱۰) ''اردو میں نعتیہ شاعری'' ص ۵۳۴ تا ۵۳۵۔ (۱۱) ''نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے'' ص ۴۹۔ (۱۲) نور احمد میرٹھی، ''بہر زماں''، ادارۂ فکر نو، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۲۸۔ (۱۳) ''مسلمان لاہور'' ص ۴۷-۴۸۔ (۱۴) ایضاً ص ۳۸-۳۹۔ (۱۵) ''بہر زماں'' ص ۲۴۳۔ (۱۶) ''مسلمان لاہور'' ص ۳۴-۳۵۔ (۱۷) ''بہر زماں'' ص ۱۶۴۔ (۱۸) ایضاً ص ۲۶۴۔ (۱۹) ''اردو میں نعتیہ شاعری'' ص ۲۴۳، ۲۴۴۔ (۲۰) ''مسلمان لاہور'' ص ۳۳۔ (۲۱) ڈاکٹر مدنا منظر ''منظر بہ منظر''، انجمن ترقی اردو ہند (کرناٹک)، بنگلور، مطبوعہ ۱۹۸۲ء، ص ۱۷، ۲۵۔ (۲۲) چندر بھان خیال، ''لولاک''، فرید بک ڈپو دہلی، مطبوعہ ۲۰۰۲ء، ص ۴۴۔

تیرہویں صدی ہجری کے ایک گمنام منظوم سیرت نگار حاجی محمود مہاجر حسرت مدراسی

ڈاکٹر راہیؔ فدائی

دکنی ادب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ نظم و نثر کی ابتدائی تحریروں اور ان کی مختلف اصناف کا ماخذ و مصدر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے حضرت بندہ نوازؒ (متوفی ۸۲۵ھ) کے دکنی رسائل (۱)، نظامیؔ بیدری کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' (تصنیف شدہ مابین ۸۲۵ تا ۸۳۹ھ) (۲) اور محمد قلی قطب شاہ کا دیوان (۳) کا مطالعہ کافی ہے۔ ان اولیات میں منظوم سیرت نگاری بھی ہے جس میں میلاد نامہ، معراج نامہ، نور نامہ، شمائل نامہ، معجزات النبیؐ، وفات نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں در حقیقت نعتیہ شاعری کے ضمن میں رکھا جانا چاہیے مگر جہاں تک منظوم سیرت کا تعلق ہے بقول ماہر دکنیات ڈاکٹر محمد علی اثرؔ اس کی شروعات قدرتیؔ بیجاپوری کی تصنیف ''قصص الانبیاء'' (قبل ۱۰۹۰ھ) سے ہوتی ہے (۴)۔ بعد ازاں غوثیؔ آرکاٹی (متوفی ۱۲۲۵ھ) کی مثنوی ''ریاض مسعود'' (تصنیف شدہ ۱۱۹۱ھ) کو اہمیت خاص حاصل ہے (۵)۔ ان دونوں مثنویوں میں اول الذکر دس ہزار اشعار اور ثانی الذکر بارہ ہزار پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے لیکن ان مثنویوں کا موضوع صرف حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ نہیں ہے بلکہ ان میں دیگر انبیاء و رسل کے قصے اور واقعے بھی شامل کیے گئے ہیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے۔ ''ریاض مسعود'' کے قلمی نسخے سالار جنگ میوزیم لائبریری، حیدرآباد اور اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری حیدرآباد کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ البتہ اردو میں مستقل و مفصل سیرت نبویؐ منظوم کرنے کی سعادت اردو کے اولین نقاد علامہ باقر آگاہ ویلوریؒ (متوفی ۱۲۲۰ھ) کے حصے میں آئی، جنہوں نے ''ہشت بہشت'' کے نام سے منظوم سیرت تحریر کی جس کے جملہ اشعار نو ہزار ہیں، بقول مولف ''خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار'':

نمبر ۲۱۔ تیسرا کراس، عثمان اسٹریٹ، خوش حال نگر، کے.جی.ہلی، بنگلور ۴۵۔

''یہ (کتاب ہشت بہشت) دراصل آٹھ مختلف و مکمل رسالوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر ایک کے لیے مستقل حمد، نعت، منقبت غوث اعظم اور مدح مرشد کے علاوہ الگ الگ اوزان کا بھی التزام کیا گیا ہے، یہ کتاب ہشت بہشت درحقیقت امیر الامراء نواب حافظ محمد منور خاں امیر ابن والی کرناٹک نواب محمد علی والا جاہ (متوفی ۱۲۱۰ھ) کی خواہش پر لکھی گئی.....ان آٹھ رسالوں میں سے ابتدائی چھ رسائل ۱۱۸۴ھ سے ۱۱۸۶ھ تک مکمل ہوگئے تھے، بعد ازاں مختلف مصروفیات اور دیگر علمی مشاغل کی بنا پر طویل وقفہ کے بعد ۱۲۰۶ھ میں آخر کے دونوں رسائل تصنیف کیے گئے''۔(۶)

علامہ باقر آگاہ کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کے بعد دکنی میں تخلیق پانے والی ضخیم منظوم سیرت طیبہ حاجی محمود صاحب مہاجر المتخلص بہ حسرتؔ کی ''ریاض سیر'' ہے جو دراصل حضرت غلام محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری (ثانی) ذوقیؔ ویلوری (متوفی ۱۱۹۴ھ) کی منظوم و مبسوط سیرت پاک ''معجز مصطفی'' (فارسی) کا آزادانہ ترجمہ ہے۔ ذوقیؔ اردو کے مایہ ناز صاحب دیوان صوفی شاعر حضرت سید شاہ ابوالحسن قربیؔ ویلوری (متوفی ۱۱۸۲ھ) کے اکلوتے فرزند تھے، ذوقی کی ولادت ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۲۷ء میں ہوئی۔ ''درخشاں'' سے سال ولادت برآمد ہوتا ہے۔ اپنے والد ماجد سے کتب متداولہ فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی، معرفت و سلوک کے اعلیٰ مراتب بھی والد بزرگوار کے زیر سرپرستی کسب کیے اور ۹۹ سلاسل میں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، شاہ قربیؔ کے وصال کے بعد منصب رشد و ہدایت پر فائز رہ کر تصنیف و تالیف میں منہمک ہوگئے۔ شاعری کا ذوق وراثت میں ملا تھا، نظم و نثر میں ان کی کتابوں کی تعداد ۶۰ سے بھی زیادہ ہے۔ بقول مولف ''علی آثار'':

''حضرت ذوقیؔ کی نثری تصنیفات علم تفسیر، علم حدیث، علم عقائد و فقہ، علم منطق، علم معانی، بیان بدیع، لغات، قواعد نحو و صرف، علم عروض پر محیط ہیں، ان کی منظوم تصنیفات میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، ترجیع بند، نظم بے نقط وغیرہ اصناف سخن میں اشعار کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے''۔(۷)

حضرت ایک پُرگو اور فطری شاعر تھے، ان کی قادر الکلامی پر ان کے معاصر علامہ آگاہ حیرت زدہ رہ جاتے تھے، علامہ آگاہ کی گواہی ہے کہ حضرت ذوقیؔ نے ایک نشست میں سات سو شعر

موزوں کیے۔(۸)

حضرت ذوقی کی تین مثنویاں تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہیں، ایک ''معجز مصطفی'' جو صرف ڈیڑھ ماہ میں مکمل ہوئی، دوسری ''نجیب نامہ'' نواب کرناٹک انورالدین خاں کے رفیق و مصاحب محمد نجیب خاں بہادر کے حالات و واقعۂ شہادت (۱۱۶۲ھ) کو شامل ہے اور تیسری ''در بے بہا'' نواب محمد علی والا جاہ کے فتح تنجاور کی تاریخ ہے۔ ''معجز مصطفی'' تقریباً ساڑھے سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے جسے انہوں نے ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء میں تحریر کیا تھا جب کہ ان کی عمر صرف تیس سال تھی، یہ معرکہ آرا مثنوی ۱۱۸۱ھ میں مدراس سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر بہت مقبول ہوئی (۹)۔ یہی وہ بلند پایہ مثنوی ہے جس کا ترجمہ حاجی محمود حسرتؔ نے مصنف کے انتقال کے ۵۳ سال بعد ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء میں دکنی زبان میں ''ریاض سیر'' کے نام سے کیا تھا، اس مثنوی کے دو نسخے تا حال دستیاب ہیں، ان میں سے ایک سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد کا مخزونہ ہے اور دوسرا کتب خانۂ محمدی، دیوان صاحب باغ، چنائی (ٹمل ناڈو) کی امانت ہے (۱۰)۔ علاوہ ازیں ''ریاض سیر'' اپنی تخلیق کے ۲۳ سال بعد ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں مطبع شرفیہ (مدراس) سے شائع ہوئی تھی مگر آج اس کے مطبوعہ نسخے بھی نایاب ہیں، البتہ ایک بوسیدہ کرم خوردہ نسخہ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور (ٹمل ناڈو) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، یہی مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کا ماخذ و مرجع ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، وہ یہ کہ حضرت حسرتؔ کی مثنوی کا نام ''ریاض سیر'' ہے نہ کہ ''ریاض السیر'' جیسا کہ افضل العلماء محمد یوسف کوکنی نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے (۱۱)۔ یہ اس لیے کہ مثنوی کے اختتام کے موقع پر خود حسرتؔ نے رقم کیا ہے کہ اس کا نام ''ریاض سیر'' ہے اور سال تصنیف ''زہے معجز انبیاء'' سے استخراج شدہ سن ۱۲۴۷ھ ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بفضل خدا خالق ذوالمنن ہوا جب کہ آراستہ یہ چمن
وہیں بلبل طبع تجویز کر رکھا نام اس کا ''ریاض سیر''
پھر آیا جو تاریخ کا کچھ خیال رکھے تا کوئی خوب سے حسب حال
تامل کے دریا میں پس غوطہ مار نکالے عجب گوہر آبدار
یہی وہ ہے تاریخ بس جاں فزا ''زہے معجز خاتم انبیاء''(۱۲)

حضرت حسرتؔ کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، افسوس کہ سات ہزار سے زائد اشعار کے شاعر کا ذکر کسی بھی معروف تذکرے میں موجود نہیں۔ البتہ "ریاض سیر" کی اندرونی شہادتوں کے پیش نظر بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت حسرتؔ کا اسم گرامی حاجی محمود مہاجر ہے، اس نام کی صراحت مطبوعہ نسخے کے سرورق پر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال مرحوم (حیدرآباد) کے بیان کے مطابق حسرتؔ کا نام حاجی غلام محمود مہاجر تھا اور وہ مدراس کے متوطن تھے (۱۳)، حضرت حسرتؔ گوشہ نشیں، مرنجاں مرنج اور صوفی شاعر تھے، پیکر علم و عرفان ہونے کے باوجود انتہائی منکسر المزاج اور خدا ترس بزرگ تھے، "ریاض سیر" اپنی عمر کے آخری دور میں تخلیق کی تھی، اس وقت ان کے پیرو مرشد حضرت سید شاہ ابوالحسن (ثانی) قادری محویؔ ویلوری (متوفی ۱۲۴۳ھ) ابن حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوقیؔ کا انتقال چار سال قبل ہو چکا تھا مگر ان کے شفیق و کرم فرما استاذ حضرت علامہ الحاج سید شاہ محی الدین قادری حیات تھے جن سے انہوں نے عربی و فارسی کے کتب متداولہ پڑھی تھیں۔ اس مقام پر ایک نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ حسرتؔ کے شیخ حضرت محویؔ اپنے اجداد کی طرح صاحب تصنیف بزرگ تھے، ان کا یہ وصف خاص ان کے مریدوں اور خلفاء کو بھی عطا ہوا ہے، چنانچہ حضرت محویؔ کے نامور خلیفہ شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری (متوفی ۱۳۳۷ھ) بانی ام المدارس جامعہ باقیات صالحات، ویلور کے والد ماجد حضرت علامہ شاہ حافظ عبدالقادر آتوری (متوفی ۱۲۵۱ھ) نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (متوفی ۱۲۳۹ھ) کی گراں قدر فارسی تفسیر کا عربی ترجمہ "التعریب القادری للتفسیر العزیزی" کے عنوان سے ۱۲۴۹ھ میں کیا، حضرت محویؔ کے شاگرد و مرید جناب حسرتؔ نے "معجز مصطفیٰ" کا ترجمہ ۱۲۴۷ھ میں فارسی سے اردو میں کیا، اس طرح حضرت محوی کے فرزند و خلیفہ حضرت سید شاہ عبداللطیف (ثالث) قادری نقوی معروف بہ "قطب ویلور" (متوفی ۱۸۲۹ھ) نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی معرکہ آرا تصنیف "تحفۂ اثنا عشریہ" کا ترجمہ ۱۲۸۸ھ میں فارسی سے عربی میں کیا جب کہ وہ اپنے دوسرے حج کے دوران مکہ مکرمہ میں فروکش تھے، حضرت محویؔ کے ایک اور شاگرد و مرید میر محمد حیات قادری میسوری ابن میر محمد یوسف (متوفی ۱۲۸۱ھ) مصنف "مصباح الحیات" نے ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں مثنوی "مفتاح الایمان" تحریر کی جس کا موضوع عقائد و ایمانیات ہے۔ یہ فہرست مزید طویل ہو سکتی ہے مگر یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔

حضرت حسرتؔ شاہ محویؔ کے شاگرد و مرید تھے نہ کہ شاہ ذوقیؔ کے جیسا کہ محترم یوسف کوکن عمری نے اپنی انگریزی تصنیف میں کہا (۱۴)۔ اس طرح ڈاکٹر افضل الدین اقبال کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ حسرتؔ حضرت قطب ویلور سید شاہ عبداللطیف قادری کے مرید تھے اور حضرت محویؔ سے بھی فیض پایا تھا (۱۵)، کیونکہ حسرتؔ نے منقبت غوث اعظمؒ کے آخر میں لکھا ہے کہ ان کے تصرف کی وجہ سے مجھے بصیرت حاصل ہوئی، کورچشم میں نور پیدا ہوا اور مجھے شاہ ابوالحسن کا در مل گیا، اس کے بعد حسرتؔ نے اپنے شیخ کی مدح سرائی کی ہے جس میں یہ اعتراف کیا کہ شاہ صاحب نے ان کے دل کو علم و عرفان سے بھر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں حسرتؔ نے شاہ عبداللطیف معروف بہ قطب ویلور سے بھی فیض پایا تھا، چنانچہ حضرت حسرتؔ کا ارشاد ہے

مرے دل کو قید غم سے چھڑا خوشی کی مجھے راہ دکھلا دیا
منور ہوئے تب مرے چشم کور دل تار نے میرے پایا ہے نور
ملا دوست سے، چھوڑ دشمن کو میں مرا سر ہے اور اس کا در بعد ازیں
مجھے عالم مکر و فن سے چھڑا سہہ بوالحسن پاس پہنچا دیا

مدح شیخ المشائخ خاص درگاہ صمدی سید ابوالحسن قادری...... ہے

زہے ابوالحسن بحر جود و نوال عطا میں حسن، بوالحسن در خصال
تمنا تھی اس کی صلاح انام حدیث حسن اس کے لب پہ مدام

سکھایا ہمیں علم عرفان کا بہت راز پنہاں دلوں میں بھرا

نہ دیکھا زمانے میں میں نے کسے جو تجھ سا شریعت کو محکم کرے
تمامی خلائق سے ہم لے کنار ترے آستاں پر ہیں امیدوار
گدایان دل خستہ پر لطف کر عطا کرکے ان کی خطا سے گذر
کرم سے نجھا حسرتؔ ریش پر کرامت کرائے شاہ، درویش پر (۱۶)

حضرت حسرتؔ متأہل تھے۔ خاندان بڑا تھا جس میں فرزند، برادران اور خویش و اقارب سبھی

تھے، انہوں نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے بھی اپنے شیخ اور شیخ زادے حضرت قطب ویلور کی تعریف وتوصیف کے بعد ان کے طفیل میں دعا کی، اشعار ملاحظہ ہوں ۔

طفیل ان بزرگوں کے سب اے خدا　　　مرے دوستاں جو ہیں اور اقربا
سبھی فرزند و خویش و برادر تمام　　　پنہ میں رکھ اپنے تو ان کو مدام
رہ راست پر ان کو رکھ سر بہ سر　　　روا ان کے حاجات دارین کر
بتوفیق خیر ان کے تیں شاد رکھ　　　دے علم و ہنر اور آباد رکھ
مری عرض ساری یہ ہووے قبول　　　بحق شہ دیں محمدؐ رسول(۱۷)

حضرت حسرتؔ نے مثنوی ''ریاض سیر'' نظم کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے رقم کیا ہے کہ انہیں اپنی آخری عمر میں یہ خیال دامن گیر ہوا کہ انہوں نے اب تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے حیات جاوداں حاصل ہو، لوگ انہیں یاد کرکے ان کی وفات کے بعد ایصال ثواب کریں جیسا کہ اہل اللہ اور اصحاب خیر کے ساتھ ہوتا آرہا ہے، پھر اپنی کم مائیگی اور زبوں حالی پر نظر پڑی تو دل نے کہا کہ ثواب جاری کے لیے انہیں دادا پیر حضرت ذوقیؔ ابن شاہ قربی کی بے نظیر مثنوی ''معجز مصطفی'' کا دکنی زبان میں ایسا ترجمہ کرنا چاہیے جس سے عوام الناس کو فائدہ پہنچے اور پڑھ کر دعا دیں۔ اس ضمن میں کہے گئے اشعار یہ ہیں:

''مرے جی میں یک روز آئی یہ بات　　　کہ کچھ زندگی کو نہیں ہے ثبات
نہیں عمر دنیا کا کچھ اعتبار　　　ہے اصل بنا اس کا ناپائیدار

موا نیں ہے وہ چھوڑ جس نے گیا　　　پل و مسجد و چاہ و مہماں سرا
میں آیا جو دنیا میں ہوکر غریب　　　یہ تینوں بھی کاموں سے ہوں بے نصیب
نہ حاصل ہوا مجھ کو عرفان حق　　　نہ طاعت سے پایا میں رضوان حق
جہاں میں نہ کچھ خیر جاری کیا　　　یہ عمر عزیز اپنی چپ کھودیا
دریغا کہ حق پاس میرے تئیں　　　سبب سرخ روئی کا کچھ بھی نہیں
مری عمر ناحق گئی سب گذر　　　ملا نیں مجھے زندگی کا ثمر

گئے لوگ جیسے جہاں سے گذر اسی طرح میں بھی کروں گا سفر
تو اس وقت جز حسرت و درد و آہ نہیں ہے مرے ساتھ کچھ زاد راہ
کسی کو نہ مجھ سے ہوا فائدہ مرے بعد تا وہ پڑھے فاتحہ
کرے گا نہیں یاد مجھ کو کوئی نہ لیوے گا کوئی مرا نام بھی

گذرنے سے یہ بات جی میں مرے نہایت ہوئی بے قراری مجھے
ہوئی درد و غم کی جو آتش بلند تڑپنے لگا دل میرا جیوں سپند
نہ تھا دل یہ گویا کہ سیماب تھا نبٹ مرغ بسمل سا بے تاب تھا
میں دیکھا تپش سے جو فرصت نہیں ہوئی زندگی تلخ میرے تئیں
اس احوال میں مجھ پہ اے ہوشیار یکایک ہوا فضل پرور دگار
کہ یکبار خاطر میں یہ آگیا کوئی ایسی تصنیف کیجیے بھلا
کہ ہو فائدہ اس سے لوگوں کے تیں کہ یہ بھی کم از خیر جاری نہیں

بملک سخن خسروِ نامور تخلص ہے ذوقیؔ جسے مشتہر
متانت میں جیسے نظامیؔ شہیر حلاوت میں سعدیؔ صفت بے نظیر
فصاحت میں سحبانؔ کا بے شک امام بلاغت میں عرفیؔ یک اس کا غلام
نظائر میں صائبؔ جو تھا بے نظیر تھا نازک خیالی کا اس کے اسیر
لکھا اس نے ہے پرشرف یک کتاب کہ بحرِ سیر میں ہے درّ خوش آب
ہے نظم اس کا اعجاز سے پر تمام بھی ہے ''معجز مصطفی'' اس کا نام
تو ہندی میں کر ترجمہ اس کے تیں بشرطیکہ افہام سے ہو قریں
نہیں فارسی سے جو کوئی آشنا کرے گا ترے حق میں پڑھ کر دعا
جو حاصل کریں فائدہ سب عوام ثواب اس کا پہنچے گا تجھ کو مدام
رہے گا جہاں بیچ اے دل فگار یہی خیر جاری ترا یادگار

جو یہ مشورت دل نے مجھ کو دیا تو میں مستعد ترجمہ پر ہوا
وہیں ہاتھ میں لے کے میں نے قلم لگا ترجمہ کرنے اس کا رقم (۱۸)

حضرت حسرتؔ نے حضرت ذوقیؔ کی تحریر کردہ حمد، مناجات، نعت اور منقبت غوث اعظم کو اپنی جانب سے لکھا ہے اور کہا کہ اس کو "ریاض سیر" کا دیباچہ سمجھا جائے۔ اس تعلق سے لکھے گئے ابیات درج ذیل ہیں۔

مصنف کے حمد و مناجات کو بھی نعت و مناقب کو اے نیک خو
کیا ترجمہ اپنی جانب سے میں وہی اس کا دیباچہ ہے دل نشیں

پھر وہ کہتے ہیں کہ ترجمہ کے دوران بڑی دقت پیش آئی اور میں نے بڑی محنت اٹھائی اور بعض مقامات پر اصل پر اضافے بھی کیے تاکہ نظم کی زیب و زینت اور قارئین میں دلچسپی و دلکشی باقی رہے۔ لوگ اس سے خوب استفادہ کریں، اس مفہوم کے چند شعر پیش ہیں۔

عزیزو! لکھا ہوں جو میں یہ کتاب اٹھایا ہوں محنت بہت بے حساب
میں ابیات کو اصول کے بھی کہیں لکھا ہوں بلا ترجمہ اے .....
کہ تا اس سے اس نظم کو ہووے زیب ہو یہ نامہ ہر ایک کا دل فریب

سبب تالیف کے آخر میں انہوں نے ناظرین سے درخواست کی کہ اگر اس میں کہیں خطا و خلل دیکھیں تو اصلاح کر دیں اور عیب چینی سے پرہیز کریں۔

جو ہیں ناظراں اس کے، ان کے حضور یہی ہے مری التجا بالضرور
خطا یا خلل گر کہیں اس میں ہو کرم کر یہ عاصی پہ اصلاح دو
وگر نہ رہ لطف سے بالضرور رکھو عیب چینی سے خاطر کو دور (۱۹)

"ریاض سیر" چار سو چھتیس صفحات پر محیط ہے جس میں حمد و مناجات اور نعت و منقبت پر مشتمل دیباچہ، نصیحتِ پدر (حضرت ذوقی) برائے پسر (حضرت محوی) اور سبب تالیف کے علاوہ "معجز مصطفیٰ" کی طرح انیس مقالہ جات، تتمہ اور حسرت کی طرف سے رقم کردہ خاتمہ درج ہے۔ آخر میں ترقیم کے طور پر کاتب کا نام حاجی سید عبدالقادر قادری اور تاریخ کتاب ۱۶؍ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ لکھا گیا ہے۔

اس گراں قدر مثنوی کے نظم نگار حضرت حاجی (غلام) محمود مہاجر حسرتؔ کے ہم نام

خان بہادر مولوی غلام محمود مہاجر ابن احمد حسین مہاجر ہیں جو کرناٹک سرکار میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے، موصوف کے جد امجد حامد سعید خاں بہادر سلطان ٹیپو شہید کے دربار میں بارسوخ فرد تسلیم کیے جاتے تھے، مولوی غلام محمود مہاجر دینی وعصری علوم وعصری فنون کے مجمع البحرین تھے، برٹش انڈیا نے آپ کو ۱۸۹۷ء میں خان اور ۱۹۰۱ء میں خان بہادر کے لقب سے نوازا تھا (۲۰)۔ خان بہادر غلام محمود مہاجر کے تعلقات حضرت مولانا سید شاہ رکن الدین قادری ویلوری (متوفی ۱۳۲۵ھ) ابن حضرت قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) سجادہ نشین آستانۂ اقطاب ویلور و بانیٔ دارالعلوم لطیفیہ سے مستحکم تھے۔ چنانچہ غلام محمود نے مذکورہ دارالعلوم سے جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ بتاریخ ۹ر شعبان ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنے خطاب مستطاب سے طلبۃ العلوم کو مستفیض بھی فرمایا۔ (روداد جلسۂ دستار بندی مطبوعہ ۱۳۱۱ھ)

حضرت حسرتؔ کا نسبی تعلق قوم نوائط سے ہے، ''مہاجر'' ان کا خاندانی لقب ہے جو نسلاً بعد نسلٍ نام کا لاحقہ بن کر چلا آرہا ہے، بقول مولف ''تاریخ النوائط'':

> ''یہ لقب (مہاجر) اس خاص گروہ کا ہے جو حوالی مدینۂ مطہرہ میں سکونت پذیر تھا حجاج بن یوسف کے مظالم سے جب تمام افراد قوم کا اجتماع مدینۂ مطہرہ میں ہوا تو مہاجر سے موسوم ہوئے جب ساری قوم بہ ہیئت مجموعی مدینۂ مطہرہ سے ہجرت کر کے بغداد آئی تو کل افراد قوم مہاجرین کہلائے، اس لقب کے اکثر افراد حیدرآباد میں موجود ہیں''۔ (۲۱)

حضرت حسرتؔ کا انتقال ''ریاض سیر'' کی طباعت ۱۲۷۰ھ سے قبل ہو چکا تھا، اس لیے کتاب کے سرورق پر اسم گرامی کے ساتھ ''غریق بحر رحمت'' لکھا ہوا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جنوب کے کثیر التصانیف بزرگ شاہ عبدالحی قادری احقرؔ بنگلوری (ولادت ۱۲۳۵ھ/ وفات ۱۳۰۱ھ) خلیفہ قطب ویلور قدس سرہ جو حضرت حسرتؔ کے بعد خانقاہ اقطاب ویلور کے خوشہ چیں ہوئے تھے، انہوں نے ''ریاض سیر'' کے بعد ''جنان السیر'' کے نام سے ۱۲۷۵ھ میں مفصل منظوم سیرت پاک تحریر کی، یہ عین ممکن ہے کہ حضرت کو ''ریاض سیر'' سے ''جنان السیر'' لکھنے کی تحریک ملی ہو۔ ''جنان السیر'' کا تعارف کراتے ہوئے مولف ''خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار'' رقم طراز ہیں:

''حضرت احقرؔ نے سیر طیبہ کو پہلی بار مبسوط طور پر واقعات کے جزئیات کے ساتھ اردو زبان میں نظم کیا اور اس کتاب کا نام ''جنان السیر فی احوال سید البشر'' رکھا۔ یہ مثنوی تقریباً بیس (۲۰) ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے دو دفتر ہیں اور ہر دفتر چار چمن (باب) سے سجایا گیا ہے، حضرت احقرؔ نے سات چمن خود ہی لکھے مگر آٹھواں چمن (معجزات محمدیؐ) اپنے لائق و فائق فرزند عبدالقادر علی صوفی سے لکھوایا''۔(۲۲)

حضرت حسرتؔ کے معاصرین میں علامہ باقر آگاہ ویلوری (متوفی ۱۲۲۰ھ)، علامہ عبدالعلی بحر العلوم لکھنوی ثم مدراسی (۱۲۲۵ھ)، علامہ حافظ عبدالقادر آتوری (۱۲۵۱ھ)، علامہ قاضی ارتضیٰ علی خاں صفوی مدراسی (متوفی ۱۲۷۰ھ)، علامہ سراج العلماء سعید اسلمی مدراسی (متوفی ۱۲۷۲ھ)، حضرت میر محمد حیات قادری میسوری (۱۲۸۱ھ)، حضرت سید شاہ عبداللطیف معروف بہ قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ)، حضرت حکیم زین العابدین مائل ویلوری (متوفی ۱۲۹۷ھ) وغیرہ علماء و صلحاء کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مگر افسوس کہ ان بزرگوں سے حسرتؔ کے روابط و تعلقات کا علم نہیں ہے حالانکہ مذکورہ اہل علم و فضل سبھی علاقۂ مدراس سے تعلق رکھتے ہیں۔

کتاب اور صاحب کتاب کے تعارف کے بعد مثنوی ''ریاض سیر'' کے مختلف حصوں سے نمونتاً اشعار پیش کیے جارہے ہیں تاکہ شاعر کی فنی صلاحیتوں اور فکری بلندیوں کا اندازہ ہو سکے اور تخلیق کار کی قادرالکلامی اور قوت متخیلہ کی کارفرمائی کا علم ہو جائے۔

حمد

خدایا سزاوار شاہی تجھے — تو صاحب ہے سب خادماں ہیں ترے
دل و جاں ترے بندہ فرماں مدام — دل و جاں سے ہیں ہم بھی تیرے تمام
کیا ہے جو تو تن کو محکوم جاں — رکھا ہے بہت اس میں حکمت نہاں
کھڑا کر کے خوبی یہ ..... سپہر — تو روشن کیا چہرۂ ماہ و مہر
سنوارا بلندی سے افلاک کو — تو پستی سے زینت دیا خاک کو
ترے حکم میں سب مَلک اور مُلک — ہے تجھ بحر احساں سے چرخ ایک فلک
منور ہے تجھ میں سے ماہ تمام — لڑی کو ہے تاروں کے تجھ سے نظام (۲۳)

نعت سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حضرت حسرت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

امام رسل، رہبر انس و جاں امان زمین و امین زماں
محمدؐ نبی شاہ ابرار ہے کلید در گنج اسرار ہے
محمدؐ کو جب حب سے حصہ دیا حبیب اور محبوب اپنا کیا
ٹھکانا تو محبوب کا جان ہے بھئی اس کے اوپر جان قربان ہے
ہے فتراک میں اس کے دست نہاں گھسا خاک پر اس کے سر آسماں
ارم ہے خجل اس کے ایوان سے ہیں رضوان اسیر اس کے رضوان سے
شفیع الخلائق بمحض الکرم رفیع المراتب امام الامم
در افشاں ہوا ابر کف اس کا جب گئی بس در افشائی ابر سبب
دل اس کا ہے دریا سے احساں میں پیش کف اس کا ہے معدن سے بخشش میں بیش
فلک ہے زمیں بوس اس کا مدام ملک حلقہ در گوش اس کے تمام
فلک جب سے در پر گھسا اس کے سر شب و روز اس پر ہے شمس و قمر
نسیم کرم اس کی در وقت کار نکالی ہے کانٹے سے گلشن ہزار
ہوئے اس کے لب سے جو ظاہر علوم معطل ہوا جملہ عالم نجوم
جہاں کو دیا دین سے روشنی سیاہی سویدا کی دل سے گئی(۲۴)

واقعہ معراج کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انہوں نے تمہید میں اپنے کمال فن اور جدت سخن کا ثبوت دیا ہے، فنکارانہ قدرت، بلند تخیل اور معنی آفرینی کی عمدہ مثال ذیل کے اشعار سے عیاں ہوتی ہے۔

تھی مشکیں شب اک یار کی زلف سی نہ ایسی معنبر ہوو بو یار کی
زبس اس میں تھی روشی جلوہ گر کہ خورشید نکلا ہے شب آن کر
فلک میں چھپا مہر اس نور سے کہ جیوں تیرگی آگے خورشید کے
بہر یک طرف شعلۂ نور تھا فراہم مگر مشک و کافور تھا
شب نور از بس وہ رکھتی تھی نور کہ طبع جہاں سے کدورت تھی دور

سیاہی کیا منہ سے دور آسماں | کہ تسبیح سے روئے تسبیح خواں
ہوئی اس قدر رات روشن تمام | ہوا روز روشن کا بس رات نام(۲۵)

صدیوں سے مصنّفین اہل سنت کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ حمد و نعت کے بعد حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت بصورت منقبت پیش کرتے ہیں، حضرت حسرت نے بھی اسی طریقۂ سلف کو اپناتے ہوئے اشعار کہے ہیں جن میں شعریت و تخیل کی فراوانی نظر آتی ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

زہے عبد قادر شہ حق پرست | زبردست سب اس کے ہیں زیردست
بزرگ بزرگاں ہے وہ محترم | پناہِ عرب اور امان عجم
رہے غوث اعظم امام انام | قدم جس کا ولیوں کے سر پر تمام
مشائخ مشائخ ہوئے اس ستی | سرافراز قطب اور اوتاد بھی
کیا جو کہ جان اس کی رہ میں سبیل | وہ اس کو دیا چشمۂ سلسبیل
بلندی میں مانند قطب وفلک | یہ قطب فلک دو ہیں اور وہ ہے یک
تقرب کے حق میں وہ عالی ہمم | گیا مصطفیٰؐ کے قدم پر قدم
فلک جیوں زمیں اس کی ہے زیر پا | زمانہ سدا اس کو ..... کیا (۲۶)

ذوقیؔ نے اپنی گراں مایہ مثنوی ''معجز مصطفی'' میں اپنے فرزند حضرت محویؔ کو طویل نصیحت فرمائی تھی جس کا اختصار حضرت حسرتؔ نے مثنوی ''ریاض سیر'' میں تحریر کیا ہے، ان نصائح میں سے صرف دو پند ہدیۂ ناظرین پیش کیے جاتے ہیں جنھیں حضرت محویؔ نے اپنی زندگی کا جزولاینفک بنایا تھا اور اس پر تاحیات ان کا عمل رہا۔ ایک نصیحت درج ذیل ہے۔

دیا کر غریبوں کو سیم اور زر | جو تجھ پاس ہو ورنہیں عذر کر
فقیروں میں بخشش کیا کر مدام | تو بر لا امیدوں کو ان کے تمام
تو دل جوئی بے دلاں کر سدا | کیا کر غریبوں پہ بذل و عطا
جو آوے تجھے زخمیٔ غم نظر | لگا مرہم لطف اس زخم پر
جو پابند غم کوئی تجھ کو دیے | چھڑا اس کو غم سے خدا کے لیے(۲۷)

حضرت محویؔ نے اپنے والد ماجد کی مذکوہ بالا پند ونصیحت کی مکمل پابندی کی، بقول مولف ''خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار'':

حضرت محوی متوکل علی اللہ بزرگ تھے تاہم آپ کی جود ونوال اور عطا وافضال کے چرچے حیران کن تھے، بقول حضرت شاہ عبدالحئ احقرؔ بنگلوری ؎

کہ بیاں اس کے ہو توکل کا — اور قناعت کا اور تبذل کا
اور سخاوت میں اس کی شان اعلیٰ — ایسا بخشا تھا لطف سے مولیٰ
کہ امیروں کو تھی پشیمانی — اغنیا کو کمال حیرانی

پوتے حضرت سید شاہ رکن الدین محمد قادری ابن حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی معروف بہ قطب ویلورؒ فرماتے ہیں:

''حاتم وقت ایسے کہ علاوہ روپیوں کے سات سو گھوڑے اللہ کی راہ میں خیرات فرمائے۔ حضرت قطب ویلور قدس سرہ اکثر فرماتے تھے کہ والد ماجد کی صحبت میں (تقریباً) چالیس سال رہا کبھی آج کی چیز کو کل کے لیے رکھنے کو نہیں فرمائے''۔(۲۸)

دوسری نصیحت مصنف ''معجز مصطفیٰؐ'' نے اپنے صاحبزادے کو اس طرح کی جسے انہوں نے حرز جاں بنائے رکھا تھا ؎

جو بد ہے فقیر، اس کو مت بول زشت — تو کر اس سے نیکی نہ کہہ بدسرشت
بد اخلاق پاوے تو اس کو اگر — ہے یک اس میں نیکی تو سو طرح شر
نظر یک پہ کر، اس کے سو پر نہ کر — تو کہہ نیک اس کو، بدی سے گذر

جس شخص میں سو طرح کے شر ہوں اور سو برائیاں ہوں اور ایک خیر ہو، ایک اچھائی ہو تو اسے خیر سے، بھلائی سے یاد کرنے کی نصیحت گراں قدر اور بے نظیر ہے۔ حضرت محویؔ کی پاکیزہ زندگی اس کا جیتا جاگتا نمونہ بنی ہوئی تھی، انہوں نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی، دشمن کو بھی بھلائی اور نیکی سے سرفراز کیا:

''ریاض سیر'' میں جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا انیس مقالے (باب یا فصل) ہیں جن میں سے پہلا مقالہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان وتشریح میں ہے۔ حضرت حسرتؔ نے اس ضمن میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا سراپا بڑے ہی معنی آفرین اور عمدہ وشستہ پیرائے میں لکھا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا حکم ارواح کو پس یہ رب کہ دیکھیں وہ نور مقدس کو سب
سب اس وقت بے خود ہوئے شوق سے لگے نور احمدؐ کے تیں دیکھنے
پڑی سر اپر اسؐ کے جس کی نگاہ ہوا ہے جہاں بیچ وہ بادشاہ
پڑی اسؐ کے آنکھوں پہ جس کی نظر ہوا حفظ قرآن سے وہ بہرہ ور
نظر جبہ پر اسؐ کے جس نے کیا جہاں بیچ وہ شاہ عادل ہوا
بھوؤں پر کیا اسؐ کے جس نے نظر ہوا پس و ہ نقاش صاحب ہنر
جو کان اسؐ کے دیکھا وہ مقبل ہوا جو رخسار دیکھا سو عاقل ہوا
نظر ناک پر اسؐ کے جس کی پڑی ہوا وہ طبیب اور عطار بھی
جو کوئی کہ دیکھا لب لعل فام وزیری میں اس نے کیا خوب نام
دہن پر نظر اسؐ کے جس نے کیا ہوا روزہ دار اور روزہ رکھا
جو دانتوں کو دیکھا وہ خوش رو بنا زباں جو کہ دیکھا سو درباں ہوا
جو حلق اسؐ کا دیکھا سو واعظ ہوا موذن بھی اس نے ہوا برملا
جو داڑی کو دیکھا مجاہد ہوا دل و جاں سے راہ محاسن لیا
بھی دیکھا جو وہ گردنِ زیب دار تجارت کا پیشہ کیا اختیار
جو بازو کو دیکھا سو ہے لشکری ہے گردن کشاں پر اسے سروری (۳۰)

حضرت حسرتؔ نے ''ریاض سیر'' کے آخری انیسویں مقالے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردہ فرمانے کا واقعہ تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اختتام کے اشعار میں اپنی فنی چابک دستی اور فکری بوقلمونی کا اظہار کیا ہے۔ ابیات ملاحظہ ہوں ؎

گیا شاہ مولود کی بارویں یہ دنیا سے باغ ارم کی تئیں
تن اس کا جو تھا مثل جاں برزمیں زمیں جی اٹھی جب گیا در زمیں
زمیں پائی جب رتبہ ایسا بڑا ہوا غم سے قد آسماں کا دوتا
ہوا گنج وہ جب زمیں میں نہال کیا کنج غم اختیار آسماں

لیا جب سے وہ جاز میں قرار فلک ہو رہا ہے زمیں پر نثار(۳۱)

حضرت حسرت کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا، ''معجز مصطفیؐ'' کا ترجمہ ہی نہیں بلکہ ترجمانی بھی کی، اپنے طور سے اضافے کیے، سلاست وروانی کا خاص خیال رکھا، صنائع وبدائع کا جابجا بھرپور استعمال کیا، تشبیہوں اور استعاروں سے مثنوی کا دامن بھر دیا، اس طرح ''ریاض سیر'' کو تخلیقی درجہ عطا کیا، اسی لیے مثنوی کے اختتام پر اس کی خوبیوں اور اس کے لفظی ومعنی محاسن کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ؎

بحمد اللہ یہ نامہ بااحترام بخوبی لیا صورت اختتام

نہیں نامہ یہ بلکہ ہے باغ نور جسے دیکھ جنت پڑی در قصور

عبارات ہیں اس کے سب دل ربا اشارات ہیں اس کے بس جانفزا

سواد سطور اس کے نوروں سے پر بظاہر شبہ اور باطن میں ڈر

جو خضر اس کے حرفوں کو دیکھا نجھا لیا اس کی ظلمت سے آبِ بقا

خطوط اس کے سب رشک مشک خطا نہ آہو کو اس دو دماں میں جگا(۳۲)

مثنوی میں معنی آفرینی اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی، خون دل کو جلایا، بحر فکر میں غوطہ زنی کی، بیان سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے باغات کو سرسبز وشاداب رکھنے اور اس کی خوبصورتی ودل آویزی کو دوبالا کرنے کے لیے خوب محنت ومشقت کی، اگر کہیں اصل عبارت کا مفہوم کھل نہ سکا ''معجز مصطفیؐ'' کے مصنف حضرت ذوقی سے روحانی مدد مانگی جس سے شرح صدر ہوتا گیا، اس طرح یہ مثنوی ''ریاض سیر'' اسم بامسمی ثابت ہوئی۔ اس تعلق سے یہ ابیات ملاحظہ ہوں ؎

بہت فکر کی بحر میں ڈوب کر نکالا ہوں میں ایسے روشن گہر

جو میں دل کو اپنے خوں کیا تو یہ لعل پارے بنے بے بہا

نہیں صرف الفاظ ہیں یہ شگرف مرا لخت دل ہے ہر ایک اس کا حرف

جو سرسبز یہ باغ رنگیں ہوا مرے خون دل سے ہی پالا گیا

لکھا ہوں جو میں یہ مقدس کتاب اٹھایا ہوں محنت بہت بے حساب

نہ تھی یہ لیاقت مجھے بالیقیں کروں ترجمہ نظم کو ایسے میں

نہ ہوتی مصنف کی تائید گر　　تو یہ کام تھا مجھ سے دشوار تر
جب اس نظم کے ترجمہ کے لیے　　کسی جا میں دشوار ہوتا مجھے
تو چہتا مصنف سے تائید میں　　پس آسان ہوتا وہ میرے تئیں
خدا کا وہ جب خاص تھا بے گماں　　کرے کیوں نہ امداد بے چارگاں
زہے ذوقیؔ قطب روشن ضمیر　　سپہر ولایت کا مہر منیر
وہ تھا تاجور ملک تصنیف کا　　مصنف ہو ایسا کہاں دوسرا
اگرچہ نہ تھی عمر اس کی زیاد　　دیا پر تصانیف میں اس نے داد
یک و نیم مہہ میں جو عالی جناب　　لکھا ''معجز مصطفیؐ'' سی کتاب (۳۳)

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت حسرتؔ نے ''ریاض سیر'' تخلیق کر کے نہ صرف منظوم سیرت نگاروں میں اپنا مقام و مرتبہ بلند کیا ہے بلکہ لسانی اعتبار سے بھی اپنی مثنوی کو شہرت دوام عطا کیا ہے (۳۴)، نقادان سخن کو اس مثنوی کے مزید محاسن و مزایا کی جانب توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مآخذ و حواشی

(۱) راہی فدائی ڈاکٹر، ''استشہاد'' کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور مطبوعہ ۲۰۱۲ء ص ۶۹۔ (۲) محمد علی اثر ڈاکٹر، ''عادل شاہی دور میں اردو غزل'' کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، تاریخ اشاعت ندارد، ص ۸۔ (۳) محمد علی اثر ڈاکٹر، ''قدیم اردو غزل'' نشاط پبلی کیشنز، محبوب چوک، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۱۱ء ص ۱۷۔ (۴) ایضاً ''قصص الانبیاء'' مخطوطہ، مخزانۂ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد۔ (۵) ''ریاض مسعود'' غوثی آرکاٹی کی مثنوی قصص الانبیاء کا تاریخی نام ہے۔ (۶) راہی فدائی ڈاکٹر ''خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار'' مطبوعہ الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد ۲۰۱۶ء ص ۱۲۶۔ (۷) ایضاً ۹۵۔ (۸) محمد غوث خاں بہادر نواب والا جاہ، ''تذکرۂ گلزار اعظم'' مطبع سرکاری، مدراس، ۱۲۷۲ھ ص ۱۹۲۔ (۹) محمد یوسف کوکن افضل العلماء، عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک 1710-1960 (Arabic and Persian in Karnatic)، مطبوعہ امیر اینڈ کو، مدراس ۱۹۷۴ء ص ۱۴۴۔ (۱۰) افضل الدین اقبال ڈاکٹر، ''مضمون حاجی غلام محمود مہاجر حسرتؔ حضرت ذوقیؔ کی فارسی مثنوی کا اردو مترجم'' مشتملہ سالنامہ ''اللطیف'' دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور، مطبوعہ ۱۴۱۵ھ ص

۹۲۔(۱۱) محمد یوسف کوکن افضل العلماء ص ۱۴۷۔(۱۲) محمود مہاجر حاجی حسرتؔ، ''ریاض سیر'' مطبوعہ مطبع شرفیہ مدراس ۱۲۷۰ھ ص ۴۳۶۔(۱۳) افضل الدین اقبال ڈاکٹر' سالنامہ اللطیف ص ۹۲۔(۱۴) محمد یوسف کوکن افضل العلماء ''عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک' ص ۱۴۷۔(۱۵) افضل الدین اقبال ڈاکٹر' سالنامہ اللطیف ص ۹۳۔(۱۶) ''ریاض سیر'' ص ۲۰۔(۱۷) ایضاً ص ۲۳۔(۱۸) ایضاً ص ۳۲۔(۱۹) ایضاً ص ۳۳۔(۲۰) عزیز جنگ نواب بہادر، ''تاریخ النوائط'' مطبوعہ عزیز المطابع ۱۳۲۲ھ ص ۴۰۳۔(۲۱) ایضاً ص ۲۱۵۔(۲۲) ''خانقاہ ویلور کے علمی آثار'' ص ۲۴۳۔(۲۳) ''ریاض سیر'' ص ۲۔(۲۴) ایضاً ص ۸۔۹۔۱۰۔۱۱۔(۲۵) ایضاً ص ۱۱۔(۲۶) ایضاً ص ۱۶۔۱۸۔(۲۷) ایضاً ص ۲۶۔۲۷۔(۲۸) ''خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار'' ص ۱۸۰۔۱۸۱۔(۲۹) ''ریاض سیر'' ص ۲۹۔(۳۰) ایضاً ص ۳۶۔۳۷۔(۳۱) ایضاً ص ۴۳۲۔(۳۲) ایضاً ص ۴۳۳۔(۳۳) ایضاً ص ۴۳۴۔۴۳۵۔(۳۴) ''ریاض سیر'' پر مضمون قلم بلند کرتے ہوئے جن اشعار کا حوالہ مطبوعہ کتاب سے دیا گیا ہے، اس میں رسم الخط دوسو سالہ قدیم نہج پر تھا، راقم نے بعض مقامات پر اس کی تسہیل کردی ہے مثلاً اوس اور ایس کی بجائے اُس اور اِس کی تبدیلی قارئین و ناظرین کی سہولت کے لیے کی گئی ہے۔ دراصل اردو کے قدیم رسم الخط میں اعراب بالحروف کی عادت تھی، موجودہ دور میں اعراب بالحرکت کو اپنایا گیا ہے جس سے نظم کی قرأت میں تکلف کا شائبہ نہیں رہتا اور ساتھ ہی سلاست و روانی بھی آجاتی ہے۔

جلد نمبر ۲۰۴ ماہ محرم الحرام ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۱۹ء عدد ۳

کلیات شبلی میں اہل بیت سے عقیدت

☆ جناب سید حسن رضا عارف ہاشمی

علامہ شبلی کی نگارشات نثری میں عقیدت آل و اصحاب رضوان اللہ علیہم کا بحر زخار ہے جو کئی ہزار صفحات کو محیط ہے جس میں الفاروق، موازنہ اور سیرت النبیؐ کی (دو جلدیں) بالتصریح عقیدت اہل بیت میں شرابور ہیں، ورنہ الف سے ی تک مولانا کی کوئی تصنیف اٹھالو، المامون سے سیرت پاک تک جس پر مولانا کا خاتمہ بالخیر ہوا، مقالات، مکتوبات، خطبات، غرضیکہ ہر تصنیف عقیدت کی خوشبو سے معطر پاؤ گے۔

مولانا عاشق رسول تھے اور اسی نسبت سے آلہ و اصحابہ سے مودت و شیفتگی رکھتے تھے، الفاروق جسے کوتاہ بین وکم سواد شیعہ شجر ممنوعہ سمجھتا ہے اور اہل سنن کی باچھیں کھل جاتی ہیں، اگر نکتہ سنجی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے ہر جگہ علیؓ نظر آتے ہیں، گویا یہ کتاب مولانا روم کے اس شعر کی مصداق ہے ؎

رافضاں دارند انگشت در دہن چوں علیؓ را با عمرؓ آمیختم

نگارشات شبلی ایک شہر نگاراں ہے، عقیدت کا چمنستان، جہاں سو سو رنگ کے پھولوں کی فراوانی ہے، اس کشت زعفران زا کی دو فصلیں ہیں، نثری و شعری، راقم الحروف سہل انکاری و عجز بیانی سے (عمر کا تقاضہ بھی ہے) مولانا کی شعری نگارشات (کلیات شبلی) کو زیر قلم لایا ہے، نثری سرمایہ تو ایک بحر زخار ہے، کو لمبس کون بنے گا؟

مولانا کی نگارشات نثری نے شعری نگارشات کو اس طرح چھالیا ہے کہ علامہ کی شعری خوبی دب کر رہ گئی ہے، شعری کائنات یعنی کلیات شبلی ۱۱۸ صفحات ہیں جس میں ۲۰ صفحہ سید ندوی صاحب کا مقدمہ ہے، اس زمانے کے شعرا کے ضخیم دواوین دیکھیے، خیال گزرتا ہے شبلی شاعر نہیں تھے لیکن جب

☆ محلہ سیتارام، اعظم گڑھ۔

اس ندی میں اتریے، اندازہ ہوتا ہے ؎

آرزو ڈوب کے گرتھاہ لگائیں تو کھلے اتھلی ندی میں نہ ہونے پہ ہے کتنا پانی

(آرزوؔ لکھنوی)

لاریب علامہ شبلی شاعر ہیں، ایک فطری اور وہبی شاعر، ان کے یہاں جو انفرادیت ہے وہ چیز ے دیگرے ہے جو انہیں ہم عصر شعرا سے ممتاز و ممیز کرتی ہے وہ ہے حقیقت کو سادگی و جوش وخروش سے بیان کرنے کا طریقہ، سادگی و پرکاری، علامہ شبلی نے چوتھے دور میں سیاسی، اخلاقی، تاریخی اور مذہبی عنوانات کو موضوع سخن بنایا ہے، مذہبی عنوانات پر کافی نظمیں ہیں:

۱۔خلافت فاروقی کا ایک واقعہ ۲۔عدل فاروقی کا نمونہ ۳۔اظہار قبول حق ۴۔خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف ۵۔خواتین عرب کا ثبات واستقلال ۶۔مساوات اسلام ۷۔تعمیر مسجد نبویؐ ۸۔ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ۹۔جرأت وصداقت ۱۰۔اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی۔(جسے جامع کلیات نے شبلی کی آخری نظم بتایا ہے، جیسے علامہ کی آخری تصنیف سیرت النبیؐ ہے، ویسے ہی آخری نظم اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہے۔)یوں خاتمہ بالخیر ہوا ہے جو مومن کی شان ہے۔

ان میں تین نظموں کا تعلق بالتصریح اہل بیت اطہار سے ہے، ان نظموں میں اہل بیت سے مودت وعقیدت کی تیز مٹھاس ہے، جس سے علامہ کے جذبات، احساسات وافکار تک قاری کو پہنچنے میں دیر نہیں لگتی، احساس کی تیز آنچ میں تپ کر وہ کچھ وہ کہہ جاتے ہیں جو علمیت کے تہ بہ تہ پردوں میں نہیں کہہ سکتے، وہ تین نظمیں یوں ہیں:

۱۔ اہل بیت رسول کی زندگی ۲۔ جرأت وصداقت ۳۔ ایک ناتمام نظم، جسے جامع نے ناتمام نظموں کی صف میں ڈال کر ایک نوٹ لگا دیا ہے۔

علامہ کی مذہبی نظموں میں ایک نظم اور ہے جس کا عنوان ''نظام حکومت اسلام'' ہے، اگرچہ اہل بیت سے اس کا تعلق نظر نہیں آتا، لیکن غور کرنے پر معرکۂ کربلا اور اقدامِ حسینی صاف نظر آتا ہے، اس لیے مضمون کے سلسلے میں پہلے اسی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس نظم کا پہلا مصرعہ ہے''جب ولی عہد ہوا تخت حکومت کا یزید'' کلیات شبلی''،ص ۴۲، علامہ نے حکومت کہا، جب کہ حکومت وخلافت ہم وزن وہم قافیہ تھے، خلافت نہیں کہا، ۱۵/اشعار کی یہ نظم محاکاتی ہے جس میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے، جب حضرت معاویہؓ نے آخر عمر میں اپنے بیٹے کی

ولیعہدی ونامزدگی چاہی تھی اور عامل مدینہ کو یزید کا نام بھی داخل خطبہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ مسجد نبویؐ نمازیوں سے چھلک رہی ہے، غالباً جمعہ کا دن ہوگا، جس میں صحبت یافتہ صحابہ کرام اور ان کی اولادیں ہیں، خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم کے صاحب زادگان ہیں، مہاجرین وانصار کا جم غفیر ہے، مروان عامل مدینہ منبر رسولؐ سے حسب الحکم حاکم وقت یزید کا نام داخل کرتا ہے اور اسے اسوۂ شیخینؓ بتاتا ہے، حضرت عبدالرحمنؓ خلیفہ اول کے فرزند ارجمند کو تاب ضبط نہیں رہتی، خطیب منبر کو ٹوکتے نہیں بلکہ للکارتے ہیں اور جو کچھ فرماتے ہیں یہ سخت وسست اور درشت کلمات علامہ شبلی کے دل کی آواز ہے، چار اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اٹھ کے فرزند ابوبکرؓ نے فوراً یہ کہا ۔۔۔ سربسر کذب ہے یہ اے خلف نسل لئام

جھوٹ ہے یہ کہ ہے سنت بوبکرؓ وعمرؓ ۔۔۔ ہاں مگر قیصر وکسریٰ کی ہے یہ سنت عام

یہ طریقہ متوارث ہے تو کفار میں ہے ۔۔۔ ورنہ اسلام ہے اک مجلس شوریٰ کا نظام

شان اسلام ہے شخصیت ذاتی سے بعید ۔۔۔ شرع میں سلطنت خاص ہے ممنوع وحرام

یہ عبدالرحمٰنؓ کے کلمات جہاد باللسان ہیں، بدرقہ مقدمۃ الجیش ہیں، جس کا ایک ایک لفظ تلوار کی کاٹ ہے، مولانا نے نسل لئام کہہ کر اس کے آباواجداد تک کو نہیں بخشا، کافر بدعتی سب کچھ بناڈالا، اسی میں ایک اور شعر ہے جو عربوں کی جبلت وفطرت کا عکاس ہے ؎

اس سے بھی قطع نظر نسل عرب ہیں ہم لوگ ۔۔۔ وہ کوئی اور ہیں ہوتے ہیں جو شاہوں کے غلام

یہ آخری شعر ہے۔

اس شعر میں اشارہ ہے جب خلافت راشدہ کے بعد خلافت، ملوکیت کا جامہ زیب تن کررہی تھی، حضرت عبدالرحمٰنؓ کا یہ جہاد باللسان باطل کے خلاف ہراول دستہ ہے جس نے حضرت امام حسین و اصحاب حسین کے لیے جہاد بالسیف کی راہ ہموار کردی، شاعر کے لاشعور میں حقانیت کی حمایت، باطل سے نفرت، حسینی اقدام سے عقیدت ہے، اگرچہ معرکہ کربلا کا کوئی واقعہ یا حضرت امام مظلوم کا کوئی خطبہ نظم کرتے وقت یہ تاثر نہیں پیدا ہوتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسی جہاد باللسان نے امام حسین کے جہاد بالسیف پر جمہور کی زبان بند کردی، جس نے امام کے قیام کو جائز اور فرض عین بنادیا، ورنہ دو شہزادوں کی جنگ کہہ دیا جاتا، مولانا شبلی نے یہ نکتہ نہایت چابک دستی، ذہانت وفطانت سے جمہور اسلام کے ذہن میں پیوست کردیا، اس کا اثر دبستان شبلی میں اس طرح ہوا کہ اقدام حسینی پر کسی نے حرف نہیں رکھا بلکہ توصیف فرمائی۔

اگر چہ علامہ کی کوئی نظم معرکہ کربلا پر نہیں ہے لیکن موازنہ انیس و دبیر سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کا گہرا مطالعہ اس واقعہ پر تھا، وجہ جو بھی ہو، شاید اس لیے کہ کربلا کا معرکہ علامہ شبلی کی جبلی اور نسلی روایات شجاعت کے مطابق تھا، جس میں بحر شجاعت کے شناور ہاشمی اطفال نوجوان، جوان بوڑھے سبھی مع اصحاب و انصار تین دن کی بھوک و پیاس کی سختیاں جھیلتے ہوئے مردانہ وار شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔

لیکن بعد شہادت حضرت امام حسینؓ (مع اعزا و اقربا، دوست و اصحاب) خانوادۂ رسولؐ پر کیا گزری، شبلی جیسے غیور و حساس، پاسدار ناموس کا دل غم سے خون ہو جاتا ہے جہاں ناموس کی حفاظت، عزت و توقیر، نسلی روایات میں شامل ہے، خانوادۂ رسولؐ، علیؓ و فاطمہؓ کی بیٹیاں سر برہنہ، بے مقنع و چادر دربار یزید میں حاضر کی گئیں، شاعر شدت غم سے چیخ پڑتا ہے۔ شبلی کی یہ یادگار نظم کلیات کے صفحہ (۱۱۶) پر درج ہے، جس کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایک عجیب سا نوٹ رواداری یا کام کی زیادتی میں جامع نے لگا دیا تھا، ناچیز خاکسار راقم السطور کو یہ فخر حاصل ہے کہ نظم سے پردہ اس ناچیز نے اٹھایا اور جریدہ معارف میں جگہ پانے کا شرف حاصل کیا۔

یہ نظم ۵ / اشعار کی ہے تطویل کے لحاظ سے نہیں لکھی جاتی، جسے جامع کلیات نے نظم ناتمام کی صف میں ڈال دیا ہے اور نوٹ لگا دیا ہے، پتہ نہیں کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، چونکہ علامہ شبلی رسول و آل رسول کے لیے سب سے قیمتی لفظ قدسی جا بجا اپنی تحریر میں بار بار لائے ہیں، مثلاً رسول اللہؐ کی ولادت و رحلت میں لفظ قدسی ملے گا، اس نظم کے چوتھے شعر میں اس محاکات کا سب سے دلدوز گوشہ جس نے شاعر کو تڑپا دیا تھا حریم قدس لا کر تڑپتے دل کو تسلی دی ہے، یہ معمولی لوگ نہیں، آل رسول پاک ہیں ؎

جن کی زباں پہ سوز ہے نوحہ ہے، بین ہے   ہیں بے نقاب پردہ گیان حریم قدس

(علامہ شبلی)

دراصل علامہ شبلی کے اس عقیدت میں ڈوبے ہوئے شعر نے ناچیز کو ان اشعار کے سمجھنے اور تہ تک پہنچنے میں مدد دی، لفظ قدسی نے اس راز سربستہ سے پردہ اٹھایا تھا، یہ نظم یوں دریافت ہوئی تھی۔

اس نظم کا پہلا شعر ہے:

اک شہر میں کہ پایۂ تخت قدیم ہے   پچھلے پہر سے آج عجب شور و شین ہے

یہ نظم ناتمام صفحہ ۱۱۶ پر ہے۔ (کلیات شبلی ۱۱۶)

۲۰۱۱ء میں دارالمصنّفین کے سیمینار بعنوان علامہ شبلی کا علمی وفکری ورثہ کے بعد دسمبر کے شمارے میں شبلی شناسی کی نئی جہات کی طرف اشارہ تھا۔

نیا گوشہ کیا ہوسکتا ہے؟ جوئندہ یابندہ، خاکسار کو یہ گوشہ نظر آیا ''علامہ شبلی اور عقیدت اہل بیتؓ''۔ علامہ شبلی پر لکھنے والوں میں علامہ اقبال سہیل کی عقابی نگاہ اس نکتہ پر گئی تھی، تفصیل آخری صفحہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ شبلی کی ایک نظم جرأت وصداقت کلیات کے صفحہ ۴۱ پر ہے، جس میں حسنی سادات کا ذکر ہے، خانوادۂ حضرت امام حسنؓ کے جیالے محمد وابراہیم حاکم وقت منصور کے لیے خطرہ بن گئے تھے، منصور نے سارے بنو ہاشم کو گرفتار وقیدی بنا دیا تھا، دیگر مظالم اس کے سوا تھے، علامہ شبلی کی ہمدردی آل حسن وخانوادۂ رسول سے ہے، مولانا کا دامن عقیدت مندی وارادت کیشی اس درجہ وسیع ہے، انہیں جگر گوشہ رسول کہا ہے، یہ نظم ۱۴/اشعار کی ہے، ۶/اشعار ملاحظہ فرمائیں جو خلوص وعقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں:

ایک دن حکم دیا اس نے کہ اولاد رسولؐ ایک جا جمع کیے جائیں جو مل جائیں کہیں
پھر دیا حکم کہ ان سب کو پہنا کر زنجیر کہہ دو ان سے کہ بنیں خانۂ زنداں کے مکیں
ایک دن سیر کو اس شان سے نکلا منصور پا بہ زنجیر تھے سادات یسار اور یمین

سادات کے حال زار پر شاعر کا دل غمزدہ، عقیدت اور محبت ومودت سے بے تاب ہوجاتا ہے، آگے شعر دیتے ہیں جس میں انہیں جگر وجان رسول کہا گیا ہے:

ساتھ ساتھ آتے تھے پیدل جان وجگر رسولؐ اور منصور تھا زیب حرم خانۂ دین
ایک نے مجمع سادات سے بڑھ کر یہ کہا گرچہ اس لطف کے مشکور ہیں ہم خاک نشیں
غزوۂ بدر میں لیکن جو کیا ہم نے سلوک وہ تو کچھ اور تھا ہے یاد بھی تم کو کہ نہیں

غزوۂ بدر میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کفار مکہ کے ساتھ آئے تھے اور گرفتار ہوئے تھے، ان کی مشکیں خوب کس کر باندھی گئی تھیں، رات میں ان کی کراہ سے آنحضرتؐ کو نیند نہیں آرہی تھی، جب مشکیں ڈھیلی یا کھول دی گئیں رحمت اللعالمینؐ سو سکے، اسی طرف اشارہ ہے، سارے واقعات قارئین عظام کو معلوم ہیں۔

کلیات شبلی کے ص ۴۳ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی جامع کلیات نے اسے علامہ کی آخری نظم کہا ہے، غالباً اس لحاظ سے ۱۹۱۴ء کے اوائل کی ہوگی، جب علامہ شبلی سیرت النبیؐ رقم فرمارہے تھے جیسے ان کی نثری تالیف میں سیرت کی شاہکار ہے، یہ نظم کلیات شبلی میں گل سرسبد کا درجہ رکھتی ہے، کلیات میں یہ نظم درمیان میں کیوں مرقوم ہے؟ (ص ۴۳) کیا مصلحت تھی، مولانا سید ندوی صاحب جانیں۔

یہی وہ نظم ہے جس پر شبلی کے ہر مبصر و ناقد نے خوب خوب قلم کو گردش دی ہے، ۱۴/اشعار کی یہ نظم مخزنِ عقیدت ہے، عقیدت کا چمن جس کی بھینی بھینی خوشبو سے مشام جان معطر ہورہا ہے، حضور پاک کو اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے انتہائی پدری محبت و شفقت ہے، بیٹی کا باپ سے احترام، اسوۂ آل پاک صبر و رضا سبھی کچھ نظم میں ہے۔

راقم السطور کے نزدیک اس کا ہر شعر علامہ کی عقیدت اہل بیت علیہ السلام و عرفان و عظمت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوبا ہوا ہے۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں صبح و شام گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

نظم طویل ومحاکاتی ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے:

یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی یہ ماجرائے دختر خیرالانامؐ تھا

نظم لکھتے وقت علامہ کے لاشعور میں ضرور ام المومنین طاہرہ حضرت خدیجہؓ کا تاریخی واقعہ رہا ہوگا، جب اہل مکہ کا مال تجارت سجتا تھا موصوفہ کا نصف رہتا تھا جسے اس محسنہ اسلام نے فروغ اسلام کی خاطر اور رسول اللہ کی محبت میں قربان کردیا، ان ہی مقدسہ معظّمہ کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں، یہ افلاس خود اختیاری و رضا کارانہ ہے جو اس خانوادہ کا اسوہ ہے، گھر میں جو آتا ہے مسکیناً، یتیماً، اسیراً نذر کردیا جاتا ہے، حضرت علیؓ سا نامور مجاہد شوہر ہے، جسے ضرور ہر مرد مجاہد کے برابر مال غنیمت ملتا ہے، خالی اوقات میں جسے محنت مزدوری سے عار نہیں، لیکن جو کچھ لاتے ہیں بے دریغ راہ خدا میں قربان و ایثار کردیا جاتا ہے یہ افلاس رضا کارانہ تھا، اب مولانا کی نظم ملاحظہ فرمائیں:

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال

اس نظم پر اہل قلم حضرات نے بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے، ایک گوشہ تھا جس پر ناچیز راقم السطور نے روشنی ڈالنے کی حقیر کوشش کی ہے۔

ملحوظ خاطر رہے علامہ جیسے عالم جید فقیہ و محدث نے حضرت فاطمۃ الزہرا کو اہل بیت میں شامل کیا ہے، یہ شبلی کی عقیدت مندی آل رسول سے ہے۔

۱۹۱۲ء میں کانپور کی ایک مسجد کا وضوخانہ (سڑک وسیع ہورہی تھی) زد میں آ گیا، گورنمنٹ نے جسے شہید کرادیا، اس سلسلہ میں عملی احتجاج کرتے نہتے مسلمان شہید ہوگئے، پورے ملک میں ہنگامہ مچ گیا، علامہ شبلی صاحب نے ایک نظم "معرکہ کانپور" کہی، "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں"۔

مولانا نے معرکہ کربلا کے تناظر میں اسے معرکہ کانپور کا عنوان دیا ہے، دراصل یہ واقعات کربلا معرکہ آرائی تھی نہ حادثۂ کانپور، دونوں احتجاج ناحق کے خلاف تھے لیکن مولانا کو حق کی حمایت اور خانوادہ رسالت سے عقیدت و شیفتگی ہے، مولانا نے پوری نظم واقعات کربلا کے تناظر میں لکھی ہے اور اس کی مقبولیت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی شاداب اس وقت تھی جب کہی گئی تھی، حالانکہ علامہ کی بہت سی عصری منظومات جن کا اس زمانے میں بہت زور و شور تھا، امتداد زمانہ کے ہاتھوں اپنی اہمیت کھوچکی ہیں یا مدھم پڑگئی ہیں، لیکن یہ نظم ویسی ہی شاداب ہے جیسی مولانا کے زمانہ میں آج سے ۱۰۰ رسال پہلے تھی۔

چونکہ شاعر کے ذہن میں معرکہ کربلا رچا بسا ہے، یہ نظم اسی تناظر میں کہی گئی ہے جس میں کمسن، نوجوانوں، بوڑھوں نے شہادت پائی ہے۔

(علامہ شبلی کو معلوم ہے گولی برسائی گئی تھی، فائرنگ ہوئی تھی، ایک شعر میں اسی کو باندھا بھی ہے اس میں یہ مصرعہ ہے کہ فیر کا حکم دیا آپ نے جب بہر ہجوم...... نظم کا عنوان ہے "آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم"۔ ص ۷۹)

لیکن شاعر معرکہ کربلا کے تناظر میں کہتا ہے ؎

سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار

معرکہ کربلا میں علی اکبر ابن امام حسینؓ ۱۸ رسالہ کڑیل جوان برچھی کھا کر شہید ہوئے تھے، میر انیس اپنے ایک مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

کچھ نوجوان ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر

(موازنہ انیس و دبیر: ص ۳۸)

مولانا شبلی فرماتے ہیں:

ع کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب ع کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خودمگر
ع سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار ع کچھ پیر کہنہ سال ہیں دل دادۂ فنا
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

واقعۂ کربلا میں حضرت حسنؓ کے کمسن بیٹے قاسم نے اقربا میں سب سے پہلے شہادت پائی، اسی طرف اشارہ ہے، یہ کلیات شبلی کے ص ۸۷ پر ہے۔

سادہ لوح قاری کہے گا ہاشمی صاحب یہ کہاں کھینچا تانی کر رہے ہو، کہاں کا روڑا کہاں کی اینٹ؟ لیکن اس کے بعد والی نظم جس کا عنوان ''علمائے زندانی'' ہے، مثال میں یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

پہنائی جارہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے

جب واقعات کانپور کے سلسلے میں علماء حضرات کو ہتھکڑی پہنا کر داخل جیل کیا گیا تھا شاعر نے اپنے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسیران کربلا سے اسباب وعلل پیدا کرلیا، جب بعد شہادت حضرت امام حسینؓ باقی السیف حضرت علی ابن الحسینؓ کو پابند سلاسل کیا گیا تھا۔

حضرت علی ابن الحسینؓ کا کثرت عبادت سے لقب سید سجاد ہے، زین العابدین ایسا مشہور ہوا لقب ہی نام بن گیا، جب مجرم کو زنجیر پہنائی جائے ذلت وخواری ہے، اگر بے جرم وخطا پہنایا جائے وراثت سجاد عالی ہے۔

ناچیز راقم الحروف نے ایک اور نظم خواتین عرب کا ثبات استقلال کو خانوادۂ رسول پاک کی عقیدت مندی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، یہ نظم کلیات کے صفحہ ۱۵۱ پر ہے، جس کا پہلا مصرعہ ہے ؎

مسند آرائے خلافت جو ہوئے ابن زبیرؓ

حضرت عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیرؓ کے فرزند ارجمند، خلیفہ اول کے نواسے ہیں، حضرت زبیرؓ کا شمار حواری رسول پاک، عشرۂ مبشرہ میں ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے شہادت امام حسینؓ کے بعد حجاز میں خلافت قائم کرلی تھی، سارے واقعات ناظرین کو معلوم ہیں، مالک بن مروان سے ان کی جنگ ہوئی اور شہید ہوئے۔

پہلا مصرعہ ہے ؎

ابن مروان نے حجاج کو جو بھیجا پئے جنگ

(مالک ابن مروان نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر فوج کشی کی تھی) دراصل یہ نظم حضرت اسما مادر ابن عبداللہ کے ثبات واستقلال کا ثبوت ہے، مذہبی منظومات میں غالباً سب سے طویل ۲۹/اشعار کی نظم ہے جس کے تناظر میں ہاشمی شجاعت ہے اور اس شجاعت کا آخری معرکہ کربلا ہے جس پر شجاعت ناز کرتی ہے بغیر زرہ وبکتر پہنے بے ناصر ومددگار حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت امام حسینؓ کی سی جنگ کررہے تھے اور ؎

پہلے ہی حملہ میں دشمن کی الٹ دیں فوجیں   جس طرف جاتے تھے یہ ٹوٹتی جاتی تھی قطار

ابن زبیرؓ کے دل میں شوق شہادت بھرا ہے، انجام کار شہید ہونا ہے:

خون ٹپکا جو قدم پر تو کہا ازرہِ فخر   یہ ادا وہ ہے کہ ہم ہاشمیوں کا ہے شعار
اس گھرانے نے کبھی پشت پہ کھایا نہیں زخم   خون ٹپکے گا تو ٹپکے گا قدم پر ہر بار

سریۂ موتہ میں حضرت جعفر طیارؓ شہید ہوئے اور سارے زخم سینہ وبازو پر تھے۔

علامہ شبلی کی شیفتگی وعقیدت آل رسول سے انتہائی درجہ پر ہے، مصائب واقعات کربلا میں چونکہ تین دن کی بھوک وپیاس زبان زد خاص وعام ہے، بھلا شبلی سا والہ وشیدا آل رسولؐ کیوں متاثر نہ ہوتا، نظم کا عنوان ''خلافت فاروقی کا ایک واقعہ'' ہے، نظم محاکاتی ہے جس میں قحط سالی ''عام الرماد'' کا ذکر ہے، حضرت عمرؓ اور ضعیفہ کا قصہ بیان کرتے ہوئے شعر دیتے ہیں۔ ضعیفہ کہتی ہے ؎

بچے یہ تین دن سے تڑپتے ہیں خاک پر   میں کیا کہوں زباں سے جو ان کا حال تھا

کلیات شبلی کی بہت ساری نظمیں، بہت سارے قطعات حالات حاضرہ پر ہیں، زیادہ تر سیاسی، تعلیمی، اخلاقی وغیرہ جن میں کانگریس، مسلم لیگ، احرار، ندوۃ العلماء، اے۔ایم۔یو کالج علی گڑھ سے متعلق ہیں جن میں ایسی تلمیحات آئی ہیں جو عقیدت وعلام سے متعلق ہیں، مثلاً ذوالفقار، پنج تن پاک، فتنۂ آخرالزماں ظہور امام (مہدی موعود) وغیرہ، آج کا تعلیم یافتہ (ہندی داں) ان سے کم واقف ہوگا، ہوسکتا ہے علامہ شبلی کے زمانہ میں یہ بات نہ رہی ہو لیکن علامہ کے زمانہ میں خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔

دور انگلشیہ میں لارڈ میکاولی کی تعلیمی سفارشات سے جو تعلیم عصری درسگاہوں میں دی جارہی تھی، اس سے نئی نسل اپنے آبا واجداد کے کارناموں کو فراموش کرتی جارہی تھی، (علامہ کا سلسلہ ناموران اسلام اسی زہر کا تریاق تھا) اور الفرڈ اعظم کی تلوار کا کلمہ پڑھ رہی تھی الفرڈ اعظم

اساطیری کردار جو تمام عمر بدی کے خلاف شمشیر زن رہا، ضعیفی میں جب ہاتھ کمزور ہو گئے جھیل میں تلوار پھینک دی۔

''اور جب دنیا بدی سے بھر جائے گی وہ دوبارہ آئے گا'' (۱) اور اسلامی نئی پود نے حقیقی تلوار (ذوالفقار) کو نیام پوش کر لیا تھا، مولانا نے اپنی نظموں میں ذوالفقار بھی باندھا ہے ؎

چلتی ہوئی زبان ہے یا ذوالفقار ہے

ملحوظ خاطر رہے کہ مولانا شبلی نظریاتی طور پر نیشنلسٹ تھے، ہندو مسلم اتحاد کے حامی کانگریس کو پسند کرتے اور مسلم لیگ کو انگریزوں کا آلہ کار جانتے اور نشانہ سادھتے تھے ؎

سعی بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق　　اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی بہر پنج وتن

نظم کا عنوان کفران نعمت ہے، قطعہ ص ۶۶ پر ہے، اگر قاری کو پنج تن کی تلمیح نہیں معلوم ہوگی وہ طنز میں چھپے نشتر کے چرکے کو نہیں سمجھے گا بلکہ الجھے گا، یہ مقدس ہستیاں حضرات رسول اللہؐ، علیؓ، فاطمہؓ اور حسنینؓ ہیں، جو یمن کے بنی نجران کے عیسائیوں کے مقابل مباہلہ میں آئی تھیں، مسلمانوں کا ایک فرقہ انہیں پنج تن کا خطاب دیتا ہے۔

کلیات کے صفحہ ۶۸ پر ایک نظم ہے، یہ مسلم لیگ کے گرتے ہوئے گراف کے سیاق وسباق میں کہی گئی ہے، جس میں فتنۂ آخر الزماں اور امام زماں مولانا نے باندھا ہے، اگر اس تلمیح کی واقفیت ہوگی لطف آئے گا۔

ایک متفق علیہ حدیث قدسی ہے، قرب قیامت کی نشانیوں میں یہ بھی ہے: جب دنیا ظلم و عدوان سے بھر جائے گی بنی قریش سے ایک فرد تشریف لائیں گے اور دوبارہ دنیا کو عدل وانصاف سے جنت نشاں بنا دیں گے (جن کا نام محمد، لقب مہدی ہوگا) اور اب تک نہ جانے یہ فتنہ کتنی بار اٹھ چکا ہے اور کتنوں نے دعوائے مہدویت کیا ہے اور ایک فرقہ انہیں بارہواں امام جانتا ہے، جو امام حسن عسکری کے فرزند ہیں، ۲۵۵ھ ان کا یوم پیدائش ہے، سر الٰہی سے زندہ اور روپوش ہیں، واللہ اعلم۔ یہ جماعت شیعان اثنا عشری کہلاتی ہے، وہ فتنۂ آخر الزمان ہے اور یہ ظہور امام ہے ؎

وہ دن گئے کہ فتنۂ آخر الزماں کے بعد　　گویا کہ اب امام زماں کا ظہور تھا (ص ۶۸)

---

(۱) لارڈ بائرن اٹھارہویں صدی کے ایک شاعر کی نظم کا عنوان ہے، الفرڈ کی تلوار (Sword of Alfrord) ہمارے کورس میں تھی۔

ان تلمیحات کے لکھنے سے ہیچ مداں راقم السطور کا یہ عندیہ ہے کہ علامہ سارے مسالک کی خبر رکھتے تھے۔

جملہ معترضہ: علامہ اقبال سہیل کی عبقری شخصیت کے مولانا سید سلیمان ندویؒ معترف تھے، اپنی عدیم الفرصتی کے سبب علامہ شبلی کی سوانح کا کام مولانا عبدالسلام اور علامہ سہیل سے لینا چاہا تھا، علامہ اقبال سہیل مولانا شبلی کے ہم مسلک، ہم وطن، ہم برادری، ہمہ وقت کے حاضر باش، شاگرد رشید بلکہ ''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ'' کے مصداق تھے، افسوس وکالت جیسے غیر ادبی پیشہ اور ملکی سیاست کا شکار ہوگئے، اردو ادب ایک نامور شاعر و ادیب نقاد سے محروم رہا۔

آمدم برسر مطلب: اقبال سہیل کی سیرت شبلی ضخامت میں کم (۱۷۵ صفحات) لیکن قدر و قیمت میں کم نہیں ہے، مصنف کی عقابی نگاہیں اس نکتہ پر مرکوز ہوئی ہیں جو اہل نظر سے پوشیدہ تھیں یا گم ہوگئی تھیں، وہ ہے علامہ شبلی کی اہل بیت اطہار خانوادہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مودت و عقیدت، سیرت شبلی کے دو اقتباسات جن پر مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال سہیل لکھتے ہیں مدرسہ علوم علی گڑھ اور سرسید علیہ الرحمہ سے علامہ شبلی کی وابستگی و وارفتگی میں ایک وجہ سرسید احمد کا دودمان رسالت کا چشم و چراغ ہونا بھی تھا، چنانچہ آگے لکھتے ہیں:

''مولانا کو عشق رسول کی بدولت سادات کے ساتھ مخصوص شیفتگی تھی، جس میں بعض اوقات تفضیلیت کی بھی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے، ایک جگہ مولانا نے خود اس کا اعتراف کیا ہے''۔(ص ۲۹)

دوبارہ لکھتے ہیں:

''مولانا کے رجحانات مذہبی میں بتدریج تغیرات ہوتے رہے ہیں، ان تمام مراحل میں چند معتقدات اور رجحانات علیٰ حالہٖ قائم رہے، حضور عالم اور اہل بیت اطہار کے ساتھ والہانہ شگفتگی''۔(ص ۱۵۴)

اقبال سہیل نے علامہ شبلی کے عقائد کے بیان میں پورا صفحہ علامہ کی وسیع المشربی پر لکھ ڈالا ہے، آخری دو سطروں میں یوں رقم طراز ہیں:

''استاذ محترم کو اس وسیع المشربی میں صرف ایک استثنا تھا، سرکار رسالت مآب (روحی فداہ) اور اہل بیت اطہار کی شان میں سوء ادب کا شائبہ بھی ناقابل

برداشت تھا"۔ (ص ۱۵۵)

ان اقتباسات سے ناچیز راقم السطور کو بہت حوصلہ اور تقویت حاصل ہوئی۔ علامہ شبلی کی نثری نگارشات بھی بہ ایں عنوان معارف کے لیے زیر قلم لائی جائیں گی۔ انشاء اللہ، علامہ شبلی کے نگارشات نثری سے ناچیز نے اعتقادات اہل بیت پر مواد جمع کیا ہے اور کتابی شکل اختیار کر گیا ہے۔

حوالہ جات

راقم نے کلیات شبلی سے اشعار رقم کرتے وقت نظم کا عنوان اور صفحہ نمبر لکھ دیا ہے لیکن موجودہ طریق کار کا حوالہ الگ سے لکھنے کا ہے اور معارف کا حکم بھی ہے اس لیے پابندی کرنا ہے۔

۱۔	نظام حکومت اسلام	کلیات شبلی	صفحہ نمبر ۴۲
۲۔	علامہ شبلی کی ایک ناتمام نظم	//	// ۱۱۶
۳۔	جرأت وصداقت	//	// ۴۱
۴۔	اہل بیت رسولؐ کی زندگی	//	// ۳۴
۵۔	معرکہ کانپور	//	// ۷۶
۶۔	علمائے زندانی	//	// ۷۸
۷۔	خواتین عرب کا اثبات واستقلال	//	// ۵۱

۸۔ ذوالفقار (ص ۸۸) پنج تن (ص ۷۴)

فتنۂ آخرالزماں (ص ۶۸)، ظہور امام

☆☆☆

کفر است انکار محمدؐ اور رگھونندن کشور شوقؔ

☆ جناب ابوزرعبدالاحد فرقانی

اردو کو محض مسلمانوں کی زبان کہنا ایسا ہی ہے جیسے سکہ کے صرف ایک رخ کو دیکھنا، برج نرائن چکبست منظوم اردو میں رامائن کے خالق، رام پرساد بسمل، دیا شنکر نسیمؔ مشہور زمانہ مثنوی ''گلزار نسیم'' کے خالق، غزل گو شعرا میں آنند نرائن ملا اور فراق گورکھپوری وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کے نام تو نہیں ہیں، غالبؔ و میرؔ کا کوئی ہمسر نہیں لیکن غالبؔ و میر نہیں ہوتے تو یہی میر ہو جاتے اور غالب رہتے۔ مؤرخ جب ہمارے عہد کی تاریخ رقم کرے گا تو اس میں پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، مالک رام صاحب جیسے مستند مبصر و ناقد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر جیسے شاعر، راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار، نغمہ نگار گلزار اور گرچرن سنگھ بشر اور سردار پنچھی وغیرہ کے ناموں سے کیسے صرف نظر کرے گا۔

سرزمین رام پور کو مدینۂ شعر و ادب بتانے والے جناب پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی تو اردو کو اپنا ایمان ہی نہیں بلکہ خود کو اردو کا امام اور بین الاقوامی زبان اور عالم بالا میں بھی وسیلۂ اظہار کی زبان اردو کو ہی بتاتے ہیں اور خود بھی سراپا اردو تہذیب کا حسین و جمیل مرقع نظر آتے ہیں۔

واللہ کہ ہر دل کی زباں ہے اردو

وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب ہے، کلچر ہے، علم تمدن ہے جو آدمی کو انسان بناتا ہے آداب محفل اور حسن سلیقہ سکھاتا ہے۔ کلچر کسی ایک مذہبی گروہ کا پروردہ نہیں ہوتا بلکہ ایک خطۂ ارض پر بسنے والے مختلف العقائد افراد اور جماعتوں کی مشترک ذہنی و قلبی کیفیتوں اور باہمی ارتباط اور انس و محبت کی آغوش میں غیر محسوس طور پر پروان چڑھ کر معرض وجود میں آجاتا ہے۔ نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار آج کل اردو کو محض مسلمانوں کے مذہب سے منسوب کر کے نسل نو کو ورغلانے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں جو حقیقت سے انحراف ہے۔

☆ سابق مینیجر اسٹیٹ بینک آف انڈیا۔ E-mail: ahad.furqani@yahoo.co.in

مردم خیز سرزمین رام پور اردو ادب کا گہوارہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل اسکول ہے شمالی ہند میں دہلی اور لکھنؤ کے درمیان تیسرے اسکول کی مستند و مسلم حیثیت رام پور کی ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ ریاست رام پور میں ارباب اقتدار نے علماء، ادبا اور شعراء کو اپنا ملازم نہیں سمجھا۔ یہاں بے شمار صاحب طرز ادیب وانشا پرداز، سحر البیان اور قادر الکلام مسلم وغیر مسلم شاعر پیدا ہوئے۔ انہیں میں ایک نام ہے آنجہانی جناب رگھونندن کشور شوقؔ صاحب کا جو سرزمین رام پور کے ایک معزز اور پڑھے لکھے اگروال خاندان میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے یہیں ابتدائی تعلیم پائی وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد رامپور آکر پہلے سرکاری وکیل بنے اور اپنی ذہانت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور نوابی ہی کے دور میں ریاست رامپور میں وزیر قانون کے اہم ترین عہدہ پر فائز کئے گئے، رام پور جو یقینی طور پر گنگا جمنی تہذیب کا اہم ترین مرکز ہے، جہاں مسلم وغیر مسلم باہم شیر وشکر ہو کر رہتے چلے آئے ہیں۔ باہمی اتحاد و اتفاق اور شیر وشکر ہو کر رہنے کی عادت آج بھی ہے اور تمام بیرونی سازشوں اور سیاست کی آلودگی کے باجود اس ماحول میں چشم بد دور کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ شوقؔ صاحب کو فطری میلان طبع اور رام پور کے علمی ماحول اور تہذیب نے شاعر بنا دیا اردو ہی نہیں فارسی شعر گوئی میں بھی دست گاہ کامل حاصل کی اردو اور فارسی کی تعلیم ''غیاث اللغات'' کے مؤلف غیاث الدین عزتؔ کے صاحبزادہ سے حاصل کی جو انہی کے محلہ راج دوارہ میں رہتے تھے۔ ذوق شاعری کے علاوہ حقانیت اور تصوف کی طرف طبیعت مائل تھی۔ رام پور کے ایک عزلت پسند گوشہ نشیں صوفی سید عرفان شاہ میاں کی صحبت اختیار کی اور غالباً مرید بھی ہو گئے تھے۔ مدح، نعت ومنقبت اور مثنوی میں دسترس تھی سہل اور زود گوئی ان کا وصف رہا ان کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

تمہارے جور کا شکوہ خدا سے زباں کٹ جائے جو میں نے کیا ہو

کیا زبان ہے سہل ممتنع کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، شوقؔ صاحب نے نعت میں تو بزبان فارسی ایک شعر ایسا کہہ دیا کہ تمام صاحبان ذوق اور محبان رسول کے دل ودماغ پر مرتسم ہو کر از بر ہو گیا ہے ؎

منم اے شوق بیگانہ ز اسلام ولے کفر است انکار محمدؐ

عقیدت مند لوگوں کی خوش گمانی ہے کہ عین ممکن ہے یہ شعر شوقؔ صاحب کی نجات، بخشش اور مغفرت کا سبب بن جائے۔

شوقؔ صاحب اخلاقی قدروں کے پاسدار، انتہائی ملنسار اور وضع دار آدمی تھے میرے ایک قریبی دوست اشوک کمار اگروال کے والد آنجہانی رام کمار اگروال صاحب ہندوستان پرنٹنگ پریس کے مالک جن کا مکان اور دروازہ شوق صاحب کے مکان محلہ راج دوارہ قیام گاہ غالب (ریاست رام پور میں مرزا غالب کی رہائش گاہ) سے متصل کوچہ پرمیشوری داس میں بالکل آمنے سامنے تھا، شوق صاحب کی وضع قطع اور میل جول رہن سہن کے بارے میں جب بتاتے تھے تو کچھ اس انداز سے کہ جیسے ان کے تصور میں کھو گئے ہوں، شوقؔ صاحب کی حیات میں ان کے بچے حصول تعلیم پھر بسلسلۂ معاش رام پور سے باہر جا بسے۔ شوق صاحب کے بڑے صاحب زادہ نریندر کشور صاحب جو کانپور میں رہائش پذیر ہیں نے اپنے والد کا کچھ کلام ''چند غزلیات'' کے نام سے ہندی میں شائع کرایا ہے شوق صاحب کا کلام تو بہت تھا لیکن دستیاب نہیں ہوسکا شوق صاحب کے مکان کے قریب ایک اچھی لائبریری ''گیان مندر'' ہے مگر وہاں بھی ان کا کلام فراہم نہیں ہے۔

امروہہ کے مصباح الدین صاحب نے رضا لائبریری کی ایما پر رام پور کے ہندو شعراء پر ایک تعارفی اشاریہ مرتب کیا ہے جس میں تقریباً تینتیس شعرا شامل کئے ہیں..........نمونۂ کلام کے طور پر صرف ایک یا دو اشعار شوق صاحب کے بھی دیے ہیں۔

رام پور کے ایک مشہور وکیل شوکت علی خاں نے ایک کتاب ''تاریخ رام پور'' تالیف کی ہے اسے رضا لائبریری نے شائع کیا ہے بڑی مقبول کتاب ہے اس میں منجملہ سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی مقتدر و مؤقر حضرات نے شوقؔ صاحب کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے۔

شوقؔ صاحب کے ہونہار فرزند خود بھی شاعری کا مزاج رکھتے تھے، سخن وری کی کوشش کی اور مذکورہ کتاب (بلکہ کتابچہ) 'چند غزلیات' میں اپنا کلام بھی 'ابن شوقؔ' کے تخلص سے شائع کیا ہے شوق صاحب کی کہی ہوئی فارسی مذکورہ نعت کا شعر 'منم اے شوق..........' زبان زد خاص و عام اور ان کی ابدی شہرت کا سبب بنا وہ دراصل ایک مخمس نظم کے آخری دو مصرعے ہیں پورا خمسہ یوں ہے:

گنہگارم ہمیں ترسم زانجام بہرلحظہ رسد از مرگ پیغام
بہ کاردیں منم مایوس و ناکام منم اے شوق بیگانہ ز اسلام
مگر کفر است انکار محمدؐ

اس سے پہلے کا خمسہ بھی بے پناہ عقیدت ومحبت اور روضۂ نبوی کی منظر کشی کا آئینہ دار ہے۔

همه دنیا و هستی سربسجده همه بالا و پستی سربسجده
همه آگاه و مستی سربسجده همه شاهان گیتی سربسجده
چه دربار است دربار محمدؐ

اور مخمس کا پہلا بند یوں ہے: جس میں آرزوئے دید اور غلامانا انکسار ملاحظہ ہو۔

کنم قربان بروضه جان خود را ببینم یک نظر امکان خود را
دہانم یاد خود پیمان خود را به یثرب چوں رسم مژگان خود را
کنم جاروب گل زار محمدؐ

ایک مشہور سکھ شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے سچ کہا ہے ؎

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

منتخب کلام ''چند غزلیات'' میں سے شوق صاحب کے کچھ اشعار اس طرح ہیں۔

اسی کا ذکر ہے، چرچہ اسی کا شام وسحر اسی کی یاد ہے عالم کی کچھ نہیں ہے خبر
الٰہی نوح کا طوفاں پھر نہ آجائے کسی کے در دِ محبت میں اشک بارہوں میں

فرط گریہ اور نوح کا طوفان بلا خیز کیا تشبیہ ہے:

پھر وہی مشق جفاہے وہی بیداد ہے بے مروت! اپنا وعدہ بھی تجھے کچھ یاد ہے
کہہ رہی ہیں یہ قفس کی تیلیاں تسکین رکھ قیدیٔ رنج والم کی بھی کچھ میعاد ہے

زبان دیکھیے:

اک ورق بھی نہ پڑھا تھا مرے افسانے کا ہنس کے کہنے لگے اک خواب ہے دیوانے کا
پسیجے سنگ دل ایسا اثر ہو الٰہی ایسی طاقت دے زباں میں

ایک غزل کے تین اشعار یوں ہیں ؎

خدا کے واسطے یوں ہی دل ناشاد رہنے دے مجھے برباد رہنے دے انہیں آباد رہنے دے
ترے جور وستم کے سارے افسانوں کو میں بھولوں سبق ضبط محبت کا مجھے بس یاد رہنے دے
نہ نکلے آہ دل سے اور نہ ہو عالم میں رسوائی مجھے خاموش تامحشر لب فریاد رہنے دے

اور شیدائے اردو نے یہ بھی کہا ہے ؎

یہ قربانی مری اے شوقؔ دیکھو میں کہتا ہوں کہ اردو کا بھلا ہو

رام پور کے ایک نامور کہنہ مشق استاد شاعر جناب ہوشؔ نعمانی نے رام پور کے قدآور اور سربرآوردہ شاعروں اور ادیبوں کا منظوم تعارف اپنی کتاب ''ادب گاہ رام پور'' میں بڑے فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ پوری کتاب استادانہ روش اور فن شاعری کی بہترین مثال کے طور پر ہمیشہ پڑھی جاتی رہے گی، ہوشؔ صاحب نے شوقؔ صاحب کے بارے میں جو اشعار کہے ہیں، اپنی محبت اور شوق صاحب کی شاعرانہ عظمت اور رسول اللہؐ سے عقیدت وارادت کے اعتراف میں واقعی حق ادا کردیا ہے۔ فرماتے ہیں:

قانون داں وہ صاحب حق صاحب سخن کرتا ہے ناز آج بھی ان پر مرا وطن
وہ فارسی کی جاں رگھو نندن کشور شوقؔ وہ نعت ہائے سرور عالمؐ کا ان کو ذوق
صد فخر اسم شوقؔ مرے لب پہ آئے ہے دل میں عقیدتوں کے یہ دریا بہائے ہے

☆☆☆

مقالات

حدیثِ رسولؐ اور شعرِ اقبال

پروفیسر عبدالحق

سیرتِ سرورِ عالمؐ شعری ثقافت کا سب سے محترم موضوع سخن ہے۔ تقریباً ہر سخن ور نے ذکرِ رسالت مآبؐ سے اپنی تخلیق کو پرنور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض شعرا اس نسبت کی برگزیدی سے بلندی پر فائز ہوئے۔ ان کی ناموری ناموس نبوت سے قائم ہوئی۔ شعری تخلیق کا ایک گراں قدر حصہ ذکر و فکر میں وظیفہ روز و شب ٹھہرا۔ شعرا کے جذب و شوق کا اظہار قاری کو عرفان و آگہی کے سوز و ساز سے سرشار کرنے کا باعث بنا۔ فن میں عشق و عقیدت کی یہ وارفتگی اور فراوانی کسی اور شخص سے وابستہ نظر نہیں آتی۔ ہماری ادبی ثقافت کا یہ امتیاز بھی ہے۔ ذات گرامیؐ کا تخلیقی محرک بن جانا معجزۂ فن کی دلیل ہے۔ تخلیق کی اس معجز نمائی کا مشاہدہ کرنا ہو تو کلام اقبال کا مطالعہ کیا جائے۔ صرف یہی موضوع پیشِ نظر رکھیے تو حیرتوں کا ایک جہان دیگر دکھائی دے گا۔ اقبال کے سرمایۂ قلم میں نہ نعت ہے اور نہ سیرتِ رسولؐ پر کوئی کتاب مگر تخلیقات میں ذکر حبیبؐ کی نور فشانی ہر سو جلوہ گر ہے۔ کہیں برملا و بے حجاب ہے تو کہیں پُراسرار حرفِ راز بن کر معنی کے نہاں خانوں میں پوشیدہ۔ اس ادراک کے لیے نگاہ کا شریک بینائی ہونا لازم ہے۔ تخلیقی تاریخ میں یہ ایک منفرد مثال ہے۔

شعرا اور سیر نگاروں نے پیغمبر اعظم و آخرؐ کی سیرت و شمائل کے بیان میں بے مثال عشق و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ تاریخ و تلمیح کے سہارے عرفانِ رسالت کے جو نذرانے قلم بند کیے ہیں وہ بنی نوع انسان کی علمی و تخلیقی سرمایہ کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ کائنات کی کسی شخصیت سے نہ یہ عشق ملتا ہے اور نہ سرمایۂ علمی ہی محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کی سب سے عظیم اور مقدس سعادت ہے۔ اقبال کا یہی خاص امتیاز ہے کہ حضور رسالت مآبؐ سے ان کا عشق اور وفورِ شوق جذب و جنوں کی انتہاؤں سے ہم آہنگ

۲۳۱۵۔ہڈسن لائن، کنگس وے کیمپ، دہلی ۔۹، فون: ۹۳۵۰۴۶۱۳۹۴۔

ہے۔اس کے ساتھ انہوں نے رسولِ کریمؐ کی ذاتِ مبارک کو حکمت و دانائی میں سراپا نور قرار دیا ہے۔ یہ مفکرانہ نسبت اقبال کو بہت محبوب ہے کیوں کہ آنحضرتؐ کی شخصیت مفکر اعظم و آخر کی ہے۔اقبال نے اپنے عشق کو وجدان والہام سے ہم آمیز کیا ہے۔جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔احادیث کے انتخاب میں یہ پُراسرار نکتہ پیش نظر رہا ہے۔اس موضوع پر گفتگو میں اقبال کے اس اقرار واعتراف پر توجہ لازم ہے۔

ایں ہمہ از لطف بے پایانِ تست   فکر ما پروردۂ احسانِ تست

(در حضور رسالت مآبؐ پس چہ باید کرد)

اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کے بیکراں لطف وعنایت کے آغوش میں ان کے فکر ونظر کی پرورش ہوئی ہے۔اس بے پایاں احسان کا اقرار مطالعۂ اقبال میں بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اقبال کی دروں بینی کے اس احساس تک دریابی کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔گویا ان کے فکری نظام کا مصدر اعظم نبی برحق کی ذات گرامیؐ ہے۔اقبال نے اشارے کیے ہیں کہ ان کے علم ومطالعہ میں دانشِ افرنگ نے اضافہ کیا ہے۔اور مشرق کے صاحبِ نظراں نے سینے کو پُر نور کیا ہے مگر خاکِ مدینہ نے فکر ونظر اور لوح وقلم کو بینائی بخشی ہے۔اقبال معترف ہیں کہ عالم آب وخاک میں اسی کے ظہور سے سب کو فروغ نظر حاصل ہے۔اسی ذات مبارک کی بدولت ہر ذرۂ ریگ کو طلوعِ آفتاب کی تابانی میسر ہے۔اس ذات تک رسائی ہی دین ودانش کا مقصود ومنتہا ہے۔

اگر بہ او نہ رسیدی   تمام بولہبی است

کلام اقبال میں عشق وعقیدت کے بے پایاں جذب وشوق کی سایہ نشینی سے پوری فضا جمال آفریں ہے۔کیوں، خدا محبوب تر گردد نبیؐ۔

جب یہ صورت ہو تو محبوب کے تمام متعلقات یا مناسبات سبھی عزیز تر ہوتے ہیں۔سیرت و شخصیت کے ساتھ اقوال وکردار کی سبھی ادائیں جسم وجان سے زیادہ پیاری ہوجاتی ہیں۔اقبال کے اشعار میں جگہ جگہ اسوۂ رسولؐ یا منصبِ نبوت کا تذکرہ ہے۔ساتھ ہی ذاتِ اقدسؐ کے ارشادات کا حوالہ بھی منظوم ہوا ہے۔

فکر اقبال کا سب سے اہم سرچشمہ قرآن ہے۔اقبال کی تحریروں میں قرآن کریم کے حوالے جس کثرت سے ملتے ہیں وہ تخلیقی ادب میں ایک نایاب نظیر ہے۔شعر اقبال کی بلاغت اور فکر کی بلندی کا

ایک اہم سبب صحفِ سماوی کے حوالے ہیں۔اقبال کی آرزو تھی کہ وہ قرآن کی تفسیر قلم بند کرتے، دوسرے تصنیفی منصوبوں کی طرح یہ اہم کام بھی انجام نہ پاسکا۔رموزِ بیخودی میں سورۂ اخلاص کی منظوم تشریح و تعبیر ان کی بنیادی فکر کی اہم ترجمان بن گئی ہے۔مختصر سورت کے لیے ایک سو سولہ اشعار منظوم کیے گئے ہیں۔قرآن اور اقبال کے سلسلے میں اقبالیات میں قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔مستعمل آیات میں جن نکات کی طرف اقبال کے اشارے ہیں وہ اقبال کے تفسیری رویے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اقبال نے نثری تحریروں میں بھی آنحضرتؐ کے اقوال قلم بند کیے ہیں اور ان کی فلسفیانہ تشریح بھی کی ہے۔قرانی آیات کے ساتھ احادیث رسولؐ کی شرح و تفصیل بھی اقبال کے پیشِ نظر ہے۔انھوں نے خطبات میں سیرت سرورِ کونینؐ کے حکیمانہ پہلوؤں پر اپنی وسعتِ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ''مضامین اقبال'' میں آنحضرتؐ کے قولِ مبارک پر ایک مقالہ قلم بند کیا ہے جو نظریۂ ادب کا سب سے اہم اور مہتم بالشان ضابطۂ تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔اس مقالے کا عنوان ہے ''جناب رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ'' آنحضرتؐ نے امراء القیس کی شاعری پر ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ ''اشعر الشعرا و قائدھم الی النار'' یعنی وہ شاعروں کا سردار تو ہے مگر جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔تخلیق کا یہ نصب العین نہیں ہے کہ حقائق زندگی سے گریز سکھائے اور تخیلات کی ساحری میں گمراہ کرے۔ادب نشاطِ زیست کا ترجمان نہیں ہے۔گویا فن برائے فن ایک اندوہ ناک تصور ہے۔اسی حدیث کو اقبال نے مرقعِ غالب کے مقدمہ میں بھی دہرایا ہے۔(۱) اسی مقالے میں اقبال نے مشہور شاعر عنترہ کے شعر پر آنحضرتؐ کے تعریفی کلمات کو نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندے کو دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے''۔(۲) عنترہ کا شعر صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی اور بولتی تصویر ہے جو تعیش کی جگہ سخت کوشی وجد و جہد کو دعوت دیتی ہے۔یہی تخلیق کی معراج ہے کہ زندگی کی کشاکشوں سے نبرد آزما ہو۔گویا آپ نے چودہ سو برس پہلے ادب برائے زندگی کو خوش آمدید کہا تھا۔

''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے پہلے خطبہ علم اور مذہبی مشاہدات میں مشہور حدیث ''لاتسبوا الدھر'' کی تشریح کی گئی ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ احادیث نبویؐ سے فکر اقبال کو ایک فلسفیانہ گرویدگی ہے۔عقیدت و احترام سے قطع نظر انہیں اقوال رسولؐ سے مفکرانہ نسبت ہے یہی وجہ ہے

کہ انہوں نے سرورِ کونینؐ کو حکمت و دانائی کا عظیم پیکر تسلیم کیا ہے۔ اشعار میں دانائے سبل، گوہر حکمت، الکتاب اور لوح و قلم کے معنی خیز الفاظ موجود ہیں۔

گوہر حکمت بہ تارِ جانِ امت سفتۂ ای

(باقیات)

درجہانِ ذکر و فکر ِ انس وجاں تو صلوتِ صبح تو بانگِ اذاں
ذکر و فکر و علم وعرفانم توئی کشتی و دریا و طوفانم توئی

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

اشعار میں منظوم احادیث کی فکر افروز حکمت بہت نمایاں ہے اقبال مفکر شاعر ہیں۔ لازم تھا کہ ایسے ہی اقوال کا انتخاب ہو جو فلسفیانہ جہانِ معنی سے معمور ہوں۔ اقبال نے احادیث سے اجتہادی استدلال بھی کیا ہے، جیسے آپؐ کا قول ''لا نبی بعدی'' اس کا منطقی نتیجہ ہوگا کہ لا قوم بعدی اس سے اقبال کے فکری منہاج و معیار اور طریق استدلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

اقبال نے تخلیقی حسن آفرینی کے ساتھ کلام میں احادیث رسولؐ کو جزوِ فن بنا دیا ہے۔ حدیث پاک کے حوالوں کی کثرت فارسی شاعری میں ہے یہ اردو میں بہت کم منظوم ہوئے ہیں۔ باقیات میں حسبِ ذیل احادیث منظوم کی گئی ہیں۔

۱۔ تیرا رتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے
۲۔ اے کہ حرفِ اطلبو الوکان بالسین گفتہ ای
۳۔ ماعرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری

یہ دونوں مصرعے نظم ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' اور ''فریادِ امت سے'' ماخوذ ہیں۔ نظم ''ماتم پسر'' کا مصرع ہے۔

۴۔ مقصد لحمک لحمی پر کھلی ان کی زبان

اردو کلیات میں بس برائے نام حوالے ہیں۔ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا یہ مصرع ضعیف حدیث کا ترجمہ قرار دیا گیا ہے۔

میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' کے مصرع میں مشہور حدیث منظوم ہے:

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

بالِ جبریل کی غزل ۴۶ کے مقطع میں بھی یہ حدیث دہرائی گئی ہے:

جہاں مقام ہے میراث مرد مومن کی میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اردو کے مجموعوں میں ذکر حدیث کی یہ صورت نہیں ہے سبب نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ضرور ہے کہ فارسی میں موضوعات اور مواقع مختلف النوع ہیں۔ ان حوالوں کی وہاں زیادہ گنجائش تھی۔ راقم کا یہ محض قیاس ہے۔

قرآن کریم کی طرح اقبال نے اقوالِ رسولؐ سے بھی اپنے فکر ونظر کی تشکیل میں بڑی مدد لی ہے، ہم جانتے ہیں کہ فلسفہ زمان ومکاں کے سلسلے میں اقبال فکری طور پر اضطراب سے دوچار تھے۔ معاصر علما واکابرین دانش سے دریافت کرتے رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی رہ نمائی نہ ہوسکی۔ لیکن انہیں حدیثِ رسولؐ نے بڑی استقامت بخشی۔ اسرارِ خودی، ان کی پہلی شعری اور فکری تخلیق ہے۔ خودی کے وجود ونمود اور پہنائی کا مسئلہ خاصا پیچیدہ تھا۔ انہوں نے قول نبیؐ سے مدد لی اور زمان ومکاں کے تصورات کو مربوط کیا۔

زندگی از دہر ودہر از زندگی است لا تسبو الدہر فرمانِ نبیؐ است

اقبالیاتی مطالعہ میں یہ موضوع خاصا اہم اور دقیق مسائل پر مشتمل ہے۔ انہوں نے رموزِ بیخودی اور پیام مشرق میں الوقت سیف' اور 'نوائے وقت' کے عنوان سے نظمیں لکھی ہیں۔ 'زمانہ' کے نام سے بالِ جبریل میں بھی ایک نظم کے علاوہ متفرق اشعار ہیں جو اس فکری نکتے کی وضاحت کرتے ہیں۔ ضربِ کلیم کا یہ شعر بڑی حکیمانہ معنویت کا حامل ہے۔

خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

''اسرارِ خودی'' میں سب سے پہلے اس حدیث پر نظر پڑتی ہے جو ''خودی از سوال ضعیف می گردد'' کے ذیل میں نقل کی گئی ہے:

آں کہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رفت　　مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

ذاتِ گرامیؐ کا ارشاد ہے ''الکاسب حبیب اللہ''یعنی محنت کش مزدور اللہ کا دوست ہے۔

تا کجا روز وشب باشی اسیر　　رمزِ وقت از لی مع اللہ یاد گیر

حدیث لی مع اللہ وقت کی طرف اشارہ ہے۔

'رموزِ بیخودی' میں پہلی حدیث ہے:

بہر آں شہزادۂ خیر الملل　　دوش ختم المرسلین نعم الجمل

یہاں حدیث ونعم الجمل جملکما ونعم العدلان انتما کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پیشِ پیغمبر چو کعب پاک زاد　　ہدیۂ آورد از بانت سعاد

گفت سیف من سیوف اللہ گو　　حق پرستی جز براہِ حق مپو

آپؐ کا قول ہے ''سیف من سیوف اللہ'' اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار پیغمبر اعظم وآخرؐ کے بارے میں ایک بہت مشہور اور معتبر حدیث مروی ہے۔

کنت نبیا و آدم بین الماءِ والطین

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز　　بود اندر آب وگل آدم ہنوز

ترمذی شریف میں ہے قال آدم بین الروح والجسد (کہا اور آدم ابھی روح اور جسد کے مابین تھے)

ایک دوسری حدیث کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے:

آنکہ نازد بر وجودش کائنات　　ذکر او فرمود باطیب وصلوۃ

سورہ اخلاص کی تفسیر میں حدیث کا اشارہ ملتا ہے:

آں امنّ الناس بر مولائے ما　　آں کلیم اولِ سینائے ما

حدیث کے الفاظ ہیں: ''امنّ الناس علیٰ فی صحبتہ ومالہ ابوبکر''

لست منّی گویدت مولائے ما　　وائے ما اے وائے ما اے وائے ما

آپ نے فرمایا تو میری قوم سے نہیں ہے۔

''پیامِ مشرق'' میں ایک آیت کریمہ کا حوالہ ہے مگر حدیث کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں اقبال کا نقشے

کے بارے میں جو مصرع بہت مقبول ہوا:

قلبِ اومومن دماغش کافراست

محسوس ہوتا ہے کہ بدونِ حوالہ آنحضرتؐ کے ایک قول کا اشارہ ہے۔ حضور رسالت مآبؐ کے عرب شاعر امیہ ابن الصلت کے لیے فرمایا تھا "امن لسانہٗ و کفر قلبہٗ"۔

اقبال کے مطالعہ اور یادداشت کو آفریں ہو کہ انھوں نے احادیث و اقوال کو حافظے کے نہاں خانے میں محفوظ رکھا اور تخلیق میں نگیں سازی سے کام لیا۔ ان کے کئی اشعار بدون حوالۂ حدیث کے بھی ہیں جن میں جزوی عبارت یا اشارے موجود ہیں۔ حدیث کے بے کراں ذخیرۂ علمی پر ان کی حکیمانہ نگاہ ہے۔ جن کی مدد سے وہ کلام کو علمی تقدیس سے ہم آمیز کرتے ہیں۔ تخلیق کو تقدیس کے مقام معراج تک رسائی کے لیے اقبال کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مشرقی ادبیات میں اقبال کا یہی مقام محمود ہے، بنی نوع بشر کی نغمہ سرائی فکر اقبال کا سب سے نمایاں امتیاز و افتخار ہے۔ وحدتِ آدم کے تصور پر اقبال سے زیادہ کسی مفکر نے توجہ نہیں دی ہے۔ انھوں نے قوموں کی وحدت کو اندوہ ناک بتایا ہے۔ اور وحدت آدم کو ترجیح دی ہے۔ اس تصور کے سرچشمے احادیث نبویؐ میں موجود ہیں۔ تمام عالم کو عیال اللہ کہا گیا ہے۔ اقبال کا شعر ملاحظہ ہو جس میں حدیث کا حوالہ نہیں ہے۔ مگر مفہوم کی معنویت پورے موثرات کے ساتھ موجود ہے۔

حرفِ بد را برلب آوردن خطا است　　کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است

اس طرح کے کئی اشارے کلام میں قلم بند ہوئے ہیں جو حدیث کے ترجمان ہیں۔

"زبورِ عجم" اور "گلشنِ رازِ جدید" میں بھی بہ ظاہر کوئی حدیث درج نہیں ہے، "جاوید نامہ" میں کئی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ جو موقع کی مناسبت سے بہت موزوں ہیں اور فکر کی تازگی اور تمازت سے معمور ہیں۔ ان کی مدد سے اقبال نے اپنے افکار کو معنویت سے آراستہ کیا ہے۔ زروان کہ روح زمان و مکان است کے ذیل میں حدیث پر نظر پڑتی ہے۔ اس حدیث کو دو شعروں میں دہرایا گیا ہے:

لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست　　آن جواں مردے طلسم من شکست

گر تو خواہی من نباشم درمیاں　　لی مع اللہ باز خواں از عین جاں

اس سے قبل اس حدیث پاک کو "اسرار خودی" میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا

ہے کہ اقبال کو زمان و مکاں کے تصورات کی تشکیل و تعبیر میں سرورِ کونینؐ کے ارشاد سے توثیق و تصدیق ہوئی۔ جاوید نامہ میں دوسری حدیث بھی بڑی خوبی سے شعر میں ڈھالی گئی ہے۔ افغانی کی زبان سے ادا کی گئی ہے:

از حدیث مصطفیؐ داری نصیب دین حق اندر جہاں آمد غریب

حدیث ہے کہ ''الاسلام جاء غریب......''

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ صرف ایک لفظ سے حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ متن کو پیش نہ کر کے صرف ایک لفظ سے پوری حدیث کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اقبال نے کئی مقامات پر قرآن کی آیات کے ساتھ بھی اختصار و اشارے کی اس صورت سے کام لیا ہے۔ جاوید نامہ میں خواجۂ اہل فراق کی زبان سے حدیث پاک نقل کی گئی ہے:

گفتمش ''بگذر ز آئین فراق ابغض الاشیاء عندی الطلاق''

جاوید نامہ کے اختتام 'خطاب بہ جاوید' کے آخر میں دو حدیثوں کا ذکر ہے:

ضعف ایمان است و دل گیری است غم نوجوانا ! نیمۂ پیری است غم

نیمہ پیری سے اشارہ ہے: اللّٰھم نصف الحرام۔

می شناسی ؟ حرص فقر حاضر است من غلام آنکہ بر خود قاہر است

یہاں بھی فقرِ حاضر کہہ کر حدیث مراد ہے جس کا متن ہے: ایّاکم والطمع فانّہٗ الفقر الحاضر۔

کبھی کبھی شعری ضروریات یا مجبوری کے سبب بھی صرف اشاراتی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی ایسا کیا ہے۔ اگرچہ عام قاری کی بساط فہم کے لیے یہ اشارے مشکل ہوتے ہیں۔ لیکن شارحین اور مترجمین نے تفہیم آسان کر دی ہے۔ اقبال نے اقرار کیا ہے کہ سیلِ معانی کو ضبط کرنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی قلندر نے اسرارِ کتاب کی وضاحت کر دی۔

مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' ایک مختصر شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی چند احادیث مذکور ہیں۔ 'فقر' کے ذیل میں یہ شعر ہے جس میں متن کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے حدیث کا متن یا اس کا کوئی حصہ نقل نہیں کیا گیا ہے۔

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں

حضور اکرمؐ کی مشہور حدیث کی طرف تلمیح کا اشارا ہے۔ جس میں ارشادِ رسولؐ کے مطابق ''تمام روئے زمین میری مسجد ہے'' 'دراسرارِ شریعت' میں دوسری حدیث ہے۔

مال را گر بہرِ دیں باشی حمول　　نِعمَ مَالٌ صَالحٌ گوید رسولؐ

اسی نظم میں تیسری اور انتہائی فکر انگیز حدیث پاک کو منظوم کیا گیا ہے:

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست　　چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست

آپؐ نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ''اتقو فراست المومن فانہ ینظر بنور اللہ''۔

''سیاسیاتِ حاضرہ'' نظم میں ایک بہت ہی مشہور حدیث کو منظوم کیا گیا ہے:

در بدن داری اگر سوزِ حیات　　ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت

اس تلمیح میں قولِ نبیؐ کو دہرایا گیا ہے کہ نماز مومن کے لیے معراج ہے: الصلوۃ معراج المومنین۔

نظم 'حرفے چند با امتِ عربیہ' کا مطلع ہے:

اے در و دشتِ تو باقی تا ابد　　نعرۂ لاقیصر و کسریٰ کہ زد

ذاتِ گرامی کا ارشاد ہے کہ هلك قيصر فلا قيصر بعدهٗ..........

مثنوی 'مسافر' میں حسب ذیل حدیث پاک کی تلمیح موجود ہے: لی خرقتان الفقر والجهاد۔

خرقۂ آں '' برزخ لا یبغیان　　دیدمش در نکتہ لی خرقتان

یہاں قرآن اور حدیث دونوں کی تلمیح موجود ہیں۔ 'ارمغانِ حجاز' میں بھی چند اقوال رسالت مآبؐ کے حوالے بہ طور تلمیح موجود ہیں۔ ایک رباعی کے آخری شعر میں ''من رانی فقد رای اللہ'' کو منظوم کیا گیا ہے۔ مشہور حدیث:

چارم کن بہ صبحِ ''من رانی''　　شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

حدیثِ پاک کا مفہوم ہے ''جس نے مجھے دیکھا اس نے اللہ کو دیکھا'' ارمغان کی ایک رباعی میں دو حدیثوں کو دو شعروں کے قافیے میں قلم بند کر کے اقبال نے جذبِ دروں کو شعری پیکروں میں پیش کیا ہے:

مسلماں را ہمیں عرفان و ادراک کہ در خود فاش بیند رمزِ لولاک
خدا اندر قیاسِ ما نگنجد شناس آں را کہ گوید ما عرفناک

ذاتِ گرامیؐ کے مقام و منصب کے عرفان و ایقان کے لیے دونوں حدیثیں بار بار پیش کی گئی ہیں یعنی کائنات کی تخلیق کا سبب ذاتِ مبارک کا وجود ہے۔ گویا آپ نہ ہوتے تو عالم افلاک نہ ہوتا نہ یہ ارض و سما ہوتے نہ ہی کوئی شے خلق ہوتی۔ دوسری حدیث کو اقبال پہلے بھی نقل کر چکے ہیں: ''ماعرفناك حق معرفتك'' محمدؐ کا عرفان ہی اللہ کا عرفان ہے یعنی آنحضرتؐ کے عرفان کے بغیر ذاتِ باری تعالیٰ کا عرفان ممکن نہیں ہے۔ جیسے کہ رسولؐ کی محبت یا اطاعت ہی اللہ سے محبت اور اس کی اطاعت ہے۔ یہی مرکز محبت ہے اور یہی مقامِ نبوت بھی جس کے ذکر و فکر سے اقبال کا کلام اپنی نورفشانی میں بے نظیر تخلیقات کا روشن آتش کدہ ہے۔ جس میں نورِ نبوت کا ہر شرر شعلۂ جہاں تاب کی طرح جلوہ ساماں ہے۔ سیرتِ رسولؐ کے کردار و گفتار سے نسبتوں کے فسانے اور زمانے دونوں عجیب ہیں جو فردائے قیامت تک کے لیے سخن کے سوز و گداز کو حقیقت ابدی میں بدل دیتے ہیں۔ اس معروضے اور مشاہدے کے لیے بارِ ثبوت کے طور پر کلام اقبال کافی ہے۔

تخریجِ احادیث

(۱) مسجد من ایں ہمہ روئے زمین است۔ ''أعطيت خمسا لم يعطهن أحد قبلي: نصرت بالرعب مسيرة شهر وجعلت لي الأرض مسجداً وطهوراً فأيما رجل من أمتي أدركته الصلاة فليصل، وأحلت لي الغنائم ولم تحل لأحد من قبلي، وأعطيت الشفاعة وكان النبي يبعث إلى قومه خاصة وبعثت إلى الناس عامة'' (بخاری و مسلم)۔ (۲) ''میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے''، اس مضمون کی کوئی حدیث احقر کے علم میں نہیں ہے اور کتبِ حدیث میں سرسری تلاش سے ملی بھی نہیں۔ (فتاویٰ عثمانی، مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبۂ معارف القرآن: کراچی ۱/۲۲۵)۔ (۳) لولاك ما خلقت الأفلاك امام شوکانی نے موضوع مانتے ہوئے اپنی کتاب ''الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة'' (ص ۳۲۶) میں یہ قول ذکر کیا ہے۔ (۴) نعم المال الصالح للرجل الصالح صحیح ہے (صحيح الأدب المفرد، ح ۲۲۹) کشف الخفاء بتحقیق هنداوی

(۳۸۷/۲)، حدیث نمبر ۲۸۲۳۔(۵) اطلبوا العلم ولو کان بالصین ضعیف ہے اور بعض علما نے موضوع قرار دیا ہے۔ حوالہ سابقہ (۱۵۶/۱) حدیث نمبر ۳۹۷۔(٦) ما عرفناك حق معرفتك حدیث کے طور پر اہل سنت کی کتابوں میں یہ جملہ نہیں ملا۔(۷) الصلاة معراج المؤمن حدیث نہیں ہے لیکن نماز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں مسلمانوں کے لیے تحفے کے طور پر ملی تھی اس لیے مفہومی طور پر نماز مسلمانوں کی معراج ہے۔ نماز میں ان کا خشوع خضوع ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہیں۔(۸) لحمك لحمی الہیثمی کی مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (۱۱۱/۹) حدیث نمبر ۱۴۶۵۴ کی عبارت اس طرح ہے: ''هَذَا عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ لَحْمُهُ لَحْمِي وَدَمُهُ دَمِي، فَهُوَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي''، اس حدیث کو الطبرانی نے بیان کیا ہے اور حدیث ضعیف ہے۔(۹) الفقر فخری وبه أفتخر، كشف الخفاء تحقيق هنداوی (۱۰۲/۲) حدیث نمبر ۱۸۳۵ ضعیف۔(۱۰) لا تسبوا الدهر فإن الدهر هو الله، حدیث ان الفاظ کے ساتھ صحیح مسلم میں روایت کی گئی ہے۔ دیگر الفاظ میں یہ حدیث بخاری وغیرہ دیگر کتب حدیث میں بھی ملتی ہے۔ كشف الخفاء تحقيق هنداوی (۴۳٦/۲) حدیث نمبر ۳۰۲۰ صحیح۔(۱۱) الکاسب حبیب الله: اہل سنت کی احادیث کی کتابوں میں یہ جملہ حدیث کے طور پر نہیں ملا البتہ بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں میں یہ جملہ حدیث کے طور پر ہے، مثنوی رومی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال یہ حدیث نہیں ہے۔ باقی حلال کسبِ معاش اور اپنے ہاتھ سے کمائی کی فضیلت میں صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں۔(۱۲) لی مع الله وقت لا يسعنی فيه ملك مقرب ولا نبی مرسل ملا علی القاری نے اپنی کتاب الأسرار المرفوعة فی الأحاديث الموضوعة (حدیث نمبر ۳۹۲) میں اسے موضوع احادیث میں شامل کیا ہے۔(۱۳) نعم الجمل جملكما: علما نے اسے ضعیف اور منکر و باطل بتایا ہے۔ تشبیہ بھی غیر مناسب ہے۔(۱۴) خالد بن الوليد سيف من سيوف الله، صبه الله على الكفار حدیث صحیح ہے۔ كشف الخفاء تحقيق هنداوی (۴۳۰/۱) حدیث نمبر ۱۱۹۵۔(۱۵) كنت نبيًا وآدم بين الماء والطين ان الفاظ میں صحیح حدیث نہیں ملتی۔ اس معنی میں صحیح حدیث اس طرح ہے: كنت نبيًا وآدم بين الروح والجسد۔ كشف الخفاء تحقيق هنداوی (۴۳۰/۱) حدیث نمبر ۲۰۰۷ کے تحت۔(۱٦) طیب صلوۃ واضح نہیں ہے۔(۱۷) إِنَّ أَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي مَالِهِ وَصُحْبَتِهِ أَبُو بَكْرٍ (صحیح مسلم تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی (۱۸۵۴/۴) حدیث نمبر ۲۳۸۲۔(۱۸) لست منی غیر واضح ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ''أنت منّی'' کی تحریف ہو۔

بخاری ومسلم ودیگر کتبِ حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں آتا ہے: ''أنت منّي وأنا منك''۔ (۱۹) آمن لسانہ و کفر قلبہ یا آمن شعرہ و کفر قلبہ ان الفاظ میں یہ عبارت مختلف کتابوں میں وارد ہوئی ہے بعض کتابوں میں یہ عبارت، خاص طور پر ''آمن لسانہ و کفر قلبہ''، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے۔ کشف الخفاء تحقیق ھنداوی (۱/ ۲۶) نمبر ۱۹ کے مطابق الفاظ یہ ہیں: ''آمن شعر أمية بن أبی الصلت و کفر قلبہ'' اور اس کی سند ضعیف ہے۔ (۲۰) الاسلام جاء غریب ایسی کوئی حدیث نہیں ملی، نحوی طور پر بھی جملہ غلط ہے۔ صحیح مسلم (۱/ ۱۳۰) حدیث نمبر...... میں اس موضوع پر حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا، وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا، فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ''۔ (۲۱) أبغض الأشياء عندی الطلاق ان الفاظ میں کوئی حدیث نہیں ملی۔ اس موضوع پر یہ حدیث ملی ہے: ''أبغض الحلال إلى الله الطلاق'' اس حدیث کو بعض علما نے صحیح مانا ہے اور دوسرے اسے ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (۲۲) اللھم نصف الحرام غیر واضح ہے، جملہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ شاید ''الھم نصف الھرم'' ہو اور ایک اور قول ہے: ''الھم نصف الداء'' لیکن یہ سب اقوال ہیں، حدیثیں نہیں۔ (۲۳) إیاکم والطمع؛ فإنه الفقر الحاضر کشف الخفاء (۱/ ۱۲-۳۱۱) برقم: ۸۵۹)، شیخ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (۲۴) اتقوا فراسة المؤمن، فإنه ينظر بنور الله ضعیف ہے۔ کشف الخفاء (۱/ ۵۰-۵۱) حدیث نمبر ۸۰۔ (۲۵) إِذَا هَلَكَ كِسْرَى فَلَا كِسْرَى بَعْدَهُ وَإِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ، فَلاَ قَيْصَرَ بَعْدَهُ، یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے، یہاں مسلم شریف کے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ (اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان) (۳/ ۳۰۸) برقم ۱۸۴۸)۔ (۲۶) لی خرقتان الفقر والجہاد بظاہر کسی کا قول ہے حدیث نہیں، ممکن ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کوئی قول ہو۔ (۲۷) من رآنی فقد رأی اللہ یہ حدیث نہیں بلکہ عیسائی نظریہ یا ان کی مقدس کتاب میں آنے والے جملے کا عربی اسلامی ترجمہ ہے ''من رآنی فقد رأی الأب''، ظاہر ہے ''الأب'' سے مراد خدا ہے (العیاذ باللہ)۔

بخاری شریف (۹/ ۳۳، حدیث نمبر ۶۹۹۷) میں آتا ہے: ''مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَأَى الحَقَّ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لاَ يَتَكَوَّنُنِي'' یعنی جس نے مجھے (خواب میں) دیکھا، اس نے حقیقتاً (مجھے ہی) دیکھا، کیونکہ شیطان میری شکل اختیار نہیں کرسکتا۔ یہاں۔ الحق، ''حقا'': درحقیقت کے معنے میں ہے۔

مدحِ پیمبرؐ بزبانِ حیدرؓ

شمائلِ نبویؐ سے متعلق حضرت علیؓ کے اشعار پر مشتمل وصلیاں

ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

اولڈ کیمیو مشین فیکٹری، لال مسجد۔ رام پور

nadwiirshad@gmail.com

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہٗ نہ صرف آنحضرت ﷺ کے عم زاد برادر اور اُن ؐ کی شرف دامادی سے مشرف اور خلفاء راشدین میں سے ہیں بلکہ تمام صحابۂ کرام میں علم و فضل، زہد و تقویٰ میں ممتاز اور تمام سلاسل تصوف اسلامی کا سرچشمہ بھی ہیں۔ آپ بلند حوصلہ، اور نہایت جری و بہادر تھے۔ ضرارؓ بن ضمرہ کے مطابق آپ کی ہر بات فیصلہ کن' اور ہر فیصلہ عدل وانصاف پر مبنی ہوتا تھا۔ ہر پہلو سے علم کے چشمے پھوٹتے تھے اور حکمت و دانائی ٹپکتی تھی۔ دنیا کی رعنائیوں سے بے نیاز، مگر رات کی تاریکیوں میں عابد و زاہد تھے۔ مفکر و عبرت پذیر تھے۔ سادہ لباس اور معمولی خوراک پسند تھی۔ غریبوں کو پہلو میں بٹھاتے، دینداروں کی تعظیم کرتے۔ طاقتور لوگ ان سے باطل کی طمع نہ کرتے اور کمزور انصاف سے مایوس نہ ہوتے تھے۔ رات کی تاریکی میں اپنی داڑھی ہاتھ میں لئے مار گزیدہ کی طرح تڑپتے اور آنکھوں سے آنسو بہتے اور فرماتے: اے دنیا! کسی اور کو فریب دے، مجھ سے لگاوٹ نہ کر، میں نے تجھے تین طلاقیں دیدی ہیں۔ تیری عمر تھوڑی، تیرا مقصد حقیر ہے۔ ہائے سفر بہت طولانی ہے راستہ وحشت ناک اور زاد سفر مختصر ہے۔

حضرت علیؓ فطرۃً للہیت اور خلوص نیت کے پابند تھے۔ اصول اسلام اور اعمال دین ان کے خمیر کا جز تھے۔ آنحضرت ﷺ سے محبت اور اپنی ذات کا شعور، اسلام کی بصیرت اور اس کا تحفظ حاصل حیات تھا۔ تبلیغ اور حفاظت دین ان کا منصب و مقصد تھا۔ وہ ہر حالت میں اسی کام کیلئے وقف تھے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ نے بالادستی حاصل کرنے میں خونریزی' اور خطرناک اختلافات کے امکانات دیکھے۔ تاریخ کے اس موڑ پر آپ کا غیر معمولی تدبر کام آیا۔ اور اسلام کو باہمی تصادم سے بچا کر اپنی صوابدید سے، تبلیغ و مشاورت سے قوت بخشی۔ قرآن مجید کی ترتیب وتدوین اور کتابت، حکام وقت کو اقدامات میں اپنی رائے سے مطلع کرنا، مقدمات میں اسلامی فیصلے اور ممکن حد تک قرآن وسنت کے نفاذ میں جد وجہد، آپ کی

سیاست کا جوہر ہے۔ دشمنوں پر لشکر کشی کے وقت انھوں نے مشورے دئے۔ فتوحات کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں فیصلہ کیا، مفتوحہ زمینوں اور نئے ٹیکسوں جیسے نئے معاملات میں قانون سازی کی۔ مقدمات میں فیصلے، مشکلات میں رہنمائی، سیاسی بحران میں مفاہمت اور اختلاف میں اتحاد کو فوقیت دی۔ ہر موقع پر ان کی رائے کو برتری حاصل رہی۔ حضرت علیؓ بیک وقت شمشیر آزما قائد و فاتح بھی تھے اور بے مثل خطیب و کاتب بھی، وہ قرآن مجید کے سب سے بڑے مفسر، اسلامی علوم کے مؤسس، مدرّس وشارح بھی ہیں اور کمال ایثار وجاں فروشی کے مظہر بھی۔ اخلاق وصفات، فکر و نظر، عقیدہ وعمل کی اس محیر العقول ذات کا یہ معجزہ ہے کہ آج تک تمام مسلمان بلااختلاف انھیں حق و صداقت کا مجسمہ، اور ان سے عقیدت کو شرط اسلام جانتے ہیں۔

عوام کی شورش، جنگ کے ہنگامے، مخالفین کے منصوبے سامنے تھے لیکن حضرت علیؓ پہاڑوں سے زیادہ ثابت قدمی کیساتھ اپنی جگہ قائم تھے۔ وہ ادنی سی جانبداری، معمولی سے اشتعال، انتقام پسندی یا ناجائز پروپیگنڈہ کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ جنگ جمل میں اونٹ کے محاصرہ کے بعد حضرت ام المومنین کا سابقہ احترام برقرار رکھا۔ صفین میں فرات پر دشمن کا قبضہ اور پانی کی بندش، اور پھر فتح مندی کے بعد گھاٹ پر دشمنوں کو آنے جانے کی اجازت، آخری معرکہ میں قرآن مجید کے احترام میں جنگ بند کرنا، علوی سیاست کے وہ لاجواب کارنامے ہیں جن کے پیش نظر آپ کے تدبر کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ ان اقدامات نے اسلام کے انسانی حقوق واحترام کو جاودانی عطا کی، حضرت علیؓ کو دلوں کا فاتح قرار دیا۔ ان فیصلوں نے حضرت علیؓ کو انسانی ضمیر کی آواز مانا۔ الطبری، جاحظ، ابن عبد ربہ، ابن جنّی، ابن مزاحم، الیعقوبی، اور سید رضی نے حضرت علیؓ کے جو خطبے اور خطوط، اقوال اور ارشادات محفوظ کئے ہیں ان سے ابن ابی الحدید، محمد عبدہٗ، توفیق الفکیکی، جارج جورداق نے حضرت علیؓ کے سیاسی اور ریاستی تدبر کی داد دی ہے۔ اور جب تک تحقیق و مطالعہ کے مردان راہ حضرت علیؓ کے ان خطبات اور خطوط کو سیرت وتاریخ کے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے حضرت علیؓ کے مناصب روحانی، کمالات معنوی ودینی روشن سے روشن تر ہوتے جائیں گے۔

حضرت علیؓ کا مدینہ سے نقل مرکز ان کے سیاسی تدبر کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے حرمین کا احترام باقی رہا۔ اس اقدام نے ان پیش قدمیوں کو روک دیا جن سے منافقین و مخالفین کی ریشہ دوانیاں حرمین کے تقدس کو پامال کر سکتی تھیں۔ اس کی وجہ سے مخالفت کا شامی مرکز، ایران میں پروپیگنڈہ کے امکانات سے محروم ہو گیا۔ کوفہ سے عراق وایران، اور مصر تک اسلامی اخلاق، اسلامی اقدار، اور اسلامی تعلیمات کا ضابطہ جاری کیا جو مدینہ میں رہنے سے نہ ہو سکتا تھا۔ اصول حکمرانیِ اسلام میں جن باتوں کو آپ نے بنیادی اہمیت دے کر فروغ بخشا وہ یہ تھے: عقیدۂ توحید، للہیت و تقوی، قرآن وسنت پر مبنی عدل وایثار، جنگ سے بچاؤ کی سعی، اور جنگ کی حالت میں انسانی واسلامی اقدار کی حفاظت، اسلامی معاشرہ وعقائد کی اشاعت، ان کا احیا و قیام، حاکم و محکوم میں

قربت، بالادستی میں ناجائز فوائد کے حصول کی روک تھام، کمزور اور شکست خوردہ لوگوں سے حسن سلوک، دولت اندوزی کا سدِّ باب، قانون شریعت کے نفاذ میں سستی اور غفلت کی ممانعت، ماضی کی یاد اور مستقبل کی تعمیر، عبادت و تقویٰ کا فروغ، اصول اخلاق میں راست بازی، رحم و شفقت، سخاوت، اور جہالت و غربت کے خلاف مسلسل جہد وجہد، تعلیم و تربیت میں، ہمدردی، انکسار و فروتنی، خود فراموشی وایثار وغیرہ۔ان تمام مسائل کے لئے دیکھئے: امام حسنؓ کے نام وصیت نامہ، مالک بن اشتر کے نام مکتوب دستور، اور دیگر خطوط، (: نہج البلاغۃ ج ۲)۔

حضرت علیؓ کم و بیش چار سال نو مہینے، آٹھ دن اقتدار میں رہے۔اس مدت میں انھوں نے سب سے پہلے گذشتہ بد نظمیوں کو دور کیا اور بد عنوانیوں کا قلع قمع کیا۔ تقسیم وظائف اور گورنروں کے تقرر کا نیا نظام جاری کیا۔بیت المال کو مرکزی خزانہ قرار دے کر تنخواہوں اور وظیفوں کی بے اعتدالی ختم کی۔پرانے گورنروں کی جگہ نئے گورنر مقرر کئے۔متعدد محاذوں پر فوج بھیجی۔مختلف علاقوں میں نگراں فوجی سردار، اور محصل متعین کئے۔

علمی آثار:

حضرت علیؓ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے؛"أنا دارُ الحكمة و عليٌّ بابُها" میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔اور یہ بھی حدیث ہے: "أنا مدينةُ العلمِ و عليٌّ بابُها" میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ حقیقت میں آپ علوم کا سر چشمہ ہیں۔آپ کی زندگی کا پورا زمانہ علم و عمل کی خدمت میں بسر ہوا۔ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے۔قرآن مجید کے سب سے بڑے حافظ و محافظ، اور عالم اور اپنے ملکۂ خداداد کی وجہ سے علوم دین کے مبلغ و معلم تھے۔چنانچہ درج ذیل علمی آثار مرتب فرمائے۔ مثلاً:

قرآن مجید: حضرت علیؓ نے آیات اور سورتوں کو نزول کے اعتبار سے مرتب فرمایا اور قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر بیان فرمائی۔

حدیث: مشہور ہے کہ آپ نے احادیث و قضایا واحکام قلم بند فرمائے تھے۔اس مجموعہ کا نام "الصحیفۃ" تھا (البخاری۔ کتاب الفرائض) اس کے علاوہ ان سے احادیث کثیر تعداد میں مروی ہیں۔بعض حضرات نے انھیں الگ بھی جمع کرکے "مسند علیؓ" نام رکھا ہے۔

خطبات و خطوط: صدر اوّل میں جس قدر خطبات و خطوط حضرت علیؓ سے مروی ہیں اور علمائے ادب نے جس قدر انھیں محفوظ رکھا ہے، اس کی مثال نہیں ہے۔ان مجامیع و مفردات میں سب سے زیادہ شہرت عام پانے والے چند یہ ہیں: غرر الحکم ودرر الکلِم، : نہج البلاغۃ، کلمات قصار، عیون الحکم واصول معاجز الکلم، دیوان امیر المومنینؓ، عجائب احکام و قضایا و مسائل امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ، الصحیفۃ العلویہ۔

''نہج البلاغۃ'' مرتبہ سید الشریف الرضی میں تقریباً ۲۳۶ خطبات، ۷۱ خطوط، ۴۸۰ کلمات جمع کئے گئے ہیں۔اس نے ادب عربی میں بے نظیر مقبولیت حاصل کی۔ اس کی سینکڑوں شرحیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی وغیرہ میں چھپ چکی ہیں۔ نہج البلاغۃ کا سب سے قدیم مخطوطہ جو رضالائبریری میں محفوظ ہے اس کو عربی فارسی اردو و انگریزی میں تحقیقی مقدمہ کے ساتھ رضالائبریری نے مئی ۲۰۱۳ء میں شائع کیا ہے۔

رامپور رضالائبریری میں موجود حضرت علیؓ کے آثار:

قرآن مجید:

۱۔ رضالائبریری کے ان نادر نسخوں میں سب سے قدیم اور سب سے اہم امیر المومنین حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلی صدی ہجری کا کلام پاک ہے جو اونٹ کی کھال پر لکھا ہوا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ جن کو رسالت مآب ﷺ نے خود باب العلم کہہ کر پکارا ہے جنھوں نے بچپن سے لیکر وفات نبوی تک مکمل تیس سال حضور ﷺ کی خدمت و رفاقت میں بسر کئے تھے کاتبانِ وحی میں آپ کا نامِ نامی شامل ہے قرآن و حدیث سے اجتہاد اور مسائل کے استنباط میں آپ کو ید طولی حاصل تھا، خلفاء ثلاثہ بھی آپ سے مشورہ کرتے تھے۔ رامپور رضالائبریری میں آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن پاک موجود ہے جس میں ۳۴۳ اوراق ہیں، کوفی رسم الخط میں اونٹ کی کھال پر لکھا ہوا ہے۔ سائز ۲۰ X ۲۸ سینٹی میٹر ہے۔ ہر ورق پر ۱۵ یا کہیں ۱۶ سطریں ہیں اور ہر دو ورق کے بیچ میں ہرن کی جھلّی لگائی گئی ہے تاکہ روشنائی آپس میں مل کر پھیل نہ سکے۔ اس مصحف شریف کے شروع میں حافظ محمد اسرائیل نقوی امروہوی کے لکھے ہوئے تقریباً سات 'تعارفی اوراق' شامل ہیں اس تعارف کو پڑھ کر اس نسخہ سے متعلق بہت سی اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ تعارف ۱۳۳۱ھ، ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ قرآن شریف اصلاً نواب حامد علی خاں نواب رامپور (متوفی ۱۹۳۰ء) کے تبرکات امام باڑہ میں شامل تھا۔ اور یہ کلام اللہ نوادراتِ زمانہ اور عجائبات روزگار میں سے ہے۔ اور قدیم زمانہ کی طرزِ کتابت اور حسن خط پر ایک روشن دلیل ہے۔ زمانہ کی دست برد نے اس کی تکمیل میں نقصان پیدا کر دیا ہے اور بعض اوراق گم ہو گئے ہیں۔ اس بات میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ یہ مصحف ابتدائی دورِ اسلام کا لکھا ہوا ہے حسنِ خط اور خوبیِ کتابت اس کے ہر حرف سے نمایاں ہے بلکہ حدِّ اعجاز پر فائز ہے۔ کیا عجب کہ یہ خیال صحیح ہو کہ یہ حضرت علیؓ کے ہی دست مبارک کا لکھا ہوا ہو۔

بہر حال امیر المومنین حضرت علیؓ کے دست مبارک کی طرف منسوب یہ کلام پاک پندرہ سو سال قبل لکھے گئے قلمی نسخے کی شکل میں رضا لائبریری کی زینت ہے۔ اس قرآن پاک کو دیکھنا خود ایک بہت خوبصورت احساس ہے اس کو دیکھنے کی حسرت لئے دور دور سے زائرین آتے ہیں۔

(۱۱۹۰): نہج البلاغۃ

بہت مشہور کتاب جو ۴۰۰ ہجری اور ۱۰۱۰ عیسوی میں لکھی گئی اور جس کو عبد الجبار بن حسین بن ابی القاسم الحاجی الفارانی نے ۵۵۳ ہجری اور ۱۱۸۵ عیسوی میں کتابت کیا۔ اور خود انھوں نے اسکو فضل اللہ بن عبد اللہ بن عبید اللہ الحسنی الراوندی کیساتھ اس پر نظر ثانی کی۔ یہ اچھی حالت میں اور مکمل ہے۔ سائز 25x10.5 اوراق کی تعداد 160-1/2 ہے۔ جو از ۸ الف تا ۱۶۹ الف ہیں۔ فی صفحہ ۲۵ سطریں ہیں۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔ ابتدا یوں ہے۔:۔" اما بعد ! حمد الله الَّذِی جَعَلَ الحَمدَ ثَمناً لِنُعَمَائِہ۔ " اس کی ایک کاپی علی گڈھ میں ہے جس کا نمبر ۱۲۷ ہے۔

(۱۱۹۳): نہج البلاغۃ

یہ مخطوطہ اچھی حالت میں ہے۔ تیرھویں صدی ہجری اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ اچھی حالت میں ہے۔ اور مکمل ہے۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔ یہ کاپی نہایت خوبصورت اور مزیّن ہے اور صفحہ ۹۶ ب سے ۴۰۸ ب کے حاشیہ پر لکھا ہوا ہے۔ لائنوں کے درمیان میں فارسی ترجمہ بھی موجود ہے۔

(۱۱۹۶): نہج البلاغۃ

یہ نسخہ قدرے کرم خوردہ ہے۔ ۱۲۶۳ ہجری اور ۱۸۴۷ عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ مکمل ہے۔ اسمیں ۱۹۳ اوراق ہیں۔ اور سطریں ۱۹ فی صفحہ ہیں۔ اس کا سائز ۳۱٫۸x۲۳ ہے۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔

(۱۱۹۷): نہج البلاغۃ

یہ نسخہ تیرھویں صدی ہجری اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے اور نامکمل ہے۔ اس میں ۴۸ اوراق ہیں اور فی صفحہ ۱۳۔۱۷ سطریں ہیں۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔ ابتدا یوں ہے:"وَمِن خُطبَۃٍ لَہٗ عَلَیہِ السَّلَام : اَیُّہَا الغَافِلُون غَیرِ المَغفُولِ عَنہُم"

(۱۱۹۸): شرح نہج البلاغۃ

یہ: نہج البلاغۃ کی شرح ہے۔ عزالدین ابو حامد عبد الحمید بن ھبۃ اللہ المدائنی المعتزلی "ابن ابی الحدید" (متوفی ۶۵۶ ہجری مطابق ۱۲۵۸ عیسوی) اس کے شارح ہیں۔ جنھوں نے اس کو (۴۹۔۶۴۴ھ ۱۲۴۷-۵۱ء) کے درمیان مؤید الدین 'ابن علقمی' (متوفی ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ عیسوی) کیلئے لکھا۔ رسم الخط نستعلیق ہے۔ سائز 33x23.8 ہے۔ اوراق 396-1/2 ہیں۔ جو ۳ ب سے ۳۹۹ ب تک ہیں۔ فی صفحہ 21 سطریں ہیں۔ یہ نسخہ نامکمل ہے۔ جلد اول (جزو نمبر ۱ تا ۱۰) پر مشتمل ہے۔ یہ کاپی بری طرح کرم خوردہ ہے۔ اور ۱۱ رویں صدی ہجری اور ۱۷ ویں صدی عیسوی کا کتابت کیا ہوا ہے اور ۱۰ خوبصورت لوح اور رنگین مذہب جدول سے سجایا گیا۔

اس کی ابتدا یوں ہے۔:"الحَمدُ لِلّٰہِ الوَاحِدِ العَدلِ ۔الحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی تَفَرَّدَ بِالکَمَال"

(۱۱۹۹) شرح: نہج البلاغۃ۔

یہ بھی: نہج البلاغۃ کی شرح ہے لیکن اس کے شارح نہیں معلوم۔ بری طرح کرم خوردہ ہے۔ کتابت گیارھویں صدی ہجری اور سترھویں صدی عیسوی ہے۔ سائز 24x16.5 ہے۔ اور سطریں ۱۸ فی صفحہ ہیں۔ اور غلطی سے مصنف کے معاصر احمد بن ناصر کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔ حواشی بھی موجود ہیں۔

ابتدا یوں ہے: "اَلحَمدُ لِلّٰهِ الَّذِی نَجَّانَا مِن مَهَاوِی الغَیِّ وَظُلُمَاتِهِ"

(۱۱۹۸)۔ شرح: نہج البلاغۃ

از عزالدین ابو حامد عبد الحمید بن ہبۃ اللہ المدائنی المعتزلی 'ابن ابی الحدید' (م ۶۵۶ھ ، ۱۲۵۸ء)۔ رسم الخط نستعلیق۔ سائز 33x23.8 ورق ۳۹۷، کتابت: (۴۹۔۶۴۴ھ ، ۵۱۔۱۲۴۷ء) برائے مؤید الدین ابن علقمی (م ۶۵۶ھ، ۱۲۵۸ء)، ۱۰ خوبصورت لوح مطلّا، مذہب۔ ابتدا: الحمد للہ الواحد العدل۔الحمد للہ الذی تفرّد بالکمال۔

(۱۱۹۹)۔ شرح: نہج البلاغۃ:

رسم الخط نستعلیق۔ سائز 24x16.5۔ ورق ۱۳۱۔ سطر فی صفحہ ۱۸۔

بری طرح کرم خوردہ۔ کتابت گیارھویں صدی ہجری و سترھوی صدی عیسوی۔ ابتدا: الحمد للہ الذی نجّانا من مہاوی الغیّ وظلماتہ۔

۱۱۹۵۔ وصایاامیر المومنین، ابن بابویہ القمی۔

(۱۱۹۳)۔ مأۃ کلمۃ (مکمل)

رسم الخط عربی نسخ۔ کتابت (۱۲۹۷ھ، ۱۸۸۸ء)، ورق ۶۲ تا ۶۹ کے حاشیہ پر فارسی ترجمہ کیساتھ فارسی رباعیات کی شکل میں ہے۔ ابتدا: الشرف عند اللہ بحسن الاعمال۔

(۱۱۹۳)۔ کلام امیر المؤمنین۔

رسم الخط عربی نسخ۔ مکمل اچھی حالت میں۔ زمانہ تیرھویں صدی ہجری و انیسویں صدی عیسوی۔ ورق ۶۹۔۷۷ کے حاشیہ پر فارسی ترجمہ کے ساتھ۔ ابتدا: استعین علی العدل بحسن النیۃ۔

(1193)۔ کلام امیر المؤمنین۔

سائز 21x 35.5 ۔ ورق ا۔ از ۸۸ب تا ۸۹ الف۔ درمیان میں فارسی ترجمہ از اسعدی۔ ابتدا: بسم اللہ اشرف العبادۃ: الاخلاص والشہادۃ۔

(۱۲۱۰)۔ نور الابرار المبین:

از صدر الدین محمد بن غیاث الدین منصور بن صدر الدین محمد بن ابراہیم الشیرازی الطبیب (م ۱۵۵۵

۹۶۲ء)۔ کرم خوردہ و آب زدہ۔ مکمل۔ سائز20 x15 ۔ ورق ۳۳۔ سطر فی صفحہ ۱۴۔ رسم الخط نسخ۔: نہج البلاغۃ ودُررُالحکم سے منتخب وصایا۔ ورق اپر ۱۱۶۶ھ و ۱۷۵۳ء کا ایک نوٹ ہے اور تین مہریں ہیں۔

ابتدا: الحمد للّٰہ الذی خلق الانسان بقدرتہ۔

عمدۃ الطالب فی انساب ابی طالب، ابی عتبہ، نزل الابرار فی فضائل الائمۃ الاطہار، مرزا محمد بدخشی، رسالہ فی بیان سرّالشہادہ۔

مطبوعات عربی:

دیوان علیؓ (نمبر ۱۰۱)۔ فن نظم عربی، ۲۔ دیوان علیؓ وشرح مغلقاتہ: مولوی عبد القصیر۔ (کال نمبر ۱۰۲) فن شرح نظم عربی۔ ۳۔ الامام علی بن ابی طالب: شعرہٗ وحکمہٗ، شیخ احمد تیمور باشا۔ (تاریخ الخلفا عربی۔ کال نمبر ۳۰)

شمائلِ نبویؐ سے متعلق عربی اشعار اور وصلیاں:

اسی طرح حضرت علیؓ کے نوادرات میں یہ پچپن عربی اشعار بھی ہیں جو حلیۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعلق ہیں۔ یہ سلاست و روانی، عقیدت کی فراوانی، اسلوب کی طاقت اور جذبات کی شدّت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی خطاطی کے نمونے رضا لائبریری کے نادر و نایاب ذخیرۂ مخطوطات کا انمول خزانہ ہیں جو اب تک قارئین کی دسترس سے محروم ہیں۔ اِن وصلیوں پر خطّاط کا نام درج نہیں ہے۔ احقر نے کوشش کی ہے کہ شعر کا مفہوم بامحاورہ اور مؤثر طریقہ پر واضح ہو جائے۔ شمائل ترمذی میں درج حلیۂ نبوی سے متعلق روایات کو بھی مدّ نظر رکھا جائے تو ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

وصلیوں کا ترجمہ:

تقریباً ۱۵۔۱۶ برس پہلے کی بات ہے جب میں رضا لائبریری کے کیٹلا گرس روم میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا درگاہ مکن پور سے متعلق مغلیہ فرامین پر اپنا کام کر رہا تھا جو کہ اب دو جلدوں میں مکمل اور طباعت کے لئے تیار ہے۔ ایک روز اچانک سابق او ایس ڈی ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی مرحوم میرے پاس آئے۔ اس وقت میرے سامنے کی سیٹ پر مرحوم و مغفور سید احمد فنان و خطاط (مصنف "خط کی کہانی تصویروں کی زبانی") اپنی میز پر حضرت علیؓ کی اِن وصلیوں کی کیٹلاگنگ کا کام کر رہے تھے۔ اور یہ پچپن وصلیاں ان کی میز پر ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ صدیقی صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ "ان کو ذرا پڑھئے کیا لکھا ہوا ہے"۔ ایک دو کو پڑھ کر ان کا مطلب پوچھا پھر گویا ان پر وجد ساطاری ہو گیا۔ خوش ہو کر مجھ سے کہا کہ "آپ اِن تمام وصلیوں کا اردو میں ترجمہ کر ڈالئے تو ایک بہت بڑا کام ہو جائے گا"۔

چنانچہ میں نے ان پر کام شروع کر دیا۔ ایک وصلی سید صاحب سے لے لیتا اور کام کر کے انھیں واپس کر دیتا۔ اس طرح دھیرے دھیرے یہ سارا کام مکمل ہو گیا۔ جو میں نے ٹائپ کر کے وقار الحسن۔ صدیقی صاحب

کے حوالہ کردیا۔انھوں نے اس کو پڑھااور میری پیٹھ تھپتھپائی اور اشاعت کا وعدہ کیا۔افسوس کہ پھر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ اہم کام طاق نسیاں کی نذر ہو کر طباعت سے محروم رہا۔

یہاں پر ان اشعار کے مضامین کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

اِن اشعار کے مطابق آنحضرت ﷺ کے حسن میں زبردست ملاحت شامل تھی اور آپ کا جمال دلوں کو مسخر کرلیتا تھا۔جب آپ جلوہ افروز ہوتے تو چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی۔آپ نہایت موزوں قد و قامت والے تھے اور اکلوتی چال کے مالک تھے یعنی اس چال میں کوئی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔آپ کا سر مبارک بڑا اور زلفیں رات کی طرح سیاہ تھیں اور بال اتنے گھنے ملیح اور پر کشش تھے کہ جن کی نظیر نہیں مل سکتی۔مخلوقات میں سب سے زیادہ ملیح و خوبصورت آپ ہی کی ذات تھی۔اور آپ کے بال کنگھی کیے ہوئے تھے گھنگریالے اور چھوٹے نہ تھے۔سیاہ تھے اور بیحد پیارے لگتے تھے۔آپ کے بالوں کے پٹھے کانوں کی لو سے آگے نہیں جاتے تھے۔رنگ کھلتا ہوا تھا۔سینہ پر بالوں کی ایک لکیر تھی جس کی ابتدا اوپر کی طرف سے گلے سے ہوتی تھی اور نیچے کی جانب ناف پر ختم ہوتی تھی۔سینہ مبارک اور دونوں شانے خوبصورت کشادہ تھے۔بالوں سے سینہ مبارک خوبصورت لگتا تھا اور بالوں کی کثرت سینہ کے اگلے اور درمیانی حصے پر تھی۔اسی طرح آپ کے بازو اور شانے بھی خوبصورت و حسین تھے۔آپ ﷺ کی آنکھیں مکمل سیاہ تھیں جو دلوں کو مسخر کرلیتی تھیں اور حاسدین کے بھی ہوش اڑا دیتی تھیں۔وہ روشن معتدل طور پر بڑی اور چشمہ کی مانند نہایت پر کشش تھیں۔چشمہ تو صرف زمین کو نفع بخشتا ہے جبکہ وہ آنکھیں تمام مخلوقات کو حسن اور فیض بخشتی ہیں۔چشمہ کا فائدہ صرف پھلوں تک محدود ہے جبکہ ان مقدس آنکھوں کا فیض تمام مخلوقات کیلئے عام ہے۔سراپا حسن، مکمل سفید، سفیدی میں سرخی شامل۔دست مبارک سخاوت میں فراخ، قدم مبارک کشادہ، شب معراج عرش پر پہنچنے والے جن کے نیچے دنیا و آخرت کی ساری بلندیاں حاصل ہوتی ہیں۔آپ اتنے خوبصورت اور نورانی تھے کہ عشاق پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔چلتے تو تیز چلتے گویا نشیب کی طرف پانی بڑھ رہا ہے۔پیشانی مبارک چوڑی، بھنویں کمان کی طرح، دونوں بھنویں جدا جدا تھیں۔پیشانی مبارک پر دونوں بھنوؤں کے درمیان ایک رگ تھی جو بسا اوقات غصہ کے وقت ابھر آتی تھی۔بینی مبارک خوبصورت اور قدرے بلند جس کا اگلا حصہ قدرے مرتفع، کان اتنے حسین جو کسی نے نہ سنے نہ دیکھے، ریش مبارک گویا تاریکی میں نور تھی۔آپ کی ذات بابرکت ہر جاندار کے لئے رحمت تھی۔دونوں رخسار مبارک گداز تھے جن سے نور پھوٹتا تھا۔تمام خوبیاں آپ کے چہرۂ مبارک میں جمع تھیں، منھ قدرے کشادہ جن سے نکلا ہوا ہر لفظ نعمت، دندان مبارک بھی کشادہ جن میں نور ہی نور تھا۔گردن مبارک ساری مخلوق کی گردنوں سے اچھی، خوبصورتی میں چاند، جس میں عزت کے ہار تھے۔اعضائے مبارک مضبوط اور موزوں، چال سراپا رحمت، اور درمیانہ چال چلتے تھے جو حسن کی تکمیل کرتی تھی۔بازو لمبے۔اور اخلاق و عادات میں اعتدال تھا۔آپؐ کا وصف بیان کرنا کوئی کھیل نہیں کیونکہ آپ کی وضع قطع کا کوئی ثانی نہیں ہے اور راقم الحروف، ہاشمی

"آپ کے غم فراق سے چور ہے جو آپ کے عُلوِّ مرتبت سے ناواقف اور اپنی کوتاہ فہمی کا معترف ہے۔اللہ ہی آپ کی شان کو بہتر جانتا ہے۔وہی آپ کے بیان سے پوری طرح واقف ہے۔اے پروردگار اس راقم کی کمیوں کو دور فرمادے اور اپنے فضل سے اس کے گناہوں کو معاف فرمادے۔(آمین)۔

ان اشعار میں بیان کردہ سراپائے رحمت کتب حدیث و سیرت میں بیان کردہ تفصیلات سے قریب تر ہے۔اور ان میں جذبات کی شدت، تشبیہات کی ندرت، اور شعری استعارہ کا حسن بھی شامل ہے نیز شعری حسن کو نثری پیرایہ میں منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا البتہ اس کے نفس مضمون یا مفہوم کو ضرور بیان کیا جاسکتا ہے۔کیا بعید ہے کہ یہ اشعار جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہیں واقعی آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوں پھر تو ان کے حسن زبان و بیان کی لطافت کا کیا کہنا کیونکہ حضرت علیؓ سے زیادہ حضور کی معرفت کسے تھی۔ حضرت صاحب دیوان شاعر تھے اور آپ کا دیوان مطبوعہ ہے۔خطاط نے اپنے فن خوشنویسی کا پورا زور صرف کرکے ان میں چار چاند لگادئے ہیں۔یقیناً یہ وصلیاں رامپور رضا لائبریری کا ایسا بیش بہا خزانہ ہیں جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

یہ وصلیاں بہت بڑے سائز میں بہت خوبصورت انداز میں لکھی گئی ہیں۔خطاط نے اپنا نام تو نہیں دیا ہے لیکن جس طرح اس نے کمالِ خط کے جوہر دکھائے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ہر شعر کے اوپر درود پاک (صلی علیہ الہنا) بھی لکھا ہے۔میں نے طغرائی شکل میں نہایت ساحرانہ وفنکارانہ طور پر لکھے گئے ان شعروں کی مشکل عبارت کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔اور جس قدر سمجھ سکا اس کو اردو میں منتقل کردیا۔جواب مکمل طور پر کتابی شکل میں طباعت کے لئے تیار ہے۔ان وصلیوں میں خطاط نے ہر شعر کا فارسی ترجمہ بھی شامل کیا ہے جو بہت ہی باریک قلم سے ہر مصرع کے نیچے سرخ روشنائی سے دیا ہوا ہے۔

ذیل میں ان اشعار کا متن اور اردو ترجمہ دیا جارہا ہے :

متن اشعار مع اردو ترجمہ

قَرْنُ الْمَلَاحَۃِ حُسْنُہٗ　　　وَالْحُسْنُ صَارَ قَرِیْنُہٗ

آپ ﷺ کے حسن میں ملاحت شامل تھی اور حسن سے آپ کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

صَادَ الْقُلُوْبَ جَمَالُہٗ　　　شَاعَ الْآفَاقَ جَلَالُہٗ

آپ ﷺ کا جمال دلوں کو شکار کرتا تھا۔اور آپ کا جلال آفاق پر چھایا ہوا تھا۔

وَالْبَدْرُ یَقْصُرُ نُوْرُہٗ　　　اِذَا مَا اسْتَبَانَ ظُہُوْرُہٗ

جب آپ ﷺ جلوہ افروز ہوتے تو چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی۔

مَرْبُوْعُ قَدٍّ کَانَّہٗ　　　وَاللّٰہُ اَعْظَمُ شَانَہٗ

گو آپ ﷺ میانہ قد و قامت والے تھے۔پر قسم اللہ کی بڑی شان والے تھے۔

لٰکِنْ یُّطَاوِلُ جَارَہٗ　　　وَھُوَ الْمُفِیْضُ بِحَارَہ

اپنے پڑوسیوں پر جود و کرم کی بارش فرماتے اور اپنی (سخاوت) کے دریا بہاتے تھے

إِذْ مَايُمَاشِيْهِ اَحَدٌ قَدْ كَانَ يُعْلِيْهِ الصَّمَدُ

آپؐ کی رفتار میں اگر کوئی آپ کی ہمسری کرتا تو خدائے بے نیاز آپؐ کو اس پر بالاتری عطا فرماتا۔

وَالْعَظْمُ كَانَ لِهَامَتِهٖ وَالْحُسْنُ كَانَ لِقَامَتِهٖ

آپ ﷺ کا سر مبارک بڑا تھا اور قد و قامت نہایت خوبصورت تھی۔

كَاللَّيْلِ سُوْدٌ شَعْرُهٗ فَاضَ الْعَجَائِبَ بَحْرُهٗ

آپ ﷺ کی زلفیں رات کی طرح سیاہ تھیں اور آپؐ (کے علم) کا سمندر عجائبات پیش کرتا تھا (اشارہ ہے آیت یعلم الکتاب والحکمۃ کی طرف)

شَعْرُ الْحَبِيْبِ تَكَثُّراً رَجُلاً مَلِيْحاً فِي الْوَرىٰ

حبیب پاک کے بال اتنے گھنے تھے کہ (اس کی وجہ سے) مخلوقات میں آپ سب سے زیادہ حسین و جمیل نظر آتے تھے۔

شَعْرٌ مُّشَيَّطٌ لَاقَطَطٌ سُوْدٌ وَدُوْدٌ لَاسَبَطٌ

آپؐ کے بال کنگھی کئے ہوئے تھے، گھنگریالے نہ تھے۔ کالے تھے بہت بھلے لگتے تھے چھوٹے نہ تھے

إِذْ مَايُوَفِّرُ جُمَّتَہٗ لَيْسَتْ تُجَاوِزُ شَحْمَتَہٗ

آپؐ کے گھنے بال اگر آپ کے وقار میں اضافہ کرتے تھے تو وہ کانوں کی لو سے آگے نہیں جاتے تھے۔

قَدْ كَانَ اَزْهَرُ لَوْنُہٗ وَهُوَ الْمُبَارَكُ كَوْنُہٗ

آپ ﷺ کا رنگ بہت کھلتا ہوا تھا۔ اور آپؐ کی ہستی نہایت مبارک و مسعود تھی

عَظُمَتْ رُؤُسُ عِظَامِہٖ كَبُرَتْ وُجُوْهُ مَرَامِہٖ

آپ کی ہڈیوں کے کنارے بڑے تھے اور آپ کے مقاصد عظیم تر تھے۔

كَالْخَطِّ يَجْرِىْ شَعْرُهٗ اَعْلىٰ حُدُوْدِهٖ نَحْرُهٗ

آپؐ کے (سینہ پر) بالوں کی ایک لکیر تھی جس کی ابتدا اوپر کی طرف حلق سے ہوتی تھی۔

اَسْفَلُ حُدُوْدِهٖ سُرَّهٗ لِلنَّاظِرِيْنَ مُسَرَّهٗ

اور اس کی انتہا نیچے کی طرف ناف پر ہوتی تھی جو دیکھنے والوں کو خوشی و مسرت سے ہمکنار کرتی تھی۔

اَلْمَنْكِبَانِ وَصَدْرُهٗ عَرُضَتْ وَرُفِعَتْ قَدْرُهٗ

آپؐ کے دونوں شانے اور سینہ مبارک کشادہ تھے اور آپؐ عالی قدر ہستی تھے۔

بِالشَّعْرِ زُيِّنَ صَدْرُهٗ لَا كُلَّہٗ بَلْ صَدْرُهٗ

آپؐ کا سینہ مبارک بالوں سے آراستہ تھا لیکن پورا سینہ نہیں بلکہ اگلا اور درمیانی حصہ

أَيْضاً ذِرَاعَاهُ بِہٖ وَالْمَنْكِبَانِ بِسِرْبِہٖ

آپؐ کے دونوں بازو اور کشادہ شانے بھی اسی طرح بالوں سے آراستہ تھے۔

عَيْنَاهُ صَادَ قُلُوْبَنَا اَللَّحْظُ صَارَ كُلُوْبَنَا

آپؐ کی آنکھیں ہمارے دلوں کو شکار کرتی تھیں اور آپؐ کی نگاہ سے ہمارے زخم بھر جاتے تھے

کُمِّلَ السَّوَادُ سَوادُهَا لِلْحَاسِدِيْنَ حُصَادُهَا

آپؐ کی آنکھیں مکمل سیاہ تھیں جو (اپنے حسن کی وجہ سے) حاسدوں کو بھی زیر کر دیتی تھیں۔

اَلْعَيْنُ عَيْنٌ بِالنَّظَرْ بَلْ كَانَ عَيْنَاهُ ذَا قَدَرْ

آپؐ کی آنکھیں بظاہر چشمہ کی مانند لگتی تھیں پر حقیقت میں چشمہ سے زیادہ حسین و جمیل تھیں

عَيْنٌ مَّضِيٌّ مُّرْتَفَعْ عَيْنٌ مَّلِيٌّ مُّشَفَّعْ

آپؐ کی دونوں آنکھیں روشن اور بڑی اور دراز تھیں (یا سفارش کرنے والی تھیں)۔

اَلْعَيْنُ تَنْفَعُ فِي الثَّرىٰ عَيْنَاهُ حَسَّنَتِ الْوَرىٰ

چشمہ تو صرف زمین کو نفع بخشتا ہے جبکہ آپ کی آنکھیں تمام مخلوقات کو حسن و زیبائی سے سرفراز کر تی تھیں۔

عَيْنَاهُ تُحْيِ ذَا النَّظَرْ اَلْعَيْنُ تَنْفَعُ فِي الثَّمَرْ

آپؐ کی آنکھیں ہر اہل نظر کو زندگی بخشتی تھیں جبکہ چشمہ صرف پھلوں کے لئے مفید ہے۔

أَيْضاً بَيَاضُهٗ قَدْ كُمِّلْ وَالْحُسْنُ فِيْهِ مُشْمَلْ

آپ مکمل طور پر گورے چٹے تھے جس میں حسن و جمال کی آمیزش تھی۔

قَدْ شَاعَ فِيْهَا حُمْرَهْ لِلنَّاظِرِيْنَ مُسَرَّهْ

آپؐ کا گورا رنگ سرخی مائل تھا جسے دیکھ کر ناظر باغ باغ ہو جاتا تھا۔

لِلْجُوْدِ وَسِعَ كَفُّهٗ كُلُّ بَخِيْلٍ كَفُّهٗ

جود و سخاوت میں آپ کا ہاتھ اس قدر فراخ تھا کہ ہر بخیل کو بھی آپ کی سخاوت سے حصہ ملتا ہے۔

قَدَمَاهُ أَيْضاً وَاسِعاً فِي الْعَرْشِ لَيْلاً رَافِعاً

آپؐ کے پاؤں مبارک بھی کشادہ تھے جن کو (شب معراج میں) عرش تک رسائی کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

مِنْ تَحْتِ كَانَتْ رِفْعَه وَالْعَيْنُ ذَاتُهٗ رِفْعَه

آپؐ کے قدموں کی برکت سے ہی بلندی ہے اور آپؐ کی ذات اقدس بہت ہی عالی قدر ہے۔

قَدْ كَانَ اَبْيَضَ مَشْرِبَا وَلِعَاشِقِيْهِ مُطْرِبَا

آپؐ اپنے مشرب و مسلک اور رفتار و گفتار کے لحاظ سے بھی اتنے محبوب تھے کہ آپؐ کے عاشقوں پر وجد و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اِنْ كَانَ يَمْشِي يَبْتَدِرْ فَكَانَ صَبَباً يَّنْحَدِرْ

آپؐ اس قدر تیز رفتاری سے چلتے تھے کہ گویا پانی ڈھلوان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

بِالْوُسْعِ كَانَ جَبِيْنُهٗ فِي الْعِشْقِ كَانَ حَبَّتُهٗ

آپؐ کی پیشانی مبارک چوڑی تھی اور آپ کا دل ہمیشہ (اللہ تعالی کے) عشق میں ڈوبا رہتا تھا۔

كَالْقَوْسِ كَانَ حَوَاجِبُهٗ قَدْ كَانَ يَفْرَحُ خَاطِبُهٗ

آپؐ کی بھنویں کمان کی طرح تھیں جسے دیکھ کر مخاطب کو خوشی حاصل ہوتی تھی۔

كَانَتْ سَوَابِغُ تَنْفَصِلْ لَيْسَتْ تُقَارِنُ تَتَّصِلْ

دونوں بھنویں جدا جدا تھیں۔ آپس میں ملی ہوئی نہیں تھیں۔

عِرْقٌ تَبَارَكَ شَانُهٗ فِي الْبَيْنِ كَانَ مَكَانُهٗ

آپؐ کی پیشانی پر ایک شاندار بابرکت رگ تھی جو دونوں بھنوؤں کے درمیان تھی۔

كَانَتْ تَدُرُّ بِغَيْظِهٖ لَا فِي مَلَاحَةِ فَيْضِهٖ

غصّہ کے وقت وہ رگ ابھر آتی تھی نہ کہ سخاوت و نرمی کے وقت۔

وَالْاَنْفُ حَسُنَتْ ذَاتُهٗ أَقْنٰى أَشَمَّ صِفَاتُهٗ

آپؐ کی بینی مبارک خوبصورت اور تنگ نتھنے والی اور درمیان سے بلند تھی۔ آپؐ کامل ترین صفات کے حامل تھے

عِرْنِيْنُهَا قَدِ ارْتَفَعَ وَالسَّمْعُ مِثْلُهٗ مَا سَمِعَ

ناک کا سخت حصہ اٹھا ہوا تھا۔ اور کان اتنے حسین تھے کہ ویسے کہیں سننے میں نہیں آئے۔

يَعْلُوْهُ نُوْرٌ بِالْيَقِيْنِ يُسْبِي قُلُوْبَ الْعَاشِقِيْنِ

آپ (کے چہرۂ انور) پر یقیناً ایسا نور تھا جو عاشقوں کے دلوں کو گرفتار کر لیتا تھا۔

قَدْ فَاقَ لِحْيَتُهُ اللُّحٰى أَلْوَانُهَا بَدْرُ الدُّجٰى

آپؐ کی ریش مبارک جبڑے سے آگے نکلی ہوئی تھی اس کی رنگت تاریکی میں ماہِ کامل جیسی اچھی لگتی تھی۔

أُسُّ الْمَحَاسِنِ نِعْمَتُهٗ وَلِكُلِّ نَفْسٍ رَحْمَتُهٗ

آپؐ کے احسانات نے ساری خوبیوں کی اساس رکھی۔ اور آپ کی ذات اقدس ہر جاندار کے لئے سراپا رحمت ہے۔

قَدْ كَانَ خَدَّاهُ السَّهَلْ وَالنُّوْرُ بِهِمَا قَدْ نَزَلْ

دونوں رخسارِ مبارک نرم و گداز تھے جن سے نور پھوٹتا تھا۔ یا جن پر نور کی بارش ہوتی تھی۔

كُمِّلَ الْمَحَاسِنُ فِي فَمِهٖ مَلَأَ الْوَرٰى بِمَكَارِمِهٖ

آپؐ کے دہن مبارک میں تمام خوبیاں جمع تھیں تمام مخلوقات آپؐ کے احسانات کے زیر بار ہیں۔

فِي فِيْهِ كَانَتْ وُسْعَتِهٖ فِي كُلِّ لَفْظٍ نِعْمَتُهٗ

منھ قدرے کشادہ تھا جس سے نکلا ہوا ہر لفظ نعمت ہوتا تھا۔

أَسْنَانُهٗ قَدِ انْفَرَجْ وَالنُّوْرُ بِهِمَا امْتَزَجْ

آپؐ کے دندانِ مبارک بھی کشادہ تھے جن میں نور کی آمیزش تھی۔

فَاقَ الْخَلَائِقَ جِيْدُهٗ فِي الْحُسْنِ كَانَ تَزِيْدُهٗ

آپؐ کی گردن مبارک ساری مخلوق کی گردنوں سے اچھی تھی جو حسن میں بے پناہ اضافہ کا سبب تھی

كَانَتْ صَفَاءً كَفِضَّةٍ فِيْهَا قَلَائِدُ عِزَّةٍ

جو چاندی کی طرح چمکتی تھی، جس میں عزت کے ہار ٹکے ہوئے تھے۔

قَدْ أُحْكِمَتْ أَعْضَائُهٗ قَدْ اَتْلَفَتْ أَعْدَائَهٗ

آپ کے اعضاء مبارک مضبوط اور موزوں تھے۔ جنھوں نے آپؐ کے دشمنوں کو ہلاک کیا۔

أَلْمَاءُ يَنْبُوْ عَنْهُمَا قَدْ كَانَ وَطْئُهٗ مَرْحَمَا

پانی آپ کے قدموں سے (خوبصورتی کی وجہ سے) دور رہتا تھا۔ آپؐ کی رفتار سراپا رحمت تھی۔

وَالْمَشْيُ كَانَ تَكَفِّياً لِلْحُسْنِ كَانَ مُوَفِّياً

آپؐ درمیانی چال سے چلتے تھے جس میں بڑی زیبائی اور الفت و دلفریبی تھی

قَدْ طَالَ زَنْدُ حَبِيْبِنَا مِنْهُ صَلَاحُ قُلُوْبِنَا

حبیب پاک کے (ہاتھ کے) گٹّے لمبے تھے جن سے ہمارے دلوں کی صلاح وابستہ ہے۔

قَدْ كَانَ خُلُقُهٗ يَعْتَدِلُ وَالْحُسْنُ فِيْهِ مُشْمَلُ

آپؐ کے اخلاق وعادات میں اعتدال تھا اور آپ کے ذات بے پناہ حسین تھی۔

لَيْسَ الْهَزَالُ بِوَصْفِهٖ لَاسَهْمَ فِيْهِ بِوَضْعِهٖ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصف بیان کرنا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے کیونکہ آپ کی وضع قطع کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

وَالْهَاشِمِيُّ مُتَكَلِّمٌ مِنْ هِجْرِهٖ مُتَأَلِّمٌ

ہاشمی (اشارہ خود حضرت علیؓ کی طرف) جو آپؐ کی نعت بیان کر رہا ہے آپؐ کی جدائی میں غم زدہ ہے۔

عَنْ ذَرْوِ وَاصِفِهٖ جَاهِلٌ وَبِقَصْرِ فَهْمِهٖ قَائِلٌ

آپؐ کا وصف بیان کرنے والا آپؐ کے علوِّ مرتبت سے ناواقف ہے۔ اس کو اپنی کوتاہ فہمی کا اعتراف ہے

اَللّٰهُ يَعْلَمُ شَأْنَهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ بَيَانَهٗ

اللہ ہی آپؐ کی شان سے واقف ہے اور آپؐ کی تعریف وتوصیف کرنا اُسی کے بس کی بات ہے۔

يَا رَبِّ صَحِّحْ سُقْمَهٗ بِالْفَضْلِ دَمِّرْ جُرْمَهٗ

اے پروردگار! اِس راقم کی کمی کو دور فرمادے اور اپنے فضل سے اس کے گناہوں کو معاف فرمادے۔

اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد

ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی

سینیر اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر

ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ، ستمبر 2022ء، جلد 209، عدد 9

دیارِ شبلی کا وہ سپوت، جسے خطۂ اعظم گڑھ کے لوگ "اقبال سہیلؔ" کے نام سے جانتے ہیں، اس کے اقبال کا پرچم ہمیشہ بلند رہا اور اس کی رخشندگی ہمیشہ قائم رہی۔ ایسے ذکی، زود گو، فی البدیہہ شعر کہنے والے شاعر کم ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت و فطانت کے قائل اکابرین علم و دانش بھی ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ "نعت" پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مدح، تعریف، توصیف اور خصائص کے منظوم بیان کو کہا جاتا ہے۔ اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعتیہ کلام میں وہ ان تمام امور اور حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہیں جس کا ذکر درج بالا سطور میں کیا گیا ہے۔ ان کی حمدیہ، نعتیہ اور منقبتیہ شاعری میں حفظ مراتب کا پورا لحاظ دیکھنے کو ملتا ہے اور ان کی شاعری میں ان تینوں اصناف کے ڈانڈے ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔

نعت گوئی کا آغاز کب ہوا؟ اس کے بارے میں حتمی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے پھر بھی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے چچا ابو طالب نے پہلے پہل نعت کہی اور اصحاب میں حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے نعت گو شاعر اور نعت خواں تھے۔ اسی بنا پر انھیں شاعرِ دربارِ رسالت بھی کہا جاتا ہے۔

نعتیہ شاعری کی روایت عربی اور فارسی شاعری میں ابتدائی دور ہی سے رہی ہے۔ اسی طرح اُردو شاعری میں بھی دکنی عہد سے لے کر عہد حاضر تک اکثر و بیشتر شعرا نے حمد، نعت و منقبت میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بعض شعرا نے اسے اپنا خاص موضوع بنایا اور اردو کی نعتیہ شاعری کو شاعرانہ عظمت سے ہم کنار کیا۔ اس سلسلے میں محسنؔ کاکوروی، احمد رضاؔ خاں بریلوی اور اقبال سہیلؔ وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی طبعِ رسا کو اس سے فطری ہم آہنگی تھی۔ انھوں نے اپنے پیش رو نعت گو شعرا کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اُردو کی نعتیہ شاعری

کے اُفق کو مزید وسعت بخشی اور فکر و فن کے اعتبار سے اسے نیا انداز و آہنگ عطا کیا۔ استاد یعنی علامہ شبلی کی صحبت نے ان کے شعور کو جلا اور پختگی عطا کی۔ اسی شعور نے ان کے نعتیہ کلام میں حقیقت و واقعیت کا رنگ بھرا۔

نعت کے لیے صرف عقیدت ہی نہیں بلکہ سیرت اور تاریخِ اسلام پر گہری نظر اور واقعات و روایات کے بارے میں بھی صحیح علم نہایت ضروری ہے۔ سہیلؔ کی شاعری میں ان بنیادی خصوصیات کے ساتھ ساتھ آداب فن کا بھی پورا التزام ہے۔ ہمارے اکثر نعت گو شعرا نے رسول پاک ﷺ کے لیے اسی طرح کا لب و لہجہ اور انداز بیان اختیار کیا ہے جو غزلیہ شاعری میں مجازی محبوب کے لیے رائج ہے۔ اس کے علاوہ مبالغہ آرائی کی وجہ سے ان کے یہاں اعتدال کی کمی بھی اکثر نظر آتی ہے۔ فی زمانہ نعت گوئی کا معاملہ تو مدینے کی گلیاں، گنبدِ خضرا کا دیدار، حضور پاک کی شخصیت کے چند واقعات پر آکر ٹھہر گئی ہے۔ اقبال سہیلؔ نے اس روش سے ہٹ کر تمام انبیاء و رسل کی عظمت کا پاس رکھتے ہوئے آپؐ کے پیغمبرانہ مرتبے، اوصاف، سیرت، جلال و جمال کے شایانِ شان الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کا ایک نعتیہ قصیدہ ''معراج'' کے عنوان سے ہے، جس میں انھوں نے معراج کے واقعے کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ مثال کے لیے چند منتخب اشعار دیکھیے:

وہ جسم پاکؐ خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

حریمِ امّ ہانیؓ میں حضورؐ آرام فرما تھے
درِ دولت پہ قُدسی و ملک تھے محوِ دربانی

ادب سے آکے جبریلِ امیں نے یہ گزارش کی
کریں سرکار بزمِ نور تک تشریف ارزانی

براقِ برق پیکر لے چلا یوں ذاتِ انورؐ کو
فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضور اس طرح گزرے گنبدِ مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی

ملائک اور رُسل صف بستہ استقبال کو آئے
اٹھا افلاک میں ہر سمت شورِ تہنیت خوانی

براق و جبرئیل آخر رکے سدرہ کی منزل پر
کہ تھی یہ انتہائے سرحدِ اقلیمِ امکانی
یہاں سے لے چلیں پھر آپؐ کو موجیں تجلی کی
وہ رفرف ہو کہ انوارِ ازل کا جوشِ فیضانی
سوادِ لامکاں تک رک گیا رَفرَف کہ اس کو بھی
کہاں اس خلوتِ وحدت میں اذنِ گرم جو لانی
کسی نے لے لیا خو د بڑھ کے آغوشِ محبت میں
ہوا ملکِ قدَم خلوت سَرائے حسنِ امکانی
ظلال و ذات میں پھر کیا ہوا اللہ ہی جانے
کہ ہے یہ مر حلہ ما فوقِ ادراکاتِ اِنسانی
بجز ذاتِ مُطہّر یہ شرف کس کو ہوا حاصل
بجز صدّیق اکبرؓ یہ حقیقت کس نے پہچانی
خِرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کج مَج، بیاں قاصِر
زمینِ نعت میں کیا دیجیے دادِ سخن دانی

یہ ایک طویل و نہایت عمدہ قصیدہ ہے، جس کا لطف شروع سے آخر تک پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ درج بالا سطور میں منتخب اشعار کی تعداد کچھ زیادہ ہو گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قارئین ان منتخب اشعار کے مطالعے سے قصیدے کے رنگ و آہنگ، شاعر کے تخیل کی بلند پروازی، اس کا مطالعہ و مشاہدہ، بندشِ الفاظ اور کیفیت کا اندازہ لگا سکیں۔ اس نعت میں سہیل نے افراط و تفریط سے دور رہتے ہوئے، جس جذبے اور احترام کے ساتھ اپنے خلوص و عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے، اس کی مثال اُردو شاعری میں کم ہے۔ اس نعت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مرزا احسان بیگ ''ارمغانِ حرم'' میں لکھتے ہیں:

> عام نعت گویوں نے اتنا ضرور بتایا کہ بُراق و جبرئیلؑ سدرۃ المنتہٰی تک پہنچ کر رک گئے، اس سے آگے قدم رکھنے کی مجال نہ تھی، لیکن یہ نہ بتا سکے کہ پھر اس کے بعد بارگاہِ قدس تک پہنچانے کا نازک فرض کس کے سپرد ہوا۔ اس کا ادراک صرف سہیل ہی ایسے (جیسے) عالی نظر شاعر کی قوتِ

متخیلہ کر سکتی تھی[1]۔

مرزا احسان بیگ نے درست کہا ہے کیوں کہ اقبال سہیل کے نعتیہ قصائد پڑھتے ہوئے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ واقعی انہوں نے نعت گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے یہاں رسول پاک کی وہی صفاتِ حسنہ اور فضائل انسانی ملتے ہیں جو قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ سہیل نے تمام انبیاءؑ و رسل کی عظمت کا پاس رکھتے ہوئے آپؐ کے جلال و جمال کے شایانِ شان الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس قصیدے کے مطالعے سے قاری کو اندازہ ہوگا کہ وہ ذاتِ اقدسؐ کن کمالات کی جامع تھی، جس کی روحانی جلالت و عظمت کے سامنے کفر و باطل کی تمام طاقتیں سرنگوں ہو گئی تھیں۔

معراج کے واقعے کو بیان کرتے وقت، ہماری روزمرہ کی عام انسانی زندگی سے تشبیہ لے کر اقبال سہیل نے اس میں مزید خوبی پیدا کر دی، ساتھ ہی اپنی تخیل آفرینی کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جس دور میں یہ قصیدہ کہا گیا، اس وقت ہندستان میں اس بات کی کافی بحث چل رہی تھی کہ حضورِ پاک بہ نفس نفیس معراج کو گئے تھے یا انھیں خواب میں دیدار کرایا گیا تھا۔ اس بحث کو انھوں نے درج ذیل شعر سے ختم کرنے کی کوشش کی:

وہ جسم پاکؐ خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

اسی طرح معراج کے لیے عرشِ معلی تک جانے میں آپ کو کتنا وقت لگا؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ رہا کہ: ''فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی''۔ وہ آسمان سے کس طرح گزرے؟: ''نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی؟'' یہ تشبیہیں جو مذکورہ اشعار میں استعمال کی گئی ہیں، وہ بڑی نازک و لطیف ہیں اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے لی گئی ہیں۔ غیر مجسم چیزوں کو مجسم چیزوں سے تشبیہ دینا، شاعری میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اقبال سہیل نے اپنے تخیل، مشاہدے، تجربے اور عقیدت سے وہ بھی کر دکھایا۔ اس کا لطف نکتہ شناس اور سخن فہم حضرات ہی جانتے ہیں کہ جب اس طرح کی چیزیں ہمارے مطالعے میں آتی ہیں تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟ مذکورہ نعتیہ قصیدے میں انھوں نے معراج کے واقعے سے متعلق تمام واقعات کو مکمل طور پر پیش کرنے کے علاوہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اوصاف کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] ۔ ارمغانِ حرم، ص: ۵۳

اسی طرح ان کا ایک اور نعتیہ قصیدہ اسی زمین میں ہے، اس سے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں:

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیٔ امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی
اِدھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمتِ مشرق سے
اُدھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبستانی
کہاں کا دشتِ ایمن ، طور کیا، برقِ تجلی کیا
یہ سب کچھ تھی جمالِ مصطفی کی پر تو افشانی
محمدؐ وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی
محمدؐ وہ حریمِ قدس کا شمعِ شبستانی
محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستیں کلکِ فطرت کا
محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربّانی
وہ فاتح جس کا پرچم اطلسِ زنگاریٔ گردوں
وہ اُمیؐ جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی
وہ ناطق جس کے آگے مہر بر لب بلبلِ سدرہ
وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطقِ ربّانی
وہ عادل ، جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے
غبارِ مسکنت ہو، یا وقارِ تاجِ سلطانی
تراشہ جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل
غُسالہ جس کے تلوؤں کا زُلالِ آبِ حیوانی
تعالَی اللہ ذاتِ مصطفیؐ کا حسنِ لاثانی
کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصافِ امکانی
دعائے یونسی، خلقِ خلیلی، صبرِ ایوبی
جلالِ موسوی، زہدِ مسیحی، حسنِ کنعانی
خدا جانے خود اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا
غلامِ بارگہ جس کے کہیں ما اَعظَم شَانِی

یہ قصیدہ ۵۳ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں بھی آنحضرت صلعم کی شخصیت کے جملہ اوصاف کو

اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ درج بالا منتخب اشعار پورے نعتیہ قصائد سے نقل کیے گئے ہیں، جن سے شاعر کے تخیل، تفکر، تصور، مطالعے، لفظی ذخیرے اور فنِ شاعری کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ابھی تک ہم نے دو الگ الگ قصیدوں سے اشعار نقل کیے ہیں مگر حسنِ اتفاق سے دونوں ہی بحرِ ہزج مثمن سالم میں ہیں۔ یہ وضاحت اس لیے کرنی پڑی کہ دونوں قصیدوں کے قافیے ایک جیسے ہی ہیں ورنہ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سہیل نے اپنے نعتیہ کلام میں حقیقت نگاری کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں تخیل کی رنگ آمیزی اور فن کی صناعی اس درجہ نہیں ہے کہ حقیقت اس میں گم ہو کر رہ جائے۔ انھیں معانی کی ترسیل کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کے خیالات میں ابہام نہیں بلکہ وضاحت ہے۔ ان کا اندازِ بیان روشِ عام سے الگ ہی نہیں بلکہ ان کے بیان میں ایک شانِ تمکنت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے نعتیہ کلام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے افتخار اعظمی لکھتے ہیں:

> وہ فن کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں، اسی بنا پر ان کے یہاں مواد و صورت کا معتدل امتزاج ہے۔ ژولیدہ بیانی اور پریشاں خاطری سے ان کا کلام پاک ہے۔ ان کے یہاں عالمانہ اظہارِ فصاحت اور لب و لہجہ کا وقار ہے۔ ان کے نعتیہ قصائد میں تازگی و توانائی، متانت و جزالت، شادابیِ خیال، بندش کی دلآویزی، الفاظ کی مرصع کاری اور صوتی تناسب سبھی کچھ پورے طور پر موجود ہے[۲]۔

سہیل کے نعتیہ قصائد میں عربی و فارسی کے الفاظ اکثر استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کے یہاں الفاظ کی بندش، تصورات کا تسلسل اور واقعات کا تناسب ایسا ہوتا ہے کہ خیالات سیلِ رواں کی مانند بہتے نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے قصائد میں الفاظ غیر مانوس نہیں لگتے۔

ان کا ایک اور طویل نعتیہ قصیدہ بہ عنوانِ ''موجِ کوثر'' ہے۔ اس میں عربی و فارسی تراکیب کی بہتات کے باوجود الفاظ کی مناسب ترتیب اور قافیہ و ردیف کی ہم آہنگی کی وجہ سے جذبے کا بہاؤ اور نغمگی قابلِ دید ہے۔ اس قصیدے کے بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

احمدِ مرسَل، فخرِ دُو عالم، صلّی اللہ علیہ و سلم
مظہرِ اول، مرسلِ خاتَم صلّی اللہ علیہ و سلم
عالمِ ناسوتی کا مجاہد، شاہدِ لاہوتی کا مشاہد

---

[۲]۔ ارمغانِ حرم، ص: ۲۴

شان میں اَرفع، صبر میں اَقوم صلّی اللہ علیہٖ وسلم

شرحِ اَلَم نَشرَح وہ سینہ، برقِ تجلّی کا گنجینہ
جگمگ جگمگ، چم چم چم چم صلی اللہ علیہٖ وسلم

جتنے فضائل، جتنے محاسن، ممکن میں ہو سکتے تھے ممکن
حق نے کیئے سب اس میں فراہم صلّی اللہ علیہٖ وسلم

علمِ لدُنّی، شانِ کریمی، خُلقِ خلیلیؑ، نطقِ کلیمیؑ
زہدِ مسیحاؑ، عفّتِ مریمؑ صلّی اللہ علیہٖ وسلم

فرد و جماعت ،امر واطاعت ،کسب و قناعت، عفو و شجاعت
حل کیے جو اسرار تھے مبہم صلّی اللہ علیہٖ وسلم

ربط و تصادم،طوع و تحکم، فقر و تنعّم، عدل و ترحم
سب کے حدود بتائے باہم صلّی اللہ علیہٖ وسلم

حفظِ مراتب، پاسِ اخوت، سعی و توکل، رفق و فتوت
تلکَ حدود اللہ میں مُنضَم صلّی اللہ علیہٖ وسلم

بعدِ خدا ہر ایک سے افضل، اشرف و اکمل، اطیب و اجمل
اصدق و اعدل، اجود و احکم صلّی اللہ علیہٖ وسلم

یہ قصیدہ ۸۶ اشعار پر مشتمل ہے اور ردیف کا تو کہنا ہی کیا ہے! مذکورہ نعتیہ قصیدے کے مطالعے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر کے دل میں اُس جامع کمالات شخصیت کی محبت کا ایک دریا موجزن ہے اور وہ اس بات کی کوشش میں ہے کہ کس طرح حضور پاکؐ کی تمام صفات کا احاطہ کر دیا جائے۔ اس قصیدے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے رسولِ پاک صلعم کی شخصیت، عظمت و صفات کے ذکر کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین اور اسلامی تاریخی واقعات واحادیث کا ذکر بھی مراتب کے اعتبار سے کیا ہے۔ وہ شریعت کی حدوں سے کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ اس نعتیہ قصیدے میں خلفائے راشدین کے ساتھ ساتھ بہت سے صحابیوں کے نام بھی بہ لحاظِ مراتب آئے ہیں۔ جیسے:

خلفا چرخِ ہدیٰ کے انجم، رضیَ اللہ تعالیٰ عنہم
آپ جہاں کے ہادیِ اعظم صلّی اللہ علیہٖ وسلم

سیّدنا صدیقِ اکبرؓ، پہلے مصدّق، پہلے مبشر
اُمّتِ مرحومہ میں ارحم صلّی اللہ علیہ وسلم
سایۂ قد صدیقِ مکرم، صیدِ نظر فاروقِ معظّمؓ
رازِ نبوت کے دو محرَم صلّی اللہ علیہ وسلم
دونوں مظہرِ شانِ رسالت، دونوں پیکرِ صدق و عدالت
دونوں بامِ شرف کے سُلّم صلّی اللہ علیہ وسلم
ختم رسالت شاہِ زمنؐ پر، ختمِ خلافت ذاتِ حَسنؓ پر
دونوں مصحفِ حق کے خاتم صلّی اللہ علیہ وسلم
سعدؓ و سعیدؓ و زبیرؓ و طلحہؓ، ابن عوفؓ اور ابو عبیدہؓ
گل کدۂ دیں جن سے ہے خُرّم صلّی اللہ علیہ وسلم
زیدؓ و بلالؓ و صہیبؓ و سلماںؓ، سب رفقاء انصار اوراعوان
رحمتِ باری سب پر پیہم صلّی اللہ علیہ وسلم

اس نعت کا واقعہ یہ ہے کہ اقبال سہیلؔ نے یہ نعت اپنی بچی کو اپنے آبائی گاؤں ’بَرہرہ‘ کی زنانہ محفلِ میلاد میں پڑھنے کے لیے لکھی تھی۔اس نعت کے سلسلے میں دستیاب مولانا اسلمؔ جیراج پوری کے خط کا جواب دیتے ہوئے سہیلؔ لکھتے ہیں:

> گرامی نامہ موجبِ سرفرازی ہوا۔ ’’موجِ کوثر‘‘ کے متعلق آپ جیسے بزرگوں اور اربابِ نظر کے کلماتِ تحسین اور مخلصانہ ہمت افزائی میرے لیے یقیناً ایک غیر مترقبہ نعمت ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ میں نے زندگی بھر شعر کہے اور کبھی اشاعت کی پروانہ کی، بلکہ دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمایہ کو بھی ضائع کردیا، لیکن یہ نظم، جو محض اپنی بچی کو ’’برھرہؔ‘‘ کی زنانہ محفلِ میلاد میں پڑھنے کے لئے لکھ دی تھی اور عبدالروفؔ سلمہٗ مالک ’’سودیشی دکان‘‘ کے اصرار پر چھپوادی، اس درجہ مقبول ہوئی کہ اب خیال ہوتا ہے کہ کم سے کم نعت و منقبت کا مجموعہ تو چھپوادوں[۳]۔

اب اس شاعر کے تخیل، تصور اور فکر کی بالیدگی کا اندازہ کیجیے کہ جو شاعر اپنی بیٹی کے لیے اس نوع کی نعت گھر میں پڑھنے کے لیے کہتا ہو تو اس کا معیارِ شاعری کیا ہوگا؟

۳۔ کلیات سہیلؔ، ص: ۲۲

آیئے اب ذرا اس نعت کی تکنیک اور خوبیوں پر بھی غور کرتے چلیں۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کی ردیف ہے یعنی "صلّی اللہ علیہ وسلم"۔ جب کوئی شاعر اپنے قصیدے یا کسی شعری تخلیق کے لیے کوئی خاص قافیہ اور ردیف اختیار کرتا ہے تو ایک طرح سے وہ اپنے اوپر ایک پابندی عائد کرتا ہے، جس کا نباہ اسے بہ حسن وخوبی اور ہر حال میں کرنا پڑتا ہے ورنہ قافیہ تنگ ہونے والی بات ہو جائے گی۔ اقبال سہیلؔ نے ﷺ کی ردیف اختیار کر کے اپنے آپ کو کچھ خاص چیزوں کا پابند کیا اور اسے اس طرح سے نباہا کہ آج کا قاری پڑھتے ہوئے مسحور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی ردیف کے شایانِ شان مصرع لگانا اور اس کے مرتبے کو نبھانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن سہیل نے اپنے مطالعے، حضور پاک کے اوصاف، اسلامی تاریخ اور حدیث سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنی طبعِ رسا کا جوہر دکھاتے ہوئے اس منزل کو کامیابی کے ساتھ سر کیا۔ ان کے نعتیہ کلام کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ان کا تفصیلی مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ سہیلؔ کے نعتیہ کلام کی خصوصیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرزا احسان بیگ نے لکھا ہے:

> نعت در اصل نہایت نازک مرحلہ ہے، جہاں ہوش و بصیرت سے کام نہ لیا جائے تو ہر قدم پر لغزش کا امکان ہے، اس لیے ہر رَاہرَو اس مقدس راہ سے کامیاب نہیں گذر سکتا، یہ کوئی دنیا کا عرصہ رَزم نہیں ہے کہ قدم پس و پیش کو نظر انداز کر کے بلا کسی غور و احتیاط کے گرد و غبار اڑاتا بڑھتا چلا جائے[۴]۔

اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد کی لفظیات، خیالات کی بلندی، واقعات کا تسلسل، حضورِ پاکؐ کی شخصیت کے اوصاف اور اظہارِ بیان اردو شاعری میں اپنی ایک منفرد شناخت اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں جب کہ قصیدے کی محفل ختم ہو گئی، اور یہ سمجھا جانے لگا کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ قصیدے کی صنف پروان چڑھ سکے، سہیلؔ نے نعتیہ قصائد کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ شاعر اگر موزوں طبع ہو تو اس کا ذہن کسی بھی موضوع اور صنف میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

سہیلؔ نے بیسویں صدی میں نعتیہ قصائد کہہ کر قصائد کے لیے نئی راہیں پیدا کیں اور خود اس راہ سے کامیاب گزرے۔ ان کے نعتیہ قصائد پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل اور نظم کے میدان میں سہیلؔ کے مدمقابل شعرا ہو سکتے ہیں لیکن بیسویں صدی کی نعتیہ شاعری میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ انہوں

---

[۴]۔ ارمغانِ حرم، ص ۵۶

نے امراء کی مدح سرائی میں عمر نہیں گنوائی بلکہ حضور پاک صلعم اور تاریخ اسلام کے عظیم افراد کی شان میں قصائد کہے تاکہ دلوں میں اعلیٰ انسانی قدروں کا احترام پیدا ہو سکے۔ سہیلؔ شاعری میں اخلاق سے فروتر بات کے قائل نہیں تھے، اس لیے انہوں نے قصیدہ نگاری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اصلاحِ قوم او ر درسِ اخلاق کا ذریعہ بنایا۔ آپؐ کی سیرت پاک وصحابہؓ کرام کے فضائل و محاسن اور تاریخ اسلام کے اہم واقعات کو اپنے قصائد کے ذریعے اُجاگر کیا۔

ادب کا مورخ آئندہ جب اردو کے نعتیہ قصائد کی تاریخ لکھے گا تو اس کا قلم اقبال سہیلؔ کے نام نامی کو بیسویں صدی کے نعتیہ قصائد کا اہم شاعر لکھنے پر مجبور ہو گا۔ ان کے نعتیہ قصائد جن خصوصیات کے حامل ہیں، ان میں ان کا تخیل، تفکر، اسلامی تاریخ کے اہم واقعات، حضور پاک صلعم کی ذات وصفات، اسوۂ حسنہ کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدینؓ کا ذکر اور الفاظ کی بندش، صنعتوں کا بہترین استعمال شامل ہے۔

کتابیات:

۱۔ ارمغانِ حرم از اقبال سہیل، مرتب: افتخار اعظمی، مرکزِ ادب، جہانگیر آباد پیلس، لکھنؤ ۱۹۶۰ء
۲۔ کلیاتِ سہیل از اقبال سہیل، مرتب: عارف رفیع، بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی ۱۹۸۸ء

"نسیمِ حجاز" حمدیہ اور نعتیہ شاعری کا گلدستہ

ڈاکٹر امتیاز احمد

لکچرار ہائر ایجوکیشن، گورنمنٹ ڈگری کالج بیروہ، بڈگام، جموں وکشمیر

imtiyazshaheen91@gmail.com

اردو ادب کی شعری روایت میں ابتدا ہی سے حمد اور نعت گوئی کا رجحان رہا ہے۔ ہر شاعر نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو ایک مشترکہ تہذیب کا نام ہے۔ اس میں تمام قوموں کے لوگوں نے اپنا حصّہ دے کر اس کی آبیاری کی ہے۔ اردو ادب کا طالب علم جب نعت گوئی کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہے تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم شعرا نے بھی حمدیہ کلام لکھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں نعت لکھے ہیں۔ ان شعرا میں آنند نرائن ملا، تلوک چند محرومؔ، نریش کمار شادؔ، رانا بھگوان داس، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، اور جگن ناتھ آزادؔ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کا شعری مجموعہ "نسیم حجاز" ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ نعت، منقبت، اور اسلامی تعلیمات سے عبارت ہے۔ اس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حمد و نعت کا مجموعہ ہے۔ آزادؔ نے اسلامی تعلیمات کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ وہ شعائر اسلامی اور پیغمبر اسلام کے بہت بڑے مداح ہیں۔ اس مجموعے میں آزادؔ نے مسلمانان عالم کی گذشتہ عظمت کو یاد دلایا ہے اور انہیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ وہ اسلامی اصولوں کو اپنا کر اپنے کردار کی از سر نو تشکیل کریں۔

جگن ناتھ آزادؔ کو اسلامی تعلیمات اور شعائر اسلامی سے بے پناہ قربت تھی۔ انہوں نے جو حمد، نعت، منقبت اور سلام لکھے ہیں ان کے تراجم مختلف زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ آزادؔ کی مثنوی "جمہور نامہ" کے حصّہ "ولادت باسعادت" کو کئی زبانوں میں شائع کیا جا چکا ہے۔ فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ اسلامی علوم کے ماہر ڈاکٹر حمید اللہ نے *Homage A Mohammed* کے نام سے کیا ہے۔ "نسیم حجاز" میں انہوں نے اپنے حمدیہ اور نعتیہ کلام کو یکجا کر کے مرتب کیا ہے۔

"نسیم حجاز" اپنے آپ میں آزادؔ کی وسیع المشربی اور اسلامی علوم سے آگہی کی ایک بڑی دلیل ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے حمدیہ اور نعتیہ کلام کو مختلف اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور کئی ہیئتوں میں پیش کیا ہے۔ "نسیم حجاز" میں شاعر نے جن عنوانات کے تحت حمدیہ

اور نعتیہ کلام کو سمیٹا ہے، ان میں حمد و نعت سے منقبت تک، دعا، ولادت باسعادت، میلاد النبی ﷺ سلام، محفل نعت میں ایک رات، قطعہ فیضانِ ارضی، تضامین، حضرت کلیم اللہ ولی کی درگاہ، دہلی کی جامع مسجد، تاریخ ہند کا ایک واقعہ، ہندوستان ہمارا، بھارت کے مسلمان، قرطبہ سے ویلینشیا (بلنسیہ) تک، ایک مشرقی رقاصہ کے نام، مرثیہ، ابوالکلام آزاد، کشور ہندوستان، بابری مسجد اور اقبال شامل ہیں۔ ان شعری تخلیقات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کی اسلامی تعلیمات اور تاریخ سیرت النبی ﷺ پر اچھی خاصی نظر تھی۔ آزاد[1] "نسیم حجاز" میں ایک بہترین عقیدت مند نظر آتے ہیں۔ نسیم حجاز کے ذریعے آزاد[1] نے اسلام کی تبلیغ اور نشرواشاعت کا کام بھی کیا ہے۔ "ولادت با سعادت" میں آزاد[1] کی نعت گوئی عروج پر نظر آتی ہے۔ آزاد[1] کے انداز بیان میں خلوص نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

مجھے لکھنا ہے اک انسانیت کا بابِ تابندہ ‏ ‏ ‏ منور جس کے ہوں الفاظ، مصرع جس کے رخشندہ
مجھے اک محسنِ انسانیت کا ذکر کرنا ہے ‏ ‏ ‏ مجھے رنگِ عقیدت فکر کے سانچے میں بھرنا ہے
بیاں کرنا ہے اوج ابن آدم بن کے کون آیا ‏ ‏ ‏ بیاں کرنا ہے فخرِ ہر دو عالم بن کے کون آیا
بشارت جس کی دی تھی ابنِ مریم نے زمانے کو
وہ ہستی کون تھی کیوں آئی تھی محفل سجانے کو[1]

"نسیم حجاز" میں آزاد[1] نے سلام بھی لکھے ہیں جو نعت گوئی کے عمدہ نمونے ہیں۔ سلام کے اشعار شاعر کی عقیدت اور احترام کی گواہی دیتے ہیں اور ساتھ میں ان کی فنی پختگی کا بھی پتہ چلتا ہے:

سلام اس ذاتِ اقدس پر، سلام اس فخر دوراں پر ‏ ‏ ‏ ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیا کے امکاں پر
سلام اس پر جو حامی بن کے آیا غم نصیبوں کا! ‏ ‏ ‏ رہا جو بیکسوں کا آسرا مشفق غریبوں کا
سلام اس پر جو آیا رحمۃ للعالمیں بن کر ‏ ‏ ‏ پیام دوست لے کر صادق الوعد وامیں بن کر[2]

"میلاد النبی" کے موضوع پر "نسیم حجاز" میں ایک نعت رسول اکرم ﷺ کی ولادت کے واقعے کو بیان کرتی ہے۔ اس نظم میں جذبات کی سچائی، خلوص اور سادگی جابجا نمایاں ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

---

[1] آزاد، جگن ناتھ، نسیم حجاز، نئی دہلی، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، ۱۹۹۹، صفحہ ۶۵-۶۶

[2] ماخذ سابق صفحہ ۴۷

آج کا دن تھا جب نور معانی کے طفیل تیرہ و تار زمیں مطلعِ انوار ہوئی
آج کا دن تھا کہ ظلمات سے ہو کر بیزار زندگی جلوۂ پنہاں کی طلب گار ہوئی
آج کا دن تھا جب باد بہاری کے سبب خس و خاشاک کی دنیا گل و گلزار ہوئی[۳]

''نسیم حجاز'' میں حمد و نعت اور منقبت کے علاوہ جو تخلیقات ملتی ہیں، ان کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور پر اسلامی تاریخ یا تعلیمات ہی سے ہے۔ان نظموں میں حضرت کلیم اللہ ولی کی درگاہ پر، تاریخ ہند کا ایک واقعہ، دہلی کی جامع مسجد اور ہندوستان ہمارا شامل ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد کو سرزمینِ ہند میں اسلامی تہذیب کی ایک عمدہ یادگار تصور کیا جاتا ہے۔اس کے ساتھ شاہ جہاں کے زہد و تقویٰ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ''ہندوستان ہمارا'' نظم میں حضرت نظام الدین اولیاء کی شخصیت اور تعلیمات کو موضوع بنایا ہے۔ان کو وہ قطب دوراں کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ نظام الدین اولیاء کی شان میں جو اشعار لکھے گئے ہیں، پیش خدمت ہیں:

نظام الدین محبوبِ الٰہی جن کو کہتے ہیں یہاں کی اور وہاں کی بادشاہی جن کو کہتے ہیں
جنید و بایزید وقت انھیں تاریخ کہتی ہے وہ جن کی یاد سے یادِ مسیحا زندہ رہتی ہے[۴]

''نسیم حجاز'' میں آزادؔ نے کچھ نظمیں ایسی لکھی ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اسلام ہی سے ہے۔ان نظموں میں بھارت کے مسلمان، ابوالکلام آزادؔ، کشور ہندوستان، بابری مسجد اور اقبال شامل ہیں۔ ''بھارت کے مسلمان'' آزادؔ نے تقسیم وطن کے بعد ہی لکھی ہے۔اس نظم کے ذریعے آزادؔ نے ہندی مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور ان کو حوصلہ دیا ہے۔ مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ وطن جتنا ہندوؤں کا ہے اتنا ہی مسلمانوں کا بھی ہے۔اس کے علاوہ اس نظم کے ذریعے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلا کر انہیں از سر نو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دی ہے۔اس نظم کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نظم مختلف رسالوں کی زینت بنی، اس نظم کے جواب میں ملک کے شاعروں نے جذبۂ شکر کے عنوان سے نظمیں لکھ کر آزادؔ کا شکریہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ دار لعلوم دیوبند میں اس نظم کا بڑا فریم بنا کر اس کو وہاں کی گیلری کی زینت بنایا گیا ہے۔ایک قدردان نے ''بھارت کے مسلمان'' کو کتابی صورت میں چھاپ کر مفت تقسیم بھی کیا ہے۔

''بابری مسجد'' کی شہادت کا المیہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔اس نے فرقہ پرستی کو

---

[۳] ماخذ سابق ص ۷۶

[۴] ماخذ سابق ص ۱۰۶

تقویت دی۔اس حادثے سے جگن ناتھ آزادؔ بہت غمگیں ہوئے۔اس کا اظہار انھوں نے ایک نظم کی صورت میں کیا ہے:

یہ تو نے ہند کی حرمت کے آئینے کو توڑا ہے | خبر بھی ہے تجھے مسجد کا گنبد توڑنے والے
ہمارے دل کو توڑا ہے عمارت کو نہیں توڑا | جہالت کی بھی حد ہوتی ہے اے حد توڑنے والے
تیرے اس فعل سے اسلام کا تو کچھ نہیں بگڑا | مگر گھونپا ہے خنجر تو نے ہندو دھرم کے دل میں
مروّت جس کو کہتے ہیں مودت جس کو کہتے ہیں | یہ مسجد اس مروّت اس مودت کی علامت ہے

اسی کے ساتھ تو ایک اپنا مندر بھی بنا لیتا
وہی تیرا بڑا پن تھا وہی تیری کرامت تھی[۵]

آزادؔ نے اس نظم کے ذریعے شدّت پسند جنونیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ تم انسانیت کے دشمن ہو، تمھاری وجہ سے مذاہب کی بدنامی ہوتی ہے، تم انسانیت کے نام پر کلنک ہو۔ نظم کے آخر میں شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مسجد لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے اور ابھی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دلوں کو جوڑنا جانتے ہیں:

یہ مسجد آج بھی زندہ ہے اہلِ دل کے سینوں میں | خبر بھی ہے تجھے مسجد کا پیکر توڑنے والے
ابھی یہ سر زمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے | ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے[۶]

جگن ناتھ آزادؔ کی اسلام دوستی اور حُب اسلام ان کی ذاتی زندگی،ان کی شاعری اور نثر میں بھی ملتی ہے۔اس کے حوالے سے مولانا ضیاءالدین اصلاحی ''نسیم حجاز'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

جگن ناتھ آزادؔ کے مضامین نظم و نثر میں رنگ حرم بہت نمایاں ہے جس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقصود احاطہ ہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اقبالیات کے اس شارح و ترجمان نے اسلامی حقائق و معارف کی ترجمانی کا حق مکمل طور سے ادا کر دیا ہے۔اس نے جن موضوعات سے تعریض کیا ہے ان پر کوئی مسلمان فاضل بھی اس سے بہتر کیا لکھے گا، کم از کم یہ کم سواد تو اس کی جرأت و ہمت بھی نہیں کر سکتا۔[۷]

---

[۵] ماخذ سابق ص ۱۵۱۔ ۱۵۲

[۶] ماخذ سابق ص ۱۵۴

[۷] ماخذ سابق ص ۵۴

عرب نژاد مسیحی شعراء اور نعت رسول: ایک جائزہ

ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرّب مرزا

استاد، عربی زبان وادب، الہ آباد یونیورسٹی - پریاگ راج، یوپی

mmjamaliindia@gmail.com

صحابۂ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے جس والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے اس کی تاریخ انسانی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ دشمنانِ اسلام بالخصوص کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، حملے کئے اور جانی ومالی نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مگر جب آپ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر ان لوگوں نے ہجویہ قصائد کہنا شروع کیا تو رسول اللہ ﷺ پر یہ بہت شاق گزرا، اس لئے نہیں کہ کفار مکہ ہجویہ اشعار کے ذریعے شان اقدس ﷺ میں نازیبا کلمات کہتے یا آپ ﷺ پر طنزیہ فقرے کستے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے پس پردہ اسلامی عقائد وتعلیمات پر بے جا اعتراضات اور تنقیدیں کرنے لگے تھے۔ ان کے اسی طرح کے ہجویہ کلام سے پریشان ہو کر ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ انصار سے فرمایا: "جو لوگ اپنے ہتھیاروں کے ذریعے اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں، انہیں زبانوں کے ذریعے مدد کرنے سے کس چیز نے روکا ہے؟"[1]۔ آپ کے اس قول کا اثر تھا کہ دربارِ رسالت سے وابستہ شعراء نے اپنی شعری توانائیاں اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں صرف کیں اور کفارِ قریش کی ہرزہ سرائیوں کا مسکت جواب دیا۔

ایک زمانے تک عرب معاشرے میں شعر و شاعری کو جنون کی حد تک پسند کیا جاتا تھا۔ شاعرانہ کلام سے کسی بھی شخص کی تذلیل یا اس کے رتبے کو گھٹایا بڑھایا جاسکتا تھا۔ عصر حاضر میں

---

[1] ضیف، شوقی، تاریخ الأدب العربي، العصر الإسلامي، دار المعارف، قاہرہ، ط ۲۰، ص ۴۷۔

جس طرح دشمنوں کے پروپیگنڈے کو روکنے کے لیے جدید ذرائع ابلاغ یا سوشل میڈیا کو ایک کارگر اور مؤثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح یہ کام عرب اُس زمانے میں شعر و شاعری سے لیا کرتے تھے۔ ضرار بن خطاب، ابوسفیان بن حارث، عمرو بن العاص، کعب بن اشرف اور عبداللہ زبعری جیسے بڑے شعراء نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ رسول اللہ ﷺ پر طنز، سب و شتم، استہزاء و استخفاف اور رسالت کی توہین کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ یا دیگر شعراء کا رسول اللہ ﷺ کی مدح و ثنا یا اوصاف حمیدہ کا بیان دراصل کفار مکہ کے ہجویہ اشعار کے ردّ عمل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے "اللهم أيده بروح القدس" حالانکہ یہ اشعار آنحضرت ﷺ کی مدح میں ہوتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے۔ عرب میں شعراء کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ زور کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے۔ ابن الزبعری اور کعب بن اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت ﷺ کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسانؓ کی مداحی اس کا ردعمل تھا[۲]۔

طلوع اسلام کے بعد سے ہی جن شعراء نے نبی کریم ﷺ کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے ان میں سب سے نمایاں حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن زہیر رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ حضرت حسان بن ثابتؓ ایک موقع پر آپ ﷺ کے حسن و جمال کی توصیف میں یوں رطب اللسان ہیں[۳]:

وأحسن منك لم تر قط عيني وأجمل منك لم تلد النساء
خُلقت مبرءاً من كل عيب كأنك قد خلقت كما تشاء

(آپ سے زیادہ حسین شخص میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا، اور آپ سے زیادہ خوبصورت شخص کسی ماں نے نہیں جنا۔ آپ کو تمام عیوب سے اس طرح پاک پیدا کیا گیا، گویا آپ ﷺ کی تخلیق آپ کی مرضی و مشیت کے عین مطابق کی گئی)۔

---

[۲] نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، حصہ دوم، ص ۲۵۸۔

[۳] دیوان حضرت حسان بن ثابت انصاری، تحقیق و ترجمہ: مولانا محمد اویس سرور، مکتبہ رحمانیہ، اقرا سنٹر، لاہور، ص ۲۵۔

اموی دور کے سب سے نمایاں شعراء الفرزدق اور کمیت الاسدی نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی محبت، خلوص اور وفاداری کا کھل کر اظہار کیا۔ عباسی دور میں جن شعرا نے رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں نعتیہ کلام پیش کئے ان میں الشریف الرضی اور دعبل الخزاعی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ممالیک کا زمانہ آیا تو نعت رسول ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ساتویں صدی ہجری میں محمد بن سعید البوصیری کا بے حد مشہور قصیدہ "البردۃ" (پورا نام الكواكب الدرية في مدح خير البرية) منظر عام پر آیا۔ یہ قصیدہ اتنا مشہور ہوا کہ عربی، فارسی اور اردو شعراء نے اس پر خوب تضمینیں کیں یہاں تک کہ آج بھی اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ محمود سامی البارودی جیسے جدید عربی ادب کے نامور شاعر نے قصیدہ "البردۃ" کے طرز پر ایک قصیدہ کہا جس کا عنوان "كشف الغمة في مدح سيد الأمة" ہے۔ امیر الشعراء احمد شوقی نے بھی اسی طرز پر ایک قصیدہ لکھا جس کا عنوان "نهج البردة" رکھا۔ اس طرح نعتیہ شاعری بے حد مقبول فن کے طور پر متعارف ہو گئی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں اس قدر کشش ہے کہ وہ تمام شعراء، ادباء اور مفکرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ آپؐ کی تعریف و توصیف کے وقت شعراء پر ایک خاص قسم کی کیفیت اور دل و دماغ میں آپؐ سے محبت و انس کا والہانہ جذبہ غالب ہوتا ہے جو کسی بھی دوسرے شخص کی مدح میں کبھی طاری نہیں ہو سکتا۔ بہ حیثیت انسان یہ آپ کا امتیاز و اختصاص ہے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک مسلمان اپنی جان سے بھی زیادہ سرور کائنات ﷺ سے محبت کرتا ہے اور یہی اس کے ایمان کے مکمل ہونے کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم شعراء نعت گوئی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں آج بھی کوشاں نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے تئیں وہ اپنے جذبات اور احساسات کا بکثرت اظہار کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی محبت میں سرشار ہو کر آپ ﷺ کی پیروی کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی محبت کو ایمان و اسلام کا جزء لاینفک سمجھتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں کے وہ شعراء جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، انہوں نے بھی ایسی شاہکار نظمیں لکھی ہیں جو مدح نبوی کے باب میں مسلم شاعروں سے کم دلچسپ نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے تئیں اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس کی بظاہر وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسی شخصیت کے حامل ہیں جنھوں نے اپنی تعلیمات میں قوم و مذہب سے اوپر اٹھ کر خدمت انسانیت کو لازم قرار دیا ہے۔ رواداری، حسن اخلاق اور غیر جانب داری کے اصولوں کو عام

کیا۔ غیر مسلموں کو ان کی مذہبی رسومات پر عمل کرنے کی مکمل اجازت عطا کی اور آپؐ خود اپنی معاشرتی زندگی میں سراپا عفو و درگزر کے پیکر نظر آتے ہیں۔

اس کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ان تمام دشمنوں کو معاف فرما دیا جنھوں نے چند ماہ نہیں بلکہ تیرہ سال تک مکہ میں آپ ﷺ پر اور صحابہؓ کرامؓ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے اور آپ کو اپنا محبوب وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان پر مکمل قابو پانے کے باوجود آپ ﷺ نے مشرکین مکہ سے ارشاد فرمایا: "جاؤ تم سب آزاد ہو!"[۴]۔

حقیقی فضل و کمال تو وہ ہوتا ہے جس کی گواہی دشمن دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی دیکھا جا رہا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے شعراء کی ایک بڑی تعداد آنحضورؐ کی مدح و توصیف میں رطب اللسان اور عشق رسول ﷺ میں سرشار ہے۔ انھوں نے حضور ﷺ کی مدح و ثنا میں بکثرت قصیدے کہے ہیں، آپ ﷺ کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے، آپؐ کی فضیلت و برتری اور انفرادیت کو تسلیم کیا ہے، آپؐ کی بہادری اور جرأت مندی کے قائل ہوئے، آپؐ کی منفرد اور بے مثال شخصیت کے دلدادہ ہوئے اور آپؐ کی سچائی اور صداقت کے آگے سر تسلیم خم کیا۔

عرب نژاد مسیحی شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے آپ ﷺ کی شان میں بہت سے مدحیہ قصائد کہے ہیں۔ ان کے علاوہ برصغیر کے بھی ہندو، سکھ اور عیسائی شعراء نے نہ صرف سیرت طیبہ کا صدق دل سے مطالعہ کیا بلکہ آپؐ کی عقیدت میں وہ اسلامی تعلیم و مزاج کو اس حد تک پی گئے تھے کہ ان کے اشعار سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کا قائل ایک مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ ان ادیبوں اور شاعروں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان میں جگ دیش مہتا درد، جگن ناتھ آزاد، مہاراجہ کشن پرساد شاد، پنڈت ہری چند اختر اور کنور مہندر سنگھ بیدی نمایاں ہیں۔ یہاں مسیحی عرب نژاد شعراء کے کلام کا ایک مطالعہ پیش ہے۔

ان عرب نژاد مسیحی شعراء میں سب سے نمایاں شاعر رشید سلیم الخوری ہیں۔ وہ اسلام اور عربیت کی عظمت پر فخریہ اشعار کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر وہ اشعار جو انھوں

---

[۴] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۵۵/۴، مصطفی السقا، ابراہیم الابیاری، عبد الحفیظ شلبی، مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی واولادہ، مصر، ۱۹۳۶ء۔

نے میلاد نبوی کے موقع پر "نحن أُعطينا القلم" (ہمیں قلم دیا گیا ہے) کے عنوان سے پڑھا تھا۔ ان اشعار میں فخریہ انداز میں انھوں نے کہا کہ ہم عربوں کو غلبہ حاصل تھا نیز قوموں کی ترقی اور خوشحالی کا سہرا ہمارے سر پر ہی ہے جب کہ اس وقت مغرب پسماندگی اور تاریکی کے بوجھ تلے دبے رہے[۵]۔

نحن الألى سدنا الشعوب ونحن مدنا الأمم
طلع الهدى من شرفنا والغرب يخبط في الظلم

(ہم نے قوموں کی سرداری کی۔ ہم ہی نے قوموں کو عروج بخشا اور ہماری بزرگی سے ہی ہدایت نکلی جب کہ اس وقت مغرب تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا)۔

الخوری نے "عيدالبرية" (انسانیت کا تیوہار) کے عنوان سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں ایک نظم کہی ہے۔ اس میں اس نے مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے محنت کرنے کی تلقین کی۔ رسول اللہ ﷺ سے اپنے والہانہ محبت اور جذبے کا اظہار کیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے اور اپنے ملک اور پورے عالم مشرق کی خدمت کرنے کے لئے نعرہ بلند کیا اور لوگوں کو برادرانہ محبت پر ابھارا۔ اس مشہور نظم کے کچھ اشعار یہ ہیں[۶]:

عيد البرية عيد المــولد النبوي في المشرقين له والمغــربين دوي
عيد النبي ابن عبد الله من طلعت شمس الهداية من قرآنه العلوي
يا قوم هذا مسيــحي يذكركم لا ينهض الشرق إلا حبنا الأخوي
فإن ذكرتــم رسول الله تكرمة فبلغوه سلام الشاعر القروي

(مولد نبوی کا تیوہار ساری انسانیت کا تیوہار ہے جس کی گونج مشرق و مغرب میں ہے۔ فرزند عبد اللہ کا، جو کہ نبی ہیں، یہ تیوہار ہے جن کے بلند و برتر قرآن سے ہدایت کا آفتاب طلوع ہوا ہے۔ اے میری قوم یہ ایک عیسائی ہے جو تمھیں یاد دلا رہا ہے کہ مشرق ہماری برادرانہ محبت ہی سے دوبارہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اگر تم رسول اللہ کو عزت و اکرام سے یاد کرو تو ان کی خدمت میں شاعر قروی کا سلام عرض کر دینا)۔

شام کے ایک نامور شاعر الیاس قنصل نے اپنے اشعار میں رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی اور

---

[۵] مکتب التدقیق اللغوی، الشاعر القروی (الاعمال الکاملۃ) الشعر، جروس بریس، طرابلس، لبنان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۹۔
[۶] مکتب التدقیق اللغوی، الشاعر القروی (الاعمال الکاملۃ) الشعر، جروس بریس، لبنان، ص ۴۷۰۔

ان کے اوصاف حمیدہ کو بیان کرتے ہوئے کہا[۷]:

إني ذكرتك يا محمد ناشراً　　روح الأخوة في بني الإنسان
يعلو بلال العبد أشرف قبة　　ليذيع منها أشرف الألحان
حق المواهب أن يقدر أهلها　　لا فرق في الأجناس والألوان

(بنی نوع انسان میں بھائی چارے کو عام کرنے والے اے محمد (ﷺ)، میں نے تجھے یاد کیا۔ سب سے معزز گنبد پر غلام بلال چڑھ کر سب سے خوبصورت نغمے نشر کرتے ہیں۔ قابلیت اس بات کی مستحق ہے کہ رنگ و نسل سے اوپر اٹھ کر صاحب صلاحیت کی قدر کی جائے)۔

شامی شاعر وصفی قرنفلی رسول اللہ ﷺ کو "مشرق کا نجات دہندہ" قرار دیتے ہوئے نہ کسی منفی تنقید یا مذمت سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اپنے خلاف کسی جنگ سے خوف کھاتا ہے۔ اپنی "منقذالشرق" (مشرق کا نجات دہندہ) نامی مشہور نظم میں رسول اللہ ﷺ کی سچائی اور صداقت کی گواہی دیتے ہوئے وہ کہتا ہے[۸]:

أو ليس الرسول منقذ هذا الشرق　　من ظلمـــة الهوى والهوان
أفكنا لولا الرســـول سوى　　العبدان بئست معيشة العبدان

(کیا رسول (ﷺ) اس مشرق کو ذلت و رسوائی کے اندھیروں سے بچانے والے نہیں ہیں۔ اگر رسول (ﷺ) نہ ہوتے تو ہم آج بھی غلام ہوتے، کیا ہی بُری زندگی ہے غلاموں کی!)۔

شام نژاد شاعر جارج صیدح نے "محمدؐ" کے عنوان سے نظم کہی جس میں اس نے نبی اکرم ﷺ کی مدح و ثنا کے ساتھ ساتھ آپؐ کے بلند مقام اور عظیم کارناموں کا ذکر اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کیا کہ رسول ﷺ میں ہم سب کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہیں۔ اس نے عربوں کو ان کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کرنے کی پرزور حمایت کی کیونکہ آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے میں ہی یقینی کامیابی اور سرخروئی کا راز مضمر ہے[۹]۔

وجهٌ أطلّ على الزمان　　لألاؤه شقّ العنان

---

[۷] خفاجی، محمد عبد المنعم، قصۃ الادب المہجری، دار الکتاب اللبنانی، بیروت، ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۵۔
[۸] ابو العیون محمد، "شعراء مسیحیون نظموا اروع القصائد فی مدح النبی"، صوت الازہر، ۲۴ نومبر، ۲۰۱۷ء۔
[۹] کیالی، سامی، الادب العربی المعاصر فی سوریا، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۶۔

فيه شعاع النيرات وفيه أنفاس الجنان
يا صاحبي بأي آلا ء السماء تكذبان

(ایک چہرہ زمانہ پر جلوہ افروز ہوا اور اس کی چمک دمک نے آسمان کو روشن کر دیا۔ اس میں روشنی کی کرنیں ہیں اور اس میں دلوں کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔ اے میرے دوستو، آسمان کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے)۔

یہ شاعر معراج نبوی پر گفتگو کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی مدح وثنا کو مسجد اقصیٰ کے جیسے اہم مسئلے سے ملا دیتا ہے، جسے یہودیوں کے شرم ناک قدموں نے روندر کھا ہے۔ وہ آپ ﷺ سے درخواست کرتا ہے کہ غاصب یہودیوں کی غلاظت سے مسجد اقصیٰ کو آزادی دلائیں۔ ساتھ ہی عربوں کی حالت زار پر بھی وہ سخت افسوس کا اظہار کرتا ہے:

يا من سرت على البراق و جزت أشواط العنان
آن الأوان لأن تجدد ليلة المعراج آن
عرج على القدس الشريف ففيه أقداس تهان

(اے براق پر سوار ہو کر آسمان تک جا پہنچنے والے! اب وقت آ گیا ہے کہ تو شب معراج کی تجدید کرے اور بیت المقدس کا دوبارہ رخ کرے کیونکہ وہاں مقدسات کی پامالی ہو رہی ہے)۔

اپنی نظم کے اختتام میں صیدح دعاء کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے ان مومنین کے جہاد میں، جو ظلم کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرا رہے ہیں، برکتیں نازل فرمانے کی درخواست کرتا ہے اور ظالموں کے خلاف ان کی مدد کرنے کی بھی تا کہ سرزمین فلسطین کو نفرت انگیزی سے اور یہودیوں کی ظلم وزیادتی سے محفوظ کیا جا سکے:

بارك جهاد المؤمنين النافرين إلى الطعان
الضارعين إليك باسم الآل والصحب الغران
وبيوم مولدك السني وبحق موحيك القرآن
أن تصون دماءهم وامنح فلسطين الصيان

(ان مومنین کے جہاد میں برکت عطا فرما جو جنگ کے لئے نکل پڑے ہیں، جو تجھ کو تیرے روشن آل وعیال اور اصحاب کے نام سے پکارتے ہیں۔ تیری پیدائش کے دن سے، اور اس کے نام سے جس نے قرآن تجھ پر نازل فرمایا کہ ان کے خون کی حفاظت فرما اور سرزمین فلسطین کو تحفظ فراہم کر)۔

ایک اور شامی نژاد شاعر مشیل بن حافظ مغربی بھی پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ ﷺ کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے آپ ﷺ کی خوب مدح وستائش کرتا ہے اور اسلام کی وجہ سے عربوں کی

برتری کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ اسی نے عربی زبان کی حفاظت کی ہے۔"عيد المولد النبوي" (مولد نبوی کا تیوہار) سے معنون نظم میں وہ کہتا ہے[۱۰]:

يا من طلعت على الفصحى و أمتها	بنصر دين يضم الدهر سرمده
الضاد لولاك ما كانت مخلـدة	ولا رواها جمال أنت مـورده
إن كان للغرب عرفان و فلسـفة	ما أعطى محمّده فـــالشرق يكفيه

(اے وہ جو فصحی عربی اور اس کی قوم پر ظاہر ہوئے ایک ایسے مذہب کی نصرت سے جس کی ہمیشگی کا زمانہ ضامن ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو عربی زبان زندۂ جاوید نہ ہوتی اور نہ اسے آپ کی خوبصورتی سیراب و شاداب کرتی۔ اگر مغرب کے پاس علم اور فلسفہ ہے تو مشرق کے لئے وہ کافی ہے جو اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے دیا ہے)۔

شام ہی کا ایک اور نامور مسیحی شاعر جاک صبری شماس ہے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا میں ایک نظم "خاتم الرسل" کے عنوان سے متحدہ عرب امارات کے "البردة" انعام میں شرکت کے لیے کہی تھی۔ حالاں کہ وہ انعام حاصل نہ کر سکا تاہم اس مقابلے کے ذمہ داروں نے شماس کی شرکت کو اس مقابلہ کی سب سے زیادہ دلکش شاعرانہ شرکت سے تعبیر کیا۔ اس نظم کا ایک حصہ مندرجہ ذیل ہے[۱۱]:

يممُ (طهَ) المُرَسَلُ الروحاني	ويُجِلّ (طه) الشاعرُ النصراني
يا خاتمَ الرسل الموشح بالهدى	و رسـول نبل شامخ البنيـان
أَلقَىَ عليكَ الوَحيِ طهرُ عقيدة	نبويةٍ همرت بفيض معـان
مهما أساء الغرب في إيلامـــه	لم يرق هـون للنبي البـاني
لا يحجب الغربال نور شريعة	ويظل نورك طاهراً روحاني

(میں روحانی رسول (طٰہٰ) کا قصد کرتا ہوں اور یہ عیسائی شاعر (طٰہٰ) کی تعظیم کرتا ہے۔ اے ہدایت کے پیکر خاتم الرسل جسے بلند مقام پر فائز کیا گیا ہے۔ وحی نے آپ پر پاک پیغمبرانہ عقیدہ کو اتارا جو معانی کی کثرت سے لبریز ہے۔ مغرب الزام تراشی میں چاہے کسی بھی پستی میں چلا جائے مگر اس سے اس نبی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا جس کی صفت

---

[۱۰] اشتر، عبد الکریم، اوراق مهجرية، دار الفكر المعاصر، بیروت، ۲۰۰۲ء، ص ۳۴۔

[۱۱] الموقف الادبي، خاتم الرسل، جاک صبری شماس، شمارہ نمبر: ۴۶۱- ۴۶۲، اتحاد الکتاب العرب، دمشق، ستمبر ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۱- ۱۱۲۔

معمار کی ہے۔ کوئی چھلنی شریعت کی روشنی کو روک نہیں سکتی، آپ کی روشنی پاک اور روحانی ہے)۔

شام نژاد مہجری شاعر حسنی غراب، جس نے برازیل ہجرت کی اور جو اندلس لیگ کے بانیوں میں سے ہے، آنحضرت ﷺ کی تعریف و توصیف میں قصیدہ پڑھتے ہوئے کہتا ہے[۱۲]:

شعلة الحق لم تــزل يا محمد منذ أضرمت نارهـا تتوقد
غمر الأرض نـورها فإذا رمت دليلاً فعد إلى الأرض واشهد
جئت والناس في ضلال وغي ومن الهدي في يديك مهند

(اے محمدؐ، حق کا شعلہ جب سے بھڑکا ہے، تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ زمین پر اس کی روشنی پھیل گئی ہے، لہٰذا اگر ثبوت چاہیے تو زمین کی طرف لوٹو اور خود دیکھو۔ آپ ایک ایسے وقت میں آئے جب لوگ گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے، اور آپ کے ہاتھ میں ہدایت کی ہندی[۱۳] تلوار تھی)۔

لبنانی عیسائی شاعر محبوب الخوری الشرتونی "قالوا تحب العرب" (انہوں نے کہا کہ آپ عربوں سے محبت کرتے ہیں) کے عنوان سے ایک نظم میں اعلان کرتا ہے کہ عرب ایک ہی نسلی گروہ اور قوم ہیں نیز ان کی مذہبی وابستگی سے قطع نظر وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس نظم میں وہ رسول اللہ ﷺ کو تمام بیابانوں کا ہیرو قرار دیتے ہوئے کہتا ہے[۱۴]:

قالوا تحب العرب قلت: أحبهم يقضي الجوار علي والأرحـامُ
قالوا: لقد بخلوا عليك، أجبتهم أهلي وإن شحــوا علي كـرام
قالوا: البداوةُ، قلتُ: أطهرُ عُنصرٍ صفت القلوبُ هناكَ والأجسامُ
ومُحَمّد ... بطـل البرية كلــها هو للأعارب أجمعين إمـامُ

(لوگوں نے کہا کیا تو عربوں سے محبت رکھتا ہے؟ تو میں نے کہا کہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں کیونکہ ہمسائیگی اور رشتے داری اس کو لازم قرار دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا: انھوں نے تو تیرے ساتھ بخل سے کام لیا ہے تو میں نے جواب دیا کہ وہ میری قوم ہیں لہذا میرے نزدیک عزیز و محترم ہیں خواہ وہ بخل کریں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ تو بدو ہیں تو میں نے کہا یہ

---

[۱۲] خفاجی، محمد عبد المنعم، قصۃ الادب المہجری، دار الکتاب اللبنانی، بیروت، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۷۔
[۱۳] ہندی تلوار (السیف المھنّد) قدیم عرب میں سب سے عمدہ تلوار سمجھی جاتی تھی۔
[۱۴] عفانی، سید حسین، وامحمداہ ان شانئک ہو الابتر، دار عفانی، مصر، ۲۰۰۶ء، ج ۴، ص ۴۰۸۔

پاک ترین نسل کے لوگ ہیں جن کی روحیں اور جسم دونوں پاک ہیں۔ محمد تو تمام انسانیت کے ہیرو ہیں اور وہ تمام عربوں کے رہبر ہیں)۔

مشہور مہجری[۱۵] شاعر الیاس فرحات بھی اپنی نعتیہ شاعری میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے عرب قوم کی بدحالی اور پسماندگی کی شکایت کرتا ہے۔ آپ ﷺ سے درخواست کرتا ہے کہ ہمیں اس دلدل سے نکال دیں جس میں ہم پوری طرح سے پھنس چکے ہیں۔ اپنی مشہور نظم "یارسول اللہ" (اے خدا کے رسول!) میں وہ رسول اللہ ﷺ کی مدح وثنا کرتے ہوئے ان کو ایک ایسا چمکتا ہوا ستارہ قرار دیتا ہے جو جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں چمکا[۱۶]:

غمر الأرض بأنوار النبـوة كوكب لم تدرك الشمس علوه
لم يكد يلمع حتى أصبحت ترقب الدنيا ومن فيها دنـوه
يا رســول الله إنا أمـة زجها التضليل في أعمق هوة
ذلك الجهل الذي حـاربته لم يزل يظهر للشرق عتــوه
قل لأتباعك صلوا وادرسوا إنما الدين هدى والعلم قـوة

(ایک ستارے نے جس کی بلندی کو آفتاب بھی پہنچ نہ سکا زمین کو نبوت کی روشنی سے ڈھک لیا۔ ابھی وہ ستارہ چمکنے بھی نہ پایا تھا کہ دنیا اور دنیا والے آپ کے قرب ظہور کا انتظار کرنے لگے تھے۔ اے اللہ کے رسول! ہم ایسی قوم ہیں جسے گمراہی نے عمیق ترین گڑھے میں گرا دیا ہے۔ وہی جہالت جس سے اے رسول اللہ آپ نے جنگ کی تھی مشرق میں پھر اپنی سرکشی ظاہر کر رہی ہے۔ اپنے پیروؤں سے فرمادیجئے کہ تم عبادت کرو اور دین کا مطالعہ کرو کیونکہ دین سیدھا راستہ ہے اور علم ایک طاقت ہے)۔

مسیحی شعراء کی پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ سے محبت کے جھونکے آج تک ہمیں تازگی بخشتے رہے ہیں۔ لبنانی شاعر حلیم دموس بغیر کسی جانبداری کے ان سے محبت کے اعلیٰ ترین درجات پر پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کی تعریف و مدح کرتے ہوئے کہتا ہے[۱۷]:

أمُحَمّدٌ والمجد بعض صفاته مجدت في تعليمك الأديانا

---

(۱۵) "مہجر" یعنی ہجرت کی جگہ — یہ ان عرب، بالخصوص شامی اور لبنانی، ادباء و شعراء کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں بالخصوص جنوبی امریکہ میں بس گئے لیکن انہوں نے عربی زبان سے اپنا تعلق برقرار رکھا اور ان میں بہت سے قابل ذکر ادباء و شعراء پیدا ہوئے۔ ایسے ادب کو "مہجری ادب" کہا جاتا ہے۔

(۱۶) د۔ مریدن، عزیزہ، الشعر القومي في المهجر الجنوبي، دار الفکر، ط ۲، ۱۹۷۳ء، ص ۳۵۹۔

(۱۷) ابوالعیون، محمد، شعراء مسیحیون نظموا أروع القصائد في مدح النبي، صوت الازہر، ۲۴ نومبر ۲۰۱۷ء۔

إني مسيحي أحب محمداً　　وأراه في فلك العلا عنوانا

(اے محمد (ﷺ)، جس کے بعض اوصاف بزرگانہ ہیں، آپ نے اپنی تعلیم میں ادیان کی تعریف وستائش کی۔ بے شک میں ایک ایسا عیسائی ہوں جسے محمد (ﷺ) سے محبت ہے اور میں ان کو بلند آسمان میں ایک عنوان کے طور پر دیکھتا ہوں)۔

ریاض معلوف، جو برازیل میں مقیم لبنانی الاصل شاعروں میں سے ایک تھا، رسول اللہ ﷺ کی مدح وثنا میں رطب اللسان ہے[18]:

يا نبي الأعراب والإسلام　　عيدك اليوم بهجة للأنام
أنت يا صاحب الرسالة فخر　　أنت أهل للمدح والإكرام
تنثر الحكمة البليغة شعراً　　عربيــاً يطيب للأفهام

(اے عربوں اور اسلام کے پیغمبر! آج تمہاری عید لوگوں کے لئے خوشی کا دن ہے۔
اے پیغام پہنچانے والے! آپ پر فخر ہے اور آپ مدح وثنا اور اکرام کے حق دار ہیں۔
آپ بلیغ حکمت کو عربی شاعری کے ذریعے پھیلاتے ہیں جو بآسانی سمجھ آجاتی ہے)۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ان عیسائی شعراء میں سے بعض شاعروں نے نہ صرف اسلامی تہذیب وثقافت کا احترام کیا بلکہ اس کی اعلیٰ انسانی اقدار اور بلند اخلاق وکردار سے متاثر ہو کر اسلام کو اپنا لیا۔ اللہ تعالی نے جب ان کو ہدایت بخشی تو انہوں نے اپنے مذہب کو خیرباد کہہ کے خالص یقین کے ساتھ اسلام قبول کر لیا، جیسے ابوالفضل الولید جو اسلام میں داخل ہونے سے پہلے الیاس طعمہ کے نام سے موسوم تھے۔ اسلام اور اس کی عظمتوں کے دفاع کے لیے انہوں نے ایک قصیدہ ابن الفارض کے مشہور قصیدہ کے طرز پر لکھا اور رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کی ایک بہترین مثال پیش کی[19]:

أعاهد ربي أن أصلي مسلما　　على أحمد المختار من خير أمة
هداني هواها ثم حبب شرعه　　إليّ فصحت مثل حبي عقيدتي

(میں اپنے رب سے عہد کرتا ہوں کہ میں ایک مسلم کی حیثیت سے اس احمد پر درود بھیجوں گا جن کا انتخاب ایک بہترین امت میں سے ہوا ہے۔ ان کی محبت نے میری رہنمائی کی، پھر انہوں نے اپنی شریعت کو میرے لیے محبوب بنادیا نیز میرا ایمان میری محبت کی طرح درست ہو گیا)۔

ایک اور مایۂ ناز لبنانی الاصل مہجری شاعر رشید ایوب ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ، خلفاء راشدین اور

---

[18] عبد الدایم، صابر، أدب المہجر، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷۵۔
[19] د. مریدن، عزیزۃ، الشعر القومی فی المہجر الجنوبی، دار الفکر، ط۲، ۱۹۷۳ء، ص ۳۵۰ - ۳۵۱۔

بہادر فاتحین پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے[۲۰]:

نحن بني الأعراب كنا ولم نزل بما خصنا المولى نفوق الأجانبا
من يا ترى أعلى الورى كمحمد وأرفعهم مجدا وأسمى مناقبا
ومن مثل من قادوا الخلافة بعده وكانوا لصرح العدل منه جوانبا
ألسنا الألى سادوا العباد ودوخوا البلاد وأبدوا في الحروب عجائبا

(ہم عرب تھے، اور ہم آج بھی عرب ہی ہیں۔ کیونکہ رب نے ہمیں غیروں سے برتر قرار دیا ہے۔ بھلا محمد ﷺ کی طرح کس کا رتبہ بلند اور عظیم الشان ہے۔ ان کے بعد خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے والوں جیسا بھلا کون ہے جو عدل کی عظیم عمارت کے ستونوں کے مانند تھے۔ کیا ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے بندوں پر سرداری کی، ملکوں کو فتح کیا اور جنگوں میں عجائبات دکھائے؟)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشعار دراصل وہ اعتراف ہے جو عرب عیسائی شعراء نے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کی بے شمار خوبیوں کا احاطہ کرتے ہوئے کیا ہے۔ آپ ﷺ کی بردباری، رواداری، سچائی، چشم پوشی، منصفانہ رویہ اور کرم فرمائی ان کو بھی آپ کا قائل کر گئی۔ نیز جب بھی ذکر نبوی چھڑتا تو ان کے جذبات پر رقت طاری ہو جاتی اور وہ بھی بے قابو اور بے تاب ہو جاتے اور ان کی زبان سے ایسے کلام صادر ہوتے جو ان کی محبتوں اور شیفتگی کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے سوا اس قسم کی والہانہ محبت اور تعظیم انسانیت کی طویل تاریخ میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ اگر ان کا ذکر یا ان کا خیال ہی دل و زبان پر آجائے تو پوری کی پوری فضاء معطر ہو جاتی ہے۔ آپ ایسی باکمال ہستی ہیں جو سراپا تعریف و مدح ہے، جن کی ہر آن تعریف و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ ہر زمان و مکان میں انہی کی مدح کا چرچا ہوتا ہے۔ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے گرویدہ اور دام محبت میں اسیر نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے ایسے بے شمار پہلو ہیں جس نے ان عرب نژاد عیسائی شاعروں کو بھی فریفتہ کر دیا۔ بالخصوص آپؐ کی رواداری، صحابہ کرامؓ سے محبت و شفقت، آپ کا بلند اخلاق و کردار اور اہل کتاب اور مشرکوں کے ساتھ آپؐ کا حسن سلوک۔ آپ ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ اگر کوئی بھی شخص اخلاص نیت کے ساتھ مطالعہ کرے تو آپ کے اوصاف و کمالات اور محاسن و محامد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

---

[۲۰] د. سراج، نادرہ جمیل، شعراء الرابطہ القلمیہ، دار المعارف، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۳۔

ہندو شعراء اور نعت گوئی

محمد فرحت حسین
ریسرچ اسکالر، شعبہ اُردو، بی آر اے بہار یونیورسٹی، مظفرپور
mdfarhat1994@gmail.com

ملک کے موجودہ صورت حال، خاص کر پچھلی ایک دہائی کی صورت حال پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ کیوں کہ ملک کے اندر جو فضا قائم کی گئی ہے وہ زہر آلود، مہلک اور خطرناک ہے جو جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل چکی ہے۔ اس کے نتیجے میں ملک کے غبارآلود اور زہر آگیں فضا میں سانس لینا دشوار ہے۔ اس میں بہنے والی بیمار ہوا کی زد میں اکثر وہ لوگ آتے ہیں جو صحت مند لیکن بے یار و مددگار ہوتے ہیں اور جلد ہی ان کی قوت مدافعت دم توڑ دیتی ہے۔ معاملہ یہیں تک رکا نہیں ہے۔ اب حالات اتنے بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں کہ اس بادِ سموم کی زد میں وہ بھی آ گئے جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس تعصب بھرے ماحول میں کوئی بعید نہیں کہ عظیم ترین شخصیت بھی زد میں آجائے جن سے بہتر اور عظیم ہستی دنیا میں کوئی نہیں ہے اور نہ ہو گی۔ ایسے پراگندہ ماحول میں دُور اَز قیاس نہیں کہ ان کی تعظیم و تکریم کے بجائے ان پر پھبتیاں کسی جائیں، گلہائے عقیدت و محبت نچھاور کرنے کے بجائے تنقید و تشنیع کی جائے، احترام بجالانے کے بجائے تمسخر سے کام لیا جائے، آداب و تسلیمات کے بجائے گستاخی اور سر خم کرنے کے بجائے بغاوت و سرکشی پر اترا جائے۔ ادھر ملک ہندستان میں ایسی ہوا چلی ہے جس میں کچھ لوگ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے، تنقید و تشنیع سے گریز نہیں کرتے، تمسخر و استہزا سے باز نہیں آتے حالاں کہ برادران وطن کے بزرگوں نے اسی نبی آخر الزماں ﷺ کی مقدس بارگاہ میں گلہائے عقیدت و محبت نچھاور کیے ہیں، عشق محمدی سے کاسۂ دل لبریز کیا ہے اور مئے الفت محمدی سے بادۂ رسالت کے متوالوں کو سیر اب کیا ہے، اسی کی معرفت الفت، محبوب سے عاشقوں کے دلوں کو آباد کیا ہے اور ذہنی و قلبی سکون کا سامان فراہم کیا ہے۔

اس مضمون میں انھیں قدیم ہندو شعراء کی عشق و محبت کی مختلف جھلکیاں دکھانا راقم الحروف کا

مقصد ہے، کہ کس طرح وہ اہل دل سخنور نے نعتیہ کلام کے ذریعے نبی پاکؐ کے اوصاف حمیدہ واخلاق کریمہ کو سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کی جھلکیاں ان کے کلام کے ذریعے دکھانا چاہتا ہوں تاکہ اس کا روشن پہلو سامنے آئے۔

نعت، اصناف شاعری کی ایک بہترین صنف ہے۔ اس سے وہ شاعر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کے پاس معلومات کا خزانہ، زبان پر دسترس ہو اور بڑی بات یہ کہ وہ عاشق کامل بھی ہو، ورنہ شاعر اس میں ناکامیاب ہو جاتا ہے۔ نعت گوئی کوئی آسان صنف نہیں ہے، بلکہ اسے مشکل ترین صنف شاعری میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں محبوب ایسا ذی شان ہے کہ اس کے اوصاف کے ذکر میں محتاط اور چوکنا رہنا پڑتا ہے، یہاں حد بندی کر دی گئی ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر اس حد کو پار کر لیا تو وہ بے ادبی اور گستاخی کہلائے گی۔ یہاں ہم ایسے کچھ ہندو شعراء کا تعارف کراتے ہیں:

مہاراجہ سر کشن پرساد: ان نعت گو شعراء میں سے ایک باکمال اور نعت گوئی میں بے مثال شاعر مہاراجہ سر کشن پرساد المتخلص شادؔ تھے، جن کی نعت گوئی میں انوکھاپن، جدت اور انفرادیت کے سبب ان کے نعتیہ کلام کو ایک بلند اور ممتاز مقام حاصل ہے جن کی نعت میں وہ سب بڑی خوبیاں ہیں جو ابدیت و آفاقیت کا سبب ہیں۔

آپ کا نام 'کشن پرساد' اور تخلص شاد تھا اور آپ دکن کے رہنے والے تھے۔ ذات کے کائستھ تھے جو کہ ہندو سماج میں ایک اونچی ذات مانی جاتی ہے۔ اپنی قابلیت اور فطری صلاحیت کی بنیاد پر دولت آصفیہ کے مدار المہام تھے؛ گویا اپنی لیاقت اور استعداد کی بنا پر سلطنت آصفیہ کے ایک عظیم رکن تھے اور نمایاں کارنامے کی بدولت انھیں القاب و خطابات سے سرفراز کیا گیا۔ قابل ستائش بات یہ ہے کہ مدار المہام جیسے معزز عہدے پر فائز، علم و فن اور عمدہ کارکردگی کی بنا پر ہوئے اور یہ اعجاز اپنے دم پر حاصل کیا نہ کہ کسی کی سفارش پر۔

آپ کا دامن تعصب کے ناگوار دھبوں سے پاک تھا اور آپ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق، یکجہتی و یک رنگی کے حامی تھے، کیوں کہ اس طرح کے خوشگوار ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی تھی جس میں کسی طرح کے تعصب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ لہٰذا اردو زبان میں آپ نے شاعری کی اور اپنے خیال کا اظہار بہترین انداز میں کیا۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور فکر و فن کا ایسا جوہر دکھایا کہ ہر صنف میں آپ کا کلام گوہر آبدار کی طرح بیش قیمتی ہے اور اس کی دلکش چمک اب بھی باقی ہے، بلکہ آپ کا کلام عصر حاضر میں بھی موزوں اور بامعنی ہے۔

طبیعت میں سوز و گداز اور دل کے حساس ہونے کی وجہ سے ساقی خمخانۂ وحدت (نبی آخر الزماں ﷺ) سے عشق اور والہانہ لگاؤ تھا، لہٰذا آپ نعت میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ آپ کے نعتیہ کلام کے کچھ اشعار بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں:

کانِ عرب سے لعل نکل کر سر تاج بنا سرداروں کا
نام محمد اپنا رکھا، سلطان بنا سرداروں کا
باندھ کے سر پہ سبز عمامہ کاندھے رکھ کر کالی کملی
ساری خدائی اپنی کر لی مختار بنا مختاروں کا
تیرا چرچا گھر گھر ہے، جلوہ دل کے اندر ہے
ذکر ترا ہر لب پہ جاری، دل دار بنا دلداروں کا
تیرے عرق میں گل کی بو، قامت تیرا سرو جو
بس گئیں کلیاں طیبہ کی، بھاگ کھلا گلزاروں کا
بادۂ عرفاں دیتا ہے ساقی وحدت کے میخانے سے
شادؔ مقدر فضل خدا سے جاگا اب میخواروں کا[۱]

ایک اعجاز: اردو نعت گویوں میں یہ شرف اور اعجاز صرف شادؔ صاحب کو ہی حاصل ہے کہ مدینہ کے اس کتب خانے کی دیوار پر آپ کا نعتیہ کلام آویزاں ہے جو مسجد نبوی کے متصل شیخ الاسلام عارف حکمت نے قائم کیا تھا، چنانچہ سید سلیمان ندوی رسالہ معارف میں 'حجاز کے کتب خانے' کے عنوان سے قسط دوم میں لکھتے ہیں:

منجملہ ان عربی، فارسی اور ترکی منظومات کے یہ دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا کہ ان میں ایک اردو کی نعتیہ غزل بھی کاغذ پر خوش خط لکھی ہوئی شیشہ میں جڑی ہوئی آویزاں تھی، نیچے اردو کے اس خوش نصیب شاعر کا نام دیکھ کر اور بھی تعجب ہوا، کہ یہ دکن کا ہندو نام اور اسلام دل صوفی شاعر مہاراجہ کشن پرساد شادؔ (سابق مدار المہام دولت آصفیہ) تھے۔ مطلع اور مقطع یہ ہے:

یہی کہتے ہیں مدح خوان محمدؐ
جو شان خدا ہے، وہ شان محمدؐ

---

[۱] ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، مؤلف فانی مرادآبادی، عارف پبلشنگ ہاؤس، لائل پور، پاکستان، ص ۲۴

شفاعت تری شاد کیونکر نہ ہوگی
کہ دل سے ہے تو مدح خوان محمدؐ (۲)

چودھری دلّورام کوثری: نام دلورام تھا اور خطہ پنجاب کے ضلع حصار میں واقع قصبہ نانڈری تھا جو آپ کا وطن مالوف تھا۔ آپ کا تعلق بشنوئی سماج سے تھا جو اس ضلع میں بڑی تعداد میں آباد تھے۔ خوبصورت دل کے مالک تھے جس میں سوز جگر کا عنصر پایا جاتا تھا۔ فارسی، اردو اور انگریزی زبان کے اچھے عالم تھے اور تینوں میں تحریر و تقریر کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چودھری صاحب ایک طویل مدت تک نعت گوئی میں مشغول رہے۔ آپ کو ریاست دکن، بھوپال، رام پور، بھاول پور اور پٹیالہ کے درباروں میں اپنا نعتیہ کلام سنانے اور انعام پانے کا متعدد بار موقع ملا۔

آپ کو فن شاعری میں کسی استاد سخن سے کوئی تلمذ حاصل نہ تھا، بلکہ یہ استعداد آپ میں فطری تھی، لہٰذا اگر آپ کو قسمت کا دھنی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

آپ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ایک دیوان محض نعت میں غیر منقوطہ لکھا ہے جس میں تخلص کے بجائے اپنا نام دلورام استعمال کیا ہے۔ آپ کے دل میں عشق نبی کا شمع فروزاں تھا جس کی روشنی اور چمک کلام میں بکھری ہوئی ہے۔ اس کی دلکشی و رعنائی اپنی طرف توجہ مبذول کراتی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد بھی کلام کی چاشنی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے:

مدینے میں مجھ کو بلا یا محمدؐ
ذرا اپنا کوچہ دکھا یا محمدؐ
نہ فرقت میں مجھ کو رلا یا محمدؐ
نہ عاشق کو اپنے ستا یا محمدؐ
خدا تیرا عاشق تو عاشق خدا کا
میں تم دونوں پر ہوں فدا یا محمدؐ
نہیں بادشاہوں کی کچھ مجھ کو پروا
ترے در کا میں ہوں گدا یا محمدؐ

---

(۲) رسالہ معارف، ماہ نومبر ۱۹۲۶ء، عدد ۵، جلد ۱۸، ص ۳۲۹

ترا کوثریؔ رہتا ہے ہندوؤں میں
ہے ظلمت میں آبِ بقا یا محمدؐ [۳]

ایک دوسری نعت میں وصف نبیؐ اور شان محمدؐ کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے:

عظیم الشان ہے شان محمدؐ
خدا ہے مرتبہ دان محمدؐ
نبی کے واسطے سب کچھ بنا ہے
بڑی ہے قیمتی جان محمدؐ
علی و فاطمہ شبیر و شبر
بسا ان سے گلستان محمدؐ [۴]

دو اور شعر ملاحظہ کریں جس میں حقیقت کی ترجمانی خوبصورتی سے کی ہے:

کچھ عشق پیمبرؐ میں نہیں شرط مسلماں
ہے کوثریؔ ہندو بھی طلبگار محمدؐ
کوثریؔ تنہا نہیں ہے مصطفیٰؐ کے ساتھ ہے
جو نبیؐ کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے

قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ انہوں نے حقانیت کی سچی ترجمانی کی ہے۔ عقائد اسلام سے جڑے پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور عشق کا اظہار اس نفاست سے کیا ہے کہ حق ادا کر دیا ہے، مثال ملاحظہ ہو:

مجھے نعت نے شادمانی میں رکھا
کہ معروف شیریں زبانی میں رکھا
درِ مصطفیٰؐ کی ملے گر گدائی
تو پھر کیا ہے صاحبقرانی میں رکھا
محمدؐ کو بے سایہ حق نے بنایا
یہ پہلا نشاں نقش ثانی میں رکھا

---

(۳) ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، مولف فانی مراد آبادی، عارف پبلشنگ ہاؤس، لائل پور، پاکستان، ص ۶۴
(۴) ہندو شعراء دربار رسول میں، مرتب مولوی محمد محفوظ الرحمن، پبلشر: مطبع گلشن ابراہیم، امین آباد، لکھنؤ، ص ۹

جو ذرہ اڑا شہ کے قدم کا
زمانے نے تاج کیانی میں رکھا
لکھیں کوثری عمر بھر ہم نے نعتیں
نہ کچھ اور غم زندگانی میں رکھا(۵)

خلاصہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں تنوع ہے، انداز بیان نرالا اور زبان وبیان عمدہ ہے، خیالات اچھوتے اور نرالے ہیں، گویا آفاقیت، شعریت، موزونیت جیسی خوبیاں کلام میں موجود ہیں جو کلام کا حسن بڑھاتی ہیں۔

منشی شنکر لال ساقی: شنکر صاحب کائستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا وطن سکندر آباد تھا اور انہوں نے وہیں تعلیم بھی پائی تھی، شاعری کی طرف رجحان ہوا تو اسد اللہ خاں غالب کے تلمیذ رشید تفتہؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور خود میں ایسی صلاحیت پیدا کرلی کہ قادرالکلام شاعر بن گئے۔ ساقیؔ تخلص رکھا جو اشارہ کرتا ہے کہ اشعار کی شکل میں بادۂ رسالت کے متوالوں کو جام پلاتے تھے۔ اشعار ملاحظہ کریں جس میں جام ومینا، ساغر وکباب کی باتیں کیں ہیں:

جب مئے عشق نبیؐ سے مجھے مستی ہوگی
بے خودی ہوگی بلندی نہ پستی ہوگی
بزم عشاق میں جب بادہ پرستی ہوگی
یاد میں ساقی کوثر ہی کے مستی ہوگی
میکشو ہے کرم ساقی کوثر جن پر
لب پہ ان کے صفت بادہ پرستی ہوگی
پی گیا بھر کے جو جام مئے عشق احمدؐ
اس کی مستی کو نہ ہرگز کبھی پستی ہوگی
کچھ غرض جنت و دوزخ سے نہیں ہے ساقیؔ
ان کے مستوں کے لیے اور ہی بستی ہوگی(۶)

(۵) ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، مولف فانی مراد آبادی، عارف پبلشنگ ہاؤس، لائل پور، پاکستان، ص ۴۲-۴۳
(۶) ہندو شعراء دربار رسول میں، مرتب مولوی محمد محفوظ الرحمٰن، مطبع گلشن ابراہیم، امین آباد، لکھنؤ، ص ۱۵

منشی دامودر داس: دامودر صاحب یوپی کے شہر کان پور میں پیدا ہوئے لیکن ملازمت کے لیے جبل پور گئے جہاں کچہری میں منصرمی کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ اپنی علمی زندگی میں محبت، ملائمت اور نرمی کے قائل تھے۔ زندگی بھر محبت و الفت کے گیت گاتے رہے اور قومی یکجہتی کے ترانے سناتے رہے، دلوں کو جوڑنے والے نغمے گنگناتے رہے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے، نفرت وعداوت اور خشونت کے سخت مخالف تھے۔ آپ کا بھی کاسۂ دل الفت محمدی سے لبریز تھا جو کیف ونشاط کے عالم میں خوب چھلکتا اور دوسروں کو سیر اب کر جاتا۔

تخلص دروغؔ تھا لیکن اپنے جذبات کو جس دیانت داری سے بیان کرتے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ استعارات سے جو خوبی پیدا کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اور یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ انھیں لفظوں کا برتنا آتا تھا:

بغیر عشق بتاں کہیے کب ملا ہے خدا
سپاس اس لیے پہلے تولا انھیں کا بجا
ریاض و تقویٰ زہد اور عبادت ہے یہی
حمد و نعت بتان رکھو زبان پر تو سدا
ملے گا تم کو بہر کیف تو وصال صنم
دروغؔ تم نے کہا ہے یہ خوب بسم اللہ[۷]

سالک رام سالکؔ: آپ گروار کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کے باکمال شاعر شمشاد لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اپنی ذہانت و فطانت کی بدولت ان کے محبوب شاگرد بن گئے تھے۔ نعت گوئی کا شوق بہت تھا۔ ان کے کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ عشق نبیؐ نے ان کے دل کو نیم بسمل کر رکھا تھا جس کی وجہ سے سوز وگداز ان کے کلام میں نظر آتی ہے جو دلوں کو پگھلا دیتی ہے۔ کلام میں کسک اور درد بے دوا بھی ہے جو قاری پر وجد کی کیفیت طاری کرتا ہے اور دل کو صد پارہ بھی کرتا ہے۔ گل سرسبد اور اس کے متعلقات سے کس درجہ محبت ہے ملاحظہ کریں:

---

[۷] ماخذ سابق ص ۱۷

لے لیگی مری جان تمنائے مدینہ
مدت سے ہے اب ورد زبان ہائے مدینہ
کیوں کر نہ دل و جان سے مجھے بھائے مدینہ
آنکھوں میں بسا ہے میرے مولائے مدینہ
سرمہ کی طرح آنکھوں میں سالک میں لگا لوں گا
ہاتھ آئے جو خاک در مولائے مدینہ(۸)

منشی راج بہادر زخمی :قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے جہاں سینکڑوں عظیم اور نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔ آپ نے طاہر فرخ آبادی سے پہلے شاعری کے آداب سیکھے اور بعد میں ایک اچھے سخن ور بن گئے۔ نمونہ اشعار جس میں الفت محمدیؐ کا اظہار والہانہ انداز میں کیا ہے:

جام بھر کے ہمیں یا ساقی کوثر دینا
ہو گزر حشر میں جس دم لب کوثر دینا
لب شیریں محمدؐ کے جو لکھے اوصاف
شعر ہر ایک ہوا قند مکرر اپنا
کیوں نہ اعجاز محمدؐ کے ہوں قائل اغیار
کر لیا ایک زمانہ کو مسخر اپنا
کیوں نہ مل جائے ہمیں منزل مقصد زخمیؔ
خضر جادہ الفت ہے پیمبر اپنا(۹)

منشی پرساد وہبیؔ :پرساد صاحب اردو کے مشہور زمانہ اخبار 'اودھ اخبار' کے منیجر تھے۔ اسی سے ان کے تبحر علمی، اردو زبان و ادب پر دسترس اور ان کے علم کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے دل میں عشق محمدیؐ کی کیفیت، تڑپ اور بے چینی کا اندازہ ان کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کے سینے میں عشق محمدی کا سمندر موجزن تھا۔ ان کی ایک خوبصورت و پُر مسرت لہر کا مشاہدہ کریں جو بحر محبت میں ظاہر ہوئی تھی:

---

(۸) ماخذ سابق ص ۱۹
(۹) ماخذ سابق ص ۲۰

بے خبر ہو دونوں عالم سے سوائے مصطفیٰ
یا الٰہی دل ہو ایسا مبتلائے مصطفیٰ
شافع محشر ملا ہے کس پیمبر کو خطاب
کون محبوب الٰہی ہے سوائے مصطفیٰ
جو ہوا سائل، رہے اس کو نہ پھر کچھ احتیاج
ایسا کر دیتی ہے مستغنی عطائے مصطفیٰ
آدمی کیا مدح کر سکتے نہیں جن وملک
حق تعالیٰ آپ کرتا ہے ثنائے مصطفیٰ
ہوتی ہے حسرت یہی کیوں دل نہ یہ میرا ہوا
دیکھتا ہوں جب میں وہی نقش پائے مصطفیٰ[(۱۰)]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے غیر مسلم شعراء ہیں جنہوں نے دربار رسول میں گلہائے عقیدت نچھاور کیے ہیں اور سوزن عشق سے محبت کا ایک خوبصورت چمنستان آباد کیا ہے۔ ہر صوفی دل ہندو شاعر نے عشق و محبت اور حسین جذبات کا اظہار اپنے اپنے انداز میں کیا ہے جس سے اس چمنستان کی خوبصورتی اور بڑھ گئی ہے۔

مذکورہ بالا اشعار جن میں لفظی و معنوی دونوں طرح کی خوبیاں موجود ہیں کہیں سے ایسا نہیں لگتا ہے کہ وہ غیر مسلم شعراء کے ہیں۔ اگر نام نہ تحریر کیا جائے تو کوئی نہیں بتا سکتا ہے کہ یہ پُر درد، پُر سوز اشعار اور عشق نبی میں ڈوبا ہوا کلام ان کے ہیں۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غیر مسلم شعراء نے اردو نعت گوئی کو وسعت وترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

---

(۱۰) ماخذ سابق ص ۲۱

تقدیسی تخلیقات (حمد، نعت، مناجات، منقبت، مرثیہ) اردو میں ابتداء ہی سے لکھے جاتے رہے لیکن انھیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ صرف کسی حد تک مرثیہ پر تحقیقی و تنقیدی کام ہوتا رہا مگر حمد و نعت تو ناقدین ادب کے لیے گویا شجرِ ممنوعہ بن گئے اس پر طرفہ یہ کہ ادب میں ترقی پسند تحریک نے تقدیسی ادب کو مظلوم بنا کر رکھ دیا اور بیچارہ تقدیسی ادب نگاہِ التفات کو ترس گیا۔ اگر چہ کہ سوداؔ اور اس کے معاصر دکن کے شاعر محمد باقر آگاہ نے اردو نعت پر نثر میں کم و بیش دو صدیوں قبل ہی تنقیدی حاشیے چڑھا دیئے تھے۔ اردو نعت پر یہ پہلا تنقیدی سرمایہ تھا۔

شبلیؔ نے جب ندوہ سے علاحدگی اختیار کر لی اور اعظم گڑھ میں دار المصنّفین کی بنیاد رکھی تو ۱۹۱۶ء میں شبلی کے دست راست سیّد سلیمان ندوی نے "معارف" جاری کیا۔ اس کا مقصد مذہب و فلسفہ و فکر کی ترجمانی اور نئی تحقیق اور تازہ خیالات کو فروغ دینا رہا۔ اس رسالے نے علم مذہبی کے ارتقا کو منظر عام پر لانے کے لیے محققانہ مضامین شائع کیے، علومِ قدیمہ کو جدید طرز پر از سرِ نو ترتیب دینے کی کوشش کی گئی۔ معارف کا یہ سلسلہ از ابتدا تا دمِ تحریر برابر جاری ہے۔

معارف کے ان تیرہ سو شماروں میں سے جناب غلام مصطفیٰ دائمؔ نے حمد و نعت اور منقبت جیسی تقدیسی اصناف پر تینتالیس اندراجات یکجا کر لیے ہیں۔ انھیں معارف جیسے رسالے میں ان اصناف کی تہی دامنی پر افسوس بھی ہے کیونکہ ۱۹۱۶ء سے جاری ہوئے معارف میں تقدیسی ادب کی تنقید پر پہلا مضمون 'محسنؔ کاکوروی اور ان کی خصوصیات' پر ستمبر ۱۹۴۱ء کے شمارے میں محمد ابو اللیث صدیقی نے تحریر فرمایا تھا۔ یعنی مسلسل ۲۵ سال تک معارف کے صفحات ان اصناف سے تہی رہے۔ بعد میں صباح الدین عبد الرحمٰن اور ضیاء الدین اصلاحی کے زمانے میں ان اصناف پر مضامین کی تعداد بڑھی جو رسالے کی پالیسی اور اس کے خاکے کے عین مطابق تھی۔ اس لیے تقدیسی ادب پر معارف کے اس ذخیرہ کو گنجینۂ خیر سمجھ لینا چاہیے۔ دائمؔ کا یہ تحقیقی کام اپنے آپ میں نہایت دقت طلب رہا ہوگا۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کام کو دائمی مقبولیت سے بھی نوازے۔ آمین یا رب العالمین۔

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

ISBN:978-969-8918-96-5